ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
اکتوبر 2011ء
معراج رسول
PDFBOOKSFREE.PK

- 11 — چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ
- 18 — الجھاوا — کاشف زبیر
  محبت، دولت اور انتقام کے شعلوں میں گھر جانے والے جانبازوں کا معرکہ خاص
- 71 — برعکس — جمال دستی
  اس شخص کا قصہ جسے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا
- 77 — اعترافِ رقابت — سیر بنارار
- 85 — گمشدہ تصویر — مختار آزاد
  ایک تصویر کی گمشدگی سے بنیاد اختیار کر لینے والی کہانی کے تانے بانے
- 102 — گرداب — اسما قادری
- 131 — غلط فہمی — محمد عفان آزاد
- 145 — زود پشیمان — بابر نعیم

- 149 — کیمیاگر — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
- 159 — للکار — طاہر جاوید مغل
- 203 — فریبِ نظر — سلیم انور
- 211 — وفاپرست — رضوانہ منظر
- 216 — واجب القتل — تنویر ریاض
  واردات قتل کا قضیہ جو ایک معمے کی صورت اختیار کر چکا تھا
- 226 — لبِ بام — منظر امام
- 257 — حریفِ جاں — پروین زبیر
- 000 — تراش خراش — ادارہ قارئین

جلد 40 • شمارہ 10 • اکتوبر 2011 • زر سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 3502551 E-mail: jdpgroup@hotmail.com
مقام اشاعت: 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

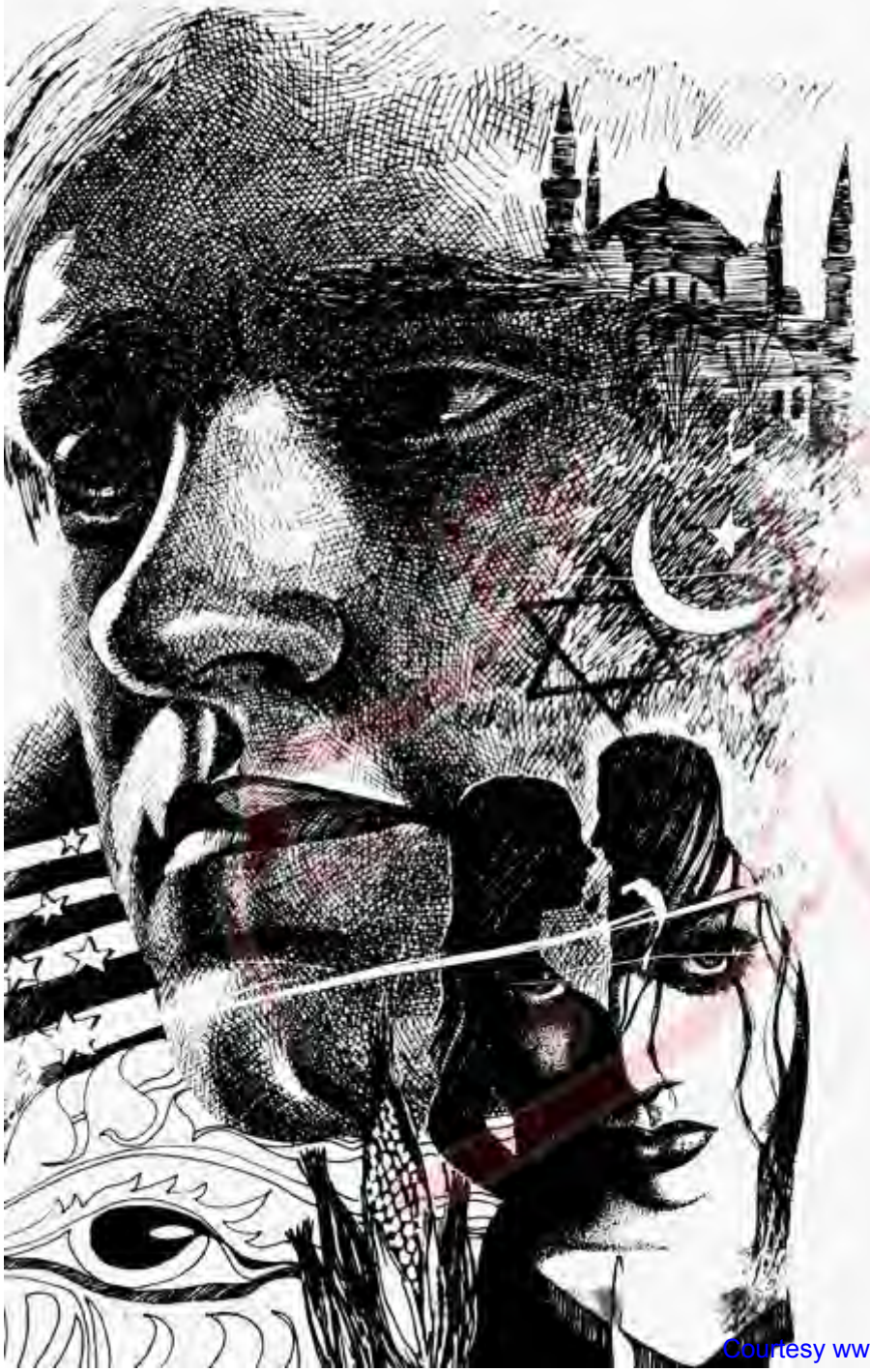

پاکستان میں زراعت کے موضوع پر سائنسی نکتہ نگاہ کی حامل ایک فکر انگیز تحریر

کاشف زبیر

الجھاوا

کسی شخص کی کوئی صفت ایسی نہیں ہوتی جو پیدائش سے موت تک ایک حالت پر رہتی ہو... انسان کی ذات مختلف صفات کا مجسم عکس ہے... اور ان صفات و کیفیات پر تغیر پذیری کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے... وقت کے ساتھ اس کی خوبیوں اور خامیوں میں کمی اور اضافے کا رجحان رہتا ہے... کبھی ایسی کوئی قوت آجاتی ہے... جو عالم مثال کی مدد سے گویائی اور بینائی عطا کر دیتی ہے... اسرار و کشف کے معاملات الہام کی صورت عیاں ہونے لگتے ہیں... ایک ایسی ہی ذات کا احاطہ کرتی تحریر جس کے شعور اور لاشعور میں بہت کچھ مدغم ہو چکا تھا... اس کی داخلی اور خارجی زندگی میں ارتعاش آچکا تھا...

اس شخص کی داستان تحیر جس کی ذات اور شناخت ایک معما بن چکی تھی

ڈاکٹر سلطان احمد کا شمار [illegible] یونیورسٹی کے سب سے قابل ترین افراد میں ہوتا تھا۔ [illegible] سے اس کا شعبہ تھا وہ بڑا کام [illegible] سے اس کا شوق تھا۔ طلبا کو پڑھانے اور نئی معلومات [illegible] مختلف پروجیکٹ [illegible] ان پروجیکٹ پر [illegible] سے کام کرتا تھا۔ وہ صبح [illegible] یونیورسٹی آجاتا اور سب سے پہلے لیب پہنچتا۔ اس وقت وہاں [illegible] کوئی نہیں ہوتا تھا۔ آٹھ بجے تک سلطان لیب میں کام کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی میں اپنے دفتر میں آجاتا۔ وہ دوپہر تین بجے تک اس کا تمام وقت اپنے طلبا سے مخصوص ہوتا تھا۔ وہ انہیں پڑھاتا اور ان کی مشکلات کو حل کرتا۔ اس [illegible] طلبا کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ اس سے کسی وقت بھی مل سکتے تھے۔ اس کے اسی [illegible] نے اسے طلبا میں مقبول اور ساتھی اساتذہ میں غیر مقبول کر دیا تھا۔ طلبا ڈاکٹر سلطان احمد کی مثالیں ان کے سامنے رکھتے تھے۔ وہ دوسرے اساتذہ سے بھی توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ ڈاکٹر سلطان کی طرح پیش آئیں جبکہ دوسرے اساتذہ پڑھانے کو مشن نہیں، پیشہ سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر سلطان کے اس کھلے مغربی طرز عمل کی وجہ سے یونیورسٹی میں دوسرے اساتذہ زیادہ خوش نہیں تھے۔

تین بجے سلطان یونیورسٹی سے نکلتا [illegible] زرعی تحقیق کے [illegible] اسلام آباد میں قائم [illegible] فصلوں پر [illegible] تعلیم کے دوران میں [illegible]

ان [illegible] سلطان احمد کا تعلق ایک [illegible] دیہی علاقے سے تھا۔ اس کا باپ [illegible] چھوٹا [illegible] اور معمولی پڑھا لکھا شخص تھا لیکن اس نے سلطان کی تعلیم پر بہت محنت کی تھی۔ سلطان کا پہلا اسکول اس کے گھر سے سات میل دور تھا اور اس کا باپ روزانہ اسے کندھے پر بٹھا کر اسکول چھوڑنے اور چھٹی کے وقت لینے آتا تھا۔ کچے راستوں پر سردی گرمی اور برسات میں یہ کام آسان نہیں تھا لیکن اس کے باپ نے اسے ایک دن بھی اسکول کا ناغہ نہیں کرنے دیا۔ شاید اسی بنا پر سلطان نے ذہن میں شروع سے [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا تھا کہ علم سے زیادہ اہم چیز اور کوئی نہیں ہے۔

پرائمری تک کتابوں سے اس کا واسطہ کم پڑا تھا اور اس نے زیادہ تر زبانی سیکھا۔ مڈل اسکول میں جب دوسرے بچے فارغ وقت میں کھیل کود رہے ہوتے، تب بھی وہ کتاب لے کر کسی گوشے میں بیٹھا ہوتا۔ اس نے مڈل اور پھر میٹرک کا امتحان ریکارڈ نمبروں سے پاس کیا اور نتیجے میں اسے کالج اور بعد میں یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے وظیفہ مل گیا۔ سلطان خوش تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنا اس کے باپ کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ اسکالر شپ سے اس کے بیشتر مسائل حل ہو گئے تھے اور اب وہ اپنی پوری توجہ تعلیم کی طرف دے سکتا تھا۔ دوسرے اخراجات کے لیے باپ جو رقم بھیجتا، وہ اس کے لیے کافی ہوتی۔

شبیر اس سے ملنے ہر مہینے کالج آتا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا بیٹا یہاں کیا پڑھ رہا ہے اور کیسا پڑھ رہا ہے لیکن وہ اپنے بیٹے کی صورت دیکھ کر مطمئن ہو جاتا کہ وہ اپنے مقصد سے ہٹا نہیں ہے۔ سلطان اس کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن میں گزر گئی تھی جب وہ دو سال کا بھی نہیں تھا۔ برسات میں ہیضے کی وبا پھیلی اور اس کی ماں بھی اس کا شکار ہو گئی۔ بیوی کے بعد شبیر کے لیے سلطان ہی سب کچھ تھا۔ پندرہ سال کی عمر تک شبیر نے اسے سینے سے لگا کر رکھا تھا اور وہ چند گھنٹے کے لیے اس کی نظروں سے دور ہوتا تو وہ بے قرار ہو جاتا۔ سلطان کو یہ بخوبی احساس تھا کہ اس کے باپ نے سینے پر کتنا بڑا پتھر رکھ کر اسے خود سے دور کیا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی سالانہ چھٹی ہوتے ہی وہ سامان باندھتا اور گاؤں کا رخ کرتا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ گاؤں کے اسٹیشن پر باپ اسے اپنا منتظر نہ ملا ہو۔

جن دنوں وہ ماسٹرز کر رہا تھا، انہی دنوں اسے جرمنی سے اسکالر شپ کی پیش کش ہوئی۔ اس نے جرمن زبان بھی سیکھی تھی اور اسی بنیاد پر اسے اسکالر شپ ملی تھی۔ آخری امتحان دے کر وہ گاؤں آیا تو اس نے ڈرتے ڈرتے باپ سے اسکالر شپ کا ذکر کیا، اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ انکار کر دے گا لیکن شبیر یہ سن کر پُرجوش ہو گیا کہ سلطان کو باہر ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس نے سنتے ہی کہا۔ ''پتر! یہ تو خدا کا انعام ہے۔''

''جی ابا جی۔'' اس نے دبے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں آپ سے دور ہو جاؤں گا۔ شاید کئی سال تک واپس نہ آ سکوں۔''

شبیر نے اس کے چہرے پر نظر جما کر جواب دیا۔ ''سلطان! تو بے شک دس سال وہاں رہ اور تعلیم حاصل کر... میں تیری جدائی برداشت کر لوں گا لیکن مجھ سے ایک وعدہ کر... تو وہاں نوکری نہیں کرے گا جب بھی تعلیم مکمل کرے گا، واپس آئے گا۔''

سلطان خوش ہو گیا، باپ نے بنا مانگے ہی اجازت دے دی تھی۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں ابا جی، خود میرا بھی باہر نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''تب ضرور جا پتر... میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔''

یوں سلطان جرمنی چلا آیا۔ ایک معروف زرعی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اس نے آگے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اپنی قابلیت اور محنت کے بل بوتے پر اس نے یہاں بھی ریکارڈ نمبروں سے پہلے ایم فل کیا اور پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری صرف تین سال میں حاصل کر لی۔ اس نے مزید ایک سال ایک تحقیقی پروجیکٹ میں کام کیا اور اس کے بدلے میں اس نے اپنے ملک کا ایک پروجیکٹ منظور کرا لیا۔ جرمن حکومت نے اس پروجیکٹ کے تمام اخراجات برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔ سلطان کی ذہانت اور صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے جرمنی کے متعدد اداروں اور یونیورسٹیوں نے اپنے پاس کام کرنے کی پیش کش کی لیکن سلطان نے ایسی ہر پیش کش کے جواب میں انکار کر دیا تھا۔ اسے باپ سے کیا ہوا وعدہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا اور وہ بے تابی سے منتظر تھا کہ کب اس کا پروجیکٹ مکمل ہو اور وہ واپس وطن جا سکے۔

ایم فل کے دوران میں اس کی ملاقات تانیہ سے ہوئی۔ تانیہ روسی نژاد جرمن شہری تھی۔ جنگ عظیم سے پہلے اس کا خاندان روس سے ہجرت کر کے جرمنی میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ تانیہ یونیورسٹی رجسٹرار آفس میں جاب کرتی تھی اور وہیں سلطان سے اس کی ملاقات ہوئی۔ چند ملاقاتوں کے بعد ان میں اچھی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی۔ اس وقت سلطان نے سوچا نہیں تھا کہ تانیہ ایک خوب صورت لڑکی بھی ہے۔ تانیہ کا خاندان کاشت کار تھا اور اس کا دادا روس کا بہت بڑا زرعی سائنس داں تھا۔ سلطان اکثر اس سے ملاقات کرنے جاتا تھا۔ بیاسی برس کی عمر میں بھی وہ پوری طرح چاق و چوبند تھا اور اپنے شعبے کے بارے میں اس کی معلومات اپ ڈیٹ تھیں۔ پھر سلطان نے محسوس کیا کہ تانیہ اس سے محبت کرنے لگی ہے اور اگر اس نے اسے شادی کی پیش کش کی تو وہ مان جائے گی، تب اس نے پہلے باپ کو خط لکھ کر تانیہ کے بارے

میں بتایا اور اس سے اجازت طلب کی۔ شبیر نے جواب دیا۔ ''پتر! مجھے یقین ہے تم نے ایسی عورت منتخب کی ہو گی جو تمہارا گھر چلا سکے گی اور تمہارے بچوں کی ٹھیک طرح سے پرورش کرے گی۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ مجھے خوشی ہو گی اگر واپسی پر تم دونوں کے ساتھ میرا کوئی پوتا یا پوتی بھی ہو۔''

باپ کی طرف سے اجازت ملتے ہی اس نے تانیہ کو پروپوز کیا اور اس نے ہاں کر دی۔ سلطان نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ تعلیم مکمل کر کے واپس اپنے ملک چلا جائے گا اور وہیں کام کرے گا۔ تانیہ نے اعتراض نہیں کیا۔ وہ عام مغربی لڑکیوں سے مختلف تھی۔ مذہب بھی ان کے درمیان میں نہیں آیا۔ سلطان نے بھی اسے مسلمان ہونے یا اسلام پر غور کرنے کو نہیں کہا، اس کے خیال میں کسی کا مسلمان ہونا یا نہ ہونا خدا کی مرضی ہے۔ تانیہ نے بھی نہیں سوچا کہ سلطان ایک مسلمان ہے۔ پی ایچ ڈی کے دوران میں سلطان نے تانیہ سے شادی کر لی اور شبیر کی خواہش کے عین مطابق جب وہ واپس آیا تو ان کی ایک بیٹی رانیہ ہو چکی تھی۔ شبیر بیوی کے مرنے کے بعد پہلی بار اتنا خوش ہوا تھا۔ پوتی میں اس کی جان تھی۔

سلطان کی خوش قسمتی کہ ملک میں آتے ہی اسے زرعی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی ملازمت مل گئی۔ یونیورسٹی اس کے گاؤں سے دو گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ سلطان کی اولین خواہش یہی تھی کہ باپ اس کے پاس آ جائے لیکن اس نے اپنا گھر اور زمین چھوڑ کر آنے سے انکار کر دیا۔ ''پتر! جس گھر اور زمین نے ساری عمر مجھے پناہ دی، اب آخر عمر میں اسے چھوڑ دوں؟ یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

یوں شبیر گاؤں میں ہی رہا۔ ایک ہفتے سلطان بیوی اور بچی کے ساتھ باپ کے پاس چلا جاتا اور دوسرے ہفتے شبیر ان کے پاس آ جاتا۔ یوں ہر ہفتے ملاقات رہنے لگی اور دوری کا احساس نہیں رہا۔ یونیورسٹی میں اپنی جگہ مستحکم کرنے میں اسے چند سال لگے پھر اس نے اعلیٰ حکام اور ہائر ایجوکیشن بورڈ کو اس پروجیکٹ سے آگاہ کیا جو جرمن حکومت نے اس کے لیے منظور کیا تھا۔ جرمن حکومت نے ایک غیر ملکی طالب علم کی صلاحیتوں کے اعتراف میں اور اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ملین ڈالرز کا پروجیکٹ بلا جھجک منظور کر لیا تھا۔ لیکن جب اپنے ملک میں اس کی منظوری کا مرحلہ آیا تو بڑی مشکل سے اس کی منظوری ملی۔ حالانکہ حکومت کو صرف اجازت عطا کرنی تھی۔ سلطان نے یونیورسٹی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ قائم کر لیا اور اس کا دیرینہ خواب پورا ہوا۔ انسٹی ٹیوٹ میں اس نے ان فصلوں پر تحقیق کا بیڑا اٹھایا جو غریب افراد کے لیے اہم ہوتی ہیں۔ اخراجات تمام کے تمام جرمن حکومت برداشت کر رہی تھی اور یہ پروجیکٹ پانچ سال کے لیے تھا۔

پانچ سال پورے ہونے والے تھے۔ سلطان نے انسٹی ٹیوٹ کے تحت پانچ ایسی فصلوں پر تحقیق کر کے ان کی بہتر اقسام تیار کی تھیں جو غریب کسان اگاتے اور استعمال کرتے ہیں۔ ان میں دو دالیں، ایک قسم کی دیسی گندم، ایک چارے والی فصل اور مکئی شامل تھی۔ سلطان نے محسوس کیا کہ ملک میں مکئی کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو اس کا حق بنتا ہے۔ یہ بہت طاقت ور اور سستی خوراک ہونے کے باوجود ہماری عمومی خوراک کا حصہ نہیں ہے اس لیے اسے اگانے پر بھی اتنی توجہ نہیں دی جا رہی ہے جبکہ دنیا میں اسے اہم ترین فصل کا درجہ حاصل ہے۔ جب اس نے مکئی کو تحقیق کے لیے منتخب کیا تو انسٹی ٹیوٹ کی ایک طالب نے اس سے سوال کیا۔

''سر! مکئی ہی کیوں؟ ہمارے ہاں اس سے زیادہ چاول اور گندم کھائی جاتی ہے۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''کیونکہ مکئی میں ان سے زیادہ غذائیت ہوتی ہے۔ یہ زیادہ نشاستہ رکھتی ہے۔ فی ایکڑ اس کی پیداوار گندم اور چاول سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھٹا بھی دیتی ہے جس سے پولٹری فیڈ بنتی ہے اور اس کا خشک ہو جانے والا پودا دودھ دینے والے جانوروں کی بہترین خوراک ہوتا ہے۔ یہ ہر طرح کی زمین اور حالات میں اگ سکتی ہے۔ پانی کی برداشت کر سکتی ہے اور اس پر بیماریوں کا حملہ کم ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک آسان اور کم خرچ فصل ہے جو زیادہ پیداوار دیتی ہے۔''

''تب ہمارے ہاں اسے زیادہ کاشت کیوں نہیں کیا جاتا؟''

''اس کی ایک وجہ تو لوگوں کی مکئی کی طرف کم رغبت ہے۔ ہم اسے صرف بھٹے یا پاپ کارن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پہلے ہمارے دیہاتوں میں مکئی کی روٹی کا رواج تھا لیکن اب وہ ختم ہو گیا ہے۔ دوسرے ہم اس کے صنعتی استعمال میں بہت پیچھے ہیں۔ امریکا اور برازیل میں مکئی سے سیکڑوں اقسام کی صنعتی اشیا بن رہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر آنے والے دنوں میں جب پیٹرولیم کے ذخائر ختم ہو جائیں گے تو ہم مکئی کی مدد سے پیٹرول بنا کر معیشت کا پہیا چلا سکیں گے۔ اس کا آغاز ہو گیا ہے۔ برازیل مکئی سے پیٹرول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتانے والا سب سے بڑا ملک ہے اور اپنی ستر فیصد ضرورت اسی سے پوری کر رہا ہے۔ خدا نے ہمارے ملک کو بہت بڑی زرخیز زمین دی ہے جو ویسے ہی پڑی ہے۔ اگر ہم اس پر مکئی لگائیں تو اپنے تیل کا نصف تک کم کر سکتے ہیں۔"

مکئی شروع سے سلطان کی دلچسپی کا مرکز تھی۔ جرمنی میں بھی اس نے پی ایچ ڈی کے بعد جس پروجیکٹ میں حصہ لیا تھا، وہ مکئی کے بارے میں تھا۔ اس پروجیکٹ کے تحت ہائی برڈ مکئی کی تیاری کی جا رہی تھی جس میں نشاستے کی مقدار عام مکئی سے زیادہ ہو کیونکہ نشاستے سے ہی الکوحل کشید کر کے اسے پیٹرول میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ مگر ہائی برڈ مکئی غریب ملکوں کے لیے نہیں تھی کیونکہ یہ بہت مہنگی پڑتی اور اس کا بیج بھی مخصوص کمپنی سے ملتا۔ سلطان نے محسوس کیا کہ یہ پروجیکٹ پہلی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے لیے ہے اور اس سے غریب ملکوں اور ان کے کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ الٹا نقصان ہوگا کیونکہ اعلیٰ درجے کی ہائی برڈ مکئی مارکیٹ میں آنے کی صورت میں ان کی مقامی اور کم تر مکئی کو کون پوچھے گا۔

اسی وقت سلطان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مکئی کو بھی اپنے پروجیکٹ میں شامل کرے گا اور اس کی ایسی قسم تیار کرے گا جو اپنا بیج خود پیدا کرے، کم پانی کے ساتھ عام زمین میں آسانی سے لگ جائے لیکن پیداوار اچھی دے اور اس میں نشاستے اور تیل کی مقدار زیادہ ہو۔ اس پانچ سالہ پروجیکٹ کے دوران میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا اور اس نے مکئی کی ایک ایسی قسم تیار کر لی تھی جو اپنا بیج خود پیدا کرتی تھی۔ اس میں تمام خصوصیات تھیں اور انسٹی ٹیوٹ کے فصل والے حصے میں اس نے کامیابی سے دوسری فصل لی تھی۔ وہ دن بعد دارالحکومت میں زرعی کمیشن اور ہائر ایجوکیشن بورڈ کا مشترکہ اجلاس تھا جس میں وہ اپنے پروجیکٹ کو پیش کرتا۔ جرمن حکومت تمام امداد دے چکی تھی لیکن ابھی مکئی کی پورے ملک میں آزمائش باقی تھی جس میں اسے مختلف زمینوں اور مختلف موسمی حالات اور بلندیوں پر اگا کر دیکھا جاتا تھا کہ پھر یہ کیسی فصل دیتی ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ کے مقابلے میں کہیں بڑا کام تھا اور اس کے لیے اسے بھرپور سرکاری مدد درکار تھی۔ سلطان مطمئن تھا کہ پروجیکٹ کی کامیابی کے بعد اسے یقیناً سرکاری مدد مل جائے گی اور وہ مکئی کی اس قسم کو جلد پورے ملک میں کاشت کر کے دیکھ سکے گا۔

لیکن جب وہ میٹنگ میں شرکت کرنے پہنچا تو اسے بعض ارکان کے رویے سے کھٹکا ہوا۔ وہ اس سے بہت اکھڑے انداز میں ملے اور اس کے پروجیکٹ کے بارے میں کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔ حالانکہ یہی لوگ پہلے بہت پرجوش تھے اور اسے پروجیکٹ کی کامیابی کی صورت میں اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلا چکے تھے۔ اس کے دل میں خدشہ پیدا ہوا اور جلد یہ خدشہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ میٹنگ میں اس کے پروجیکٹ کی کامیابی کو سراہا گیا لیکن اس کے لیے گرانٹ کی منظوری سے انکار کر دیا گیا۔ اسے کہا گیا کہ اس سال بجٹ میں رقم نہیں ہے اس لیے وہ اگلے سال کا انتظار کرے۔ سلطان بہت دل برداشتہ ہوا جب اس نے دیکھا کہ کتنے بیکار اور ملک و قوم کے لیے بے سود منصوبوں کی فراخ دلی سے منظوری دی جا رہی ہے۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میٹنگ کے بعد اس نے یہ سوال اپنے ایک دوست سے کیا جو ہائر ایجوکیشن میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔

"سلطان! تم باہر سے ہو کر آ گئے ہو لیکن اب تک مغربی ممالک کا طریقۂ واردات نہیں سمجھ سکے۔ میرے بھائی، یہ صرف ان کاموں کے لیے گرانٹ دیتے ہیں جس سے انہیں ذاتی طور پر فائدہ ہو، انہیں ہمارا فائدہ مطلوب نہیں ہوتا۔ یہاں جن منصوبوں کی منظوری دی گئی ہے ان سب کے لیے گرانٹ باہر سے آئی ہے اور ظاہر ہے وہ ہمارے لیے سود مند پروجیکٹس کے لیے کیوں امداد دیتے لگے؟"

سلطان نے مایوسی سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے اوپر بیٹھے لوگوں میں سے کسی کو ملک کے مفاد سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"یہ تو بالکل واضح ہے۔ بورڈ کے چیئرمین صاحب خود ایک بڑا تحقیقاتی ادارہ چلا رہے ہیں اور ان سے پوچھا جائے کہ ادارے میں کی جانے والی تحقیق سے ملک کے لیے کوئی حل نکلا تو ان کے پاس یقیناً کوئی جواب نہیں ہوگا۔ ہاں، ان کا ذاتی کاروبار خوب چمک رہا ہے۔"

واپسی پر سلطان مایوس تھا لیکن اتنا بھی نہیں، اسے امید تھی کہ آنے والے سال میں اس کے پروجیکٹ کے لیے رقم مل جائے گی۔ اس نے دریافت کی جانے والی نئی اقسام پیٹنٹ کے لیے دے دیں اور اپنی تحقیق مقالے کی صورت میں لکھ کر زرعی سائنس کے ایک بین الاقوامی جریدے کو بھیج دی۔ ان دنوں شبیر کی طبیعت خراب تھی اس لیے وہ چھٹی لے کر اس کے پاس چلا آیا۔ اسے نمونیا ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام اور احتیاط کا مشورہ دیا تھا۔ سلطان دو ہفتے اس کے پاس رہا جب تک وہ بالکل ٹھیک نہیں ہو گیا۔ برسوں بعد اسے باپ کے پاس رہنے کا موقع ملا تھا۔ اس نے ان برسوں کی باتیں کیں۔ پھر سلطان نے باپ کو اپنے پروجیکٹ کے بارے میں بتایا، شبیر خوش ہو گیا۔

"تو نے بہت اچھا کام کیا ہے۔"

"لیکن کیا فائدہ جب میری تحقیق کا ثمر غریب کسان تک نہ پہنچے۔"

"پہنچے گا پتر... پہنچے گا۔" شبیر نے یقین سے کہا۔ "یاد رکھ پتر جب ظلم بہت زیادہ ہو جائے تو سمجھ لینا اس کے مٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس ملک میں اور دنیا میں ظلم بہت زیادہ ہو گیا ہے اس لیے اب اس کے مٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس لیے کبھی حوصلہ مت ہارنا اور کبھی ہار نہیں ماننا۔ ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو خدا ستر دروازے کھول دیتا ہے۔ یہ بندے کا کام ہے کہ وہ بند دروازے پر وقت ضائع کرنے کے بجائے دوسرے دروازے تلاش کرے۔ اصل کام کرنے والا خدا ہے، بندہ نہیں ہے اس لیے خدا کی طرف دیکھو، بندوں کی طرف نہ دیکھو۔"

سلطان سوچ میں پڑ گیا۔ جو بات اس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہن میں نہیں آئی، وہ اس کے پانچویں پاس باپ کے ذہن میں آ گئی۔ اصل چیز تو اپنے کام کو آگے بڑھانا اور اسے عام لوگوں تک پہنچانا تھا اس لیے سرکاری مدد کا انتظار وقت ضائع کرنے کے برابر تھا۔ اسے کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کرنا تھا۔ اس نے ممنون نظروں سے اپنے دیہاتی باپ کو دیکھا۔ "ابا جی! آپ ہمیشہ میری راہنمائی کرتے ہیں۔ آج میں جس مقام پر ہوں، آپ کی وجہ سے ہوں۔ خدا آپ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رکھے۔ مجھے ہمیشہ آپ کی ضرورت رہے گی۔"

شبیر نے محبت سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جو اس کی پوری کائنات تھا۔ "پتر! میں تو جیا ہی تیرے لیے ہوں، تیری سعادت مندی اور خدمت گزاری مجھے زندہ رکھتی ہے۔"

شبیر بالکل ٹھیک ہو گیا تھا لیکن سلطان اسے اصرار کر کے اپنے ساتھ لے آیا کہ وہ کچھ دن اس کے ساتھ رہے۔ ثانیہ اور بچے اس کی آمد سے خوش تھے۔ خاص طور سے رانیہ اور اس سے چھوٹے دونوں لڑکے سعد اور معاذ شبیر کے دیوانے تھے۔ جب وہ گاؤں جاتے یا شبیر ان کے پاس آتا تو وہ اس کے آگے پیچھے ہی گھومتے تھے۔ خود شبیر ان میں زیادہ خوش رہتا تھا۔ بیٹے سے اس کا سنجیدگی کا رشتہ تھا لیکن پوتی اور پوتوں سے اس کا دوست والا رشتہ تھا۔

ایک مہینے بعد سلطان نے دبئی کے لیے فلائٹ لی۔ اس نے یونیورسٹی سے دس دن کی چھٹی لی تھی اور گھر میں صرف یہ بتایا تھا کہ وہ ایک ضروری کام سے بیرونِ ملک جا رہا ہے۔ ائیرپورٹ پر اس کا استقبال ایک خوش پوش نوجوان نے کیا۔

"مجھے ابو حماد الرقیب کہتے ہیں۔"

"پھر تو تم سے محتاط رہنا پڑے گا۔" سلطان ہنسا۔ "ہمارے ہاں رقیب محبوبہ کے دوسرے امیدوار کو کہتے ہیں۔"

رقیب اچھا رفیق ثابت ہوا۔ دو دن تک اس نے سلطان کو پورا دبئی گھما دیا لیکن سلطان یہاں گھومنے کے لیے نہیں آیا تھا اس لیے جب تیسرے دن وہ ہوٹل سے روانہ ہوئے تو اس نے رقیب سے کہا۔ "میں یہاں گھومنے نہیں آیا ہوں، مجھے ملاقات کے لیے بلایا گیا ہے۔"

"ملاقات بھی ہو جائے گی جناب۔" رقیب نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔

"کب؟"

"ابھی۔" رقیب نے گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے روک دی۔ "آپ کا یہاں انتظار کیا جا رہا ہے۔"

سلطان رقیب کے ساتھ ہوٹل کے ایک چھوٹے سے میٹنگ روم میں پہنچا جہاں تین افراد اس کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک ترک نور مصطفیٰ پاشا تھا، وہ تقریباً پینتالیس برس کا خوبرو اور بہت تروتازہ نظر آنے والا شخص تھا۔ ہلکی فرنچ کٹ اس کے سرخ و سفید چہرے پر بھلی لگ رہی تھی۔ دوسرا عرب، ادب پتی سرمایہ کار شیخ حمید الغزالی تھا۔ عمر میں وہ نور پاشا سے کچھ چھوٹا تھا لیکن اپنی سانولی رنگت اور کسی قدر کھردرے چہرے کی وجہ سے بڑی عمر کا لگتا تھا۔ وہ طویل قامت اور مضبوط جسم کا مالک تھا کیونکہ اس کے دو شوق تھے، ایک گھڑسواری اور دوسرے بوٹ ریس۔ تیسرا فرد ایک فوڈ کمپنی افرو ایشیا فوڈ کا سی او مصری نژاد حسن بن علی تھا۔ حسن جوان تھا، اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن کم عمری میں اس نے شاندار ترقی کی تھی۔ اپنی نرم آنکھوں اور لڑکوں جیسے نقوش کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ کوئی طالب علم لگتا تھا۔ درحقیقت فوڈ کمپنی نور پاشا اور حمید الغزالی کی تھی لیکن فرنٹ مین کے طور پر حسن بن علی تھا۔ کمپنی وسیع پیمانے پر غذائی مواد کو پروسیس کر کے ساری دنیا میں بھیجتی تھی۔ اس کی پروڈکٹس میں بی فوڈ سے لے کر پھلوں تک سب کچھ شامل تھا۔ میٹنگ روم کی میز پر ایک چھوٹی ٹرے میں مکئی کے پودے لگے ہوئے تھے۔ ٹرے میں جیل تھا جس میں کوئی بھی پودا اگایا جا سکتا ہے۔ سرسبز پودے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد سلطان نے شکایت کی۔

"میں دو دن سے دبئی دیکھ رہا ہوں۔"

"ہم آپ کو بور نہیں کرنا چاہتے تھے ڈاکٹر سلطان۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نور پاشا نے کہا۔ ''اس لیے دو دن آپ کو تفریح کا موقع دیا۔ حسن بن علی آج ہی آئے ہیں اور یہ ایک پلان تیار کر کے لائے ہیں۔''

''ہماری آج کی میٹنگ کا ایجنڈا یہی پلان ہے۔'' حمید الغزالی نے کہا۔ دو گھنٹے بعد وہ اس میٹنگ سے اٹھے، ان سب کے چہرے مسکرا رہے تھے اور خاص طور سے سلطان بہت خوش تھا۔ پروجیکٹ بہت بڑا تھا اور وقت کم تھا، انہیں فوراً ہی کام سے لگ جانا تھا۔ اسی شام سلطان واپس روانہ ہو گیا۔ اسے دو کام کرنا تھے، ایک تو یونیورسٹی سے طویل چھٹی لینا تھی اور دوسرے شمیر کو آمادہ کرنا تھا کہ وہ گاؤں سے آ کر تانیہ اور بچوں کے پاس رہے۔ اس کی طویل غیر حاضری میں گھر میں کسی مرد کا ہونا ضروری تھا۔ وہ مہینے دو مہینے بعد ہی گھر کا چکر لگا سکتا تھا۔ اسے یقین تھا جب وہ شمیر کو اپنے کام کے بارے میں بتائے گا تو وہ مان جائے گا۔

☆☆☆

صوفیہ ایک تاریخی شہر ہے۔ بلغاریہ کا دارالحکومت ہونے کے ساتھ اسے ایک زمانے میں یورپ میں مسلمانوں کا اہم مستقر ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ عثمانی سلاطین یہیں سے باقی یورپ پر نظر رکھتے تھے اور فوجی مہمات روانہ کرتے تھے۔ پھر اہلِ یورپ بیدار ہوئے اور انہوں نے سب سے پہلے وسط یورپ سے مسلمانوں کو بے دخل کیا۔ صوفیہ ہاتھ سے نکلا اور اس کے بعد ایک ایک کر کے یورپ کے علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتے چلے گئے۔ صوفیہ ایک صدی کے اندر پہلے والا عیسائی صوفیہ بن گیا اور یہاں سے مسلمانوں کے آثار تک مٹا دیے گئے۔ اس کے باوجود کئی عمارتیں اور کچھ مساجد یہاں آنے والے سیاحوں کو بتاتی تھیں کہ کبھی یہاں مسلمانوں کے قدم بھی پہنچے تھے۔ آج بھی یہاں کی پچیس فیصد آبادی مسلمان ہے۔

ستر سال تک روسی اقتدار کے سائے کے بعد صوفیہ ایک بار پھر آزاد ہوا۔ ملک میں جمہوریت اور سرمایہ دارانہ حکومت آئی لیکن صوفیہ کا دھیما مزاج تبدیل نہیں ہوا۔ یہ آج بھی خاموش اور پُرسکون شہر ہے جس میں بے شمار تاریخی عمارتیں ہیں جنہیں دیکھنے کے لیے ہر سال لاکھوں سیاح یہاں آتے ہیں۔ ان سیاحوں کے لیے یہاں ہر طرح کے ہوٹل ہیں۔ ان میں درمیانے درجے کے ہوٹل بھی ہیں اور اعلیٰ درجے کے ہوٹل بھی۔ مرکزی شہر سے ذرا دور اس فائیو اسٹار ہوٹل کے کانفرنس روم میں موجود یہ چھ افراد سیاح نہیں تھے۔ ان میں سے پانچ دنیا کی سب سے بڑی فوڈ کمپنیوں کے بااختیار نمائندے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ سب یہودی تھے اور ان میں سے دو کا تعلق اسرائیل اور تین کا یورپ سے تھا۔

''افرو ایشیا کا معاملہ ہمارے قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔'' پہلا یورپی نمائندہ بولا۔ اس کا لہجہ سرد تھا۔

''یہ معاملہ کبھی ہمارے قابو میں نہیں تھا۔'' پہلا اسرائیلی نمائندہ بولا۔

''ہم نے جو کام کروڑوں ڈالرز کی سرمایہ کاری کر کے، سازشیں کر کے اور بدنامی کما کر کیا، وہ یہ صرف بیج تقسیم کر کے کر رہے ہیں۔'' دوسرا اسرائیلی نمائندہ بولا۔ ''اناطولیہ میں بائیو فیول بنانے والا کمپلیکس تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور یہ ایک سال کے اندر کام شروع کر دے گا۔''

''اب تو اس کا نتیجہ بھی آنے والا ہے۔'' دوسرے یورپی نمائندے نے کہا۔ ''بالائی مصر میں دس ہزار ہیکٹر رقبے پر گندم کی فصل تیار ہے اور اس سے حاصل ہونے والا بیج ایک کروڑ ہیکٹر رقبے پر کاشت کے لیے کافی ہوگا۔''

''اور ایسا ہو گیا تو آنے والے پانچ سالوں میں گندم کی مارکیٹ مکمل طور پر ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔'' تیسرے یورپی نمائندے نے معاملے کا نتیجہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ ''باقی ہر قسم کی تمام اقسام ڈاکٹر سلطان کی ایجاد کی ہوئی گندم کے سامنے فیل ہو جائیں گی۔''

''یہ سب ہمارے علم میں ہے۔'' پہلے اسرائیلی نمائندے نے کہا۔ ''دنیا میں جاری ہمارے منصوبوں کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم خوراک کے وسائل اپنے قابو میں رکھیں۔''

''گندم آنے والے دنوں میں سب سے اہم فصل ہوگی اور اس کی کاشت اور تقسیم کو لازمی ہمارے قابو میں ہونا چاہیے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں کوئی بھی حربہ استعمال کرنا پڑے۔'' دوسرا یورپی نمائندہ بولا۔

''معاملہ صرف گندم کا نہیں ہے اگر یہ طریقہ کار انہوں نے دوسری چیزوں میں اپنایا تو بہت جلد فوڈ مارکیٹ ہمارے قبضے سے نکل جائے گی۔'' پہلے یورپی نمائندے نے صورتِ حال کا بدترین رخ پیش کیا۔ ''ڈاکٹر سلطان، نور پاشا اور شیخ حمید کا اشتراک ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

چھٹا شخص جو اب تک خاموش تھا، اس نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''تم سیدھی طرح اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ تم بزنس کے میدان میں ان کے سامنے ناکام ہو گئے ہو۔''

''یہ درست ہے اور مڈل ایسٹ کی موجودہ صورتِ

حال اور مصر کی نئی حکومت پر اخوان کے اثر کو دیکھتے ہوئے ہم نے سوچا تھا کہ افرو ایشیا کے منصوبوں کو روکوا سکیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ معاملہ مجھے اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔'' چھٹے آدمی نے کہا۔

''ہم اسی لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔'' پہلے اسرائیلی نمائندے نے ادب سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ چھٹا آدمی ان میں خاص حیثیت کا حامل ہے۔ ''اگر ان لوگوں کو نہ روکا گیا تو آنے والے دنوں میں ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' چھٹے آدمی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ جن سے نقصان کا اندیشہ ہے، جلد وہ اس دنیا میں نہیں رہیں گے۔''

یہ سنتے ہی پانچوں نمائندوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ دوسرا اسرائیلی نمائندہ بولا۔ ''مجھے یقین ہے جناب، اب یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

☆☆☆

وہ انقرہ سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور ان کی منزل استنبول تھی۔ مرد تقریباً چالیس برس کا تھا اور اس نے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ عورت اس سے سات آٹھ سال چھوٹی تھی۔ مرد کے نقوش ایشیائی تھے لیکن اس کی قومیت کا اندازہ کرنا دشوار تھا، وہ صورت سے یورپی اور وجیہ نظر آ رہا تھا۔ البتہ عورت یقینی طور پر سفید فام تھی۔ ان کے پاس کئی سوٹ کیس تھے جو انہوں نے لگیج کمپارٹمنٹ میں رکھ دیے۔ البتہ ان کے ہینڈ کیری ان کے پاس تھے۔ مرد نے عورت کا بیگ بھی اٹھا رکھا تھا۔ ٹرین میں ان کی سیٹیں برابر برابر تھیں۔ وہ ڈبے میں آئے تو کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ وہ بالکل عام سا کپل لگ رہا تھا۔ ان کے انداز سے لگتا تھا، وہ میاں بیوی ہیں۔

ترکی میں ریل سسٹم کسی طرح یورپ سے کم نہیں اور گزشتہ چند سالوں میں اس میں مزید ترقی ہوئی ہے۔ ٹرینیں صاف ستھری اور تمام سہولیات سے آراستہ ہیں اور پھر بہت تیز رفتار ہیں۔ جب ٹرین چلی تو مرد نے مسکرا کر عورت کی طرف دیکھا۔ ''ہم چند گھنٹے کی تاخیر سے سہی لیکن اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔''

''کوئی مسئلہ نہ ہو۔'' عورت نے آہستہ سے کہا۔ ''خاص طور سے ہوٹل ریزرویشن میں؟''

مرد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس میں کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ ہم نے گھر سے نکلتے ہی بک کرا لیے تھے۔''

''لیکن ہم نے کوئی ادائیگی تو نہیں کی ہے۔'' عورت نے اصرار کیا۔ ''اگر ہم وقت پر نہ پہنچے تو ہوٹل انتظامیہ ہماری بکنگ منسوخ کرنے کی مجاز ہوگی۔''

اس بات نے مرد کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے امید ہے ایسا نہیں ہوگا۔ پرواز کی تبدیلی میں ہمارا قصور تو نہیں ہے۔''

عورت نے سر ہلایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ موسم یہاں بھی اچھا نہیں تھا۔ شہر سے باہر آتے ہی دور تک پڑی برف کے مناظر واضح ہو گئے تھے۔ البتہ یہاں آسمان صاف تھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے اور لنچ میں وقت تھا۔ دو گھنٹے پہلے انہوں نے طیارے میں ناشتا کر لیا تھا اس لیے مرد نے اپنے اور عورت کے لیے کافی منگوائی۔ ٹرین ہوسٹس مختلف سامان اور چیزوں سے بھی ٹرالی لے کر ان کے پاس سے گزرنے لگی تو مرد نے اس سے انگریزی زبان کا ایک مقامی اخبار لے لیا۔ اس میں زیادہ تر خبریں مقامی تھیں۔ آنے والے انتخابات کا تجزیہ تھا جس میں ماہرین یک زبان ہو کر موجودہ حکومت کی کامیابی کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ ترکی کی موجودہ حکومت پر اسلام پسند ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن اس الزام سے قطع نظر اس کے دورِ حکومت میں ترکی نے دس سال میں قابلِ رشک ترقی کی تھی اور تباہ شدہ معیشت کا حامل ترکی اب دنیا کی پندرہ بڑی معیشتوں میں شامل ہو گیا تھا۔

مرد کی توجہ ایک خبر پر مرکوز ہو گئی۔ ایک ہفتے بعد استنبول میں افرو ایشیا فوڈ کے زیرِ اہتمام ایک تقریب ہو رہی تھی جس میں زرعی سائنس دان ڈاکٹر سلطان اکمل ایک اہم اعلان کرنے والے تھے۔ تقریب میں شرکت کے لیے ترقی یافتہ ممالک سے زرعی ماہرین کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ترکی اور مغربی ممالک کا میڈیا اسے خاص طور سے اہمیت دے رہا تھا۔ ایک جرمن ماہرِ خوراک نے کہا تھا کہ آنے والے دس سالوں میں ایشیا فوڈ مارکیٹ کے پچاس فیصد حصے پر قابض ہو جائے گا اور اس شعبے میں یورپ کی سو سالہ برتری ختم ہو کر رہ جائے گی بلکہ یورپ خوراک کے لیے ایشیا کا محتاج ہو جائے گا۔ مرد نے اشارے سے عورت کی توجہ اس خبر کی طرف دلائی تو وہ مسکرا دی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، جرمن ماہر کا اندازہ درست ہے؟''

مرد نے شانے اچکائے۔ ''مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ سائنٹفک انداز میں کام کرتے ہیں اور ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اندازے بہت کم غلط ہوتے ہیں۔''

کافی نوشی اور اخبار بینی میں خاصا وقت گزر گیا۔ عورت نے آرام کو ترجیح دی۔ وہ سنہری بالوں اور سرخ رنگت والی دل کش عورت تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے اسکرٹ تلے سیاہ ٹنگی پہن رکھا تھا اور اوپر گرم کوٹ تھا۔ لیکن یہ لباس اس کی جسمانی نزاکت کو عیاں کرنے میں رکاوٹ نہیں تھا۔ مرد نے سوٹ کے ساتھ اوور کوٹ بھی لیا تھا لیکن ٹرین میں آنے کے بعد اس نے اوور کوٹ اتار دیا تھا۔ اندر درجۂ حرارت خوش گوار تھا اور اوور کوٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی قلموں کے سفید ہوتے بالوں سے قطع نظر وہ خوبرو اور مضبوط جسامت کا آدمی تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ استنبول کے قریب پہنچ گئے۔ ترکی کا یہ سارا علاقہ انتہائی دل کش اور خوب صورت نظاروں سے بھرپور ہے۔ اگرچہ برف اور خراب موسم نے ان نظاروں کو ذرا دھندلا دیا تھا مگر اسے چھپا نہیں سکا تھا۔ عورت اٹھ گئی۔ اس نے باہر دیکھا اور بولی۔ ''ترکی خوب صورت ملک ہے۔''

مرد نے سر ہلایا۔ ''میں نے بہت وقت یہاں گزارا ہے۔''

عورت نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''اچھا...؟ تم نے کبھی بتایا نہیں؟''

''ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت ساری باتیں نہیں جانتے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' عورت آہستہ سے بولی پھر معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''حالانکہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے ہیں۔''

مرد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، اس کے بجائے اس نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ ترکی بہت خوب صورت ملک ہے۔''

''میں نے سنا ہے تمہارا ملک پاکستان بھی کم خوب صورت نہیں ہے، خاص طور سے اس کا شمالی حصہ۔''

''تم نے ٹھیک سنا ہے۔'' مرد مسکرا دیا اور کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ''میرا خیال ہے ہم بیس منٹ میں استنبول اسٹیشن پر ہوں گے۔''

''میں تھک گئی ہوں، ہوٹل پہنچ کر آرام کروں گی۔''

مرد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، وہ اپنے پیروں تلے ٹرین کے فرش کو لرزتا ہوا محسوس کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا، اچانک ہی سب الٹ پلٹ گیا۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ایک تیز شور ہوا اور روشنیاں بند ہو گئیں۔ ٹرین کی یہ بوگی الٹ پلٹ کر رہ گئی۔ دوسرے لمحے کوئی چیز مرد کے سر سے ٹکرائی اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ یہ تاریکی کتنی دیر رہی، اسے نہیں معلوم تھا۔

☆☆☆

وہ آنکھیں کھول کر پتلیاں گھما رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ایک خاص دائرے سے ہٹ کر کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔ واقعتاً ایسا ہی تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ایک دائرے کے علاوہ چاروں طرف دھند ہو اور وہ اس دھند کے پار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک دائرے میں ایک نسوانی چہرہ نمودار ہوا، اس کے ہونٹ ہلے۔ ''تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے بڑی دقت سے کہا۔ ''لیکن مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''ایک منٹ۔'' لڑکی نے کہا اور دائرے سے ہٹ گئی پھر اس کی آواز سنائی دی، وہ کسی ڈاکٹر ازمیر کو کال کر رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد ایک بوڑھا مردانہ چہرہ اس کے سامنے آیا۔ وہ ڈاکٹر ازمیر تھا، اس نے جھک کر آنکھوں میں دیکھا اور پھر تیز روشنی والی ٹارچ سے اس کی پتلیوں کا معائنہ کیا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور کچھ دیر کے لیے اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

''تم استنبول کے ایک اسپتال میں ہو۔'' ڈاکٹر ازمیر نے جواب دیا۔ ''تمہیں یاد ہے تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

اس نے سوچا لیکن فوری طور پر اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

روشنی ہٹ گئی اور کچھ دیر بعد وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو آس پاس کی دھند چھٹ گئی۔ اب وہ درست طور پر دیکھ سکتا تھا۔ یہ اسپتال کا کمرا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا اور برابر میں مختلف اقسام کی مشینیں رکھی تھیں جن میں دل اور دماغ کی تحریک بتانے والی مشینیں بھی تھیں۔ ڈاکٹر ازمیر نے اسٹول کھینچ کر بستر کے پاس کرلیا اور اس پر بیٹھ کر پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس کا خیال تھا کہ اسے اپنا نام بھی یاد نہیں ہے لیکن اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔

''ڈاکٹر ایاز درانی۔''

''میڈیکل ڈاکٹر؟''

''نہیں، ایگری کلچر سائنس کا ڈاکٹر۔''

''تعلق کہاں سے ہے؟''

''میرا تعلق پاکستان... سے ہے لیکن اب میں امریکن شہری ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور پھر وہ چونک گیا۔ ''مجھے یاد آگیا، میں اپنی بیوی کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ ہم انقرہ سے استنبول جا رہے تھے۔''

ایاز درانی کے پاکستانی ہونے کا سن کر ڈاکٹر ازمیر نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ یقیناً کچھ ترک ایسے بھی ہوں گے جنہیں پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ''استنبول کے قریب ٹرین حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس کی دو بوگیاں پٹری سے اتر کر کھیتوں میں گھس گئیں اور دو تو الٹ پلٹ کر رہ گئے تھے۔ حادثے میں نو افراد ہلاک اور بائیس زخمی ہوئے ہیں لیکن ہلاک ہونے والوں میں کوئی عورت نہیں ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''پانچ دن پہلے کی۔''

''تب میری بیوی کہاں ہے؟ کیا اس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا؟'' ایاز درانی مضطرب ہو گیا۔ اگرچہ بیوی کے زندہ ہونے کا سن کر اس نے اطمینان بھی محسوس کیا تھا۔

''زخمیوں میں چار عورتیں تھیں۔ تم اپنی بیوی کا حلیہ بتاؤ گے؟''

''نام ہیلن درانی ہے۔ گولڈن براؤن شولڈر کٹ بال ہیں۔ وہ سفید فام ہے اور امریکن شہری ہے۔ گورا ہوا ناک نقشہ ہے اور کالر بونز کے درمیان گردن پر سامنے ایک سرخ رنگ کا تل ہے۔''

''ایسی کوئی عورت اس حادثے کے بعد یہاں نہیں آئی ہے۔'' ڈاکٹر ازمیر نے کہا۔ ''تمام زخمیوں کو میں نے دیکھا ہے۔''

''ممکن ہے اسے کسی اور اسپتال منتقل کیا گیا ہو؟''

ڈاکٹر ازمیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس حادثے کے تمام زخمی یہیں لائے گئے ہیں کیونکہ یہ جائے حادثہ سے نزدیک ترین بڑا اسپتال ہے۔''

ایاز درانی کا ذہن الجھ رہا تھا۔ اس کی یادداشت شاید پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی کیونکہ ایگرو ٹیک کے بارے میں اس کا ذہن بالکل صاف تھا اور جب اس سے کسی بارے میں سوال کیا جاتا تو جیسے خود بہ خود اس کا جواب ذہن میں آجاتا تھا اس کے علاوہ سب بلینک تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ''میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ حادثے کے بعد جب تم اسپتال لائے گئے تو تقریباً مردہ تھے لیکن پھر آلات کی مدد سے تمہارے دل اور دماغ کو تحریک دی گئی۔ تم بچ گئے لیکن اتنے دن تم کوما میں رہے ہو۔ ممکن ہے تمہیں سب فوری طور پر یاد نہ آئے لیکن تمہاری حالت اب تسلی بخش ہے۔''

''میرے بارے میں ہیلن یا کسی اور نے معلوم کرنے کی کوشش کی؟''

''مجھ سے تو نہیں کی، البتہ ہو سکتا ہے اسپتال میں ریسپشن پر کسی نے پوچھا ہو لیکن تمہارا کوئی جاننے والا سامنے نہیں آیا اور نہ ہی ہمیں تمہارے بارے میں معلومات تھیں۔''

''لیکن میرا سامان، میرا پرس اور موبائل...''

''لباس کے ساتھ صرف تمہارا پرس ہے اور اس میں ڈالرز کی صورت میں اچھی خاصی رقم ہے لیکن کوئی شناختی چیز نہیں ہے اور نہ ہی موبائل ہے۔ پرس تمہارے لباس سے نکلا تھا۔'' ڈاکٹر ازمیر کھڑا ہو گیا۔ ''اب تم آرام کرو، میں پولیس کو اطلاع کرتا ہوں۔ ممکن ہے ان کے پاس تمہارے لیے کوئی تازہ خبر ہو۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد نرس شامین نے اسے پانی دیا اور اپنا تعارف کرایا۔ ''مجھے شامین کہتے ہیں۔''

''مسز شامین! میری جسمانی حالت کیسی ہے؟''

اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی کیونکہ اسے ڈرپ کی مدد سے مسلسل خوراک اور طاقت ور ادویات دی جا رہی تھیں۔ اسے پانی پلاتے ہوئے نرس شامین نے ذرا جھک کر کہا۔ ''مسٹر درانی! تم ایک مضبوط انسان ہو ورنہ کومے سے باہر آنے کے بعد آدمی اتنی جلدی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔''

''شکریہ۔'' درانی نے کہا۔ ''تم میری خاطر ایک بار زخمیوں کی لسٹ دیکھ سکتی ہو ممکن ہے اس میں ہیلن کا نام ہو۔''

''تمام زخمیوں کو میں اور ڈاکٹر ازمیر ہی دیکھ رہے ہیں اس لیے مجھے سب زبانی یاد ہے لیکن تمہاری تسلی کے لیے میں لسٹ نکال کر لے آتی ہوں۔'' شامین نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ وہ دس منٹ بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک لسٹ تھی اور اس میں انگریزی میں تمام زخمیوں کے نام تحریر تھے۔ ان میں ہیلن کا نام نہیں تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اگر ہیلن زخمی نہیں ہوئی تھی تو اس کا مطلب ہے وہ ٹھیک تھی، تب اس نے اسپتال میں اس کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟ حادثہ خطرناک تھا لیکن اتنا بڑا نہیں تھا کہ پولیس یا اسپتال انتظامیہ کسی شخص کو مِس کر جاتی اور وہ غائب ہو جاتا۔ ڈاکٹر ازمیر کی بات سے ظاہر تھا کہ تمام زخمی اور ہلاک ہونے والے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی اسپتال میں لائے گئے تھے۔ پھر ہیلن نے اسے دیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ نرس شاہین اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایاز سے کاغذ لے لیا۔

"مسٹر درانی! تم سوچنے کے بجائے آرام کرو اور ذہن پر زور مت ڈالو۔ جلد تمہیں سب یاد آجائے گا۔ ویسے تمہاری ترکش بہت اچھی ہے۔"

شاہین کی بات سن کر اسے احساس ہوا کہ وہ غیر ارادی طور پر ترکی زبان میں بات کر رہا تھا۔ "شکریہ سسٹر۔" ایاز نے کہا۔ "میری چیزیں کہاں ہیں؟"

شاہین نے ایک کونے میں رکھی ایلومینیم کی ہلکی سی ٹرے اٹھائی جس پر ایاز کا سارا سامان موجود تھا۔ اس میں اس کا مکمل لباس، اوور کوٹ، جوتے موزے، گھڑی، چین اور پرس تھا۔ ایاز یہ چیزیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ اسے اٹھتے دیکھ کر شاہین تیزی سے آگے آئی۔ "پلیز! ابھی اٹھو نہیں۔ تمہیں جو کام ہے مجھ سے کہو۔"

"میں اپنا پرس دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شاہین نے ٹرے اس کے سرہانے موجود سائڈ دراز پر رکھ دی۔ "تم لیٹ کر بھی یہ سب دیکھ سکتے ہو۔ میری ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دینا۔" اس نے بیڈ کے سرہانے لگے بٹن کی طرف اشارہ کیا اور کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ایاز درانی نے جلدی سے پرس اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی، اندر تقریباً ڈھائی ہزار ڈالرز مالیت کی رقم موجود تھی۔ لیکن اس کے علاوہ پرس میں کچھ نہیں تھا۔ کوئی ایک کاغذ کا ٹکڑا یا شناخت کے کام آنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس میں اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور سوشل سیکیورٹی کارڈ اور اس کے ادارے کا کارڈ ہونا چاہیے تھا۔ وہ ایک یونیورسٹی کی زرعی تحقیق کے مرکز سے وابستہ تھا اور خصوصی دعوت پر استنبول میں افرو ایشیا فوڈ کی تقریب میں شرکت کرنے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی ہیلن بھی تھی لیکن اب وہ غائب تھی۔ انہیں اسی ہوٹل میں ٹھہرنا تھا جہاں یہ تقریب ہو رہی تھی۔ یہ سب اس کی یادداشت میں بالکل واضح تھا لیکن جب وہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچنے کی کوشش کرتا تو اس کے ذہن پر ایک طرح کی دھند سی چھا جاتی تھی اور وہ اس کے پار کچھ دیکھنے اور جاننے سے قاصر ہو جاتا۔ سوچنے سے اس کے سر میں درد ہونے لگا اور اس نے بہتر سمجھا کہ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر آرام کر لے مگر آنکھیں بند کرنے سے ذہن سوچنے کا کام ترک نہیں کرتا بلکہ پہلے سے زیادہ تیز کام کرنے لگتا ہے۔

وہ ہیلن کے بارے میں سوچتا تو اس کے ذہن میں چند جھلکیاں آتیں۔ انہوں نے رات ساتھ گزاری تھی اور پھر صبح ہیلن نہا کر باتھ روب میں لپٹی واش روم سے برآمد ہوتی ہے اور اس سے پوچھتی ہے کہ کام ہو گیا اور وہ دیوار کے سامنے بیٹھا ہے جس پر ایک خوب صورت پینٹنگ اسکرو ڈرائیور کی مدد سے لگا ہے اور وہ پلٹ کر ہیلن سے کہتا ہے... ہاں اب ہو گیا۔ اس سے آگے اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے امریکا میں اپنے گھر، ہیلن کے ساتھ گزارے شب و روز اور اپنے دوسرے معمولات یاد کرنے کی کوشش کرتا تو ذہن پر کوئی تصویر، کوئی نقش نہیں ابھرتا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف دو باتیں بالکل واضح تھیں۔ ایک تو وہ ڈاکٹر ایاز درانی ہے اور ایگری کلچر سائنس سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں افرو ایشیا فوڈ کی تقریب میں شرکت کرنے آیا ہے اور دوسرے ہیلن اس کی بیوی ہے۔

اس نے اپنا لباس اٹھایا، اس کے نیچے ٹرے میں ایک کاغذ رکھا تھا لیکن یہ کاغذ نہیں بلکہ پاکٹ سائز تصویر تھی۔ تصویر میں ہیلن اس کی گود میں بیٹھی تھی اور یہ تصویر خاص طور سے کھنچوائی گئی تھی۔ تصویر دیکھتے ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ اور ہیلن کسی ریستوران میں گئے تھے جہاں ایک پیشہ ور فوٹو گرافر نے ان کی تصویر کھینچنے کی پیش کش کی تھی اور تب انہوں نے یہ تصویر کھنچوائی تھی۔ عقب میں ریستوران کا شیشہ تھا اور اس سے باہر کا ٹریفک نظر آرہا تھا۔ سڑک کے پار دوسری طرف نیویارک کا مشہور آرٹس چرچ تھا۔ تصویر کو دیکھتے ہوئے اس نے ایسے ہی پلٹ کر دیکھا تو اسے پشت پر ہینڈ رائٹنگ میں چند ہندسے لکھے نظر آئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ چھ ہندسے تھے۔ اسے تعجب ہوا یہ کس قسم کے ہندسے تھے اور تصویر کی پشت پر لکھے جانے کا کیا مقصد تھا؟ اسے شبہ ہوا کہ رائٹنگ نسوانی ہے۔ یہ تصویر پرس میں کیوں نہیں تھی؟ ایاز نے سوچا لیکن اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے نرس کو بلانے والا بٹن دبا دیا۔ شاہین فوراً آگئی۔ "یہ تصویر میرے لباس میں کہاں سے نکلی ہے؟"

"اوور کوٹ سے۔" شاہین نے جواب دیا۔ "اسی سے پولیس کو پتا چلا کہ اوور کوٹ تمہارا ہے۔"

گویا تصویر پرس میں نہیں تھی اور شاید اسی وجہ سے غائب ہونے سے رہ گئی۔ اسے یقین تھا پرس سے اس کی شناختی دستاویزات غائب کی گئی ہیں۔ یہ کام کسی چور اچکے کا نہیں ہو سکتا تھا ورنہ وہ ڈھائی ہزار امریکن ڈالرز کسی صورت نہ چھوڑتا۔ کمرے میں دیوار پر ٹی وی لگا ہوا تھا۔ ایاز نے شاہین سے پوچھا۔ "اس کا ریموٹ کہاں ہے؟"

شاہین نے اسے دراز سے ریموٹ اٹھا کر دیا۔ "بہتر ہوگا تم ترکی ٹی وی دیکھو تا کہ تمہاری توجہ بٹ جائے۔"

لیکن وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ حادثے کے بعد کیا ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ کسی چینل سے اس بارے میں کوئی نہ کوئی خبر آرہی ہوگی۔ اس کی توقع پوری ہوئی اور ایک مقامی چینل سے حادثے کے بارے میں رپورٹ پیش کی جارہی تھی۔ اس میں حادثے کی وجہ سے لے کر ہلاک اور زخمی ہونے والوں کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ پہلے ہلاک ہونے والوں کی تصویریں دکھائی گئیں اور پھر زخمی ہونے والوں کی۔ اس کی تصویر بھی آئی تھی لیکن اس کے نام کی جگہ نامعلوم فرد کہا گیا تھا۔ اب تک پولیس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ہوش میں آگیا ہے۔ شاید ڈاکٹر ازمیر نے ابھی تک اطلاع نہیں دی تھی۔ ہلاک اور زخمی ہونے والوں میں کہیں ہیلن کا نام نہیں تھا۔ امدادی کارروائیاں حادثے کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھیں۔ ایاز درانی غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اسے تباہ شدہ ڈبوں سے نکالے جانے والے افراد میں بھی ہیلن کہیں نظر نہیں آئی۔ کیا وہ دھچکا آنے سے پہلے ڈبے سے نکل گئی تھی؟ جس ڈبے میں وہ سفر کر رہے تھے، وہ کئی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا اور اس میں اتنے بڑے سوراخ ہو گئے تھے جن سے کوئی بھی شخص آسانی سے باہر جا سکتا تھا۔

اگر ہیلن حادثے کے بعد از خود ڈبے سے باہر آئی تھی تو وہ کہاں گئی؟ اسے لازمی ایاز کو تلاش کرنا چاہیے تھا۔ کہیں وہ کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہوئی؟ پھر ایاز کو ایک خیال آیا۔ جیسے حادثے نے اس کی یادداشت کو متاثر کیا ہے اور اسے ایک خاص حد سے آگے کچھ یاد نہیں آرہا ہے، ممکن ہے اسی طرح ہیلن کی یادداشت بھی متاثر ہوئی ہو۔ وہ ایاز کو بھول گئی ہو لیکن پھر بھی وہ کہاں گئی؟ اپنی یادداشت کھو جانے کے بعد بھی اسے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ سوال اور اس جیسے دوسرے سوال اس کے ذہن میں چکرانے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ یہاں لیٹے لیٹے وہ کچھ نہیں معلوم کر سکے گا۔ اسے یہاں سے نکلنا ہوگا مگر کیا اس کی جسمانی حالت اس قابل تھی کہ وہ چل پھر سکے؟

تجربے کے طور پر وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اسے چکر نہیں آئے اور نہ ہی جسمانی کمزوری کا احساس ہوا۔ اس کے جسم سے منسلک الیکٹروڈ اور آکسیجن کی نلکی پہلے ہی الگ کی جا چکی تھی۔ اس کا جسم معمولی چوٹوں کے علاوہ بالکل محفوظ تھا اور صرف کنپٹی پر ایک ہلکا سا زخم تھا۔ چار دن میں اس پر کھرنڈ آگیا تھا۔ اس نے کمرے کی کھڑکی کے سامنے پردہ کر دیا اور ٹرے سے اپنے کپڑے اٹھائے۔ جس وقت وہ لباس پہن رہا تھا، نرس شاہین وہاں آگئی۔ اسے تیار ہوتے دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

"مسٹر درانی۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں یہاں سے جا رہا ہوں۔" ایاز نے کوٹ پہنا۔

"تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے کہا۔ پرس وہ پہلے ہی جیب میں رکھ چکا تھا۔ ہیلن اور اس کی یادگار تصویر پرس کے اندر تھی۔ اسے یاد تھا، ان دونوں کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی اور اس سے کچھ ہی پہلے ان دونوں میں ملاقات ہوئی تھی۔ ہیلن کے بارے میں اسے پوری طرح یاد نہیں تھا لیکن وہ کسی فرم میں اچھے عہدے پر کام کرتی تھی۔ جب اس نے اوور کوٹ اٹھایا تو نرس شاہین سمجھ گئی کہ وہ کسی صورت نہیں رکے گا۔ وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ ایاز کمرے سے باہر آیا اور دیواروں پر لگے راہنمائی کے نشانات دیکھتا ہوا اسپتال کے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔

"مسٹر ایاز درانی۔" عقب سے ڈاکٹر ازمیر کی آواز آئی۔ وہ دوڑتا آرہا تھا، اس کے پاس آکر وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "تم اس طرح نہیں جا سکتے۔"

ایاز درانی رک گیا۔ "میں بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔" ڈاکٹر ازمیر نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم میری ذمے داری ہو۔"

"میں تمہیں اس ذمے داری سے آزاد کرتا ہوں۔"

"اوکے... اور پولیس؟"

"میں استنبول کے کوپاک پیلس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ یہاں فوڈ انڈسٹری سے متعلق ایک تقریب میں شریک ہونے آیا تھا اور ہوٹل میں میرے اور ہیلن کے لیے ایک کمرا بک ہے۔ تم پولیس کو اس بارے میں بتا سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے، تب تم یہاں دستخط کر دو۔" ڈاکٹر ازمیر نے کلپ بورڈ پر لگا کاغذ اس کے سامنے کر دیا اور خبردار کرنے کے انداز میں بولا۔ "تم اپنی ذمے داری پر یہاں سے جا رہے ہو اور اگر بعد میں کوئی مسئلہ ہوا تو میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ایاز درانی نے سائن کر دیے۔ پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے خیال آیا اور اس نے کاغذ کے ایک کونے پر ایک دو تین کے ہندسے لکھے۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ تصویر کی پشت پر لکھے ہندسے اس کی تحریر نہیں تھی۔ یہ کسی اور کا کام تھا، شاید ہیلن کا۔ اس نے شیٹ ڈاکٹر کو پکڑا دی۔ اس نے ایک کارڈ نکال کر ایاز کو دیا۔

"یہ میرا کارڈ ہے۔ کسی بھی تکلیف یا مشکل کی صورت میں تم مجھے کال کر سکتے ہو۔"

ایاز نے شکریہ کہہ کر کارڈ لیا اور باہر نکل آیا۔ چار دن میں استنبول کا موسم خاصی حد تک بدل گیا تھا۔ آسمان صاف تھا لیکن سڑکوں کے کناروں اور گلیوں میں برف کے ڈھیر لگے تھے اور سردی شدت کی تھی۔ اوور کوٹ کے باوجود وہ کھلی فضا میں آتے ہی ایک لمحے کو لرز گیا۔ اس نے ٹیکسی کے لیے سڑک کی طرف دیکھا اور آنے والی پہلی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ وہ اس کے پاس رک گئی اور ایاز دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھ گیا۔

"کوپاک ہوٹل۔"

"یس سر۔" ڈرائیور نے کہا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور نقوش سے ترکش کے بجائے یورپی نظر آتی تھی لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اکثر ترکوں کے نقوش یورپی لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ڈیش بورڈ پر آج کا اخبار رکھا ہوا تھا۔ ایاز نے اخبار مانگا تو لڑکی نے اٹھا کر اسے دے دیا۔ وہ اس میں ٹرین حادثے کے بارے میں دیکھنے لگا لیکن چار دن گزر جانے کے بعد حادثے میں دلچسپی کم ہو گئی تھی۔

"بڑا خوف ناک حادثہ تھا سر۔ میں اس وقت وہیں تھی۔" لڑکی نے حادثے کی خبر میں اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے کہا۔

ایاز درانی چونک گیا۔ "اچھا... میں بھی اس حادثے میں زخمی ہوا تھا اور میری بیوی میرے ساتھ تھی۔"

"اب وہ کہاں ہے سر؟"

"معلوم نہیں۔" ایاز درانی نے مایوسی سے کہا۔ "میں چار دن تک کومے میں پڑا رہا اور اس دوران میں میری بیوی کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"اوہ۔" لڑکی نے ہمدردی سے کہا۔ "مجھے امید ہے وہ ٹھیک ہو گی اور جلد تم سے مل جائے گی۔"

ایاز کو بھی یہی امید تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہیلن اس کا سراغ کھوجتی ہو گی۔ اس صورت میں اسے لازمی ہوٹل میں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے سوا اس کا کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں تھا استنبول میں۔ اس پر ایاز درانی کو خیال آیا کہ یہاں اس کا کوئی اور واقف کار نہیں ہے۔ یہ سوچتے ہی اس کے ذہن میں پروفیسر حبیب اوبیگان کا نام آیا۔ وہ استنبول یونیورسٹی میں انگریزی لٹریچر اور سائنس کا پروفیسر تھا اور ایاز درانی کو یاد تھا، اس کی پروفیسر سے کئی مہینے سے بذریعہ ای میل بات چل رہی تھی۔ کئی بار ان کی فون پر بات ہوئی تھی۔ یہاں آنے سے کچھ پہلے بھی اس نے پروفیسر سے بات کی تھی۔

"سر۔" لڑکی نے اسے پکارا تو وہ چونکا۔ "کوپاک پیلس ہوٹل سر۔"

کوپاک پیلس ہوٹل کا شمار استنبول کے چند اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں ہوتا تھا اور یہاں صرف بہت دولت مند افراد ہی ٹھہر سکتے تھے۔ ٹیکسی ہوٹل کی عمارت کے سامنے کھڑی تھی اور ایک بیل بوائے دروازہ کھولے اس کے اترنے کا منتظر تھا۔ وہ نیچے اترا، میٹر دیکھا اور ڈالرز میں اس کے حساب سے ادائیگی کر دی۔ اس نے اچھی خاصی ٹپ بھی دی تھی۔ لڑکی خوش نظر آنے لگی اور اس کا شکریہ ادا کر کے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ایاز اندر لابی میں آیا اور استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا جہاں ایک خوش پوش اور خوش شکل ترکش خاتون موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں سر؟"

ایاز درانی نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ چار دن پہلے اسے اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آنا تھا لیکن وہ ٹرین حادثے کا شکار ہو گئے۔ کیا ان کی بکنگ موجود ہے؟ عورت نے سامنے موجود کمپیوٹر پر چیک کیا اور بولی۔ "مسٹر اور مسز درانی کے نام سے کمرا بالکل محفوظ ہے اور استعمال میں ہے۔"

ایاز درانی خوش ہو گیا۔ "اس کا مطلب ہے ہیلن... میری بیوی یہاں آ گئی ہے۔ کیا کمرے تک میری راہنمائی کی جا سکتی ہے؟"

"سر! آپ کے پاس شناخت کے لیے کچھ ہے؟ پاسپورٹ، آئی ڈی، ڈرائیونگ لائسنس یا کچھ اور؟"

"بدقسمتی سے ٹرین حادثے میں، میں سب کچھ گنوا چکا ہوں۔"

یہ سنتے ہی عورت نے کہا۔ "اس صورت میں، میں معذرت چاہوں گی....."

"ایک منٹ... تم کمرے میں کال ملا سکتی ہو... ہیلن یہاں آ کر میری شناخت کر سکتی ہے۔"

عورت نے سوچا اور فون اٹھا کر نمبر ملایا۔ "میں مسز درانی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ مسٹر درانی یہاں استقبالیہ پر موجود ہیں۔"

جواب میں عورت نے جو سنا، اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور ایاز نے محسوس کیا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ عورت نے کوئی خفیہ اشارہ دیا کیونکہ فوراً ہی دو تنومند افراد اس کے دائیں بائیں آ گئے۔ ان میں سے ایک نے مؤدب لیکن سرد لہجے میں کہا۔ "سر! ہمارے ساتھ آئیے۔"

ایاز گڑبڑ کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اسے ایک کمرے میں لے آئے۔ دس منٹ بعد ہوٹل کا منیجر شباہت پاشا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا سر بالوں سے فارغ تھا اور وہ چہرے سے تیز نظر آ رہا تھا۔ اس نے غور سے ایاز درانی کو دیکھا۔ "مسٹر ایاز درانی۔"

"ہاں میں ہوں۔"

"میں کوپاک پیلس ہوٹل کا منیجر شباہت پاشا ہوں۔" اس نے ایاز درانی سے ہاتھ ملایا۔ "تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم ایاز درانی ہو؟"

"اس میں دعوے کی کیا بات ہے؟ میں حقیقت میں ایاز درانی ہوں... ڈاکٹر ایاز درانی۔" اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ "مجھے چار دن پہلے اپنی بیوی ہیلن کے ساتھ یہاں آنا تھا اور میں یہاں افروایشیا فوڈ کی تقریب میں بلایا گیا مہمان ہوں۔"

"میں تمہاری بات پر شک نہیں کر رہا۔" شباہت پاشا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "لیکن مسٹر درانی ایک عجیب بات ہے کہ اسی کمرے میں جو مسٹر ایاز درانی کے لیے بک ہوا تھا، پہلے سے ایک ایاز درانی موجود ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ مسٹر درانی۔" شباہت پاشا نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "یہ حقیقت ہے مسٹر درانی کمرے میں موجود ہے اور کال اسی نے ریسیو کی تھی۔"

ایاز درانی کو لگا جیسے اس کا سر گھوم رہا ہو۔ "ہیلن... ہیلن کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت تقریب والے حصے میں ہیں۔"

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہیلن مجھے شناخت کر لے گی اور یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔"

شباہت پاشا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے مسٹر درانی! یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں لیکن تم اس دوران میں کوئی گڑبڑ نہیں کرو گے، اگر مسز درانی نے تمہیں پہچاننے سے انکار کیا تو تم خاموشی سے ہوٹل سے چلے جاؤ گے۔ دوسری صورت میں مجھے معاملہ پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔ کیا تم میری بات سے متفق ہو؟"

ایاز درانی کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس کا ذہن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فی الحال اس کی پوزیشن نہایت کمزور ہے۔ اس کے پاس اپنی شناخت کرانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور اس کے پاس شباہت پاشا کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "مجھے منظور ہے۔"

شباہت پاشا نے اپنے دونوں سیکیورٹی گارڈز کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ایاز درانی کو لے کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ہوٹل کی عمارت کل چھ منزلہ تھی۔ وہ چھٹی اور آخری منزل پر پہنچے۔ تقریب میں شرکت کے لیے اجازت نامہ لازمی تھا۔ شباہت پاشا نے ایاز درانی سے اجازت نامے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔

"ٹرین حادثے کے بعد سے میرا سامان غائب ہے۔ اجازت نامہ بھی اسی میں ہو گا۔"

شباہت پاشا نے استہزائیہ انداز میں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو، ابھی سب سامنے آ جائے گا۔ وہ واک تھرو گیٹ کے سامنے پہنچے تو ایاز درانی کو ہیلن نظر آ گئی۔ وہ سیاہ لباس میں پوری طرح تیار تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا مخصوص ہینڈ بیگ تھا۔ فراک نما لباس کی پشت اس کی سنہری اور پتلی سی کمر کے آخری حصے تک کھلی ہوئی تھی۔ ایاز درانی اسے دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ "وہ... وہ ہیلن ہے۔"

"ہم ابھی دیکھتے ہیں۔" شباہت پاشا نے کہا لیکن ہیلن کو دیکھ کر ایاز درانی اتنا بے خود ہوا کہ اپنا وعدہ بھول گیا اور اس نے واک تھرو گیٹ سے گزر کر اندر جانے کی کوشش کی تو سیکیورٹی پر مامور شخص نے اس کا بازو پکڑ لیا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا اور ہال میں داخل ہو گیا۔ سیکیورٹی گارڈز نے اس کے پیچھے جا کر اسے روکنا چاہا لیکن شباہت پاشا نے اشارے سے منع کر دیا اور خود ایاز درانی کے پیچھے آیا جو ہیلن تک پہنچ گیا تھا۔ ہیلن ایک خاتون سے بات کر رہی تھی۔ وہ مڑی تو اس نے ایاز درانی کو بالکل سامنے پایا۔ ایاز درانی کا خیال تھا کہ اسے دیکھ کر وہ اچھل پڑے گی اور شاید بے تابی سے اس کے گلے لگ جائے گی مگر ہیلن کا ردعمل اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس نے بالکل اجنبی اور سوالیہ نظروں سے ایاز درانی کی طرف دیکھا۔ وہ امید سے بولا۔

"ہیلن....."

"یس... لیکن تم کون ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے خیال آیا اور اس نے کاغذ کے ایک کونے پر ایک دو تین کے ہندسے لکھے۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ تصویر کی پشت پر لکھے ہندسے اس کی تحریر نہیں تھی۔ یہ کسی اور کا کام تھا، شاید ہیلن کا۔ اس نے شیٹ ڈاکٹر کو پکڑا دی۔ اس نے ایک کارڈ نکال کر ایاز کو دیا۔

"یہ میرا کارڈ ہے۔ کسی بھی تکلیف یا مشکل کی صورت میں تم مجھے کال کر سکتے ہو۔"

ایاز نے شکریہ کہہ کر کارڈ لیا اور باہر نکل آیا۔ چار دن میں استنبول کا موسم خاصی حد تک بدل گیا تھا۔ آسمان صاف تھا لیکن سڑکوں کے کناروں اور گلیوں میں برف کے ڈھیر لگے تھے اور سردی شدت کی تھی۔ اوور کوٹ کے باوجود وہ کھلی فضا میں آتے ہی ایک لمحے کو لرز گیا۔ اس نے ٹیکسی کے لیے سڑک کی طرف دیکھا اور آنے والی پہلی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ وہ اس کے پاس رک گئی اور ایاز دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھ گیا۔

"کوپاک ہوٹل۔"

"یس سر۔" ڈرائیور نے کہا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور نقوش سے ترکش کے بجائے یورپی نظر آتی تھی لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اکثر ترکوں کے نقوش یورپی لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ڈیش بورڈ پر آج کا اخبار رکھا ہوا تھا۔ ایاز نے اخبار مانگا تو لڑکی نے اٹھا کر اسے دے دیا۔ وہ اس میں ٹرین حادثے کے بارے میں دیکھنے لگا لیکن چار دن گزر جانے کے بعد حادثے میں دلچسپی کم ہو گئی تھی۔

"بڑا خوف ناک حادثہ تھا سر۔ میں اس وقت وہیں تھی۔" لڑکی نے حادثے کی خبر میں اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے کہا۔

ایاز درانی چونک گیا۔ "اچھا... میں بھی اس حادثے میں زخمی ہوا تھا اور میری بیوی میرے ساتھ تھی۔"

"اب وہ کہاں ہے سر؟"

"معلوم نہیں۔" ایاز درانی نے مایوسی سے کہا۔ "میں چار دن تک کومے میں پڑا رہا اور اس دوران میں میری بیوی کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"اوہ۔" لڑکی نے ہمدردی سے کہا۔ "مجھے امید ہے وہ ٹھیک ہو گی اور جلد تم سے مل جائے گی۔"

ایاز کو بھی یہی امید تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہیلن اس کا سراغ کھوجتی ہو گی۔ اس صورت میں اسے لازمی ہوٹل میں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے سوا اس کا کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں تھا استنبول میں۔ اس پر ایاز درانی کو خیال آیا کہ یہاں اس کا کوئی اور واقف کار نہیں ہے۔ یہ سوچتے ہی اس کے ذہن میں پروفیسر حبیب اوبیگان کا نام آیا۔ وہ استنبول یونیورسٹی میں انگریزی لٹریچر اور سائنس کا پروفیسر تھا اور ایاز درانی کو یاد تھا، اس کی پروفیسر سے کئی مہینے سے بذریعہ ای میل بات چل رہی تھی۔ کئی بار ان کی فون پر بات ہوئی تھی۔ یہاں آنے سے کچھ پہلے بھی اس نے پروفیسر سے بات کی تھی۔

"سر۔" لڑکی نے اسے پکارا تو وہ چونکا۔ "کوپاک پیلس ہوٹل سر۔"

کوپاک پیلس ہوٹل کا شمار استنبول کے چند اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں ہوتا تھا اور یہاں صرف بہت دولت مند افراد ہی ٹھہر سکتے تھے۔ ٹیکسی ہوٹل کی عمارت کے سامنے کھڑی تھی اور ایک بیل بوائے دروازہ کھولے اس کے اترنے کا منتظر تھا۔ وہ نیچے اترا، میٹر دیکھا اور ڈالرز میں اس کے حساب سے ادائیگی کر دی۔ اس نے اچھی خاصی ٹپ بھی دی تھی۔ لڑکی خوش نظر آنے لگی اور اس کا شکریہ ادا کر کے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ایاز اندر لابی میں آیا اور استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا جہاں ایک خوش پوش اور خوش شکل ترکش خاتون موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں سر؟"

ایاز درانی نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ چار دن پہلے اسے اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آنا تھا لیکن وہ ٹرین حادثے کا شکار ہو گئے۔ کیا ان کی بکنگ موجود ہے؟ عورت نے سامنے موجود کمپیوٹر پر چیک کیا اور بولی۔ "مسٹر اور مسز درانی کے نام سے کمرا بالکل محفوظ ہے اور استعمال میں ہے۔"

ایاز درانی خوش ہو گیا۔ "اس کا مطلب ہے ہیلن... میری بیوی یہاں آ گئی ہے۔ کیا کمرے تک میری راہنمائی کی جا سکتی ہے؟"

"سر! آپ کے پاس شناخت کے لیے کچھ ہے؟ پاسپورٹ، آئی ڈی، ڈرائیونگ لائسنس یا کچھ اور؟"

"بدقسمتی سے ٹرین حادثے میں، میں سب کچھ گنوا چکا ہوں۔"

یہ سنتے ہی عورت نے کہا۔ "اس صورت میں، میں معذرت چاہوں گی....."

"ایک منٹ... تم کمرے میں کال ملا سکتی ہو... ہیلن یہاں آ کر میری شناخت کر سکتی ہے۔"

عورت نے سوچا اور فون اٹھا کر نمبر ملایا۔ "میں مسز درانی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ مسٹر درانی یہاں استقبالیہ پر موجود ہیں۔"

جواب میں عورت نے جو سنا، اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور ایاز نے محسوس کیا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ عورت نے کوئی خفیہ اشارہ دیا کیونکہ فوراً ہی دو تنومند افراد اس کے دائیں بائیں آ گئے۔ ان میں سے ایک نے مؤدب لیکن سرد لہجے میں کہا۔ "سر! ہمارے ساتھ آئیے۔"

ایاز گڑبڑ کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اسے ایک کمرے میں لے آئے۔ دس منٹ بعد ہوٹل کا منیجر شباہت پاشا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا سر بالوں سے فارغ تھا اور وہ چہرے سے تیز نظر آ رہا تھا۔ اس نے غور سے ایاز درانی کو دیکھا۔ "مسٹر ایاز درانی۔"

"ہاں میں ہوں۔"

"میں کوپاک پیلس ہوٹل کا منیجر شباہت پاشا ہوں۔" اس نے ایاز درانی سے ہاتھ ملایا۔ "تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم ایاز درانی ہو؟"

"اس میں دعوے کی کیا بات ہے؟ میں حقیقت میں ایاز درانی ہوں... ڈاکٹر ایاز درانی۔" اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ "مجھے چار دن پہلے اپنی بیوی ہیلن کے ساتھ یہاں آنا تھا اور میں یہاں افروایشیا فوڈ کی تقریب میں بلایا گیا مہمان ہوں۔"

"میں تمہاری بات پر شک نہیں کر رہا۔" شباہت پاشا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "لیکن مسٹر درانی ایک عجیب بات ہے کہ اسی کمرے میں جو مسٹر ایاز درانی کے لیے بک ہوا تھا، پہلے سے ایک ایاز درانی موجود ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ مسٹر درانی۔" شباہت پاشا نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "یہ حقیقت ہے مسٹر درانی کمرے میں موجود ہے اور کال اسی نے ریسیو کی تھی۔"

ایاز درانی کو لگا جیسے اس کا سر گھوم رہا ہو۔ "ہیلن... ہیلن کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت تقریب والے حصے میں ہیں۔"

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہیلن مجھے شناخت کر لے گی اور یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔"

شباہت پاشا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے مسٹر درانی! یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں لیکن تم اس دوران میں کوئی گڑبڑ نہیں کرو گے، اگر مسز درانی نے تمہیں پہچاننے سے انکار کیا تو تم خاموشی سے ہوٹل سے چلے جاؤ گے۔ دوسری صورت میں مجھے معاملہ پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔ کیا تم میری بات سے متفق ہو؟"

ایاز درانی کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس کا ذہن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فی الحال اس کی پوزیشن نہایت کمزور ہے۔ اس کے پاس اپنی شناخت کرانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور اس کے پاس شباہت پاشا کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "مجھے منظور ہے۔"

شباہت پاشا نے اپنے دونوں سیکیورٹی گارڈز کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ایاز درانی کو لے کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ہوٹل کی عمارت کل چھ منزلہ تھی۔ وہ چھٹی اور آخری منزل پر پہنچے۔ تقریب میں شرکت کے لیے اجازت نامہ لازمی تھا۔ شباہت پاشا نے ایاز درانی سے اجازت نامے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔

"ٹرین حادثے کے بعد سے میرا سامان غائب ہے۔ اجازت نامہ بھی اسی میں ہو گا۔"

شباہت پاشا نے استہزائیہ انداز میں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو، ابھی سب سامنے آ جائے گا۔ وہ واک تھرو گیٹ کے سامنے پہنچے تو ایاز درانی کو ہیلن نظر آ گئی۔ وہ سیاہ لباس میں پوری طرح تیار تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا مخصوص ہینڈ بیگ تھا۔ فراک نما لباس کی پشت اس کی سنہری اور پتلی سی کمر کے آخری حصے تک کھلی ہوئی تھی۔ ایاز درانی اسے دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ "وہ... وہ ہیلن ہے۔"

"ہم ابھی دیکھتے ہیں۔" شباہت پاشا نے کہا لیکن ہیلن کو دیکھ کر ایاز درانی اتنا بے خود ہوا کہ اپنا وعدہ بھول گیا اور اس نے واک تھرو گیٹ سے گزر کر اندر جانے کی کوشش کی تو سیکیورٹی پر مامور شخص نے اس کا بازو پکڑ لیا لیکن اس نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا اور ہال میں داخل ہو گیا۔ سیکیورٹی گارڈز نے اس کے پیچھے جا کر اسے روکنا چاہا لیکن شباہت پاشا نے اشارے سے منع کر دیا اور خود ایاز درانی کے پیچھے آیا جو ہیلن تک پہنچ گیا تھا۔ ہیلن ایک خاتون سے بات کر رہی تھی۔ وہ مڑی تو اس نے ایاز درانی کو بالکل سامنے پایا۔ ایاز درانی کا خیال تھا کہ اسے دیکھ کر وہ اچھل پڑے گی اور شاید بے تابی سے اس کے گلے لگ جائے گی مگر ہیلن کا ردعمل اس کی توقع کے خلاف تھا۔ اس نے بالکل اجنبی اور سوالیہ نظروں سے ایاز درانی کی طرف دیکھا۔ وہ امید سے بولا۔

"ہیلن....."

"یس... لیکن تم کون ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایاز درانی کو اس کے الفاظ پتھر کی طرح لگے۔ وہ کسی قدر تیز لہجے میں بولا۔ ”تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو، کیا تمہاری یادداشت بھی کھو گئی ہے؟“

ہیلن نے اب شباہت پاشا کی طرف دیکھا۔ ”یہ شخص کون ہے؟“

شباہت پاشا نے ایاز درانی کا بازو تھام لیا۔ ”مسٹر! تم نے سن لیا اب واپس چلو۔“

”نہیں، ایک منٹ رکو۔“ ایاز نے ملتجی لہجے میں کہا۔ پھر وہ ہیلن کی طرف مڑا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم مجھے نہیں پہچان رہی ہو۔ میں ایاز ہوں، تمہارا شوہر۔“

ہیلن لڑکھڑا کر پیچھے ہوئی۔ اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی پھر اسے غصہ آ گیا۔ ”تمہارا دماغ ٹھیک ہے مسٹر۔“ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”میرا شوہر یہاں موجود ہے، وہ آنے والا ہے۔ بہتر ہوگا تم اس کے آنے سے پہلے یہاں سے چلے جاؤ۔“

”بس مسٹر۔“ شباہت پاشا نے اس بار سختی سے کہا مگر اس نے آواز دھیمی رکھی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تقریب میں کوئی بدمزگی ہو۔ وہ ایاز کو وہاں سے لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھی بھی اس کی مدد کو آ گئے تھے اسی لمحے ایک ادھیڑ عمر لیکن خوش پوش شخص وہاں آیا اور ہیلن کے پاس آ کر اس نے سوالیہ نظروں سے ان سب کی طرف دیکھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“

”ڈیئر! یہ شخص خود کو ایاز درانی اور میرا شوہر کہہ رہا ہے۔“ ہیلن نے اس سے کہا۔ اس کا لہجہ کسی قدر طنزیہ تھا۔

”کیا؟“ آنے والے نے برہمی سے کہا۔ ”ایاز درانی میں ہوں اور یہ میری بیوی ہے۔ پھر یہ شخص کون ہے؟“

”تم جھوٹے ہو۔“ ایاز نے بلند آواز سے کہا۔ ”ایاز درانی میں ہوں۔“

”اچھا۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا اور جیب سے پرس نکال کر اس سے اپنا ڈرائیونگ لائسنس نکالا اور ان کے سامنے کر دیا۔ اس پر ڈاکٹر ایاز درانی کا نام تھا اور اس شخص کی تصویر لگی تھی۔ ایاز دم بخود سا پرس کے اندر لگی اس تصویر کو دیکھ رہا تھا جس میں ہیلن اس کی گود میں بیٹھی تھی، بالکل اسی انداز میں جیسے اس کے پاس موجود تصویر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس شخص نے اپنا پاسپورٹ اور یونیورسٹی کا کارڈ بھی دکھایا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ حد یہ کہ اس کے پاس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ تک موجود تھا۔ ایاز کو لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔۔۔ ایک بھیانک خواب۔ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن کچھ ٹھیک نہیں ہوا، اسے اس وقت ہوش آیا جب ہوٹل کی سیکیورٹی اہلکار اسے تقریباً گھسیٹ کر وہاں سے لے جانے لگے۔ ان کا انداز مہذب لیکن گرفت بہت سخت تھی۔ ہیلن نقلی ایاز درانی کے ساتھ ایک طرف چلی گئی تھی اور شباہت پاشا ان سے معذرت کر رہا تھا۔ سیکیورٹی اہلکار ایاز کو نیچے دفتر میں لے آئے۔

چند منٹ بعد شباہت پاشا اس کے سامنے تھا۔ اس دوران میں ایاز نے اپنے حواس بحال کر لیے تھے اور اپنی بات ثابت کرنے کے طریقوں پر غور کر رہا تھا۔ شباہت پاشا کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ”اس شخص نے نقلی دستاویزات کی مدد سے خود کو ڈاکٹر ایاز درانی ثابت کیا ہے لیکن کیا وہ میرے جیسے حوالے رکھتا ہے؟ انٹرنیٹ پر میرے بارے میں یونیورسٹی کے ہوم پیج سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔“

”میں نے اپنے آدمیوں کو پہلے ہی اس بارے میں تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے۔“ شباہت پاشا نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ ایاز کو سیکیورٹی کنٹرول روم میں لایا جہاں سے پورے ہوٹل کی نگرانی کی جاتی تھی۔ ہوٹل میں درجنوں سیکیورٹی کیمرے لگے تھے اور ان کی نگرانی یہیں سے ہوتی تھی۔ شباہت پاشا نے ایک نوجوان سے پوچھا۔ ”کوئی نتیجہ نکلا تلاش کا؟“

اس نے اسکرین ان کی طرف گھما دی۔ اس پر اس یونیورسٹی کا ہوم پیج کھلا ہوا تھا جس میں ایاز درانی کام کرتا تھا اور پھر اس پر اسی شخص کی تصویر نمودار ہوئی جو ہوٹل میں ایاز درانی بنا ہوا تھا۔ ایاز دنگ رہ گیا تمام حوالے اس کے تھے، بس تصویر اس شخص کی تھی۔ شباہت پاشا نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اب تم کیا کہتے ہو؟“

”یہ فراڈ ہے۔۔۔ جو شخص نقلی دستاویزات بنا سکتا ہے وہ ویب پیج کو بھی بدل سکتا ہے۔ دیکھو، یہاں میرے حوالے ہیں۔ استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر حبیب اومیگان میرے واقف کار ہیں اور میری ان سے بات چیت چلتی رہی ہے۔“

مگر اب شباہت پاشا کو اس کی شناخت سے مزید کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایاز کی پیشانی کا زخم دیکھا۔ ”یہ کیا ہوا ہے؟“

ایاز نے اسے حادثے کے بارے میں بتایا جس میں وہ چار دن تک کومے میں پڑا رہا تھا۔ تفصیل سن کر شباہت پاشا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ”تم چار دن کومے میں رہنے کے بعد اب سے پانچ چھ گھنٹے پہلے ہوش میں آئے ہو؟“

”ہاں، اس کی گواہی ڈاکٹر ازمیر بھی دے گا۔ میں اس اسپتال میں داخل تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ تم پوری طرح صحت یاب ہوئے بغیر اسپتال سے نکل آئے ہو۔“ شباہت پاشا نے کہا۔ ”جو شخص چار دن کومے میں رہا ہو، ڈاکٹر اسے کسی صورت اتنی جلدی اسپتال سے فارغ نہیں کرتے۔“

”یہ درست نہیں ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”مسٹر! تم جو کوئی بھی ہو، میں اپنے ہوٹل میں کوئی گڑبڑ نہیں چاہتا جبکہ کل رات یہاں ایک بہت اہم تقریب ہونے والی ہے۔ تمہارے پاس دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ میں تمہیں ان تمام واقعات کے ساتھ پولیس کے حوالے کر دوں اور وہ تمہاری تفتیش کرے گی۔ دوسرے تمہیں واپس اسپتال بھیج دیا جائے۔ فیصلے کے لیے تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔“ شباہت پاشا نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا۔

”میری بات سنو۔۔۔۔“ ایاز نے کہنا چاہا۔

”پولیس سے ملاؤ۔“ شباہت پاشا نے آپریٹر کو حکم دیا۔

ایاز نے محسوس کیا کہ معاملہ پولیس تک چلا گیا تو وہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس کے پاس کوئی دستاویز نہیں تھی اور پولیس غیر ملکی ہونے کی وجہ سے اسے اپنی تحویل میں لے لے گی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”او کے۔۔۔ او کے، میں اسپتال جانے کے لیے تیار ہوں۔“

شباہت پاشا مسکرایا اور اس نے آپریٹر سے رکنے کو کہا۔ ”تو تم اقرار کر رہے ہو کہ تم ایاز درانی نہیں ہو؟“

ایاز نے مجبوراً سر ہلایا۔ ”ہاں، مجھے لگ رہا ہے کہ میری حالت ٹھیک نہیں ہے۔“

دو منٹ بعد وہ شباہت پاشا اور اس کے سیکیورٹی اہلکاروں کے ساتھ ہوٹل کے باہر موجود تھا۔ اشارے پر ایک وائٹ کیب آ کر سامنے رکی۔ ایک سیکیورٹی اہلکار نے اس کا دروازہ کھولا اور ایاز کو تقریباً اندر دھکا دے کر بٹھا دیا اور ڈرائیور کو اس اسپتال کا نام بتایا جہاں ایاز کو جانا تھا۔ شباہت پاشا نے دروازے پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر! مجھے امید ہے کہ اب تم دوبارہ مجھے یہاں نظر نہیں آؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو اس بار تم مجھے پولیس کو کال کرنے سے نہیں روک سکو گے۔“

ایاز نے صرف سر ہلایا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ”مسٹر! تمہیں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔“ جانی پہچانی آواز نے ایاز کو چونکا دیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اسے اسپتال سے یہاں لائی تھی۔

”تم؟“

”ہاں، میں نے خالی واپس جانے کے بجائے کسی مسافر کا انتظار کرنا بہتر سمجھا لیکن کئی گھنٹے بعد جو سواری ملی، وہ تم نکلے۔“

ایاز سوچ رہا تھا، اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”امینہ۔“ وہ بولی تو ایاز چونک گیا۔

”تم مسلم ہو؟“

”ہاں، میرا تعلق بوسنیا سے ہے۔ جنگ کے دوران میں ماں مجھے یہاں لے آئی تھی۔ پورے گھر میں بس ہم دو ہی بچے تھے۔ پہلے ہم پناہ گزین تھے پھر ہمیں ترکی کی شہریت مل گئی۔ ماں کا ایک سال پہلے انتقال ہو گیا۔“

”اوہ۔۔۔ مجھے افسوس ہے۔“ ایاز نے رسمی انداز میں کہا۔ ”امینہ! میں نے فیصلہ بدل دیا ہے۔ اب میں اسپتال کے بجائے استنبول یونیورسٹی جانا چاہوں گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی مسٹر۔۔۔۔۔“

”ایاز، ایاز درانی۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

”تم بھی مسلمان ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے بے خیالی سے کہا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ یہ گورکھ دھندا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ پانچ دن پہلے تک وہ ہیلن کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا اور اب وہ ایک بے نام شخص تھا۔ اس کے تمام حوالے ایک دوسرے شخص کے پاس تھے اور وہ اس کی بیوی پر بھی قابض ہو چکا تھا۔ ہیلن بھی اسے ایاز درانی تسلیم کر رہی تھی اور ایاز کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

امینہ نے ٹیکسی کا رخ موڑ دیا اور اب وہ یونیورسٹی کی طرف جا رہی تھی۔ ”تمہاری بیوی ملی؟“

ایاز نے گہری سانس لی۔ ”ملی بھی اور نہیں بھی۔“

”کیا مطلب؟“

ایاز نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر امینہ کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سنا دیے۔ اس نے اختصار سے کام لیا اور غیر ضروری باتوں کو بیان نہیں کیا لیکن جو بتایا، وہ امینہ کو حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرے خدا! یہ تو کوئی جاسوسی ناول لگ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ حادثے کی وجہ سے تمہارے دماغ پر اثر ہوا ہو اور تم غلط سمجھ رہے ہو۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ ایاز پھیکے انداز میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہنسا۔ ''ممکن ہے میں غلطی پر ہوں لیکن میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا۔''

''تم یونیورسٹی کیوں جارہے ہو؟''

''پروفیسر حبیب اومیگان سے میری ای میلز سے بات چیت ہوتی رہی ہے اور وہ مجھے جانتا ہے۔ اس شخص نے میری ہر چیز کی نقل تیار کرلی ہے لیکن وہ ایک بات بھول گیا ہے۔''

یونیورسٹی آگئی تھی۔ امینہ نے پارکنگ میں ٹیکسی روکتے ہوئے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

''یہی کہ وہ میرے علم کی نقل نہیں کرسکتا۔ اپنے شعبے کے بارے میں جو میں جانتا ہوں، وہ نقلی ایاز درانی کیسے جان سکتا ہے؟'' ایاز نے کہا اور ٹیکسی سے نیچے اتر آیا۔ اس نے کرائے کی رقم ڈیش بورڈ پر رکھی اور بولا۔ ''کیا تم یہاں میرا انتظار کرسکتی ہو؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں کیب کے لیے مخصوص پارکنگ میں ملوں گی۔''

ایاز یونیورسٹی کے مین انٹرنس کی طرف بڑھ گیا۔ شام ہوچکی تھی لیکن اسے امید تھی کہ پروفیسر حبیب اومیگان اسے اپنے دفتر میں مل جائے گا۔ شام کی کلاسز والے طلبا اور طالبات کی آمد و رفت جاری تھی۔ ایاز نے انفارمیشن کاؤنٹر سے پروفیسر کے بارے میں معلوم کیا۔ کاؤنٹر پر موجود آدمی نے کہا۔ ''تم انگریزی لٹریچر سائنس کے شعبے میں چلے جاؤ، پروفیسر کے بارے میں وہیں سے پتا چلے گا۔''

شعبے کا راستہ سمجھ کر ایاز روانہ ہوا۔ اس کی عمارت کچھ دور تھی۔ لیکن عمارت کے داخلی دروازے پر ''غیر متعلقہ افراد کا داخلہ ممنوع ہے'' لکھا ہوا تھا۔ اگر ایاز سامنے سے جانے کی کوشش کرتا تو امکان تھا اسے اندر جانے نہ دیا جاتا۔ وہ گھوم کر پیچھے آیا اور اسے سروس ایریا کا دروازہ کھلا مل گیا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور ہنگامی حالت کے لیے مخصوص سیڑھیوں کا رخ کیا۔ اسے امید تھی کہ یہاں اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس کی توقع پوری ہوئی اور وہ بغیر کسی روک ٹوک کے تیسرے فلور پر پہنچ گیا۔ یہاں وہ ایک ایسی جگہ نکلا جو تجربہ گاہ لگ رہی تھی۔ شیشوں کے پیچھے بڑے بڑے بالوں میں پودوں اور نباتات کی مختلف اقسام کو ڈشوں میں لگایا ہوا تھا اور کہیں ان پودوں پر تجربات جاری تھے۔ وہ مختلف کمروں اور ہالز میں جھانکتا ہوا بالآخر پروفیسر حبیب اومیگان کے دفتر تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ اس کے نام کی تختی باہر لگی تھی۔ وہ بلا دستک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو پروفیسر حبیب اومیگان کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ موضوع سائنسی تھا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سفید اور الجھے بالوں والا مخصوص پروفیسر ٹائپ حلیے والا شخص تھا۔ اس کا ملاقاتی میز کے دوسری طرف اس طرح بیٹھا تھا کہ ایاز کو نظر نہیں آیا۔

''کون ہو تم؟'' پروفیسر حبیب نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''میں ڈاکٹر ایاز درانی ہوں پروفیسر۔'' ایاز نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تو پروفیسر حبیب بے ساختہ پیچھے ہوگیا اور اس نے میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر کچھ کیا اور بولا۔

''غلط، تم ایاز درانی نہیں ہو۔''

''پروفیسر! میں مشکل میں پڑ گیا ہوں... پلیز میری مدد کرو۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ تقریب میں شرکت کے لیے استنبول آرہا تھا کہ ٹرین کو حادثہ پیش آگیا اور میں زخمی ہوکر چار دن کوما میں رہا۔ اب میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں ایاز درانی ہوں۔ ہیلن بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی ہے۔''

''ہیلن کون ہے؟''

''میری بیوی ہے۔''

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔'' کرسی پر بیٹھے شخص نے کرسی گھمائی اور ایاز کے سامنے آگیا۔ ایاز اسے دیکھ کر اچھل پڑا۔ یہ وہی نقلی ایاز درانی تھا۔ ''ہیلن میری بیوی ہے۔''

ایاز بے قابو ہوکر اس کی طرف بڑھا تو پروفیسر درمیان میں آگیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''مسٹر! تم مجھے پڑھے لکھے اور مہذب آدمی لگ رہے ہو۔ اگر دلیل کے ساتھ بات کرو تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

ایاز نے تلخ انداز میں نقلی ایاز درانی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ میری ہر چیز چرا سکتا ہے۔ حد یہ کہ کسی طرح میری بیوی کو بھی مجھ سے برگشتہ کرسکتا ہے لیکن کیا یہ میرا علم چرا سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اسے انگریزی لٹریچر سائنس کی اے بی سی بھی نہیں آتی ہوگی۔ تمہیں یاد ہے، ہم ای میل پر آخری دنوں میں جس موضوع پر بات کررہے تھے؟''

پروفیسر حبیب نے سر ہلایا۔ ''بالکل اچھی طرح یاد ہے اور ابھی ہم اسی موضوع پر بات کررہے تھے۔''

ایاز نے بے یقینی سے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ ''اس شخص سے؟''

''ہاں اور یہ اس موضوع پر مکمل عبور رکھتا ہے۔''

''تب یہ اس مقالے کے بارے میں کیا کہے گا جو میرے اور تمہارے درمیان زیر بحث رہا ہے۔''

جواب میں نقلی ایاز درانی نے روانی سے مقالے کے

موضوع پر بات شروع کردی۔ وہ یوں بول رہا تھا جیسے زیر بحث موضوع پر اسے مکمل اختیار ہو۔ وہ روانی سے سائنسی اصطلاحات استعمال کررہا تھا اور چند منٹ میں اس نے واضح کردیا کہ وہ اس بارے میں سب جانتا ہے۔ وہ خاموش ہوکر مسکرایا تو ایاز ایک بار پھر بے قابو ہوکر اس کی طرف جھپٹا۔ اس بار پروفیسر بھی اسے نہیں روک سکا تھا۔ اس نقلی ایاز کے چہرے پر گھونسا مارنے کی کوشش کی لیکن وہ صفائی سے خود کو بچا گیا اور اسے جوابی دھکا دیا تو وہ پلٹ کر ڈیش پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، پروفیسر کی خفیہ کال پر اندر آنے والے سیکیورٹی گارڈ نے اس کی گردن سے برقی ہلاکت دینے والا آلہ لگا دیا اور شدید برقی جھٹکے نے اسے ایک لمحے میں مفلوج کردیا۔ وہ زمین پر گر کر لرزنے لگا۔ پروفیسر اور نقلی ایاز جھک کر اسے دیکھنے لگے۔

''میرا خیال ہے کہ یہ کوئی نفسیاتی مریض ہے۔'' نقلی ایاز نے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' پروفیسر حبیب بولا۔ ''مجھے یاد آرہا ہے، ٹرین حادثے کے زخمیوں میں اس کی تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ اسے اسپتال بھیج دینا بہتر ہوگا۔''

''بالکل اسے اسپتال بھیج دینا چاہیے۔'' ایاز کی توقع کے خلاف نقلی ایاز درانی نے بھی یہی بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے پولیس کے حوالے کرنے کو کہے گا۔ پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس کی جسمانی حالت ٹھیک نہیں تھی اس لیے برقی جھٹکے نے زیادہ اثر کیا تھا۔

☆☆☆

ایاز کو ہوش آیا تو وہ ایک بار پھر اسپتال میں تھا۔ اس کے سامنے ڈاکٹر ازمیر اور نرس شامین تھے۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کررہا تھا اور اسے ہوش میں آتے دیکھ کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی آواز لہراتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

''دماغ... پر... اثر... اچھی بات... نہیں... سی ٹی اسکین۔''

اس دوران میں نرس شامین ایک انجکشن تیار کرکے لائی اور اسے ایاز کے بازو میں لگا دیا۔ چند لمحے بعد اس کے دماغ پر چھائی دھند گہری ہونے لگی اور وہ پھر بے ہوش ہوگیا۔ اگرچہ اس نے مزاحمت کی لیکن دوا کے اثر کے سامنے اس کی مزاحمت بیکار گئی۔ اگلی بار اسے ہوش آیا تو وہ کسی سرد اور روشن جگہ ساکت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے۔ روشنیوں کے علاوہ اسے چاروں طرف ایک سفید سی سرنگ نظر آرہی تھی۔ اس کے سر پر کئی جگہوں پر کچھ چیزیں چپکی ہوئی تھیں۔ ایاز نے ہلنے کی کوشش کی لیکن اس کا جسم مفلوج ہورہا تھا۔ اس سے ہلا نہیں گیا۔ اس نے بولنا چاہا تو بولا بھی نہیں گیا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ مرگیا ہے اور یہ شاید دوسری دنیا ہے۔

اسی لمحے زمین ہلی پھر رک گئی۔ چند لمحے بعد دوبارہ ہلی اور وہ زمین کے ساتھ پھسلتا ہوا اس سفید سرنگ سے باہر آگیا۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ وہ سی ٹی اسکین مشین کے اندر تھا۔ رنگ برنگی روشنیاں مشین کی تھیں اور اس کے ماتھے اور سر کے دوسرے حصوں سے الیکٹروڈ چپکے ہوئے تھے۔ اسے کھینچنے والا ایک جوان لیکن جوانی میں بالوں سے محروم ہوجانے والا ڈاکٹر تھا۔ اس نے زرد شیشوں والے آئی گلاسز لگا رکھے تھے۔ جنکے نقوش کی وجہ سے وہ بہت چالاک لگ رہا تھا۔ اس نے جھکتے ہوئے ایاز سے کہا۔

''ہیلو بڈی... کیسے ہو؟''

نہ جانے کیوں ایاز کو اس کا یہ جملہ اور انداز جانا پہچانا لگا۔ حالانکہ وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بے دردی سے اس کے چہرے سے لگے الیکٹروڈ کھینچ دیے اور انہیں ایک طرف ڈالتے ہوئے اچانک ہی ایاز کو بازو سے پکڑ کر الٹ دیا۔ ایک لمحے کو ایاز کو لگا کہ وہ سی ٹی اسکین مشین کے پلیٹ فارم سے براہِ راست نیچے فرش پر جا گرا ہے لیکن یہ بالکل برابر میں رکھا ہوا اسٹریچر تھا۔ وہ الٹا اس پر گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اس کے گرتے ہی اس کا دایاں ہاتھ اسٹریچر کی راڈ سے بندھی پٹی سے باندھ دیا۔ یہ کمر اتنی سی ٹی اسکین کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ ایاز سمجھ نہیں سکا کہ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ کو کیوں باندھا ہے۔ اسی لمحے باہر کا دروازہ کھلا اور نرس شامین اندر آئی۔ اس نے ڈاکٹر کو دیکھا۔

''تم کون ہو اور ڈاکٹر ازمیر کہاں ہے؟''

''وہ وہاں ہے۔'' جوان ڈاکٹر نے ایک بند کمرے کی طرف اشارہ کیا اور جیسے ہی نرس شامین نے دروازے کی طرف دیکھا، ڈاکٹر نے اسے بازو سے پکڑ کر گھمایا اور عقب سے اس کی گردن کو جکڑ لیا۔ نرس شامین نے تڑپ کر خود کو آزاد کرانا چاہا مگر ڈاکٹر نے اس کی طاقت اسی کے خلاف استعمال کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اس کی گردن توڑ دی۔ ڈاکٹر کی گرفت میں تڑپتا ہوا شامین کا جسم یک دم ساکت ہوگیا۔ اس نے شامین کو چھوڑا تو وہ ایاز کے بالکل سامنے فرش پر گری۔ اس کی کھلی ہوئی بے نور ہوتی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے روح اور جسم کا ناتا ٹوٹ چکا ہے۔ ایاز درانی دم بہ خود رہ گیا۔ ایک لمحے پہلے وہ جسے ڈاکٹر سمجھ رہا تھا، وہ اچانک ہی قاتل کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ ایاز نے کہنا چاہا کہ اس نے یہ کیا کیا ہے لیکن اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس کا جسم بدستور سن ہو رہا تھا۔ زرد چشمے والے قاتل نے سرد نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔

''یہی انجام تمہارا ہونے والا ہے لیکن دوسرے طریقے سے۔''

اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ پاس رکھی سرنج میں اس نے شیشی کی دوا بھری اور اس سرنج کو خود ڈیک ہی اسٹینڈ پر لگی ڈرپ کی تھیلی میں خالی کر دیا۔ ''بس ایک منٹ کی بات ہے۔ جب یہ دوا تمہارے خون میں شامل ہوگی تو تمہیں مرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

تب ایاز کو پتا چلا کہ اس کے ہاتھ میں لگے کینولا سے ڈرپ منسلک تھی۔ اس نے پھر بولنے کی کوشش کی اور اس بار کامیاب رہا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم کیسے ہو۔''

قاتل نے اس کی بات کا کوئی اثر ــــ نہیں لیا اور وہ دروازے کی طرف چلا گیا۔ غالباً وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہاں نرس کے سوا کوئی اور تو نہیں ہے۔ اس کے جاتے ہی ایاز نے نرس کی طرف دیکھا۔ ایاز کا بایاں ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا، یہ آزاد تھا۔ اس کی حالت کے پیش نظر قاتل نے صرف دایاں ہاتھ باندھنا کافی سمجھا تھا۔ نرس کے یونیفارم کی جیب سے ایک چھوٹی سی قینچی جھانک رہی تھی۔ ایاز نے ہاتھ آگے کر کے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی پہنچ سے چند انچ دور تھی۔ ایاز کوشش کرنے لگا۔ وہ اپنے مفلوج جسم کو آگے بڑھا رہا تھا پھر قینچی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اسی لمحے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور قاتل اندر آگیا۔ وہ اطمینان کر چکا تھا۔ اس نے اندر آکر ایک بار غور سے ایاز کو دیکھا... جیسے اسے شک ہو کہ اس نے کوئی حرکت کی ہے لیکن پھر اس کے پاس آنے کے بجائے اس نے نرس کی لاش کے دونوں بازو پکڑے اور اسے کھینچتا ہوا کمرے کے دوسرے بند دروازے کی طرف لے گیا۔ اس نے آہنی دروازہ کھولا تو دوسری طرف بڑا سا اسٹور روم نکلا۔ سامان کے ساتھ ایاز نے مین پر ایک سفید کوٹ کی جھلک بھی دیکھی تھی۔

جیسے ہی قاتل نظروں سے اوجھل ہوا، وہ حرکت میں آگیا اور اس نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کینولا سے لگی ڈرپ کی لائن چھوٹی قینچی سے کاٹ دی۔ اسے نہیں معلوم کہ اتنی دیر میں کتنا زہر اس کے جسم میں گیا تھا یا نہیں کیونکہ ڈرپ بہت سست روی سے قطرہ قطرہ کر کے گر رہی تھی اور وہ اپنے جسم میں زہر کے آثار بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کینولا ہٹایا تو اس کی تکلیف سے جسم کی بے حسی تیزی سے کم ہوئی۔ وہ اسٹریچر سے نیچے اترا تو ایک لمحے کو لڑکھڑا گیا اور اس نے اسٹریچر کا سہارا لیا تو وہ سی ٹی اسکین کے پلیٹ فارم سے ٹکرایا۔ ایک واضح اور بلند آواز پیدا ہوئی جس کا قاتل تک پہنچنا یقینی تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسٹور روم سے باہر آتا، ایاز دروازے کی طرف جھپٹا اور جب وہ دروازہ بند کر رہا تھا تو اس کی نظر اسٹور روم کے فرش پر پڑی ڈاکٹر ازمیر کی لاش پر گئی۔ قاتل نے اس کی گردن بھی توڑ دی تھی۔

اسی لمحے قاتل اندر سے نمودار ہوا لیکن اسے باہر آنے کا موقع نہیں ملا۔ ایاز نے تیزی سے دروازہ بند کر کے اس کا بولٹ چڑھا دیا۔ اب قاتل اندر بند تھا۔ اس نے دروازے کے اوپر چھوٹے سے خانے سے جھانک کر ایاز کو دیکھا اور غرا کر بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، اس طرح بچ جاؤ گے؟''

یہ کہہ کر وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ ایاز کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ قاتل اسٹور روم کے کسی اور راستے سے نکلنے گیا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ یہاں آئے، ایاز کا یہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔ اس کے کپڑے اور جوتے پاس ہی ایک میز پر رکھے تھے۔ غالباً جب ڈاکٹر ازمیر اسے سی ٹی اسکین مشین میں ڈال چکا تھا، تب قاتل یہاں آیا اور اس نے پہلے ڈاکٹر ازمیر کو مارا پھر خلل دینے پر نرس شاہین کو قتل کیا اور اس کے قتل کا سامان کر دیا۔ ایاز کے جسم پر اسپتال کا لباس تھا، وقت بچانے کے لیے اس نے اسی پر اپنے کپڑے پہن لیے۔ اوور کوٹ بھاری تھا اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے اٹھا سکتا اس لیے وہیں چھوڑ دیا۔ گھڑی اور پرس جیب میں رکھتا ہوا وہ تیزی سے اس دروازے سے باہر آیا جس سے نرس شاہین اندر آئی تھی۔ یہ دروازہ ایک ویٹنگ روم میں کھلتا تھا۔

اس کے ساتھ مرکزی راہداری تھی۔ اس میں بے شمار افراد آجا رہے تھے۔ ایاز نے دیوار پر بنے راستوں کی نشان دہی کے اشارے دیکھے اور باہر کی طرف چل پڑا۔ آگے چل کر گیلری گھوم رہی تھی اور وہ پارکنگ کی طرف جا رہی تھی۔ جب وہ گیلری کے دوسری طرف پہنچا تو اس نے قاتل کو گیلری کے شروع کے حصے میں نمودار ہوتے دیکھا۔ درمیان میں اسپتال کی عمارت کا خالی حصہ تھا۔ قاتل نے بھی اسے دیکھ لیا اور لوگوں کو دھکیلتا ہوا تیزی سے آنے لگا۔ اس کے آنے سے

پہلے ایاز پارکنگ تک پہنچ گیا۔ یہاں نجی پارکنگ تھی اور بے شمار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کسی ٹیکسی کے لیے اسے ذرا دور جانا تھا مگر اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی۔ وہ جب تک یہاں سے نکلتا قاتل اسے آلیتا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ پوری قوت سے بھاگ دوڑ کر سکتا۔ اس وقت بھی وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر یہاں تک چلا آیا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور گاڑیوں کے دروازے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ خوش قسمتی سے تیسری وین کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر گھستے ہی اس نے دروازے لاک کر دیے۔ وہ پچھلی نشست پر دبک گیا، یہاں تاریکی تھی اور اس کے دیکھ لیے جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ لیکن کوئی خاص طور سے جھانکتا تو اسے دیکھ سکتا تھا۔

اسی لمحے قاتل پارکنگ میں داخل ہوا اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اسے بھی یقین تھا کہ ایاز اتنی جلدی پارکنگ سے باہر نہیں جا سکتا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ وہ جھک جھک کر گاڑیوں کے نیچے دیکھنے لگا۔ بعض جگہوں پر اندھیرا تھا اور وہ ٹارچ استعمال کر رہا تھا۔ پھر وہ گاڑیوں کے اندر جھانکنے لگا۔ ایاز اس کی سرگرمیوں کی آہٹیں سن رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس وین کے قریب آرہا تھا۔ ایاز کو خطرہ محسوس ہونے لگا، اگر وہ تیز ٹارچ کی روشنی میں اندر جھانکتا تو یقینی تھا، ایاز اسے نظر آجاتا۔ کوئی چیز اس کی کمر سے چبھ رہی تھی، اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹٹولا تو یہ ایک دھاتی تھرماس ثابت ہوا جس میں شاید کافی تھی۔ اس نے ڈھکن کھول کر کافی کا گھونٹ بھرا۔ کافی بالکل ٹھنڈی تھی لیکن فرحت بخش ثابت ہوئی اور اس نے ایاز کے جسم میں چستی بھر دی۔ اس نے ذرا سا اٹھ کر دیکھا، زرد چشمے والا قاتل اسی طرف آرہا تھا اور ٹارچ سے گاڑیوں میں روشنی ڈال کر دیکھ رہا تھا۔

پھر اس کی نظر وین کی طرف گئی اور اس نے جیب سے ایک چھوٹا سا خنجر نکال لیا۔ پاس آکر جیسے ہی اس نے وین کے پچھلے حصے میں روشنی ڈالنا چاہی، کلک کی آواز کے ساتھ اس کا دروازہ پوری قوت سے کھلا اور اس کے منہ سے ٹکرایا۔ وہ پیچھے جا گرا۔ گرتے ہی اس نے پھرتی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں ایاز وین سے نکل کر اس کی طرف جھپٹا اور اس نے دھاتی تھرماس گھما کر قاتل کے سر پر دے مارا۔ ضرب شدید تھی، وہ دوبارہ نیچے گر گیا۔ ایاز نے ایک ضرب اور لگائی۔ تھرماس وہیں پھینکا اور تیز قدموں سے پارکنگ سے باہر کی طرف جانے لگا۔ خوش قسمتی سے اس کی راہ میں حائل ہونے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ باہر دن روشن تھا اور دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔

باہر آتے ہوئے اس نے مزید دو افراد کو پیچھے آتے دیکھا اور اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ وہ بھی قاتل کے ساتھی ہیں۔ ان میں ایک دبلا اور لمبے قد والا نوجوان تھا اور دوسرا ایک پستہ قد اور ادھیڑ عمر شخص تھا۔ باہر آتے ہی ایاز ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں باہر آگئے۔ ایاز ٹریفک کی پروا کیے بغیر دوڑا اور سڑک کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ سڑک ہارن اور لوگوں کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ شور نے ان دشمنوں کی راہنمائی کی اور انہوں نے ایاز کو سڑک کراس کرتے دیکھ لیا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے آئے لیکن وہ اس کی طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر نہیں آسکتے تھے اس لیے انہیں کسی قدر تاخیر ہوگئی اور ایاز دوسری طرف کی سڑک کراس کر کے فٹ پاتھ پر تیزی سے آگے جانے لگا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اسپتال کی پارکنگ سے ایک سیاہ وین نکلی ہے اور گھوم کر اس کی طرف آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس میں وہی زرد چشمے والا قاتل تھا۔ ایک شاپنگ سینٹر کا دروازہ سامنے آیا تو وہ اس میں چلا گیا۔ اسے امید تھی کہ اس کے دشمنوں نے اسے کھو دیا ہوگا۔

لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی، وہ پوری چالاکی سے اسے نظروں میں رکھے ہوئے سڑک کے پار آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ایاز کو شاپنگ سینٹر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اندر ایاز شاپنگ سینٹر کے پچھلے دروازے کی تلاش میں تھا۔ وہ کاؤنٹر پر آیا اور وہاں موجود سیلز گرل سے پچھلے دروازے کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ دیکھیں سر!'' لڑکی نے دور بلندی پر لکھے انگریزی کے الفاظ کی طرف اشارہ کیا۔ ''بس اس کے پیچھے باہر جانے والا دروازہ ہے۔''

ایاز اس کا شکریہ ادا کر کے ذرا پیچھے ہوا تھا کہ کوئی چیز تیزی سے اس کے سر کے پاس سے گزری اور اس سے آگے کھڑا نوجوان اپنا شانہ تھام کر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کے شانے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ خون دیکھ کر سیلز گرل ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ ایاز تیزی سے پیچھے ہٹا اور ایک ریک کی آڑ میں آگیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک پستہ قد شخص لمبی نال والی پستول لیے ہوئے اسے نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ فائر کی آواز نہیں آئی تھی...... یقیناً اس کے پستول پر سائلنسر فٹ تھا۔ ریک کے پاس کچھ ڈبے بھی اچھلے تھے، ان میں سوراخ ہو گئے تھے۔ خطرہ ایاز کے پاس آگیا تھا۔ وہ ایک دم سر جھکا کر دوڑا۔ ساتھ ہی اس نے راہ میں آنے والے ریکس اور دوسری چیزیں الٹنا شروع کر دیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاکہ دشمن آسانی سے پیچھے نہ آسکے۔ اس کے پیچھے آنے والے قاتل وہاں عام لوگوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اس پر فائرنگ کر رہے تھے۔ لوگوں نے بھی دیکھ لیا تھا اور وہ چیختے چلاتے ہوئے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ سراسیمگی اتنی تیزی سے پھیلی کہ جب تک ایاز مختی دروازے تک پہنچا وہاں پہلے ہی باہر نکلنے والوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا اور وہ اس ہجوم میں پھنس کر رہ گیا۔

شاپنگ سینٹر کی انتظامیہ نے بدنظمی دیکھتے ہی اپنے گارڈز کو مستعد کر دیا اور وہ بدنظمی پھیلانے والوں کو تلاش کرنے لگے۔ ایاز باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا لیکن لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ وہ نکل نہیں پا رہا تھا، اسی لمحے پستہ قد شخص وہاں نمودار ہوا۔ اس نے ایاز کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سفاک انداز میں مسکرایا اور اپنا پستول اس کی طرف کیا۔ ایاز چلایا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟... یہاں بہت سارے لوگ ہیں۔''

اوپر والے فلور سے دو گارڈز نمودار ہوئے، انہوں نے پستہ قد شخص کو مسلح دیکھ لیا تھا۔ ایک گارڈ نے چلا کر اسے ہتھیار پھینکنے کو کہا تو اس نے گھومتے ہوئے گارڈ پر فائر کر دیا۔ وہ گولی کھا کر گرا تو اس کے ساتھی نے پستہ قد شخص پر گولی چلا دی۔ شاٹ گن کی گولی نے پستہ قد کے پیٹ میں سوراخ کر دیا اور وہ تیزی سے بہنے والے خون کو روکنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔ شاٹ گن کے دھماکے نے سراسیمہ عوام کو پاگل کر دیا اور وہ دیوانہ وار باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے ریلے میں پھنس کر ایاز خود بہ خود باہر آ گیا۔

باہر نکلتے ہی وہ تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن وہ پولیس یا اپنے دشمنوں کی آمد سے پہلے یہاں سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ پہلا پبلک ٹائلٹ نظر آتے ہی وہ اس میں گھس گیا اور ایک واش روم میں داخل ہو کر کموڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن خالی ہو رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں جو اسے قتل کرنے کے درپے ہیں؟ وہ خاصی دیر تک وہیں بیٹھا سانس اور حواس درست کرتا رہا۔ پھر وہ باہر آیا اور واش بیسن میں منہ ہاتھ دھویا۔ وہاں سے بال درست کیے، اپنے کپڑے جہاں جہاں سے کچھ لگا تھا، صاف کیے اور گھڑی کلائی میں باندھ کر وہ دوبارہ سے معقول حلیے میں آ گیا۔ اس کے پرس میں رقم بدستور موجود تھی اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ باہر آ کر وہ ایک طرف چل پڑا اور کچھ دور جانے کے بعد ایک ریستوران سے آتی کبابوں کی خوشبو نے اسے احساس دلایا کہ وہ شدید بھوکا ہے۔ اس نے شاید پورے ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اگرچہ ڈرپ کے ذریعے اسے خوراک اور پانی ملتا رہا تھا لیکن اس کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔

وہ ریستوران میں داخل ہوا اور ایک کونے کی میز پر بیٹھ گیا۔ ایک نوجوان ویٹر نے اس سے پوچھا۔ ایاز جانتا تھا، ترکش کباب اور روٹی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس نے ان کا آرڈر دیا اور اس سے پہلے کافی منگوائی۔ کافی آ گئی تو وہ اس کے گھونٹ لیتے ہوئے حالات پر غور کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ ایک بات تو سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہ سارے واقعات اسی چکر کا ایک حصہ ہیں جس میں وہ پھنس گیا ہے۔ سازش بہت بڑی تھی اور یقیناً اس میں صرف نقلی ایاز اور ہیلن ملوث نہیں تھے، ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ اسے قتل کرنے کی کوشش کرنے والے یقیناً اس سازش کا ایک حصہ تھے۔ کھانا آ گیا تھا، وہ سوچنے کے ساتھ کھانے میں بھی مصروف ہو گیا۔

وہ کئی دن بعد کچھ کھا رہا تھا اس لیے اس نے ہاتھ ہلکا رکھا اور بھوک سے کم کھایا اور کھانے کے بعد ترکش قہوہ طلب کیا۔ قہوہ پیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ سب کچھ ممکن تھا لیکن آخر ہیلن نے اسے کیوں پہچاننے سے انکار کر دیا؟ کیا وہ بھی ان لوگوں سے مل گئی تھی؟ اور ان لوگوں کے عزائم کیا تھے؟ وہ کیوں اسے ہر قیمت پر مارنے پر تل گئے تھے؟ اس نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ وہ ایک عام سا ایگری کلچرل سائنٹسٹ تھا اور ایک یونیورسٹی میں کام کرتا تھا۔ اس کا کسی گینگ یا مافیا سے تعلق نہیں تھا لیکن اس کے پیچھے آنے والے دشمن پیشہ ور قاتل لگتے تھے۔ نرس شاہین کو قاتل نے اس کے سامنے کتنی آسانی اور نارمل انداز میں ہلاک کر دیا تھا جیسے اس کے لیے یہ معمول کا کوئی کام ہو۔ اس سے پہلے وہ ڈاکٹر اذمیر کو بھی ہلاک کر چکا تھا۔

کھانا کھا کر اس نے بل ادا کیا اور ریستوران سے باہر آ گیا۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ امریکا میں کون اس کے بارے میں تصدیق کر سکتا ہے تو فوراً ہی اس کے ذہن میں پروفیسر ایڈورڈ کا نام آیا۔ یہ شاید اس کا کوئی کولیگ تھا لیکن وہ اس سے کہاں رابطہ کرتا؟ اس کے پاس کوئی نمبر نہیں تھا۔ وہ ایک فون بوتھ تک آیا اور اس نے فون ڈائریکٹری میں پروفیسر حبیب اومیگان کا نمبر تلاش کرنا شروع کیا۔ اس کے گھر اور دفتر دونوں جگہوں کا نمبر مل گیا۔ جب وہ نمبر ڈائل کرنے لگا تو اسے پتا چلا کہ اس کے پاس سکے تو ہیں نہیں۔ ایک قریبی دکان سے اس نے دس ڈالر کا نوٹ دے کر ڈھیر سارے سکے حاصل کر لیے۔ دکان والے نے اسے

بتا دیا تھا کہ مقامی کال کرنے کے لیے کون سے سکے کتنی مقدار میں سلاٹ میں ڈالنے ہوں گے اور بین الاقوامی کال کرنے کے لیے کتنے سکوں کی ضرورت ہو گی۔ وہ بوتھ تک آیا۔ آسمان پر سیاہ بادل جمع ہونے لگے تھے اور ایک بار پھر بارش کے آثار لگ رہے تھے۔ اس نے پروفیسر حبیب کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''پروفیسر! میں ڈاکٹر ایاز درانی بات کر رہا ہوں۔''

''تم دھوکے باز۔'' پروفیسر نے اسے آواز سے پہچان لیا۔

''پلیز پروفیسر! میں کسی بہت بڑی سازش کا شکار ہو گیا ہوں۔''

''سازش۔'' پروفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جس میں تمہاری بیوی بھی شامل ہے؟''

''ہاں، وہ بھی شامل ہے۔'' ایاز برہم ہو گیا۔ ''لیکن میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہے۔ شاید اسے کسی طرح سے مجبور کیا گیا ہے۔''

''تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟ میرا خیال ہے کہ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔''

''پلیز! تم مجھے ایک موقع تو دو۔'' ایاز نے لجاجت سے کہا تو پروفیسر چپ ہو گیا پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم کیا چاہتے ہو؟''

''امریکا میں کوئی پروفیسر ایڈورڈ ہے، کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''ہاں، دوسرے ایاز درانی نے بھی اس کا حوالہ دیا تھا، میری آج ہی اس سے بات ہوئی ہے۔'' پروفیسر کا لہجہ بدل گیا۔ ''تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ پروفیسر ایڈورڈ نے ایاز درانی کو شناخت کر لیا ہے، اب تم کیا کہتے ہو؟''

''یہ ناممکن ہے... ایاز درانی میں ہوں۔''

''یہ تو تم کہہ رہے ہو اور اس کی کہیں سے تصدیق نہیں ہو رہی ہے جبکہ اس کی ہر بات کی تصدیق ہو رہی ہے۔''

''پروفیسر! جب کوئی چیز زیادہ ہی صاف نظر آنے لگے تو وہ مشکوک نہیں ہوتی؟''

''ایسا کرو، تم مجھے شام کو کال کرو۔'' پروفیسر نے کہا۔ اور اس نے فون بند کر دیا۔ ایاز نے دوبارہ نمبر ملایا لیکن نمبر انگیج جا رہا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر حبیب اومیگان ترکی کے چند ذہین ترین انسانوں میں سے ایک تھا۔ ترکی نے گزشتہ دو عشروں میں جو شاندار زرعی ترقی کی تھی اور بہت ساری اجناس، پھلوں اور سبزیوں میں نہ صرف خود کفیل ہو گیا تھا بلکہ انہیں برآمد بھی کرنے لگا تھا، اس میں پروفیسر حبیب کا بہت بڑا کردار تھا۔ مذہب کے بارے میں اپنے رجحان کی وجہ سے جوانی میں اس کو ملک سے باہر جانا پڑا تھا کیونکہ اس وقت ترکی میں کسی مذہبی رجحان رکھنے والے شخص کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کئی سال جرمنی میں مقیم رہا اور وہیں اس نے زراعت کے شعبے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ یورپ کی زرعی تحقیق کی تجربہ گاہوں میں کام کرتا رہا۔ پھر ترکی میں حالات بدلے اور معتدل مزاج رکھنے والی حکومت آئی تو ترکی سے چلے جانے والے اس کے جوہر قابل نے واپسی کا سوچا اور ان میں پروفیسر حبیب اومیگان بھی تھا۔ وہ واپس آیا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ملک کی سب سے بڑی زرعی تجربہ گاہ کے سربراہ کے ساتھ استنبول یونیورسٹی میں پروفیسر بھی بنا دیا گیا۔ اس مقام تک پروفیسر صرف اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے نہیں پہنچا تھا، اس کے پاس صلاحیتوں کو درست طریقے سے استعمال کرنے والی ذہانت بھی تھی۔ اسی چیز نے اسے ملک کا سب سے بڑا سائنس داں بنا دیا تھا۔

ایاز درانی سے بات کر کے اس نے لائن کاٹ دی اور ریسیور نیچے رکھ دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے دوبارہ کال کرے گا لیکن وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ذہن اس حوالے سے بالکل واضح تھا۔ اس کے دفتر میں اس سے ملنے کے لیے آنے والے ڈاکٹر ایاز درانی نے اسے سو فیصد مطمئن کیا تھا لیکن اس ایاز درانی کی بات نے اسے کسی قدر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ واقعی ڈاکٹر ایاز درانی کچھ زیادہ ہی صاف شفاف نظر نہیں آ رہا تھا جو پھر اس نے پروفیسر حبیب کو اطلاعات فراہم کرنے کے انداز میں اپنے بارے میں سب بتایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پیش بندی کر رہا تھا۔ جیسے اس سے یہ سب پوچھا جائے گا اور وہ پہلے سے بتا رہا تھا۔ اس نے پروفیسر کو یہ تک بتایا تھا کہ وہ کس پرواز سے انقرہ پہنچے تھے اور پھر وہاں سے حادثے کا شکار ہونے والی ٹرین کے ذریعے استنبول آئے تھے لیکن وہ اس بوگی میں تھے جو حادثے میں بچ گئی تھی۔ سوچتے ہوئے پروفیسر حبیب نے ریسیور اٹھا کر کریڈل دبایا اور ٹون آنے پر ایک نمبر ڈائل کیا۔

''عثمان! میں پروفیسر حبیب اومیگان بات کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم آج کل انقرہ ائرپورٹ پر ہوتے ہو، مجھے تم سے ایک کام ہے۔''

عثمان انور رشتے میں پروفیسر حبیب کا بھانجا لگتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے مستعدی سے کہا۔ ''حکم کریں انکل۔''

پروفیسر حبیب نے اسے بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے، اس کی بات سن کر عثمان نے کہا۔ ''کام ہو جائے گا لیکن کچھ وقت لگے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم مجھے ای میل کر دینا، میں گھر جا کر دیکھ لوں گا لیکن یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیے۔''

فون رکھ کر اس نے پروفیسر ایڈورڈ کا نمبر ملایا لیکن دوسری طرف سے ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ پروفیسر نے پیغام نوٹ کرا دیا کہ وہ ایڈورڈ سے ملنا چاہتا ہے اور اس نے اپنا پتا بھی دُہرا دیا۔ یہ کام کر کے وہ سوچنے لگا اگر دوسرا ایاز درانی درست کہہ رہا تھا تو یہ کوئی بہت بڑی سازش تھی اور اس کا دائرہ بھی یقیناً خاصا وسیع تھا۔

☆☆☆

ایاز بوتھ سے نکل آیا، وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے اور کہاں جائے؟ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور اسے آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس حالت میں وہ کسی ہوٹل کا رخ نہیں کر سکتا تھا جبکہ اس کے پاس شناخت کے لیے ایک بھی چیز نہ ہو۔ وہ جہاں کھڑا تھا، اس سے ذرا دور ہی وائٹ کیب کا دفتر تھا۔ دفتر دیکھتے ہی اسے امینہ کا خیال آیا اور امینہ سے خیال آیا کہ ممکن ہے وہ اسے کسی جگہ پناہ دلوا سکے۔ وہ دفتر کی طرف بڑھا۔ اندر ایک خوش رو نوجوان بیٹھا فی وی پر فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹی وی سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

''یس؟''

''مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ اس کا نام امینہ ہے اور اس کی ٹیکسی کا..... نمبر... 212007 ہے۔''

نوجوان نے چونک کر پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو، کیا کوئی شکایت ہے؟''

''نہیں، مجھے اس سے ذاتی کام ہے۔'' ایاز نے نرمی سے کہا اور سوڈالر کا ایک نوٹ میز پر رکھ دیا۔ ''اگر مجھے اس کا پتا مل جائے تو میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔''

نوجوان نے نوٹ دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس نے نوٹ لینا چاہا لیکن ایاز نے نوٹ واپس کھینچ لیا اور بدستور نرمی سے بولا۔ ''پہلے اس کا پتا؟''

نوجوان نے میز پر رکھے کمپیوٹر کی طرف توجہ دی اور چند لمحے بعد ایک کاغذ پر چند لائنیں کھینچ کر اس کے سامنے کر دیں۔ ایاز نے دیکھا، یہ استنبول کے پرانے علاقے کا پتا تھا۔ وہ اس جگہ سے کسی حد تک واقف تھا۔ ''ایک چیز اور... امینہ کون سی شفٹ میں کام کر رہی ہے؟''

نوجوان نے بادل نا خواستہ کمپیوٹر کی طرف دیکھا اور بتایا۔ ''مارننگ شفٹ میں، چار بجے اس کی آف ہو جائے گی۔''

ایاز نے نوٹ میز پر رکھ دیا اور وہاں سے نکل آیا۔ جیسے ہی وہ باہر آیا، ٹی وی پر دکھایا جانے والا میچ روک کر چینل نے ایک اشتہار چلایا اور اسکرین پر ایاز درانی کی تصویر نمودار ہوئی۔ نوجوان چونک گیا۔ اس نے اشتہار دیکھا اور پھر جھپٹ کر دفتر سے باہر آیا لیکن ایاز جا چکا تھا۔ اندر آ کر اس نے اشتہار میں دیا جانے والا نمبر نوٹ کر لیا۔

دفتر سے باہر آتے ہی ایاز کو ٹیکسی مل گئی اور اس نے اندر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو امینہ کا پتا بتایا۔ ٹیکسی حرکت میں آ گئی۔ پتا زیادہ دور کا نہیں تھا۔ ٹیکسی بیس منٹ بعد مطلوبہ عمارت کے سامنے رکی۔ ایاز نے کرایہ ادا کیا اور نیچے اتر آیا۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ یہ نچلے طبقے کا علاقہ تھا۔ دس سال پہلے تک یہ علاقے تیسری دنیا کے غریب علاقوں کی طرح گندگی اور پسماندگی کا شکار تھے لیکن اب اس کی حالت خاصی بہتر ہوئی تھی۔ گلیاں پختہ اور صاف تھیں جبکہ مکانوں کی حالت بھی بہتر نظر آ رہی تھی۔ ایاز عمارت کے داخلی دروازے سے کچھ دور بنی ہوئی اینٹوں کی منڈیر پر ٹک گیا۔ موسم سرمئی ہو گیا تھا۔ ابھی برف باری کا آغاز نہیں ہوا تھا لیکن شمال کی طرف سے چلنے والی ہوا میں بلا کی کاٹ تھی اور صرف سوٹ میں اسے سردی لگ رہی تھی۔ اب اسے کسی گرم چیز کی ضرورت تھی۔

پانچ بجے کے قریب گلی کے کونے پر بس رکی اور امینہ اس سے اتر کر آنے لگی۔ وہ ٹیکسی صرف ڈیوٹی کے دوران میں استعمال کر سکتی تھی۔ جیسے ہی وہ قریب آئی، ایاز نے کھڑے ہوتے ہوئے اسے آواز دی۔ وہ ٹھٹک گئی اور پھر ایاز پر نظر پڑتے ہی تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ ایاز اس کے پیچھے آیا۔

''امینہ! میری بات سنو۔''

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔'' وہ راہی سے بولی۔ ''تم مجرم ہو، میں نے خود دیکھا تھا۔ یونیورسٹی سے پولیس والے تمہیں گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے۔''

''وہ ایک غلط فہمی تھی۔ انہوں نے مجھے اسپتال پہنچا دیا تھا۔''

''اور تم وہاں سے بھاگ آئے نا؟'' امینہ عمارت کے اندر داخل ہو کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''مجبوری تھی... وہاں میرے دشمن پہنچ گئے تھے اور میں اس شہر میں کہیں پناہ نہیں لے سکتا، مجھے مدد کی ضرورت

''میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

''پلیز! میرے پاس رقم ہے، میں ادائیگی کر سکتا ہوں۔'' ایاز نے اپنا پرس نکال کر اسے رقم کی جھلک دکھائی۔ ''مجھے صرف ایک رات کے لیے پناہ چاہیے۔''

امینہ رک گئی۔ اس کے چہرے پر دلچسپی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے پرس کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک رات کے لیے پناہ دے سکتی ہوں۔ لیکن برائے مہربانی اس سے کوئی غلط مطلب مت نکالنا۔ تم صرف رات ٹھہر سکتے ہو اور میں تمہیں کھانا اور ناشتا بھی مہیا کروں گی۔ اس کے میں تم سے سوڈالر لوں گی۔''

''میں بالکل بھی کوئی غلط مطلب نہیں نکالوں گا۔'' ایاز نے وعدہ کیا۔ ''میں ادائیگی کروں گا اور تمہارا شکر گزار بھی ہوں گا۔''

''آؤ میرے ساتھ۔''

امینہ اسے چوتھے فلور پر واقع اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں لائی۔ اس میں صرف ایک بیڈ روم اور ایک باتھ روم تھا۔ امینہ نے اسے صاف ستھرا اور سجا کر رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایاز کو لاؤنج میں بٹھایا اور خود لباس تبدیل کرنے... بیڈ روم میں چلی گئی۔ باہر کی کھلی فضا کے مقابلے میں یہاں موسم بہتر تھا اور ایاز کی جان میں جان آئی تھی۔ کچھ دیر بعد امینہ اندر سے سادہ پینٹ اور ہائی نیک شرٹ میں برآمد ہوئی۔ اس نے کیتلی میں کافی کا پانی رکھا اور ایاز سے پوچھا۔ ''تمہیں میرا پتا کس نے بتایا؟''

ایاز نے اسے بتایا کہ اس نے اس کا پتا کس طرح حاصل کیا ہے۔ امینہ مسکرانے لگی۔ ''ترکی ترقی کر رہا ہے لیکن یہاں ابھی تک رشوت لینے کا رواج ہے۔ سوال یہ ہے کہ تمہیں میرا خیال ہی کیوں آیا؟ اس طرح رقم دے کر تم کہیں بھی ٹھہر سکتے ہو۔ اس شہر میں پیشہ ور عورتوں کی کمی نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں کسی نئی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مجھے یقین ہے، میرے دشمن جس طرح میرے پیچھے لگے ہیں انہوں نے اس چیز کو بھی زیر نظر رکھا ہوگا کہ میں پناہ کے لیے کہاں کہاں جا سکتا ہوں۔''

''یہ لوگ کون ہیں اور تمہارے دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں؟''

ایاز نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کاش کہ میں جان سکتا۔ میری یادداشت کا بڑا حصہ غائب ہے اور میں اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیتلی نے سیٹی بجائی تو امینہ اٹھ کر کافی بنانے لگی۔ ''تم نے اسپتال سے جلدی نکل کر غلطی کی۔ ممکن ہے مکمل علاج سے تمہاری یادداشت بحال ہو جاتی۔''

''ممکن ہے لیکن ہیلن کا سوچ کر میں رہ نہیں سکا تھا۔''

''اب تم کیا کرو گے؟'' امینہ نے اسے کافی کا مگ تھمایا اور خود اپنا مگ لے کر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں کوشش کر رہا ہوں۔ ایک شخص یہاں استنبول میں بڑے عہدے پر ہے۔ اگر میں نے اسے قائل کر لیا تو وہ میری بہت مدد کر سکتا ہے۔''

امینہ نے سر ہلایا۔ ''کنڈلک مسٹر ایاز درانی! نام سے تم ایشیائی لگتے ہو؟''

''میرا تعلق پاکستان سے ہے لیکن میں زمانۂ طالب علمی میں امریکا چلا گیا تھا اور پھر مجھے وہیں کی شہریت مل گئی۔''

''اوہ... تم پاکستانی ہو۔'' امینہ پہلی بار پُرجوش ہوئی۔ ''جب بوسنیا میں سرب ہم پر ٹوٹ پڑے تھے اور ہم ان سے لڑ رہے تھے تو کئی پاکستانی ہماری مدد کے لیے آئے تھے۔ یہاں ترکی میں بھی میں نے لوگوں کو دیکھا ہے، وہ پاکستان سے پیار کرتے ہیں۔''

''اس کی ایک طویل تاریخ ہے۔'' ایاز نے ٹالنے والے انداز میں کہا، وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے کافی پی لی تو امینہ نے اسے پیش کش کی کہ جب تک وہ کھانا بنا رہی ہے، وہ چاہے تو نہا سکتا ہے۔ خود ایاز بھی شدت سے غسل کی خواہش محسوس کر رہا تھا۔ امینہ صرف دلکش اور جوان ہی نہیں بلکہ خود اعتماد لڑکی تھی، جبھی وہ اسے اتنی آسانی سے اپنے فلیٹ میں لے آئی تھی۔

☆☆☆

سیاہ وین سڑک پر ایک طرف کھڑی تھی اور اس میں زرد چشمے والا قاتل اور اس کے لمبے ساتھی کے ساتھ ایک معمر شخص بھی موجود تھا۔ اس نے سردی کی مناسبت سے اوورکوٹ اور سر پر ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''کرسٹن کا کیا ہوا؟''

''پولیس اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکے گی۔'' زرد چشمے والے نے اعتماد سے کہا۔ ''ہم بالکل مختلف حلیے میں یہاں آئے تھے۔''

ہیٹ والے نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ''ایاز کی تلاش کے لیے مزید کیا کیا ہے؟''

''ٹی وی پر اشتہار دے دیا ہے، جلد کوئی نتیجہ نکل آئے گا۔''

''اور اگر نہ نکلا تو؟'' ہیٹ والے کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''تب بھی آج رات کام ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم اسے آرام سے تلاش کر سکتے ہیں۔''

ہیٹ والے نے اس کی بات کا تجزیہ کیا اور بولا۔ ''میں مطمئن نہیں ہوں۔ اسے ہر صورت میں تلاش کرنا ہے اور ختم کرنا ہے۔''

''ہم پوری کوشش کر رہے ہیں جناب۔'' زرد چشمے والا بولا۔ ایسا لگ رہا تھا ہیٹ والا ان سب کا باس تھا اور باقی لوگوں کا باس زرد چشمے والا تھا۔ لمبا آدمی اس دوران میں بالکل چپ رہا۔ اچانک زرد چشمے والے شخص کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے سن کر تیزی سے کہا۔ ''تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟... ہاں وہ ایک نفسیاتی مریض ہے... ٹھیک ہے، ہم تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ کسی اور سے اس کا ذکر مت کرنا ورنہ انعام میں کوئی حصے دار بھی پیدا ہو جائے گا۔'' بولنے کے دوران اس نے نوٹ پیڈ پر ایک پتا لکھ لیا اور کال منقطع کر کے بولا۔ ''اشتہار نے کام کیا ہے۔ اب ہم اس شخص کے پاس جائیں گے۔'' زرد چشمے والے نے وین میں موجود کمپیوٹر پر استنبول کا نقشہ نکالا اور اس میں مطلوبہ پتا تلاش کیا۔ ہیٹ والے نے جھک کر دیکھا اور نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔

''مجھے اس جگہ اتار دینا ایک ضروری کام نمٹانا ہے۔''

اس دوران میں لمبا آدمی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا اور وین تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

پروفیسر حبیب اومیگان گھر پہنچا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس نے یورپ میں قیام کے دوران شادی کی تھی اور اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔ بیوی سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ بیٹی شادی کر کے قبرص چلی گئی، اس کا شوہر وہاں بزنس کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس سے ملنے آتی تھی۔ ایک خوب صورت علاقے کی پوش عمارت کے دوسرے فلور پر پروفیسر کا عالی شان اپارٹمنٹ تھا۔ وہ اندر آیا تو اس کی بلی بھوک سے بے تاب ہو رہی تھی۔ اندر گھستے ہی وہ اس کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ پروفیسر مسکرانے لگا۔ ''ایک منٹ ڈولی... ایک منٹ۔''

اس نے کوٹ اتار کر لٹکایا اور اپنا بریف کیس ایک طرف رکھا۔ ڈولی کو کھانا دے کر وہ پہلے کمپیوٹر کی طرف آیا اور اپنی ای میل چیک کیں۔ عثمان کی طرف سے دو عدد ای میلز

آئی تھیں۔ اس نے انہیں کھولا اور ان میں موجود فائلز کو ڈاؤن لوڈ کرنے لگا۔ جب تک فائلز ڈاؤن لوڈ ہوئیں، اس نے اپنے لیے کافی تیار کی۔ کافی لے کر وہ کمپیوٹر کے سامنے آ گیا اور اس نے فائلیں کھولیں۔ اس میں تصویریں تھیں۔ پروفیسر تصویریں دیکھنے لگا، ساتھ ہی وہ کافی پیتا جا رہا تھا۔ کافی ختم کر کے اس نے تمام تصویریں اپنے کمپیوٹر میں ایک جگہ محفوظ کر دیں اور پھر کافی کا مگ دھو کر رکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی بلی ڈولی اچھل کر اس کی گود میں آ گئی اور وہ اسے سہلاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ تصویریں ان مسافروں کی تھیں جو ایک فلائٹ سے انقرہ پہنچے تھے اور امیگریشن کاؤنٹر کے اوپر لگے کیمروں نے اس پرواز کے مسافروں کی تصویریں لی تھی۔

اچانک اپارٹمنٹ کی کال بیل بجی۔ پروفیسر نے اٹھ کر دروازے کے سوراخ سے باہر جھانکا۔ ایک گول چہرے والا معمر شخص کھڑا تھا۔ اس نے قیمتی کوٹ پہن رکھا تھا۔ پروفیسر نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ''یس؟''

''پروفیسر حبیب اومیگان؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''یس۔''

''مجھے پروفیسر ایڈورڈ کہتے ہیں۔'' بوڑھے نے اپنا ہیٹ اتارتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

پورے ایک ہفتے بعد ایاز کو نہانے کا موقع ملا تھا اور وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ گرم پانی اس کی جسمانی کسل مندی دھو رہا تھا۔ امینہ کھانا بنانے میں مصروف تھی کہ کال بیل بجی۔ اس نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''اوگیو۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تو امینہ نے دروازہ کھول دیا۔

''اوگیو تم؟'' امینہ نے کہا۔ یہ وہی وائٹ کیب کے دفتر والا نوجوان تھا۔

''ہاں، آج ایک آدمی تمہارے بارے میں پوچھتا ہوا آیا تھا اور میں نے اسے تمہارا پتا دے دیا تھا۔ اس وقت وہ ٹھیک لگا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں میں نے غلطی نہ کر دی ہو۔ کیا وہ یہاں آیا ہے؟'' اوگیو نے اندر جھانکنے کی کوشش کی تو امینہ جلدی سے اس کے سامنے آ گئی۔

''اوہ... تو یہ تم تھے جس سے اس نے پتا لیا ہے۔'' امینہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہاں، وہ آیا ہے اور فکر کی

کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے یہ بات تم فون پر بھی معلوم کر سکتے تھے... یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''بس میں نے سوچا کہ تمہاری خیریت معلوم کر لوں۔'' اوگیو بدستور اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے یقیناً واش روم میں شاور کی آواز سن لی تھی۔

''ٹھیک ہے معلوم کر لی، اب جاؤ بابے۔'' امینہ نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ چولہے پر اس کا سالن تیار ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے واپس آئی اور چمچہ چلانے لگی۔ ابھی ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ کال بیل دوبارہ بجی۔ امینہ جھنجلا گئی۔ اوگیو ڈھیٹ نوجوان تھا اور کچھ عرصے اس کے پیچھے بھی رہا تھا لیکن جلد اس نے جان لیا کہ امینہ ٹائم پاس کرنے والی لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔ امینہ جھنجلاتی ہوئی دروازے تک آئی اور کھولتے ہوئے بولی۔ ''اب کیا...؟''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ سامنے ایک گنجا اور زرد چشمے والا آدمی تھا اور اس نے امینہ کی گردن کے نیچے ایک پستول رکھ دیا تھا۔ امینہ یک دم ساکت ہو گئی۔ وہ خاموشی سے اندر آیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر امینہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک منٹ بعد ایک لمبا اور پتلے تن والا آدمی اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ زرد چشمے والے نے اسے اشارہ کیا تو وہ دبے قدموں... بیڈروم کی طرف بڑھا۔ شاور سے پانی گرنے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ لمبے آدمی نے واش روم کے دروازے کے پاس پہنچ کر اچانک ہی دروازہ کھولا لیکن واش روم اندر سے خالی تھا اور صرف شاور چل رہا تھا۔ وہ تیزی سے واپس آیا تو اس کی نظر بیڈروم کی کھلی کھڑکی پر گئی۔ بیڈ پر پانی کا نشان تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ کھڑکی کے بالکل ساتھ ایک فولادی سیڑھی عمارت کے نیچے تک جا رہی تھی۔ یہ یقیناً ہنگامی حالت کے لیے مخصوص تھی۔ لمبے آدمی نے اپنا پستول جیکٹ میں رکھا اور تیزی سے سیڑھی پر آیا اور تقریباً پھسلتے ہوئے نیچے گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے قدم زمین پر جمی برف میں تھے۔

زرد چشمے والا لاؤنج سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک دھکا دے کر امینہ کو صوفے پر گرایا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹا اور چپٹا سا لائٹر پین نکالا لیکن جب اس نے اس کا ڈھکن ہٹایا تو اندر پین کی نب کے بجائے سرنج جیسی سوئی تھی۔ اس نے ہاتھ گھما کر سوئی امینہ کی گردن میں اتارنا چاہی۔ اس کی طرف سے زرد چشمے والے کو اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ عام سی لڑکی ہے اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرے گی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لیے جب وہ تڑپ کر ایک طرف ہوئی تو سوئی کی نوک صوفے میں گھس گئی۔ امینہ نے ٹانگ گھمائی جو زرد چشمے والے کی ٹانگوں کے درمیان لگی۔ تکلیف کی شدت سے اس کا منہ کھل گیا۔ وہ دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ امینہ نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو اس نے امینہ کے پیر پر لات ماری۔ وہ اوندھے منہ گری۔ قالین کی وجہ سے بچت ہو گئی ورنہ اس کا منہ زخمی ہو جاتا۔

اب بھی اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ امینہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بائی لائٹر نما سرنج کوئی خطرناک ہتھیار ہے اور ممکن ہے اس سے وہ جان لیوا زہر اس کے جسم میں انجیکٹ کر دے۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ اسے ایسا نہ کرنے دے۔ جیسے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھی، زرد چشمے والے نے اس پر چھلانگ لگائی۔ امینہ بروقت جھکائی دے کر بچ گئی اور وہ اپنے زور میں صوفے پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، امینہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ کسی سے مدد طلب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ ان قاتلوں سے دور رہے۔ وہ اپنی سسکیاں روکتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے جانے لگی۔ عمارت اس وقت سنسان تھی۔ یہاں اکا دکا لوگ رہتے تھے اور رات کے وقت تفریح کے لیے نکل جاتے تھے۔ وہ سب سے نیچے والے حصے میں پہنچی تو اسے دروازے کے شیشے کے پار لمبے آدمی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ حیرت انگیز طور پر یہاں پہنچ گیا تھا۔ امینہ پلٹ کر برابر والی چھوٹی سی راہداری میں گھس گئی جس کے سرے پر عمارت کے منیجر کا دفتر تھا اور اس وقت دفتر بند ہو جاتا تھا۔ گیلری میں داخل ہوتے ہی اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہاں اوتیگو زمین پر ساکت پڑا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے سفید جھاگ نکل رہا تھا۔ امینہ کو دیکھ کر ہی محسوس ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے پھر بھی اس نے لرزتے ہاتھوں سے اوتیگو کی نبض دیکھی۔ وہ مر چکا تھا اس کے پاس سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔ امینہ کو خیال آیا کہ شاید اسے بھی وہی انجکشن لگایا گیا تھا جو زرد چشمے والے نے امینہ کو لگانے کی کوشش کی تھی۔ امینہ اپنی سسکیاں دبا رہی تھی۔ اوتیگو اس کا اچھا دوست تھا اور اسے وائٹ کیب میں ملازمت اسی نے دلوائی تھی۔ اسی لمحے باہر کا دروازہ کھلا اور لمبا آدمی اندر آ گیا۔

جس وقت لمبا آدمی ایاز کی تلاش میں نیچے جا رہا تھا، وہ عمارت کی ترچھی چھت پر تھا۔ کھپریل کی بنی اس چھت پر چڑھنا آسان کام نہیں تھا، اسی وجہ سے لمبے آدمی نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ایاز اوپر جا سکتا ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے نیچے اتر گیا۔ جب وہ شاور میں تھا تب اس نے کال بیل بجتی سنی تھی اور جب دوسری بار کال بیل بجی اور امینہ اچانک بولتے بولتے رک گئی تو اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا۔ کپڑے وہ پہن چکا تھا، اس نے شاور آن کیا اور کھڑکی کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے نیچے جانے کے بجائے چھت کا رخ کیا تھا۔

لمبے آدمی کے جاتے ہی ایاز واپس کنارے تک آیا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا۔ ذرا سی گرفت کمزور پڑتی تو وہ پھسلتا ہوا اس چھ منزلہ عمارت سے نیچے جا گرتا۔ اتنی بلندی سے گر کر اگر وہ بچ جاتا تب بھی اس کی ہڈی پسلی ضرور ٹوٹ جاتی۔ سیڑھی کا سرا تھام کر اس کی جان میں جان آئی اور وہ تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ امینہ کے فلیٹ کی کھڑکی کے پاس آ کر اس نے پہلے سن گن لی۔ اندر خاموشی تھی۔ وہ احتیاط سے اندر آیا۔ بیڈ روم میں کوئی نہیں تھا۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اسے امینہ یا کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ لمبے آدمی کو دیکھ کر اسے پتا چل گیا تھا کہ قاتلوں کی وہی ٹیم اس کے پیچھے تھی اور انہوں نے کسی طرح اس کا سراغ لگا لیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فلیٹ خالی ہے اور شاید وہ لوگ امینہ کو لے گئے ہیں۔

لیکن جیسے ہی اس نے لاؤنج میں قدم رکھا، پردے کے پیچھے چھپے زرد چشمے والے نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے پستول استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے پستول پر سائلنسر نہیں تھا اور وہ شاید یہاں فائر کی آواز نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے چاقو سے کام لیا۔ چاقو اس کے شانے کے پاس سے گزر گیا ورنہ وہ اس کی گردن میں پیوست ہو جاتا۔ زرد چشمے والا جھونک میں آگے آیا تو ایاز نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر اس نے بھی ہاتھ گھما کر ایاز کے منہ پر مارا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ زرد چشمے والے شخص نے سر جھکا کر اس کے پیٹ پر ٹکر ماری اور اسے لیتا ہوا بستر پر آ گرا۔ اس نے ایاز کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کی گردن پکڑ لی اور پوری قوت سے اسے دبانے لگا۔ ایاز کی سانس رکنے لگی اور وہ سانس کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ اس نے زرد چشمے والے کے منہ پر گھونسا مارنے کی کوشش کی لیکن اس کا منہ ذرا دور تھا اور وہ پوری توجہ ایاز کا گلا دبانے پر لگائے ہوئے تھا۔ اس کی کوشش رنگ لائی اور ایاز کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا۔ آکسیجن کی کمی سے اس کا جسم رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زرد چشمے والا غرایا۔

"بڈی... اب تم جلد لاش میں تبدیل ہو جاؤ گے۔"

اسی لمحے امینہ فلیٹ میں داخل ہوئی اور اس نے زرد چشمے والے کو ایاز کے سینے پر سوار دیکھ لیا۔ اوتیگو کی لاش دیکھ

اس کا تو غم و غصے سے برا حال تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اس کی نظر صوفے پر پڑے بائی لائٹر نما سرنج کی طرف گئی، اس نے اسے اٹھایا۔ اس کا نچلا حصہ دبانے سے اس میں سے ہی وہ سوئی کے راستے نکلتی تھی۔ وہ اسے لے کر بے آواز قدموں بیڈ روم میں داخل ہوئی اور ہاتھ بڑھا کر سوئی زرد چشمے والے کی گردن میں پیوست کر دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کھینچ کر سوئی نکالتا، امینہ نے دوا اس کے جسم میں اتار دی اور تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا فوری ردعمل ہوا۔ زرد چشمے والے نے ایاز کا گلا چھوڑ دیا اور گردن میں پیوست سرنج نکال کر اپنا گلا پکڑ لیا۔ اس کا منہ یوں کھلا ہوا تھا جیسے وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ سیدھا ہوا اور پھر پیچھے گر کر ساکت ہو گیا۔ امینہ اسے نظرانداز کرتی ہوئی ایاز کی طرف بڑھی جو اپنا گلا مسلتے ہوئے دیوانہ وار سانس لے رہا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" امینہ نے پوچھا۔

ایاز نے سر ہلایا۔ وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ زرد چشمے والا اب دم توڑ رہا تھا۔ زہر نہایت خطرناک تھا۔ اس نے لمحوں میں اس کی جان لے لی۔ وہ ساکت ہو گیا اور اب اس کے منہ سے ویسا ہی جھاگ نکل رہا تھا جیسا امینہ نے اوتیگو کے منہ سے نکلتے دیکھا تھا۔ اتنی دیر میں ایاز کی سانس بحال ہو گئی تھی۔ اس نے امینہ سے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو... اور اس کا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

امینہ نے اچانک اسے تھپڑ مارا اور پھر رونے لگی۔ ایاز ششدر رہ گیا لیکن پھر اس نے کچھ کہے بغیر تیزی سے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ امینہ اب رو رہی تھی۔ ایاز نے کوٹ پہنا اور اپنی ساری چیزیں اٹھا لیں۔ ایاز نے امینہ کا بازو تھام کر نرمی سے کہا۔ "ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"انہوں نے اوتیگو کو مار دیا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "اس کی لاش نیچے گیلری میں پڑی ہے۔"

"اوتیگو کون ہے؟"

"میرا دوست اور کمیونٹی کا ساتھی ہے۔ اسی نے تمہیں میرا پتا بتایا تھا۔ وہ وائٹ کیب آفس میں کام کرتا تھا۔ اس کی لاش نیچے پڑی ہے۔" امینہ نے کہا۔ ایاز سمجھ گیا کہ اوتیگو نے ہی ان قاتلوں کی یہاں تک رہنمائی کی تھی البتہ قاتل اس تک کیسے پہنچے، وہ یہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ ممکن ہے وہ اس کے تعاقب میں ہوں اور کسی طرح ان کو پتا چل گیا ہو کہ وہ وائٹ کیب کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ وہ اوتیگو کو ساتھ لے آئے اور جب ان کا کام نکل گیا تو انہوں نے اسے مار دیا۔ وہ ایسے ہی سفاک لوگ تھے۔ جس سے کام لیتے تھے، بعد میں اسے بھی مار دیتے تھے تاکہ ان کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ وہ پیشہ ور قاتل لگ رہے تھے اور ان کو پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ آج کے دن سات آٹھ گھنٹوں میں پانچ افراد اپنی جان سے گئے تھے۔

"امینہ! اگر ہم یہاں سے نہیں نکلے تو ہماری لاشیں بھی یہیں پڑی رہ جائیں گی۔" ایاز نے کہتے ہوئے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ عمارت کا عقبی حصہ خالی تھا۔ وہ کھڑکی سے نکل کر سیڑھی پر آ گیا۔ "ہری اَپ۔"

اسی لمحے فلیٹ کے دروازے پر کسی نے ٹکر ماری۔ امینہ لمبے آدمی کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر اوپر آ گئی تھی اور یقیناً وہی اس کے پیچھے آیا تھا۔ دروازہ بند پا کر وہ اسے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امینہ نے لپک کر اپنا پرس اور جیکٹ اٹھائی اور اسے پہنتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی۔ ایاز نے کہا۔ "اب اترنے کا وقت نہیں ہے سیڑھی کا پائپ تھام کر پھسلتے ہوئے نیچے جانا ہوگا۔" ایاز نے کہا اور پھسلتا ہوا نیچے جانے لگا۔ امینہ نے دیکھا اور خود بھی سیڑھی پر آ کر اسی طرح پھسلتے ہوئے نیچے پہنچ گئی۔

جب وہ گھوم کر عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف جا رہے تھے تو عین اسی وقت اوپر کھڑکی سے لمبے آدمی نے جھانک کر دیکھا۔ اس نے پستول سیدھا کیا لیکن اتنی دیر میں ایاز اور امینہ عمارت کے کونے سے مڑ چکے تھے۔ لمبا آدمی پلٹ کر تیزی سے فلیٹ سے نکل گیا۔ اس دوران میں ایاز عمارت کے سامنے پارک گاڑیوں کے دروازے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ان میں سے بیشتر لاک تھیں اور جو کھلی ہوئی تھیں، ان میں چابی نہیں تھی۔ امینہ بار بار عمارت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ لمبا آدمی کسی وقت بھی وہاں آ سکتا ہے۔ وہ مسلح تھا اور کسی طرح زرد چشمے والے شخص سے کم خطرناک نہیں تھا۔

"پلیز! جلدی کرو۔" امینہ نے کہا۔

ایاز نے ایک پرانی سیڈان کار کا دروازہ کھولا اور اگنیشن میں چابی لگی دیکھ کر خوش ہو گیا۔ "جلدی آؤ، اس میں چابی ہے۔"

امینہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ جیسے ہی ایاز نے کار اسٹارٹ کی، لمبا آدمی عمارت سے برآمد ہوا اور انجن کی آواز سنتے ہی اپنی سیاہ وین کی طرف دوڑا۔ امینہ نے کار نکالی اور آگے بڑھا دی۔ سڑک صاف تھی اس لیے اس نے بے فکری سے ایکسلریٹر دبا دیا۔ ایاز عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی سیاہ وین حرکت میں آئی، اس نے امینہ کو مطلع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا۔ ''وہ پیچھے آرہا ہے۔''

''یہ کون لوگ ہیں؟'' امینہ تیز لہجے میں بولی۔ وہ مضبوط اعصاب رکھتی تھی اور اتنی دیر میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''کیا تمہارا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے؟''

''میں صرف ایک سائنٹسٹ ہوں۔'' ایاز نے جواب دیا۔

''تب یہ تمہارے پیچھے کیوں لگے ہیں؟ میرے خدا..... انہوں نے کس طرح ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''میں اس بارے میں اتنا ہی لاعلم ہوں جتنا کہ تم۔'' ایاز نے جواب دیا۔ ''رفتار تیز کرو، وہ قریب آرہا ہے۔''

''یہ پرانی کار ہے، اس سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتی۔'' امینہ اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے بولی۔

سیاہ وین واقعی نزدیک آرہی تھی۔ ایاز جانتا تھا کہ یہ لوگ اسے ہر صورت ختم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ وین سے چھٹکارا حاصل کرنا لازمی تھا۔ سڑک آگے جا کر بائی وے سے مل رہی تھی اور یہاں کئی فلائی اوورز اور زیرِ زمین راستوں کا جال بچھا ہوا تھا جس میں شہر کا ٹریفک بہہ رہا تھا۔ آگے ایک فلائی اوور سے ٹریفک گھوم کر اس سڑک پر آرہا تھا۔ ایاز نے فلائی اوور دیکھا اور امینہ سے کہا۔ ''کار اس طرف گھما دو۔''

''تمہارا دماغ درست ہے؟'' وہ چلائی۔ ''یہ ون وے کے خلاف ہوگا، سامنے سے گاڑیاں آرہی ہیں۔''

''اس سے چھٹکارا پانے کی ایک یہی صورت ہے۔'' ایاز بولا۔ ''کار گھماؤ۔''

مجبوراً امینہ نے کار فلائی اوور کی طرف گھمائی۔ فوراً ہی سامنے سے آنے والی گاڑیوں کے ہارن سے ماحول گونج اٹھا۔ امینہ سامنے سے آتی گاڑیوں کو بچانے کے لیے کار کو لہرا رہی تھی۔ ٹریفک بہت تیز تھا اور کسی وقت بھی حادثہ ہو سکتا تھا۔ ایاز پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

''وہ آرہا ہے۔ شاباش! اسی طرح ڈرائیو کرتی رہو... وہ پھنس جائے گا۔''

ایاز ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ سیاہ وین بڑی تھی اور وہ ون وے ٹریفک کے خلاف آسانی سے نہیں آسکتی تھی۔ امینہ بولی۔ ''میں اسی طرح ڈرائیو کرتی رہی تو جلد ہماری زندگی کا سفر ختم ہو جائے گا... تم ٹریفک دیکھ رہے ہو؟''

امینہ واقعی ماہر ڈرائیور تھی اور اس وقت اپنی پوری مہارت بروئے کار لا رہی تھی۔ سیاہ وین پھنس کر پیچھے رہ گئی تھی۔ ایاز نے سامنے دیکھا۔ فلائی اوور جہاں سے شروع ہو رہا تھا، وہاں سے وہ دوبارہ ٹریفک کے دھارے میں شامل ہو سکتے تھے کیونکہ یہ فلائی اوور صرف راستہ تبدیل کرنے والوں کے لیے تھا۔ ''وہ دیکھو، بس کچھ راستہ رہ گیا ہے۔''

''سیاہ وین کتنی دور ہے؟''

''وہ پیچھے رہ گئی ہے۔ ایک بار ہم فلائی اوور سے نکل گئے تو اس سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔''

چند منٹ بعد وہ فلائی اوور سے نکلے اور بائی وے پر سیدھے ٹریفک میں شامل ہو گئے۔ اس وقت سیاہ وین خاصی پیچھے رہ گئی تھی۔ اس نے ایاز سے پوچھا۔ ''اب کہاں جانا ہے؟''

''یہ تو تم ہی بہتر جانتی ہو۔'' ایاز نے گہری سانس لی۔ ''لیکن کسی ایسی جگہ چلو جہاں میں سکون سے کچھ سوچ سکوں۔''

امینہ نے سر ہلایا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔

☆☆☆

پروفیسر حبیب ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔ اسے لگا جیسے اس نے اس شخص کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ پھر اس نے چونک کر ہاتھ آگے کیا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی پروفیسر... آؤ اندر آؤ۔''

پروفیسر ایڈورڈ اندر آیا۔ اس نے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ ''تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے۔''

''شکریہ۔'' پروفیسر حبیب نے کہا اور اسے نشست گاہ میں لے آیا۔ ''کیا پیش کروں؟''

''شکریہ... فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر ایاز درانی والے معاملے پر بات کرنے آیا ہوں۔ اس نے مجھے الجھا دیا ہے۔''

پروفیسر حبیب نے اسے نظریں جما کر دیکھا۔ ''امریکا سے؟''

''نہیں، اتفاق سے میں ان دنوں یونان آیا تھا اس لیے یہاں آنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔''

''اس معاملے نے مجھے بھی پریشان کر دیا ہے..... بظاہر دوسرا شخص جھوٹا ہے لیکن اس کے انداز میں سچائی بھی محسوس ہوتی ہے۔''

''اس کی وجہ؟''

پروفیسر حبیب نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ''تم میری چھٹی حس کہہ سکتے ہو۔''

پروفیسر ایڈورڈ کچھ دیر خاموش رہا۔ ''میں ڈاکٹر ایاز درانی کو ذاتی طور پر جانتا ہوں، وہ بہت قابل آدمی ہے۔''

''مجھے بھی اس میں شبہ نہیں ہے۔'' پروفیسر حبیب نے کہا۔ ''میری اس سے ای میل پر بات ہوتی رہی ہے اور کل بالمشافہ ملاقات ہوئی ہے۔ میرے خیال میں وہ اپنے شعبے کا ماہر آدمی ہے۔''

''اسی وجہ سے مجھے اس کے بارے میں تشویش ہے۔ کہیں اس کے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی۔''

پروفیسر حبیب نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے دوسرا آدمی شاید کسی مسئلے سے دوچار ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس نے وہی کچھ کہا جو ڈاکٹر ایاز درانی کہہ رہا تھا۔''

''وہ جھوٹا ہوگا۔'' پروفیسر ایڈورڈ نے زور دے کر کہا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن یوں کھول دیے جیسے اسے گرمی لگ رہی ہو۔ اپارٹمنٹ کے اندر کا درجۂ حرارت معتدل تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کی باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ممکن ہے۔'' پروفیسر حبیب کھڑا ہو گیا۔ ''ویسے بھی میں نے معاملہ پولیس کے حوالے کر دیا تھا اور وہ بہتر طور پر تفتیش کریں گے۔ تم چائے پیو گے؟''

پروفیسر ایڈورڈ ہچکچایا پھر اس نے سر ہلا دیا۔ ''بغیر چینی اور دودھ کے۔''

کچن پاس ہی تھا، پروفیسر حبیب کچن میں آیا اور کیتلی میں پانی رکھ دیا اور ایک کیبنٹ سے چائے کے دوسرے لوازمات نکالنے لگا۔ سامان نکال کر اس نے شیلف پر رکھا اور دبے قدموں لاؤنج کی طرف آیا، تب اس نے پروفیسر ایڈورڈ کو اپنے کمپیوٹر پر جھکے دیکھا۔ وہ کی بورڈ کے بٹن دبا رہا تھا۔ پروفیسر حبیب کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر وہ واپس آیا اور اس نے کپ بورڈ میں رکھا ایک ڈبا نکالا اور اس میں موجود ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا۔ پروفیسر ایڈورڈ کمپیوٹر کا معائنہ کر چکا تھا اور اس وقت نشست گاہ میں لگی تصویروں اور دوسری چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پکار کر کہا۔ ''تم بوسنیا میں بھی رہے ہو؟''

''ہاں، جنگ کے بعد میں نے وہاں کچھ عرصے کام کیا ہے۔''

''تمہارا جنگ سے بھی تعلق رہا ہے؟''

''بہت مختصر سا۔'' پروفیسر حبیب نے جواب دیا۔ ''اصل میں، میں جنگ کے دوران ہی بعض آزاد ہو جانے والے علاقوں میں زراعت کی بحالی کے لیے کام کر رہا تھا۔''

''ایک تصویر میں تم ایک گروپ کے ساتھ نظر آرہے ہو۔ ان میں کئی افراد مجھے جانے پہچانے لگ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ جنگ کے دوران بوسنیا کے مسلمانوں کو اسلحہ اور رقم پہنچاتے رہے ہیں۔''

پروفیسر حبیب دو کپ چائے تیار کر کے نشست گاہ میں لے آیا اور پروفیسر کو اس کا کپ تھما دیا۔ ''تمہارا خیال ہے، میں اس گروپ کا ایک حصہ تھا؟''

''اس کا امکان ہے۔''

پروفیسر حبیب نے اپنی چائے میز پر رکھی اور پھر پڑیا کھول کر اس میں موجود سفوف اپنی چائے میں ڈال لیا۔ اس نے ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''اگر تھا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

پروفیسر ایڈورڈ کی آنکھوں میں سختی آگئی۔ ''فرق تو پڑتا ہے... بعض معاملات میں۔''

''جیسے ڈاکٹر درانی والا معاملہ؟'' پروفیسر حبیب کا لہجہ سوالیہ تھا۔ اس نے ایک اور گھونٹ لیا اور کپ میز پر رکھ دیا۔ ''بہرحال، اب مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

پروفیسر ایڈورڈ نے اپنا کپ رکھ دیا..... اس کا ہاتھ اپنے اوورکوٹ کے اندر کی طرف گیا تھا کہ پروفیسر حبیب لڑکھڑا کر قالین پر گر گیا۔ ایڈورڈ کا ہاتھ رک گیا اور وہ تیزی سے اس کے پاس پہنچا۔ پروفیسر حبیب کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے منہ سے کڑوے بادام جیسی بو آرہی تھی۔ ''سائنائڈ۔'' ایڈورڈ نے آہستہ سے کہا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں سمجھتا تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا جب مجھے اس کی ضرورت پڑے گی۔'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''میں کسی کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے... اس لیے...'' پروفیسر حبیب کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس کے جسم نے جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا۔ ایڈورڈ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر کے اپارٹمنٹ سے نکلنے سے پہلے اس نے ان تمام جگہوں کو صاف کر دیا جہاں اس کے ہاتھ لگے تھے۔ پھر اس نے کمپیوٹر آن کر کے اس سے وہ تصویریں اڑائیں جو پروفیسر حبیب نے محفوظ کی تھیں۔ وہ تصویریں دیکھتے ہی اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن پروفیسر نے اس سے پہلے ہی خودکشی کر کے اس کا کام آسان کر دیا۔ اس نے پروفیسر کی لاش کو آرام کرسی پر ڈالا اور جاتے ہوئے دروازہ لاک کرنا نہیں بھولا۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امینہ نے گاڑی ایک نائٹ کلب کے سامنے روکی اور اتر کر اندر کی طرف بڑھی۔ ایاز اس کے ساتھ تھا۔ جیسے ہی وہ داخلی دروازے تک پہنچا، ایک تنومند آدمی نے اس کا راستہ روک لیا لیکن امینہ نے آگے بڑھ کر اس کے کان میں کچھ کہا تو اس نے فوراً راستہ چھوڑ دیا۔ ایاز اور امینہ اندر آ گئے۔ ایک راہداری سے گزر کر وہ ایک ہال تک پہنچے جہاں میوزک کا بے پناہ شور تھا اور ناچنے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ انہیں آگے آنے کے لیے باقاعدہ راستہ بنانا پڑ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ بار والے حصے میں آئے اور ایک کونے کی میز منتخب کی۔ اندر آ کر ایاز نے سکون کا سانس لیا کیونکہ باہر وہ صرف سوٹ میں ٹھٹھر رہا تھا۔ برف باری کے آغاز سے پہلے ہی سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ امینہ نے پوچھا۔

”کیا لو گے؟“

”بلیک کافی۔“

”تم بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔“ امینہ اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ یہاں میوزک کا شور کسی قدر کم تھا۔ چند لمحے بعد ایک عورت اس کے سامنے کافی رکھ گئی۔ ایاز نے کپ اٹھا لیا۔ گرم اور تلخ کافی نے اسے سکون دیا اور اب وہ بہتر طور پر سوچنے کے قابل ہوا تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں جو واقعات پیش آئے تھے انہوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا ماضی اس طرح نہیں تھا جس طرح اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی ایسی بات تھی جس کے نتیجے میں کچھ لوگ پاگل کتوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ گئے تھے اور اسے ہر قیمت پر مار ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ حقیقت تک پہنچنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس کے سامنے ایک ہی ہستی تھی۔ وہ ہیلن تھی۔ ہیلن ہی اسے بتا سکتی تھی کہ یہ کیا چکر ہے اور اس کا ماضی اصل میں کیا تھا۔

”یہ لو۔“ امینہ نے اچانک ہی ایک شاپر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا وہ کب وہاں آئی تھی۔ اس نے شاپر کی طرف دیکھا۔

”اس میں کیا ہے؟“

”تمہارا دوسرا لباس.... اور کچھ اور چیزیں ہیں جن سے تم اپنا حلیہ بدل سکتے ہو۔“

کپڑے اور دوسری چیزیں استعمال شدہ لگ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ امینہ اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہے اور یہاں کے لوگ بھی اس سے واقف ہیں۔ ایاز نے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”ہم ایک کمیونٹی ہیں۔ یہ سب میرے جانے پہچانے لوگ ہیں۔“

”اوڈیگو بھی تمہاری کمیونٹی سے تھا؟“

امینہ افسردہ ہو گئی۔ ”ہاں، وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ شروع میں اس نے مجھے تنگ کیا تھا لیکن پھر وہ میری فطرت سمجھ گیا۔“

”مجھے اس کی موت کا افسوس ہے۔“ ایاز نے کہا۔ ”لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ قاتلوں نے کسی طرح اسے ٹریپ کر لیا تھا اور وہی ان کو تمہارے فلیٹ تک لایا تھا۔“

”یہ سامنے کی بات ہے۔“ امینہ بولی۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”میں نے سوچ لیا ہے ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”ہمیں۔“ امینہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں اب تمہارے ساتھ نہیں ہوں، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے گھر واپس جانا ہوگا۔“

ایاز مضطرب ہو گیا۔ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تم گھر واپس نہیں جا سکتیں... وہاں جو ہوا ہے، اس کے بعد تم وہاں کیسے جا سکتی ہو؟ وہاں خطرہ ہے۔“

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے تو میں پولیس سے کیوں ڈروں؟“

”میں پولیس کی نہیں، ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔“ ایاز بولا۔ ”وہ دوبارہ آ سکتے ہیں۔ امینہ! تمہارا وہاں جانا کسی صورت ٹھیک نہیں ہے اور دوسرے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں ادائیگی کروں گا۔“ ایاز نے کہتے ہوئے اپنے پرس میں موجود ڈالرز نکالے اور ان میں سے ہزار ڈالرز الگ کر کے امینہ کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ امینہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تو اس نے التجا کی۔ ”پلیز.... یہ تمہارا احسان ہوگا۔“

امینہ نے گہری سانس لی اور رقم اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے، مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

”میں ہیلن سے ملنا چاہتا ہوں اور تم اسے راضی کرو گی۔“

”ہیلن؟“ امینہ چونکی۔ ”میں اسے بالکل نہیں جانتی پھر وہ میری بات کس طرح مان لے گی؟“

”تم اسے میرا حوالہ دو گی۔ مجھے امید ہے کہ میرے بارے میں سن کر وہ مان جائے گی۔“

امینہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی۔ تم یہاں واش روم میں کپڑے بدل لو اور اپنا سوٹ اسی شاپر میں ڈال کر مجھے لا دو۔“

ایاز واش روم میں آیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے دیکھے۔ یہ اونی ٹراؤزر اور گرم جرسی کے ساتھ لیدر جیکٹ تھی۔ اس کے ساتھ موٹے دستانے اور ایک گول اونی ٹوپی تھی۔ یہ تمام چیزیں اسے سردی سے بچانے کے لیے کافی تھیں۔ وہ باہر آیا، امینہ انتظار کر رہی تھی۔ ایاز نے شاپر اس کے حوالے کر دیا۔ ”اس کے بدلے رقم دینی ہے؟“

”نہیں، یہ سوٹ کافی ہے۔ اچھا قیمتی سوٹ ہے اور رقم تمہیں دینا پڑے گی۔“ اس نے تنقیدی نظروں سے ایاز کا جائزہ لیا۔ ”اب تم بہت مختلف لگ رہے ہو۔“

امینہ کے جانے کے بعد ایاز نے ایک طرف لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ وہ واقعی بہت مختلف لگ رہا تھا۔ اس نے کبھی اس قسم کا لباس نہیں پہنا تھا۔ امینہ ایک منٹ بعد واپس آئی اور اس نے ایاز کا بازو تھاما اور باہر آ گئی۔ انہیں ایک بار پھر موسیقی پر پاگلوں کی طرح ناچنے والوں کے ہجوم سے گزرنا پڑا۔ ایاز نے اندازہ لگایا کہ وہاں منشیات کا دھندا بھی جاری تھا۔ وہ کار میں بیٹھے تو امینہ نے کہا۔ ”ہیلن تمہیں پہچاننے سے انکار کر چکی ہے۔ اس کا مطلب ہے، وہ بھی قاتلوں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔“

”امکان بھی ہے۔“

”اس صورت میں اسے ملاقات کے لیے بلانے کا مطلب خودکشی بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں لیکن میں ایک چانس لینا چاہتا ہوں۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہیلن میرے لیے کچھ نہ کچھ ہمدردی رکھتی ہے۔“

”میں اس سے کیسے ملاقات کروں گی؟“

ایاز نے سوچا اور کہا۔ ”ہوٹل کے ساتھ ایک ہال میں تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے۔ تم ہیلن سے نمائش کی ایجنٹ بن کر مل سکتی ہو اور موقع پا کر اسے میرے بارے میں بتا سکتی ہو۔ پھر اسے ہال میں آنے پر راضی کرنا ہوگا۔“

”کیا وہ مان جائے گی؟“

”ممکن ہے۔“ ایاز نے امید سے کہا۔ ”اگر وہ مان گئی تو میں اس سے معلوم کر سکتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔“

”اور اس نے انکار کر دیا تو؟“

”اس کا امکان ہے۔“ ایاز کسی قدر جھنجلا گیا۔ ”میں تم سے ایک بار کوشش کرنے کا کہہ رہا ہوں کامیابی یا ناکامی مقدر کے ہاتھ میں ہے۔“

امینہ نے سر ہلایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ ”نہ جانے یہ کس کی کار ہے؟ خاصی پرانی ہے لیکن اس کا انجن اور ٹائر بہت اچھی حالت میں ہیں، اسی وجہ سے آج ہماری جان بچی۔ حادثہ بھی ہوتے ہوتے رہ گیا جب میں فلائی اوور پر ون وے کے خلاف جا رہی تھی۔“

”لیکن مجھے یقین تھا کہ حادثہ نہیں ہوگا کیونکہ تم بہت اچھی ڈرائیور ہو۔“ ایاز مسکرایا۔ ”مجھے امید ہے کہ یہ کار جس کی بھی ہے، وہ اتنی جلدی پولیس میں اس کی چوری کی رپورٹ نہیں لکھوائے گا۔“

آدھے گھنٹے بعد وہ پاک پیلس ہوٹل کے سامنے تھے۔ امینہ نے کار پارکنگ میں ایسی جگہ روکی جہاں وہ نمایاں نظر نہ آئے۔ اس نے ایاز سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم یہیں رکو، میں اندر جاتی ہوں۔ اگر ہیلن مجھے اکیلے میں مل گئی تو اس میں اس سے بات کروں گی۔“

”ہوشیار رہنا، ممکن ہے فلیٹ میں آنے والا دوسرا فرد بھی یہیں کہیں ہو۔“ ایاز نے اسے خبردار کیا۔ امینہ سر ہلاتی ہوئی ہوٹل کی طرف بڑھ گئی۔ ایاز کار کی تاریکی میں اکیلا رہ گیا۔ اس نے ہیلن کے بارے میں سوچا تو اس کے ذہن میں ادھوری جھلکیاں نمودار ہوئیں۔ وہ ایک دیوار کے سامنے بیٹھا تھا اور دیوار میں خلا تھا۔ خلا کے دوسری طرف کچھ تھا لیکن وہ دیکھ نہیں سکا پھر اس نے ایک تختہ اٹھا کر اس خلا پر لگایا اور اسکرو ڈرائیور سے اسے کسنے لگا۔ اسے احساس تھا کہ ہیلن اس کے عقب میں موجود ہے۔ وہ اس سے پوچھتی ہے کہ کام ہو گیا اور وہ جواب دیتا ہے کہ ہاں اب ہو گیا ہے۔

ایاز چونکا۔ اس کے ذہن میں یہی منظر بار بار کیوں آتا تھا؟ امینہ کو اندر گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ شاید پندرہ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ایاز مضطرب ہو کر کار سے نکل آیا اور ہوٹل کی عمارت کی طرف بڑھا۔ نیچے کا حصہ لابی اور اس سے ملحق ڈائننگ ہال پر مشتمل تھا اور بڑی کھڑکیوں کے پاس میزوں کے گرد بیٹھے لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔ ایاز چونکا، ایک کھڑکی سے ملحق ایاز درانی نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا اور وہ دونوں آپس میں بات کر رہے تھے۔ دوسرا آدمی ایاز کو دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس کی پشت ایاز کی طرف تھی اور اس نے اوور کوٹ کے ساتھ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ہیلن اس کے ساتھ نہیں تھی، اس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں اور تھی اور امکان تھا کہ وہ امینہ کے ساتھ باہر آ جائے گی۔ ایاز کی بے تاب نظریں ہوٹل کے داخلی دروازے پر مرکوز ہو گئیں۔

نمائش والا ہال ہوٹل کا ایک حصہ تھا لیکن اسے الگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھلک رکھا گیا تھا۔ یعنی ہال اور ہوٹل میں آنے جانے کا کوئی براہ راست راستہ نہیں تھا یا اگر تھا تو اسے عام لوگوں کے لیے بند رکھا گیا تھا۔ چند منٹ بعد دو خواتین ہوٹل سے باہر آ گئیں۔ ایاز کی آنکھوں میں جان آ گئی۔ اس نے ہیلن کو پہچان لیا۔ حالانکہ اس نے ہیئر اسٹائل بدل لیا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے لباس میں تھی جس پر جھلملاتے تارے سے لگے تھے۔ اوپر اس نے چھوٹا سا فر کوٹ لیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ امینہ تھی۔ دونوں نمائش والے ہال کی طرف جانے لگیں۔ ایاز پارکنگ کے تاریک گوشوں سے ہوتا ہوا ہال کے سامنے پہنچا اور اس نے تیزی سے سڑک پار کی اور ہال میں داخل ہو گیا۔ یہاں تصویروں اور مجسموں کی صورت میں فن پارے رکھے تھے اور کیونکہ یہ عام اور نئے فن کاروں کے تھے اس لیے سیکیورٹی نہ ہونے کے برابر تھی۔ نمائش عام تھی اس لیے ایاز کو کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ اندر آیا تو اسے ہیلن یا امینہ کہیں نظر نہیں آئیں۔ وہ ان کی تلاش میں ہال میں منڈلانے لگا۔ ہال میں جا بجا مصنوعی دیواریں کھڑی کر کے ان پر تصاویر اور مجسموں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لوگ ان دیواروں کے درمیان گھومتے پھرتے نمائش دیکھ رہے تھے۔ امینہ اور ہیلن بھی یہیں کہیں تھیں۔ ایاز سست روی سے چل رہا تھا کہ اس نے لمبے آدمی کو دیکھ لیا۔ خوش قسمتی سے وہ آگے تھا اور اس نے ایاز کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ یقیناً ایاز کے لیے ہی وہاں آیا تھا۔ ایاز جلدی سے ایک دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ لمبے آدمی کی یہاں موجودگی کا مطلب تھا کہ ان لوگوں کو ایاز کی یہاں موجودگی کا علم ہو گیا ہے اور ممکنہ طور پر ہیلن نے راز افشا کر دیا تھا۔ ایاز کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا ہیلن مکمل طور پر ان قاتلوں سے ملی ہوئی تھی؟ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ شاید ہیلن کسی مجبوری کی وجہ سے ان لوگوں کا ساتھ دے رہی تھی۔

اچانک کسی نے عقب سے اس کا بازو تھاما تو وہ بھڑک گیا۔ "آرام سے۔" امینہ نے سرگوشی کی۔ "یہ میں ہوں۔"

"ہیلن کہاں ہے؟" ایاز نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"وہ اس طرف ہے۔" امینہ نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں وہی لمبا آدمی بھی ہے۔"

"اسے کیسے پتا چلا؟"

"میں کہہ نہیں سکتی لیکن شاید یہ لوگ ہیلن پر بھی اعتبار نہیں کرتے اور اس کی خفیہ نگرانی جاری ہے کیونکہ ہیلن نے میرے سامنے تو کسی سے رابطہ کیا اور نہ اشارہ کیا۔"

"کیا میرا نام سن کر وہ ملنے کے لیے تیار ہو گئی تھی؟"

"اتنی آسانی سے نہیں۔" امینہ بولی۔ "وقت کم ہے۔ بہتر ہے تم اس سے مل لو ورنہ وہ واپس چلی جائے گی۔"

ایاز نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے تم یہیں رکو... اگر میں کسی وجہ سے پھنس جاؤں تو تم نکل جانا۔"

امینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایاز آگے بڑھ گیا۔ اس نے لمبے آدمی کو نظروں میں رکھا تھا اور اس سے دور حرکت کر رہا تھا۔ بالآخر وہ اس حصے میں پہنچا جہاں ہیلن موجود تھی۔ پہلے وہ اسے نظر نہیں آئی۔ پھر اسے ایک دیوار کے ساتھ سیاہ لباس کی جھلک نظر آئی۔ وہ اس طرف بڑھا۔ ہیلن زرد چہرے کے ساتھ دیوار کے پیچھے رکھے مجسمے کے ساتھ خود بھی مجسمہ لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔

"ہیلن۔" ایاز نے بے تابی سے اس کا بازو تھام لیا۔

"ایاز! تم کیا کر رہے ہو؟" وہ سرگوشی میں بولی۔ "تم پلان کے بالکل مخالف سمت میں جا رہے ہو۔ تمہیں معلوم تھا کہ کس صورت حال میں کیا کرنا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تمہیں اب تک واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ استنبول ائرپورٹ کے امریکن ایکسپریس میں تمہارے لیے ایک پارسل موجود ہے۔ اس پر تمہاری تصویر لگی ہے اور تم حوالے دے کر اسے حاصل کر سکتے ہو۔"

"ایک منٹ ہیلن... تم کیا کہہ رہی ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟ یہ کیا چکر ہے... کیا ہم وہ لوگ نہیں ہیں جو... بظاہر نظر آتے ہیں؟"

ہیلن کے چہرے کی زردی مزید بڑھ گئی۔ "تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"تم جانتی ہو... ہوش میں آنے کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں ڈاکٹر ایاز درانی ہوں اور تم میری بیوی ہیلن ہو۔"

ہیلن یہ سن کر مضطرب ہو گئی۔ "ایاز! خدا کے لیے یہاں سے نکل جاؤ۔"

"لیکن کیوں اور کیسے نکل جاؤں؟ ہیلن! یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"یہ سب ہمارے پلان کا حصہ ہے۔" ہیلن بولی۔ اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ "تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکتی۔ اس سے پہلے کہ میری غیر موجودگی محسوس کی جائے، مجھے جانا ہوگا۔"

"تمہاری یہاں موجودگی ان کے علم میں ہے۔ ایک لمبا اور بوڑھا آدمی تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔"

ہیلن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "میرے خدا۔"

ہیلن وہاں سے جانے لگی تو ایاز نے اس کا بازو تھام لیا۔ "ہیلن! ایک منٹ... میرے صرف ایک سوال کا جواب دے دو۔ کیا ہم میاں بیوی نہیں ہیں؟"

ہیلن نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نمی جھلملا رہی تھی۔ اس نے ذرا اچک کر ایاز کو پیار کیا اور بولی۔ "نہیں۔"

"تب کیا ہم آپس میں محبت کرتے ہیں؟"

"تم نہیں کرتے۔" ہیلن نے کہا اور پلٹ کر جانے لگی۔

ایاز خاموشی سے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ یہ خاموشی ہیلن کے ایک لفظ "نہیں" کے ساتھ اس کے اندر اتر آئی تھی۔ دوسرے سوال کا جواب واضح تھا۔ وہ ہیلن سے محبت نہیں کرتا تھا لیکن وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ امینہ اس کے پاس آئی اور اس کا بازو تھام کر کہا۔ "ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔"

ہال میں اور آس پاس ایاز کی جان کے دشمن گھوم رہے تھے۔ ہیلن سے ملاقات سے صورت حال کسی قدر واضح ہو گئی تھی۔ اس کا ماضی ویسا نہیں تھا جیسا کہ اسے یاد آ رہا تھا۔ اس میں گڑبڑ بہت زیادہ تھی لیکن اس کی اپنی شخصیت ابھی تک تاریکی میں تھی اور ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی ناواقف تھا کہ ترکی اور استنبول میں ان کی موجودگی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ وہ امینہ کے ساتھ باہر نکل رہا تھا کہ ہال کے داخلی حصے میں اسے ایک بڑا سا پوسٹر دکھائی دیا۔ اس پر تین افراد کی تصویریں بنی تھیں۔ انہوں نے ہاتھ میں مکئی کے سبز پودے تھام رکھے تھے اور نیچے لکھا تھا۔

"خوراک سب کے لیے۔"

تینوں افراد ڈاکٹر سلطان اکمل، نور پاشا اور حمید الغزالی تھے۔ پوسٹر کے مطابق آج رات یہ تینوں افراد ہوٹل کی ایک تقریب میں دنیا والوں کے لیے نہایت اہم اعلان کرنے جا رہے تھے۔ ایاز پوسٹر دیکھ کر رک گیا۔ امینہ وہاں سے نکلنے کے لیے بے تاب تھی۔ اس نے کہا۔ "پلیز... یہاں خطرہ ہے۔"

"یہ تینوں کون ہیں؟ تم انہیں جانتی ہو؟" اس نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ اسے لگا کہ یہ تینوں اس کی یادوں میں شامل ہیں۔

"میں انہیں نہیں جانتی۔" امینہ نے کہا۔ "میرے خدا... لمبا آدمی اسی طرف آ رہا ہے۔"

ایاز کو ہوش آ گیا اور وہ تیزی سے باہر نکلے۔ انہوں نے عجلت میں سڑک کراس کی اور پارکنگ میں آ گئے۔ یہاں آتے ہی امینہ نے ایاز کو ایک گاڑی کی آڑ میں کھینچ لیا۔ اسی لمحے لمبا آدمی ہال سے نمودار ہوا اور آس پاس نظر دوڑانے لگا۔ یقیناً اسے ایاز اور امینہ کی تلاش تھی۔ شاید اس نے ان کی جھلک دیکھ لی تھی لیکن انہیں پارکنگ میں داخل ہوتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ امینہ نے کار دور پارک کر کے اچھا کام کیا تھا ورنہ وہ ان کی چرائی ہوئی کار دیکھ لیتا تو ممکن ہے اسے شناخت کر لیتا، تب اسے یقین ہو جاتا کہ وہ یہیں ہیں۔ ابھی تو اسے صرف شک تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

ہیلن سے ملاقات نے ایاز کے ذہن کے کئی دریچوں کو کھول دیا تھا اور اب وہ اپنا ماضی یاد کرنے کی پہلے سے زیادہ کوشش کر رہا تھا۔ اب اسے ایک راستہ تو نظر آیا تھا، ائرپورٹ پر امریکن ایکسپریس میں ایک پارسل اس کا منتظر تھا۔ یقیناً اس پارسل سے اسے اپنے بارے میں جاننے میں مدد ملتی۔ اس نے امینہ سے کہا۔ "ہمیں استنبول ائرپورٹ جانا ہوگا۔"

"ائرپورٹ؟" وہ چونکی۔ "کیا ہم کہیں اور جا رہے ہیں؟"

"نہیں، وہاں امریکن ایکسپریس میں میرے لیے ایک پارسل ہے۔"

"تمہاری ہیلن سے کیا بات ہوئی ہے؟" امینہ نے پوچھا تو اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

ایاز چونکا۔ "تم نے ہمیں دیکھا تھا؟"

امینہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ "ہاں... کیا وہ واقعی تمہاری بیوی ہے؟"

ایاز ہچکچایا پھر اس نے سچ بولا۔ "نہیں۔"

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" امینہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "وہ تمہاری ساتھی ہو سکتی ہے لیکن بیوی نہیں۔"

"تم نے کیسے جانا؟"

"کوئی بیوی اپنے شوہر کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اگر میرے شوہر کا کوئی دشمن ہو تو میں مر تو سکتی ہوں لیکن اپنے شوہر کے خلاف اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔"

ایاز مسکرایا۔ "یہ تو تم اپنے نقطۂ نظر سے سوچ رہی ہو۔ ممکن ہے ہیلن کا نقطۂ نظر الگ ہو۔"

"یقیناً الگ ہے۔" امینہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ یہ لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے ہیلن ناپسند ہے۔ "یقیناً تم دونوں کے درمیان تعلق رہا ہے اور وہ اسے نظر انداز کر کے تمہارے دشمنوں کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معمول سپاٹ تھا۔ اس نے ہیلن کی طرف دیکھا۔ ”تم آرٹ ہال میں کیا کرنے گئی تھیں؟“

”ایسے ہی ٹائم پاس کرنے۔“ اس نے گھبرائے بغیر کہا۔ ”یہاں سب ٹھیک چل رہا ہے۔“

”سب ٹھیک نہیں ہے۔“ پروفیسر سرد لہجے میں بولا۔ ”ایاز نے مسئلہ کردیا ہے۔ وہ دو بار میرے آدمیوں کے ہاتھ سے آکر نکل چکا ہے۔ میرے دو آدمی مارے جاچکے ہیں۔ اس لیے سب ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں مشن کے حوالے سے بات کررہی ہوں۔“ ہیلن بولی۔ ”میرے خیال میں سب ٹھیک ہے اور کچھ دیر میں ہمارا مشن مکمل ہوجائے گا۔“

”اسی میں سب کی عافیت ہے۔“ پروفیسر نے خطرناک لہجے میں کہا۔ ”ناکامی کا مطلب موت بھی ہوسکتا ہے۔“

پروفیسر کی بات سن کر نقلی ایاز اور ہیلن کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ نقلی ایاز نے جلدی سے کہا۔ ”جناب! آپ بے فکر رہیں، سب کچھ پلان کے مطابق چل رہا ہے۔ جہاں تک ایاز کا تعلق ہے تو اسے کچھ یاد نہیں ہے۔“

”ممکن ہے اسے یاد ہو اور وہ ہمیں دھوکا دے رہا ہو۔“ لمبا آدمی بولا۔

”اس صورت میں اسے پولیس کو صرف ایک فون کال کرنی پڑتی اور ہم سب پکڑے جاتے۔“ نقلی ایاز نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں اس سے دو بار مل چکا ہوں اور مجھے یقین ہے اسے کچھ یاد نہیں ہے۔“

”لیکن یاد آ بھی سکتا ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”ہمیں بہرصورت اسے روکنا ہوگا۔ ڈین اور کائل کے مارے جانے کے بعد میرے پاس صرف شارپ رہ گیا ہے۔“ پروفیسر نے لمبے آدمی کی طرف دیکھا۔ شارپ اسی کا نام تھا۔ ”ریزرو میں صرف جوزف ہے لیکن وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ بہرحال میں نے اسے بلالیا ہے۔“

”میرے خدا!“ ہیلن بے ساختہ بولی۔ ”ڈین اور کائل کیسے مارے گئے؟“

پروفیسر نے سرد نظروں سے ہیلن کی طرف دیکھا۔ ”ایاز کو مارنے کی کوشش میں۔“

نقلی ایاز نے گھڑی دیکھی۔ ”وقت ہوگیا ہے، ہمیں تیار ہونا ہے۔“

پروفیسر نے سر ہلایا۔ ”میں اور شارپ جارہے ہیں، امید ہے جلد مجھے یہاں سے مشن کی کامیابی کی اطلاع ملے گی۔“

پروفیسر اور شارپ نیچے کی طرف روانہ ہوگئے جبکہ ہیلن اور نقلی ایاز اوپر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ جس وقت پروفیسر اور شارپ ہوٹل سے نکلے تو وہاں لوگوں اور میڈیا کا ایک چھوٹا سا ہجوم موجود تھا اور ان کی وجہ سے کوپاک پلیس ہوٹل کے سامنے اس وقت رونق تھی۔ میڈیا اور شہر کے معززین داخلی دروازے کے سامنے جمع تھے۔ پریس اور ٹی وی چینلز کے نمائندے اس موقع کی کوریج کے لیے وہاں موجود تھے۔ بعض چینل براہ راست نشریات دکھا رہے تھے۔ پھر ایک لمبی کار آکر رکی اور اس سے حمید الغزالی نمودار ہوا۔ شرکاء نے زوردار تالیوں سے اس کا استقبال کیا اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا اپنی فرنچ گرل فرینڈ کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اس کے چار چوکنے اور تربیت یافتہ محافظ اس کے ساتھ تھے۔ پانچ منٹ کے وقفے سے دوسری گاڑی آکر رکی اور اس سے نور پاشا باہر نکلا۔ اس بار لوگوں کا انداز زیادہ پُرجوش تھا۔ نور پاشا مقامی بزنس مین اور ترکی کا مخیر شخص تھا اس لیے لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ اس کی آمد کے پانچ منٹ بعد تیسری گاڑی آئی اور اس سے ڈاکٹر سلطان اکمل، ثانیہ اور ان کے تینوں بچے اترے۔ ہجوم نے اس بار بھی گرم جوشی سے تالیاں بجائیں اور وہ اندر چلے گئے۔ کچھ دور پارکنگ میں سیاہ وین میں موجود پروفیسر ایڈورڈ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جب لوگ منتشر ہونے لگے تو اس نے شارپ کو روانگی کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

عین اس وقت ہوٹل کے ایک کمرے میں ہیلن اور نقلی ایاز تیاری کررہے تھے۔ ہیلن کسی قدر پریشان تھی۔ جب وہ ٹیرس سے واپس کمرے میں آئے تو نقلی ایاز اس سے بہت سختی سے پیش آیا تھا۔ ہیلن نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی کہ وہ اس سے کسی طرح کم نہیں ہے تو اس نے ہیلن کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ ”تمہیں اپنی اوقات یاد رکھنی چاہیے۔“ وہ زہریلے انداز میں بولا۔ ”جب تمہیں معلوم ہے کہ یہ مشن کا آخری مرحلہ ہے تو تم نے ایسی بے احتیاطی کیوں کی۔ تم نمائش میں کیا کرنے گئی تھیں؟“

ہیلن ششدر رہ گئی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اب اس کی واقعی پہلے جیسی حیثیت نہیں ہے ورنہ وہ کبھی اسے تھپڑ مارنے کی جرأت نہ کرتا۔ وہ اپنی توہین پی گئی۔ اس نے سنبھل کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”سوری، مجھے واقعی خیال نہیں رہا۔ میں سمجھی کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ اسے گھور رہا تھا۔ ”کیا نمائش میں تمہیں کوئی جانا پہچانا آدمی نظر آیا؟“

”نہیں۔“ ہیلن نے نفی میں سر ہلایا اور موتیوں کا ہار اپنی شفاف گردن میں پہننے لگی۔ وہ دونوں تقریباً تیار ہوچکے تھے۔ ایاز بنے شخص نے گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی سے پردہ ہٹا کر نیچے جھانکا۔ ”وہ لوگ آگئے ہیں۔“

”ہاں، وقت ہوگیا ہے۔“ ہیلن نے کہا اور بستر پر پڑا ہوا لیپ ٹاپ کھول کر اسے آن کیا اور کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگی۔ اپنا کام مکمل کرکے اس نے لیپ ٹاپ بند کرکے اسے بستر پر ہی ڈال دیا اور کھڑی ہوگئی۔ ایک منٹ بعد وہ دونوں باہر نکل آئے۔ ہیلن نے الیکٹرانک کارڈ سے دروازہ لاک کرکے کارڈ اپنے پاس رکھ لیا۔ کچھ لمحے بعد وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر تقریب والے ہال تک پہنچے۔ واک تھرو پر انہیں تقریب میں شرکت کے لیے دعوت نامہ دکھانا پڑا۔ تقریب والے ہال میں کوئی شخص دعوت نامہ دکھائے بغیر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

اس وسیع و عریض اور خوب صورت ہال میں کم و بیش کوئی دو سو افراد کی گنجائش تھی اور ہال اس وقت مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ حمید الغزالی آچکا تھا اور جب ہیلن اور ایاز بنا ہوا شخص وہاں پہنچے تو ایک منٹ بعد نور پاشا بھی آگیا۔ پھر ڈاکٹر سلطان اکمل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آن پہنچا۔ نقلی ایاز اور ہیلن اس کی طرف بڑھے۔ انہوں نے سلطان سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ”ڈاکٹر اکمل! میں ڈاکٹر ایاز درانی ہوں اور یہ میری وائف ہیلن ہے۔“

”نائس ٹو میٹ یو۔“ ڈاکٹر سلطان اکمل مسکرایا۔ ”میرے ہم وطن لیکن تمہارا لہجہ بالکل امریکی ہے۔“

”شاید اس لیے کہ مجھے ملک سے نکلے ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔“ نقلی ایاز مسکرایا۔ ”تم نے ایک شان دار کارنامہ انجام دیا ہے۔“

”اصل کارنامہ تو جناب نور پاشا اور جناب حمید الغزالی نے انجام دیا ہے۔“ ڈاکٹر سلطان نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سب ان کی کاوش ہے۔“

”نہیں ڈاکٹر، اگر تم گنے کی یہ قسم ایجاد نہ کرتے تو یہ دونوں صاحبان کچھ نہیں کرسکتے تھے اس لیے اصل آدمی تم ہی ہو۔“

ہیلن، ثانیہ اور بچوں کو لے کر اندر کی طرف بڑھ گئی جبکہ نقلی ایاز ڈاکٹر سلطان کے ساتھ ساتھ لگا ہوا نور پاشا اور حمید الغزالی کی طرف جارہا تھا۔ وہ دونوں ڈاکٹر سلطان کو دیکھ کر کھل اٹھے تھے۔ سلطان، نقلی ایاز سے معذرت کرتا ہوا ان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ خفیف ہوکر وہیں رک گیا پھر اس کے ہونٹ نفرت انگیز انداز میں سکڑ گئے اور اس نے زیرلب کہا۔

”بس کچھ دیر کی بات ہے، تمہاری ساری کامیابی تمہارے سمیت مٹی میں مل جائے گی۔“

تمام مہمان آچکے تھے اور اب تقریب کا آغاز ہونے والا تھا۔ میڈیا سے منتخب افراد کو اس تقریب میں شرکت کی اجازت ملی تھی اور اس میں مغربی میڈیا کے نمائندوں کی تعداد حیرت انگیز طور پر نہ ہونے کے برابر تھی۔ زیادہ تر افریقا، عرب ممالک اور جنوبی امریکا سے صحافی بلائے گئے تھے۔ وہ اس تقریب کی کوریج کررہے تھے۔ صرف ایک ترک اور ایک عرب چینل اسے براہ راست نشر کررہے تھے اور اگر دنیا میں کہیں یہ تقریب کسی اور چینل سے بھی دکھائی جارہی تھی تو انہی دو چینلز کے توسط سے دکھائی جارہی تھی۔ جبکہ زرعی ماہرین ساری دنیا سے بلائے گئے تھے۔ اس معاملے میں مغربی ممالک کو نظرانداز نہیں کیا گیا تھا۔

نقلی ایاز پلٹ کر اس طرف آیا جہاں ہیلن موجود تھی۔ اس نے آنکھوں سے اسے اشارہ کیا تو ہیلن غیر محسوس انداز میں باہر کی طرف کھسکنے لگی۔ چند لمحے بعد وہ واک تھرو سے باہر آئی اور تیزی سے زینے سے نیچے روانہ ہوگئی۔ ایک منٹ بعد وہ کمرے میں تھی۔ اس نے اندر آکر دروازہ بند کیا اور لیپ ٹاپ کھول کر کام کرنے لگی۔ اس نے بلوٹوتھ آن کیا اور پھر کسی وائرلیس ڈیوائس سے رابطہ کرنے لگی۔ ڈیوائس نے اس سے پاس ورڈ مانگے۔ اس نے اپنے پرس سے اپنی اور ایاز درانی کی بہ ظاہر ایک ریستوران میں کھینچی ہوئی تصویر نکالی اور اس کی پشت پر درج نمبر یکے بعد دیگرے پاس ورڈ کے طور پر لکھنے لگی۔ جب ایک نمبر قبول ہوجاتا تو وہ دوسرا نمبر ڈالتی تھی۔ اس طرح اس نے یکے بعد دیگرے چھ کے چھ نمبر ڈالے۔ ڈیوائس نے پاس ورڈ قبول کرنے کی نوید سنائی۔ ہیلن نے سکون کا سانس لیا اور دوبارہ لیپ ٹاپ پر جھک گئی۔ اس نے ڈیوائس میں آدھے گھنٹے کا وقت سیٹ کیا اور لیپ ٹاپ آف کردیا۔ وہ پھر باہر جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ وہ جس کام کے لیے مہینوں سے لگے ہوئے تھے، اس کی تکمیل میں صرف آدھے گھنٹے کا وقت رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اس بار امینہ نے کار ہوٹل سے پہلے روک دی تھی۔ ایاز نے اس سے کہا۔ ”ہمیں کسی ایسے طریقے سے اندر جانا ہوگا کہ کسی کو علم نہ ہوسکے۔“

”میں ایسے کسی راستے سے واقف نہیں ہوں۔“ امینہ نے اسے آگاہ کیا۔ ”میں اس سے پہلے کبھی اس ہوٹل کے اندر نہیں گئی۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں جانتا ہوں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ ہمیں چھپ کر اندر جانا ہے۔''

وہ ہوٹل کے عقبی حصے میں پہنچے۔ اتنا تو ایاز جانتا تھا کہ یہاں بھی سیکیورٹی ہوگی۔ یہ فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اس کا کوئی حصہ بغیر سیکیورٹی کے نہیں چھوڑا گیا ہوگا اس کے باوجود وہ چانس لینا چاہتا تھا۔ سوئمنگ پول کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ سروس ایریا میں داخل ہوئے۔ ملازمین کی سہولت کی دیوار پر نقشہ بنا ہوا تھا۔ ایاز نے اسے دیکھا۔ اگر وہ کچن کے راستے جاتے تو براہ راست اوپر جانے والی سیڑھیوں پر نکلتے۔ ایاز نے نقشے پر انگلی رکھی۔

''ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

اب تک انہیں کسی نے نہیں روکا تھا اور ایاز مطمئن تھا لیکن وہ ایک چیز بھول گیا تھا۔ پورے ہوٹل میں جا بجا کھلے اور چھپے ہوئے کیمرے لگے تھے جو ہر حصے کی نگرانی کرتے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے کچن میں داخل ہونے کی کوشش کی، سامنے دو عدد مسلح گارڈز نمودار ہوئے اور پانچ منٹ بعد ایاز اور امینہ ہوٹل کے مرکزی کنٹرول روم میں شہابت پاشا کے سامنے تھے۔ وہ بولا تو اس کے الفاظ طنزیہ تھے لیکن لہجہ نہایت سرد تھا۔

''مسٹر ڈاکٹر ایاز درانی! تمہیں دوبارہ یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔'' پھر اس نے امینہ کی طرف دیکھا اور مہذب انداز میں بولا۔ ''خاتون کی تعریف؟''

''یہ امینہ ہے، اس نے میری مدد کی ہے۔''

''اوہ... بھی یہ مجھے جانی پہچانی لگ رہی ہیں۔ ان کی تصویر مسلسل ٹی وی پر دکھائی جا رہی ہے۔'' شہابت پاشا نے کہا۔ ''مسٹر ایاز درانی یا تم جو کوئی بھی ہو، مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم بڑی مشکل میں پڑ گئے ہو۔'' اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر آپریٹر سے پولیس کو ملانے کو کہا۔ ایاز نے جلدی سے کریڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔

''مسٹر شہابت! پلیز میری بات سن لو، اس میں صرف میرا ہی نہیں بلکہ تمہارے ہوٹل کا بھی فائدہ ہے۔''

ہوٹل کی بات سن کر وہ رک گیا اور اس نے آپریٹر سے فی الحال پولیس سے رابطہ نہ کرنے کو کہا پھر ایاز کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم اپنی بات کی وضاحت کرو گے؟''

''دیکھو، میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ یہاں ایاز درانی بن کر مجھے ہی آنا تھا۔''

اس بار شہابت پاشا چونک گیا۔ ''ایاز درانی بن کر؟''

''ہاں، مجھے شک ہے کہ یہ بھی میرا اصلی نام نہیں ہے اور میرا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے۔''

شہابت پاشا نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''تب تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟''

''میں ہر قیمت پر حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے جب تم نے مجھے اسپتال روانہ کیا اور میں اس کے بجائے پروفیسر حبیب سے ملنے یونیورسٹی جا پہنچا تو وہاں بھی نقلی ایاز درانی موجود تھا اور اس نے پروفیسر کے سامنے مجھے جھوٹا ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نتیجے میں پروفیسر نے گارڈز کو بلا لیا اور انہوں نے مجھے بے بس کر کے پولیس کے حوالے کر دیا اور پولیس مجھے دوبارہ ڈاکٹر ایاز میر کے پاس لے گئی۔''

''پولیس نے بالکل ٹھیک کیا۔ تمہیں اب بھی میڈیکل ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے لیکن اس کا بہتر فیصلہ پولیس کرے گی۔ تم نے ہوٹل سے متعلق اپنے حملے کی وضاحت نہیں کی؟''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ اسپتال میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور قاتلوں نے پہلے ڈاکٹر ایاز میر اور اس کی نرس کو قتل کر دیا۔''

اس کے بعد اس نے شاپنگ سینٹر میں پیش آنے والی صورتِ حال تفصیل سے گوش گزار کر دی۔

شہابت پاشا کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''مسٹر درانی! کیا اتفاق ہے، مرنے والا ہمیشہ کوئی دوسرا ہوتا ہے اور تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔''

ایاز نے اس کی بات نظر انداز کی اور بولا۔ ''مسٹر پاشا! تمہارے ہوٹل میں کوئی بہت بڑی سازش جاری ہے اور اس میں مرکزی کردار میری بیوی ہیلن اور اس کا دوسرا نام نہاد شوہر ہے۔''

شہابت پاشا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ''مسٹر درانی! تم دو معزز افراد پر نہایت خطرناک الزام لگا رہے ہو۔''

''میں صرف الزام نہیں لگا رہا بلکہ ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے، آج سے تین مہینے پہلے اکتوبر کی دو تاریخ کو میں اور ہیلن الگ نام اور ملک کے پاسپورٹ پر استنبول آئے تھے۔''

''اگر تمہیں اس حد تک معلوم ہے تو پھر یہ کیوں نہیں معلوم کہ تم کیوں آئے تھے؟''

''کیونکہ یہ سب میری یادداشت سے گم ہو چکا ہے۔'' ایاز نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے بلکہ بڑی حد تک یقین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے، میں اور ہیلن اسی ہوٹل میں رکے ہوں گے۔ اگر تم دو اکتوبر والے دن اپنے ہوٹل کے کیمروں کی ریکارڈنگ چلا کر دیکھو تو یقیناً تمہیں استقبالیہ پر کچھ نہ کچھ دیکھنے کو ملے گا۔"

شباہت پاشا اب اسے نہایت سرد نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "مسٹر درانی! اگر یہ بات غلط نکلی تو......؟"

"تو پولیس کا آپشن تمہارے پاس موجود ہے۔" ایاز نے جواب دیا۔ "لیکن پلیز جو کرنا ہے جلدی کرو، ممکن ہے تاخیر سے کوئی ناقابل تلافی نقصان ہو جائے۔"

شباہت پاشا کا ذہن فوری طور پر اوپر جاری تقریب کی طرف گیا۔ اس میں اہم ترین مقامی اور بین الاقوامی شخصیات موجود تھیں اور اگر ان کو کوئی نقصان ہو جاتا تو ہوٹل کی ساکھ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی۔ اس نے کیمروں کے انچارج سے کہا۔ "دو اکتوبر کی استقبالیہ کی مووی نکالو... جلدی۔" پھر اس نے ایک مخصوص چھوٹا سا واکی ٹاکی نکالا اور ہوٹل کے سیکیورٹی انچارج سے رابطہ کیا۔ "سلیم! فوری طور پر تمام سیکیورٹی گارڈز کو الرٹ کر دو اور اوپر تقریب والے فلور پر زیادہ سیکیورٹی لگا دو۔ کسی کو مزید وہاں جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔"

انچارج نے مووی نکال لی تھی اور اب اسے فاسٹ فارورڈ میں چلا کر دکھا رہا تھا۔ جیسے ہی کاؤنٹر پر کوئی آتا، وہ مووی اسلو کر دیتا اور جب شباہت پاشا اسے اشارہ کرتا تو وہ مووی آگے بڑھا دیتا۔ ہر بار جب وہ مووی روکتا تو سب غور سے کمپیوٹر مانیٹر کی طرف دیکھتے۔ مووی کے ساتھ وقت بھی اسکرین پر آ رہا تھا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی لیکن اسکرین پر ہیلن اور ایاز نمودار نہیں ہوئے تھے پھر شام ہو گئی۔ شباہت پاشا نے کہا۔ "تمہارا اندازہ غلط نظر آ رہا ہے مسٹر درانی۔"

اسی لمحے مووی میں ایک جوڑا نمودار ہوا۔ وہ کاؤنٹر پر آیا تھا۔ مووی چلانے والے کا دھیان ایک لمحے کے لیے ہٹا تو یہ سین آگے نکل گیا۔ اس نے اسٹاپ کر کے جلدی سے اسے واپس کیا۔ ایاز مضطرب ہو کر اسکرین کی طرف جھکا اور بولا۔ "یہ... یہ ہم ہیں۔ میں اور ہیلن۔"

شباہت پاشا نے جھک کر اسکرین پر غور سے دیکھا اور اسے پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ واقعی ایاز اور ہیلن تھے، بس ذرا بدلے ہوئے حلیے میں تھے۔ اس نے سیدھے ہو کر ایاز سے کہا۔ "تم یہیں رکو۔" پھر اس نے اپنے گارڈز میں سے ایک کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور دوسرے کے ساتھ تیزی سے کنٹرول روم سے نکل گیا۔ وہاں کوئی دو درجن اسکرینز لگی تھیں جن پر پورے ہوٹل کا عمومی حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ کیمرے صرف کمروں میں دکھانے سے قاصر تھے ورنہ ہوٹل کا کوئی حصہ ان کی گرفت سے محفوظ نہیں تھا۔ دو اسکرینوں پر اوپر ہونے والی تقریب کا حال دکھایا جا رہا تھا۔ ایک اسکرین پر نظر آنے والے منظر نے ایاز کے ذہن میں جھماکا کیا۔ یہ ہوٹل کا کمرا نہیں تھا لیکن اس کی آرائش کمرے جیسی تھی۔ اسے دیکھ کر ایاز کی یادداشت میں ہلچل مچ گئی۔

وہ ایک تاریک خلا کے سامنے بیٹھا تھا لیکن خلا اتنا تاریک بھی نہیں تھا، اس میں ہلکی سی روشنی تھی اور اس روشنی میں وہاں موجود وہ بم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ مخصوص کیمیائی محلولوں کی آمیزش سے پھٹنے والا بم تھا اور اس کی تباہ کاری عام بارودی مواد سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔

"ایاز..." اینا اسے خاصی دیر سے ساکت دیکھ رہی تھی لیکن اس بار اس نے اسے نہیں چھیڑا۔ وہ سمجھ گئی تھی، اس کیفیت میں ایاز کو ماضی کی کوئی خاص بات یاد آتی ہے۔ مگر کچھ دیر بعد اس کا صبر جواب دے گیا اور اس نے ایاز کو پکارا۔ وہ چونکا اور زیرلب بولا۔ "میرے خدا... اس ہوٹل میں ایک بہت بڑا بم ہے۔"

گارڈ چونکا۔ "بم؟"

"ہاں، اوپر کے فلور پر عین تقریب والے ہال کے نیچے ایک کمرے میں ہے۔ مہمانوں کو فوراً وہاں سے نکالو۔" ایاز نے کیمرا انچارج سے کہا۔

"میں... میں اس کا مجاز نہیں ہوں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔ بم کی اطلاع سن کر اس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔

"کیا اوپر ہونے والی تقریب میں تمام اہم لوگ آ چکے ہیں؟"

"ہاں، تقریب کا آغاز ہو گیا ہے۔" کیمرا انچارج نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا مطلب ہے تمام لوگ آ چکے ہیں۔"

"ان کو یہاں سے نکالنا ضروری ہے۔ ورنہ بم بلاسٹ ہو گیا تو ان میں سے کوئی نہیں بچے گا۔" ایاز نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ مجرموں کا پلان جان گیا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے پر گارڈ نے چوکنا ہو کر اس پر گن تان لی۔

"تم فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"دیکھو، انہیں روکنا ضروری ہے۔" ایاز نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر بم پھٹ گیا تو بہت نقصان ہو گا۔"

مگر گارڈ اس کی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ "بیٹھ جاؤ ابھی..."

گارڈ کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک طرف کھڑی اینا نے اچانک اس کے سر پر ہاتھ مارا۔ اس کے ہاتھ میں ماربل کا پیپر ویٹ دبا ہوا تھا۔ اس ضرب نے گارڈ کو عارضی طور پر مفلوج کر دیا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اینا نے اس سے پہلے اس کی گن چھین لی تھی۔ "بس، اب حرکت مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گی۔" اینا نے اسے دھمکی دی اور ایاز سے کہا۔ "تم جا کر دیکھو، اس کو میں روکتی ہوں۔"

وقت نہیں تھا اس لیے ایاز تیزی سے باہر آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر تقریب شروع ہو گئی ہے تو یقیناً بم ایکٹیویٹ کیا جا چکا ہو گا اور وہ کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ بم کے چکر میں پڑنے کے بجائے اسے لوگوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے کچھ کرنا تھا۔ اسے سیڑھیوں کے پاس ایک شیشے کے بکس میں الارم کا بٹن دکھائی دیا۔ بکس لاک تھا۔ ایاز نے آس پاس دیکھا اور ذرا آگے ایک چھوٹے سے لاؤنج سے اسے ماربل کا بنا شوپیس مل گیا۔ خوش قسمتی سے یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے شوپیس مار کر شیشہ توڑ دیا اور الارم کا بٹن دبا دیا۔ دوسرے لمحے پورے ہوٹل میں ہنگامی الارم کی آواز گونجنے لگی اور اس کا مطلب تھا کہ ہوٹل میں موجود تمام افراد فوری طور پر باہر نکل جائیں۔ ایاز جانتا تھا کہ الارم سنتے ہی لوگوں کا ایک ریلا اوپر سے نیچے کا رخ کرے گا اور سیڑھیاں جام ہو جائیں گی۔ وہ اس سے پہلے ہی اوپر پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن ابھی وہ تیسری منزل تک پہنچا تھا کہ سیڑھیوں پر لوگوں کا ہجوم نمودار ہوا۔ وہ تند و تیز سیلاب کی طرح نیچے آ رہے تھے۔

☆☆☆

ہیلن دوبارہ ہال میں آئی تو نقلی ایاز دروازے کے پاس ہی موجود تھا۔ اس نے آنکھوں میں ہیلن سے سوال کیا کہ کام ہو گیا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر اس نے گھڑی پر انگلی رکھ کر وقت بتایا۔ جواب میں نقلی ایاز نے اپنی گھڑی پر انگلی رکھ کر بتایا کہ انہیں دھماکے سے دس منٹ پہلے یہاں سے نکل جانا ہے۔ ہیلن نے سر ہلایا۔ وہ پورے اطمینان سے مہمانوں میں گھل مل رہی تھی جبکہ نقلی ایاز اب مضطرب لگ رہا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں بم پھٹنے کے وقت میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے اور جن کو نشانہ بنانا ہے ان کے ساتھ وہ بھی مارے جائیں۔ وہ ایک طرف کھڑا وسکی کے گھونٹ لے رہا تھا۔

کوئی دس منٹ بعد ہال میں ہوٹل کا منیجر شباہت پاشا داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک سیکیورٹی والا بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی نقلی ایاز کی چھٹی حس نے خبردار کیا لیکن چھپنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ شباہت پاشا نے اسے دیکھ لیا تھا اور سیدھا اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "مسٹر درانی! ایک اہم معاملہ ہے۔ تمہیں ذرا زحمت کرنا ہو گی۔"

نقلی ایاز نے کھردرے انداز میں کہا۔ "کس قسم کی زحمت؟"

"ہمیں تم سے اور تمہاری مسز سے کچھ سوال کرنے ہیں۔"

وہ گھبرائے بغیر بولا۔ "کیا تم اس کا اختیار رکھتے ہو؟"

"بالکل۔" شباہت پاشا نے جواب دیا۔ "ہوٹل کے قواعد و ضوابط میں یہ شامل ہے۔ جن شرائط پر لوگ یہاں رکتے ہیں، اس میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ سیکیورٹی کے معاملے پر مہمانوں کو انتظامیہ سے مکمل تعاون کرنا ہو گا۔ تمہاری مسز کہاں ہے؟"

انہوں نے آس پاس دیکھا لیکن ہیلن ہال میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ نقلی ایاز انکار نہیں کر سکتا تھا اور اب اسے فکر لگ گئی تھی کہ اس افراتفری کے چکر میں کہیں بم پھٹنے کا وقت نہ ہو جائے۔ وہ مجبور تھا۔ شباہت پاشا نقلی ایاز درانی کو اسی فلور کے ایک کمرے میں لے آیا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔ "مسٹر! تم نے خود کو ایاز درانی بتایا ہے جبکہ ہوٹل کے کیمرا ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ خود کو ایاز درانی کہنے والا دوسرا شخص اور مسز درانی تین مہینے پہلے یہاں ہوٹل میں آئے تھے۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟"

نقلی ایاز کا چہرہ سفید پڑ گیا اور اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ممکن ہے یہ دھوکا ہو۔"

"استنبول کی پولیس نے گزشتہ دس سال میں اپنی کارکردگی بہت بہتر بنائی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ جلد تم سے سب اگلوا لے گی۔" شباہت پاشا نے کہا۔ اس نے ہوٹل کی ساری سیکیورٹی کو الرٹ کر دیا تھا پھر وہ اوپر آیا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے کتنا قیمتی وقت ضائع کر دیا ہے۔ ابھی وہ نقلی ایاز درانی سے پوچھ گچھ کر رہا تھا کہ ہوٹل میں ہنگامی الارم کی آواز گونجنے لگی۔ "لعنت ہو۔" شباہت پاشا کے منہ سے نکلا پھر اس نے اپنے آدمی سے کہا۔ "اس پر نظر رکھو۔"

وہ تیزی سے باہر آیا تو تقریب والے ہال کا بڑا دروازہ کھول دیا گیا تھا اور لوگ افراتفری میں وہاں سے نکل رہے تھے۔ نور پاشا اور حمید الغزالی کو ان کے محافظ اپنے گھیرے میں لیے تیزی سے باہر لے جا رہے تھے۔ شباہت پاشا نے ایک سپروائزر کو روک کر الارم کے بارے میں پوچھا لیکن اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ الارم کس وجہ سے بجایا گیا ہے۔ اوپری فلور تیزی سے خالی ہو رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شباہت پاشا نے واکی ٹاکی پر کنٹرول روم سے رابطہ کیا لیکن وہاں سے اس کی کال کا کوئی جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔ اس نے واکی ٹاکی جیب میں رکھا اور خود سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ ہنگامی حالت کا الارم بجتے ہی ہوٹل کی تمام لفٹیں خود بہ خود اس فلور پر رک جاتی تھیں جہاں وہ ہوتی تھیں اور ان کے دروازے کھل جاتے تھے۔ ایسے میں باہر نکلنے والوں کو لازمی سیڑھیاں ہی استعمال کرنا پڑتیں۔

☆☆☆

شباہت پاشا کو دیکھتے ہی ہیلن کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا اور وہ دوسرے لوگوں کی آڑ میں فوری طور پر ہال سے نکل گئی۔ باہر نکل کر وہ ایک نزدیکی گیلری میں آ گئی جہاں سے وہ ہال کے دروازے پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اس نے نقلی ایاز درانی کو شباہت پاشا کے ساتھ آتے دیکھا وہ مجبور لگ رہا تھا۔ وہ اسی فلور کے ایک کمرے میں چلے گئے۔ ہیلن نے اپنے پرس میں موجود ایک چھوٹا سا آلہ نکال کر اپنے کان میں چپکا لیا۔ یہ مختصر ترین ایف ایم ریڈیو تھا جو انسانی جسم کی حرارت ملتے ہی کام شروع کر دیتا تھا اور ایک ہی فریکوئنسی پر سیٹ تھا۔ مائیکروفون نقلی ایاز درانی اور ہیلن دونوں کے پاس تھا۔ ریڈیو لگاتے ہی اسے ان لوگوں کی گفتگو سنائی دینے لگی تھی۔ چند لمحے میں وہ سمجھ گئی کہ ان کا پول کھل گیا ہے لیکن اب بھی ان کا مشن مکمل ہونے کا چانس تھا کیونکہ شباہت پاشا کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ اسے ان کے اصل پلان کی کوئی خبر نہیں۔

ہیلن نے گھڑی دیکھی۔ ابھی دس منٹ کا وقت تھا۔ یعنی ان کے یہاں سے نکلنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ نکل سکتی تھی لیکن نقلی ایاز اندر پھنسا ہوا تھا۔ اچانک ہی ہنگامی الارم بج اٹھا۔ ہیلن چونک گئی۔ فوراً ہی تقریب والے ہال اور کمروں میں موجود مہمان باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ بم پھٹنے میں ابھی سات منٹ باقی تھے۔ ہیلن نے دیکھا، شباہت پاشا بھی کمرے سے نکل کر چلا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ کمرے کی طرف بڑھی اور اس نے آہستہ سے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے بے آواز دروازہ ذرا کھول کر اندر جھانکا تو نقلی ایاز کرسی پر بیٹھا تھا اور ذرا دور موجود گارڈ کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ ہیلن نے دبے قدموں اندر داخل ہو کر دروازے کے پاس رکھا ایک گلدان اٹھایا۔ نقلی ایاز نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے دیکھ چکا ہے۔ جیسے ہی ہیلن نے گلدان گارڈ کے سر پر مارا اور وہ چکرا کر گرا نقلی ایاز نے لپک کر گارڈ کی گن اٹھائی۔

ہیلن نے اسے آگاہ کیا۔ ”ہمارا پلان ناکام ہو گیا ہے۔ وہ تینوں یہاں سے نکل گئے ہیں۔“

”ملعنت ہو۔“ نقلی ایاز کے منہ سے نکلا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”ڈاکٹر سلطان بھی؟“

”نہیں، اسے میں نے نہیں دیکھا۔ نور پاشا اور حمید الغزالی کو ان کے محافظ گھیرے میں لے کر نیچے لے جا چکے ہیں۔“

نقلی ایاز نے سوچا اور گن پھینک دی۔ اس نے ہیلن سے کہا۔ ”وہ دونوں جائیں جہنم میں... ہمارا اصل شکار ڈاکٹر سلطان ہے... وہ کسی قیمت پر ہوٹل سے زندہ نکلنا نہیں چاہیے۔“

”اور بم؟“

”اسے پھٹنے دو، یہ ہوٹل بھی جہنم میں جائے۔“ نقلی ایاز نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس نے ہیلن کو ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ اسے ڈاکٹر سلطان کی تلاش تھی۔ اس کے جاتے ہی ہیلن اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں اس نے تین مہینے پہلے ایاز کے ساتھ مل کر بم نصب کیا تھا۔

☆☆☆

ہنگامی الارم بجتے ہی تقریب میں سراسیمگی پھیل گئی تھی اور لوگوں نے فوری طور پر ہال سے باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دی۔ ہوٹل کا عملہ بھی ان کی معاونت کر رہا تھا۔ نور پاشا اور حمید الغزالی کو ان کے محافظ فوری طور پر اپنے حصار میں باہر لے گئے لیکن ڈاکٹر سلطان اور اس کے بیوی بچے دوسرے عام لوگوں کی طرح از خود باہر جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے رانیہ کا ہاتھ خود پکڑ لیا۔ معاذ کو اس نے گود میں اٹھا لیا تھا اور سعد کو ثانیہ نے سنبھال لیا تھا۔ ڈاکٹر سلطان کوشش کر رہا تھا کہ وہ لوگوں کے ریلے میں نہ پھنسے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کے بچے نہ بچھڑ جائیں۔ اس نے ثانیہ سے کہا۔ ”دیوار کے ساتھ ساتھ رہو۔“

”بچوں کو کسی صورت مت چھوڑنا۔“ ثانیہ بولی۔ اسی اثنا میں کمروں سے نکلنے والے بدحواس لوگوں کا ایک ریلا آیا اور ثانیہ اس ریلے میں آگے نکل گئی۔ سلطان نے اس کا ساتھ دینے کی کوشش کی تو رانیہ لوگوں کے بیچ میں پھنس گئی اور اس کا ہاتھ سلطان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سلطان کو ذرا دیر میں احساس ہوا کہ رانیہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ اوپر والے فلور سے نیچے آ گئے تھے اور سیڑھیوں کے پاس تھے۔ سلطان نے رانیہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں اتنا ہجوم تھا کہ اسے رانیہ نظر نہیں آئی۔ شور کی وجہ سے وہ کوئی آواز بھی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ خود چلا چلا کر رانیہ کو آواز دے رہا تھا مگر اسے دوسری طرف سے کوئی جواب بھی نہیں مل رہا تھا۔ وہ اپنی بچی کو کسی صورت چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

وہ تیزی سے واپس پلٹا اور لوگوں کو دھکیلتے ہوئے رانیہ کو تلاش کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ گیلری میں داخل ہوا۔ یہاں رہائشی کمرے تھے اور ان کے مکین اب تک باہر آ رہے تھے لیکن سیڑھیوں کے مقابلے میں یہاں رش بہت کم تھا اور وہ آسانی سے چل رہا تھا۔ خوش قسمتی سے یہاں آتے ہی اسے رانیہ نظر آ گئی۔ وہ ایک طرف سہمی کھڑی تھی۔ لوگوں کے ریلے سے بچنے کے لیے وہ اس طرف آ گئی تھی۔ بچی نے ذہانت کا ثبوت دیا تھا کیونکہ وہ سیڑھیوں پر ہوتی تو اب تک لوگوں کے پیروں تلے کچلی جا چکی ہوتی۔ اس وقت سیڑھیوں پر یہی ہو رہا تھا۔ لوگ اس طرح بدحواسی میں نکل رہے تھے کہ جو ایک بار گر جاتا، اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر اس پر سے گزرتے چلے جاتے۔ ایسے مضروبوں کے چلانے کی آوازیں بھی شور میں شامل تھیں۔

”رانیہ۔“ سلطان نے چلا کر کہا تو اس نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف دوڑی لیکن اس سے پہلے وہ سلطان تک آتی، کسی نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ یہ نقلی ایاز درانی تھا۔ اس نے رانیہ کو لا کر سلطان کے حوالے کیا۔ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔“

”تمہارا شکریہ... یہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔“

سلطان نے کہا اور رانیہ کو بھی گود میں لے کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی سلطان کی پشت نقلی ایاز کی طرف ہوئی، اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا چاقو نکال لیا۔ اس کا چاقو پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کے استعمال پر مکمل عبور رکھتا ہے۔ وہ دبے قدموں ڈاکٹر سلطان کی طرف بڑھا اور اس نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا تھا کہ کسی طرف راہداری سے کسی نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے لیتا ہوا زمین پر جا گرا۔ وہاں اتنا شور تھا کہ سلطان کو علم ہی نہ ہو سکا کہ موت اس کے بالکل پاس سے گزر گئی ہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے بچوں سمیت سیڑھیاں اترنے لگا۔ چاقو نقلی ایاز کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اس نے سنبھل کر حملہ کرنے والے کو دیکھا تو ایاز کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ”تم؟“

”ہاں میں۔“ ایاز نے نفرت سے کہا اور اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ وہ اس کے اوپر تھا۔ پھر اس پر جنون طاری ہو گیا۔ اسے اس شخص سے بے پناہ نفرت محسوس ہو رہی تھی جو صرف اس کے نام اور شخصیت پر ہی نہیں بلکہ ہیلن پر بھی قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ نقلی ایاز نے چند گھونسے آرام سے کھائے اور پھر اچانک کروٹ لے کر اسے دور اچھال دیا۔ پھر دونوں بیک وقت اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ نقلی ایاز نے اپنی باچھوں سے بہنے والا خون صاف کیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ ”دوست، لگتا ہے تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔“

ایاز نے ایک بار پھر اسے گھونسا مارنے کی کوشش کی لیکن اس بار وہ صفائی سے بچ گیا اور اس کے جوابی گھونسے نے ایاز کے جبڑے پر قیامت ڈھا دی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا۔ اس نے خون صاف کیا اور بولا۔ ”ممکن ہے لیکن تمہارا منصوبہ ناکام رہا۔“

”وہ تمہارا منصوبہ تھا۔“ نقلی ایاز نے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

”میں جانتا ہوں کہ یہاں بم میں نے لگایا تھا لیکن اب میں نہیں چاہتا کہ کوئی اس کا شکار ہو۔“

نقلی ایاز کو اس کشمکش کے دوران میں چاقو مل گیا تھا۔ اس نے ایاز کو فرش پر گرا دیا اور چاقو اس کے سینے میں اتارنے کی کوشش کی لیکن ایاز نے بروقت اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں پورا زور لگا رہے تھے۔ نقلی ایاز اوپر ہونے کی وجہ سے کامیاب تھا اور چاقو رفتہ رفتہ ایاز کے سینے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ اس سے ایک انچ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ایاز کو لگ رہا تھا کہ موت اس کے قریب آ چکی ہے۔

☆☆☆

ہیلن کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے اپنا پرس بستر پر پھینکا اور گھڑی دیکھی۔ بم پھٹنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ جن لوگوں کو نشانہ بنایا جانا تھا وہ یہاں سے جا چکے تھے اور اب وہ نہیں چاہتی تھی کہ بے گناہ لوگ اس بم کا نشانہ بنیں۔ اس نے دیوار پر لگے لکڑی کے پینل کا جائزہ لیا۔ اسے دس عدد اسکروز کی مدد سے دیوار میں لگایا گیا تھا اور اس کے پاس اسکرو ڈرائیور نہیں تھا۔ ہوتا تب بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اتنے سارے اسکروز کھول سکتی۔ اس نے آسان طریقہ اختیار کیا۔ وہ واش روم میں آ گئی اور اس نے فلیش ٹینک کا بھاری ڈھکن اٹھایا۔ اس کی مدد سے دیوار توڑی جا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں صرف نمائشی دیوار تھی جو صرف دو انچ موٹی تھی۔

ہیلن نے ڈھکن سے دیوار پر ضرب لگائی۔ اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ ایک دو وار میں دیوار توڑ دیتی۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مستقل ضربیں لگاتی رہی۔ اس کی نظر بار بار گھڑی کی طرف جا رہی تھی۔ جس وقت اس نے دیوار میں سوراخ کیا، بم پھٹنے میں صرف ایک منٹ رہ گیا تھا۔ اس نے ڈھکن پھینک کر اندر ہاتھ ڈالا اور بم کی تاریں ٹٹولنے لگی۔ اگر وہ سرکٹ سے منسلک تاروں کو کھینچ لیتی تو بم پھٹنے سے رک جاتا۔ لیکن اندر تاریک خلا میں اسے تاریں نہیں مل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ بے تابی سے تاروں کو تلاش کر رہے تھے۔ خوف کی وجہ سے اسے پسینا آرہا تھا۔ آخر اس کی انگلیوں نے تاروں کے ایک گچھے کو تلاش کر لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے پکڑ کر کھینچتی، اندر سے کلک کی آواز آئی۔ وہ ساکت ہو گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی ساکت ہو گئی۔ پھر سوراخ سے آگ کا ایک طوفان برآمد ہوا اور ہیلن کا حسین وجود اس طوفان میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ خنجر ایاز کے سینے میں اترتا، اچانک خوف ناک دھماکا ہوا۔ نقلی ایاز تو اڑ کر نہ جانے کہاں جا گرا تھا، خود ایاز بھی ہوا کے طوفانی جھکڑ کے ساتھ گھسٹتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے سامنے ہوٹل کا ایک حصہ یوں کھل گیا جیسے گتے اور کاغذ کا بنا ہو۔ آگ کا ایک طوفان اس حصے سے نکلا تھا۔ ایاز نے منہ دیوار کی طرف کر لیا لیکن وہ گیلری کے کونے والے حصے میں ہونے کی وجہ سے محفوظ رہا تھا۔ آگ کے بعد دھوئیں اور تاریکی کا ریلا آیا۔ لائٹ غائب ہو چکی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ لوگوں کا بے پناہ شور سنائی دے رہا تھا۔ اس دھماکے نے انہیں پاگل کر دیا تھا۔ جو لوگ باہر نکلتے ہوئے تھوڑے بہت ہوش اور انسانیت کا مظاہرہ کر رہے تھے اور دوسروں کو پہلے موقع دے رہے تھے، اب وہ بھی تہذیب اور انسانیت بالائے طاق رکھ کر ہوٹل سے نکلنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے تھے۔

دھماکے کی لہر اور پھر اڑتی چیزوں نے ایاز کو زخمی کیا تھا۔ وہ بمشکل اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اس کا پاؤں کسی تار سے الجھا اور وہ اسے نکالنے کے لیے جھکا تھا کہ کسی نے اسے عقب سے جکڑ لیا۔ پھر وہ اس کے کان میں غرّایا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا؟''

وہ ایاز کی گردن توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایاز نے اس کی کوشش ناکام بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں، مجھے معلوم ہے تم مر کر ہی میرا پیچھا چھوڑو گے اور میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ میں تم میں سے ایک ہوں۔ میں بھی قاتل ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے انداز سے ہاتھ میں آنے والے سخت تار کی نوک نقلی ایاز کی آنکھ میں اتار دی۔ اس نے چیخ ماری اور ایاز کی گردن چھوڑ دی۔ ایاز نے گھومتے ہوئے تار اس کی گردن کے گرد لپیٹا اور اسے کس لیا۔ وہ تڑپنے اور گردن آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا لیکن فولادی تار اس کی گردن میں دھنستا چلا گیا۔ تار گردن سے نکالنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ لیکن اس کی ہر کوشش ناکام رہی اور بالآخر اس نے دم توڑ دیا۔ ایاز نے ایک آخری جھٹکا دیا اور تار چھوڑ دیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو گرتے گرتے بچا۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لمحے اسے امینہ کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے تلاش کرتی یہاں تک آ گئی تھی جبکہ ہوٹل میں موجود ہر فرد باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اسے پکار رہی تھی۔ اس کے پاس ٹارچ تھی۔ وہ گیلری میں برآمد ہوئی اور اس نے ایاز کو کھڑے دیکھا تو دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

''ایاز! تم ٹھیک ہو نا؟'' وہ اسے ٹٹول رہی تھی۔

''میرے خدا... کتنا خوف ناک دھماکا تھا۔ یہ کیا ہوا ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' ایاز نے اجنبی سی آواز میں کہا۔ ''بم پھٹ گیا جو میں نے یہاں لگایا تھا لیکن جس مقصد کے لیے لگایا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔''

اسی لمحے امینہ نے نقلی ایاز کی لاش دیکھ لی۔ وہ ڈر گئی۔

''یہ... وہ... یہ... اسے کس نے مارا؟''

''میں نے۔'' ایاز بولا۔ ''میں بھی ان کی طرح قاتل ہوں... پیشہ ور قاتل۔'' وہ یوں بول رہا تھا جیسے ذہنی لحاظ سے غیر حاضر ہو۔ شاید اس انکشاف نے اسے شاک دیا تھا۔ امینہ غیر ارادی طور پر ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ قاتل سے سب ڈرتے ہیں لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر ایاز کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم قاتل ہو نہیں، قاتل تھے۔ آؤ میرے ساتھ۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے... پولیس کے آنے سے پہلے۔''

پولیس کا نام سن کر ایاز جیسے ہوش میں آ گیا اور... تیزی سے امینہ کے ساتھ اترنے لگا۔ جس وقت وہ ہوٹل کے عقبی حصے سے باہر آ رہے تھے تو اگلے حصے میں شباہت پاشا نکلنے والوں کے ہجوم میں انہیں تلاش کر رہا تھا۔ دھماکا اس وقت ہوا تھا جب اوپری فلورز مکمل طور پر خالی ہو چکے تھے اور امکان تھا کہ کسی مسافر کو کوئی نقصان نہیں ہوا ہوگا۔ اب اسے اپنے آدمیوں کے ساتھ ایاز اور اس کی ساتھی لڑکی کی تلاش تھی۔ لیکن لوگوں کے ہجوم میں وہ اسے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ پندرہ منٹ بعد پولیس اور فائر فائٹرز آ چکے تھے اور دو گھنٹے بعد انہوں نے ہوٹل میں لگی آگ پر مکمل قابو پا لیا تھا۔ اس دوران میں پتا چلا تھا کہ صرف تین افراد ہلاک ہوئے تھے جو اوپری

فلور پر موجود تھے۔ ان میں ایک نقلی ایاز درانی تھا۔ دوسرا وہ سیکیورٹی گارڈ جسے اس کی نگرانی پر لگایا گیا تھا اور تیسری ایک نامعلوم لاش تھی کیونکہ اس کے جسم کا صرف دایاں پاؤں ملا تھا اور وہ بھی مکمل طور پر جلا ہوا تھا۔ لیکن شباہت پاشا جانتا تھا کہ یہ لاش کس کی ہو سکتی تھی؛ اسے نکلنے والوں میں ہیلن نظر نہیں آئی تھی۔ حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ جس شخص کو وہ فراڈ سمجھ رہا تھا، وہ ٹھیک تھا اور درحقیقت اس کی وجہ سے یہ بھیانک سازش ناکام ہوئی تھی۔

شباہت پاشا نے فیصلہ کیا کہ وہ اس شخص ایاز اور اس کی ساتھی لڑکی کا پولیس سے تذکرہ نہیں کرے گا۔ اس کے جو آدمی اس بات سے واقف تھے، اس نے انہیں بھی منع کر دیا۔ وہ ممکنہ طور پر مجرم تھے لیکن ان کے محسن بھی تھے۔ کنٹرول روم کے کیمرا انچارج اور دوسرے سیکیورٹی گارڈ نے شباہت پاشا کو باقی کہانی بھی سنائی تھی۔ اگر ایاز الارم بجا کر لوگوں کو ہوٹل سے نکلنے پر مجبور نہ کرتا تو اس وقت دو سو سے زیادہ لوگ مر چکے ہوتے۔ ہوٹل ضرور تباہ ہوا تھا لیکن ایاز نے اس کے ہوٹل کی ساکھ کو ہمیشہ کے لیے ختم ہونے سے بچا لیا تھا۔ شباہت پاشا جانتا تھا کہ وہ اب بھی اسے نظر نہیں آئے گا اس لیے اس کے احسان کا صلہ وہ اسی طرح دے سکتا تھا کہ پولیس سے اس کا ذکر نہ کرے۔

☆☆☆

کئی گھنٹے بعد ایاز اور امینہ ایک ریستوران میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ انہوں نے صاف ستھرے ہو کر لباس بدل لیے تھے۔ ہوٹل سے نکل کر وہ اسی نائٹ کلب میں گئے تھے، وہاں ایاز کا سوٹ اسے واپس مل گیا تھا۔ انہوں نے خود کو صاف ستھرا کر لیا تھا اور زخموں کی مرہم پٹی بھی کر لی تھی۔ خوش قسمتی سے ان دونوں کو... خطرناک چوٹیں نہیں آئی تھیں اور اب ایک خوف ناک رات کے بعد روشن صبح ہو رہی تھی۔ نائٹ کلب صبح پانچ بجے بند ہو جاتا تھا، وہ وہاں سے نکلے تو کوئی اور ٹھکانا نہیں تھا اس لیے اس پہلے ریستوران میں آ بیٹھے جو ابھی کھلا ہی تھا۔ یہاں بیٹھ کر ایاز نے پہلی بار پارسل سے نکلنے والا موبائل فون دیکھا۔ یہ بالکل نیا تھا۔ اس میں ایک عدد سم بھی موجود تھی اور یہ یقیناً مقامی سم تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ موبائل فون آن کرے یا نہ کرے۔ پھر اس نے اسے آن کیا۔ آن ہوتے ہی موبائل اسکرین پر اس کا نام لکھا ہوا آیا اور پھر نیٹ ورک کا نام آنے لگا۔ موبائل سم ایکٹیو تھی۔ وہ اس سے... کال کر سکتا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر ایڈورڈ غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور شارپ اسے دیکھ کر سہما ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا سرد مزاج اور سپاٹ نظر آنے والا باس کس قدر خطرناک آدمی ہے۔ اس نے ایسے ہی پیشہ ور قاتلوں کا یہ گروپ تشکیل نہیں دے دیا تھا۔ پروفیسر کا تعلق مشرقی یورپ سے تھا اور سوویت دور کے خاتمے کے بعد اس نے یہ گروپ بنایا تھا۔ شاید اس کا تعلق کبھی فوج یا اسپیشل یونٹ سے رہا ہو کیونکہ وہ اسلحے کے استعمال اور خالی ہاتھ سے لڑائی میں اپنے تمام آدمیوں پر بھاری تھا۔ حالانکہ اس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی مگر سب سے بڑھ کر اس کی خطرناک ذہانت تھی۔ شروع میں وہ اکیلا کام کرتا تھا اور اس نے اپنی ایک ساکھ بنائی تھی۔ اب اس کا تربیت یافتہ گروپ تھا لیکن اس مشن کی تکمیل کے لیے اس کے چار اہم ترین افراد مارے جا چکے تھے۔ عملاً ایاز بھی اس کے لیے مر چکا تھا۔ وہ اس ناکامی کی وجہ تھا اور وہی اس کا سب سے اہم آدمی تھا۔ وہ سیاہ وین میں تھے اور اس میں لگے چھوٹے سے ٹی وی سے پتا چلا تھا کہ ان کا مشن ناکام رہا۔ گو پاک پیلس میں بم ضرور پھٹا تھا لیکن جن لوگوں کو نشانہ بنانا تھا، وہ صاف بچ نکلے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی پروفیسر دیوانہ ہو گیا تھا اور بہت دیر تک ایاز کو گالیاں دیتا رہا تھا۔ اس کا سارا غصہ اتر گیا تھا اور اس وقت وہ ایک تھرڈ کلاس بدمعاش لگ رہا تھا۔ جب اس کا غصہ ذرا سرد ہوا تو اس نے شارپ کی طرف دیکھا۔

''کاش میکائل (نقلی ایاز) اور ہیلن اس دھماکے میں بچ جاتے۔ میں ان کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتا۔''

شارپ کی اپنی حالت خراب تھی کہ کہیں باس کا غصہ اس کی طرف رخ نہ کر لے۔ اس نے جلدی سے تائید کی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو باس... یقیناً انہوں نے غفلت برتی تھی جس کی وجہ سے مشن ناکام ہوا۔''

''انہوں نے غفلت برتی اور اپنی جان دے کر تلافی کر دی لیکن ایاز نے میرے ساتھ غداری کی ہے اور اسے اس کی سزا ضرور ملے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے سامنے مرے۔''

''ایسا ہی ہوگا باس۔'' شارپ خوشامدانہ انداز میں بولا۔ ''لیکن وہ کہاں ہے... ہم اسے کیسے تلاش کر سکتے ہیں؟''

''کیسے تلاش کر سکتے ہیں؟'' پروفیسر نے جیسے خود سے کہا۔ ''ایک طریقہ ہے، وہ خود ہمیں بتائے گا کہ وہ کہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔" پروفیسر نے کہا اور وین میں لگا ہوا کمپیوٹر آن کر دیا۔ "اب ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"جوزف آ گیا ہے باس۔" شارپ نے اپنے موبائل پر آنے والا ایس ایم ایس دیکھ کر کہا۔ "وہ آدھے گھنٹے میں ہمارے پاس ہوگا۔"

"گڈ! یہ اچھی خبر ہے۔" پروفیسر نے کہا۔ اس کا موڈ بہتر ہوتا دیکھ کر شارپ نے سکون کا سانس لیا۔ کچھ دیر میں جوزف آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ سیاہ وین اسے کہاں ملے گی۔ اندر آ کر اس نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھال لی۔ رات کا آخری پہر تھا اور صبح قریب تھی۔ اچانک کمپیوٹر پر ایک اشارہ ملا اور ایک بیپ کی آواز گونجی۔ پروفیسر اونگھ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔ "تیار ہو جاؤ، ہمارے شکار نے اپنی لوکیشن بتا دی ہے۔" اس نے اسکرین پر جلتے بجھتے نقطے کی طرف اشارہ کیا۔ "سورج نکلنے سے پہلے اس کی زندگی کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو جانا چاہیے۔"

☆☆☆

وہ دونوں خوش تھے لیکن اداس بھی تھے۔ خاص طور سے امینہ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ان کی جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ امینہ نے اپنے ہاتھ کا کنگن گھماتے ہوئے کہا۔ "تمہیں سب یاد آ گیا ہے؟"

"سب تو نہیں لیکن مجھے امید ہے جلد مجھے سب یاد آ جائے گا۔" ایاز نے کہا۔ "اب تم کیا کرو گی؟"

"میں یہاں نہیں رہ سکتی۔" وہ افسردہ ہو گئی۔ "میں اپنے لوگوں کی مدد سے واپس بوسنیا چلی جاؤں گی۔ تمہیں یہاں سے جانے میں میری مدد کی...."

"نہیں، میں اپنا بندوبست خود کر لوں گا۔" ایاز نے کہا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے یورو کی گڈی نکالی اور اس میں سے آدھی گڈی الگ کر کے امینہ کی طرف بڑھا دی۔ یہ پانچ ہزار یورو تھے۔ وہ جلدی سے بولی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرورت ہے۔" ایاز نے نرمی سے کہا۔ "تمہارا ٹھکانا تباہ ہو چکا ہے اور تمہیں واپس جانے کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔ پلیز یہ رکھ لو۔"

امینہ نے ہچکچاتے ہوئے رقم لے لی۔ "شکریہ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔" ایاز بولا اور پھر ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ پھر امینہ نے گہری سانس لی اور پرس شانے پر ٹانگتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"اب میں چلوں گی۔"

ایاز نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ کہہ سکا۔ امینہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی پھر مایوس ہو کر باہر کی طرف چل پڑی۔ ریستوران عمارت کے کونے پر بنا ہوا تھا اور فی الوقت وہاں سناٹا تھا۔ امینہ سڑک پار کر کے دوسری طرف کھڑی کار کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی اسے یہ کار بھی واپس کرنا تھی۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ کار لے جا کر اسی جگہ کھڑی کر دیتی جہاں سے انہوں نے رات کو اٹھائی تھی انہوں نے اسے خوب استعمال کیا تھا لیکن کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ امینہ سوچ رہی تھی کہ کار کے ڈیش بورڈ میں کچھ رقم بطور تلافی رکھ دے گی۔ ایاز اسے جاتا دیکھ رہا تھا پھر وہ بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کے پاس دو عدد پاسپورٹ اور رقم تھی۔ ان کی مدد سے وہ دنیا میں کہیں بھی جا سکتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کہاں جائے؟

ایک سیاہ وین آ کر ریستوران سے کچھ دور رکی اور اس سے پروفیسر ایڈورڈ اترا۔ وہ سیدھا ایاز کی طرف آیا اور اس کے پاس آ کر یوں چونکا جیسے ایاز اسے اتفاقاً نظر آ گیا ہو۔ اس نے تعجب سے کہا۔ "ڈاکٹر ایاز درانی تم یہاں؟"

ایاز چونکا۔ اس نے مخاطب کرنے والے کی طرف دیکھا تو اس کی صورت اسے جانی پہچانی لگی۔ اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور اسے یوں لگا جیسے یہ شخص کیمرا لیے اس سے کچھ کہہ رہا ہو۔ یہ جھلک لمحاتی تھی لیکن اس سے ایاز اتنا سمجھ گیا کہ اس شخص کا اس کے ماضی سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ وہ شخص متوقع نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایاز دہل گیا کہ اس کا جاننے والا یہ کون نکل آیا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ہاں... لیکن میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔"

"میں پروفیسر ایڈورڈ ہوں۔" وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہوا ہے؟ میں یونان آیا ہوا تھا، مجھے تمہارے بارے میں پتا چلا تو میں یہاں آ گیا۔ ٹی وی پر تمہارے بارے میں خبریں آ رہی ہیں۔ کل سے شہر میں قتل و غارت گری کے کئی واقعات ہو چکے ہیں اور پولیس اس سلسلے میں تمہیں تلاش کر رہی ہے۔"

ایاز کے خدشات کم ہوئے۔ اس نے گہری سانس لی۔ "اس میں شبہ نہیں ہے پروفیسر کہ میں بہت مشکل میں پھنس گیا ہوں لیکن میری اصل مشکل یہ ہے کہ میں اپنا ماضی

بھول گیا ہوں، مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"اوہ۔" پروفیسر ایڈورڈ نے تاسف سے کہا۔ "میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں اپنے ماضی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"تم ڈاکٹر ایاز درانی ہو اور میرے ساتھ یونیورسٹی میں کام کرتے ہو۔" پروفیسر ایڈورڈ نے سادگی سے کہا۔

"تو یہ میرا کور ہے۔" ایاز نے سوچا۔ "اس کی آڑ میں میں اس قاتل گروپ کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

پروفیسر ایڈورڈ اسے غور سے دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"سب سے پہلے تمہیں ایک پناہ گاہ کی ضرورت ہے تاکہ تم پولیس اور اپنے دشمنوں سے محفوظ رہو۔"

ایاز نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے لیکن میرے لیے اصل مسئلہ یہاں سے نکلنا ہے۔"

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ ہم امریکن ایمبیسی سے رابطہ کر کے تمہارے لیے دوسرے پاسپورٹ کا بندوبست کر سکتے ہیں۔"

"اور پولیس کا جو میری تلاش میں ہے؟"

"اس کا حل بھی نکل سکتا ہے۔" پروفیسر ایڈورڈ نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" وہ کھڑا ہو گیا لیکن ایاز بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن نظر آنے والی جھلک میں الجھا ہوا تھا۔ یہ شخص اسے کیمرے کے ساتھ نظر آیا تھا۔ آخر اسے یہی منظر کیوں دکھائی دیا تھا؟ کیا اس میں کوئی خاص بات تھی؟ پروفیسر ایڈورڈ اس کی طرف جھکا۔ "ڈاکٹر ایاز! مجھ پر اعتماد کرو۔"

ایاز نے سوچا کہ اس کے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ فی الحال اسے پولیس سے بچنا تھا اور ترکی سے باہر جانا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ "ہمیں کہاں جانا ہے؟"

"یہاں میرے پاس ایک رہائش ہے۔ میرا دوست ہے۔ تم اس کے گھر میں بالکل محفوظ رہو گے۔"

ایاز نے بل کی رقم کافی کے کپ کے نیچے رکھ دی اور پروفیسر ایڈورڈ کے ساتھ چل پڑا۔ وہ فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر آئے۔ اسی لمحے سڑک کے کونے پر موجود سیاہ وین اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے آ کر ایاز کے عین سامنے رکی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ اس نے مڑ کر پروفیسر کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اس نے عقب سے ایاز کی گردن سے کرنٹ مارنے والا آلہ لگایا اور شدید جھٹکے نے ایاز کو مفلوج کر دیا۔ وہ بے جان ہو کر زمین پر گرنے لگا تھا کہ وین کا سلائیڈ ڈور کھلا اور اس میں سے شارپ نے نکل کر ایاز کو تھام لیا اور پھر وین کے اندر کھینچ لیا۔ فوراً ہی پروفیسر ایڈورڈ بھی وین میں سوار ہو گیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جوزف موجود تھا۔ اس سارے عمل میں مشکل سے نصف منٹ لگا تھا اور شاید ہی کسی نے یہ منظر دیکھا ہو۔ پروفیسر ایڈورڈ نے اپنا ہیٹ اتارتے ہوئے جوزف سے کہا۔ "جلدی چلو۔"

شارپ بولا۔ "میرا خیال ہے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔"

ایاز وین کے فرش پر بے بسی سے پڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

شارپ کا خیال غلط تھا کہ کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ امینہ کار میں وہاں سے کوئی سو گز دور موجود تھی۔ وہ گئی نہیں تھی کیونکہ جس وقت وہ روانہ ہونے والی تھی، اس نے اوور کوٹ اور ہیٹ میں اس شخص کو ایاز کے پاس رکتے دیکھا تھا۔ پھر وہ دونوں بات کرنے لگے اور ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ اوور کوٹ والا وہیں بیٹھ گیا۔ امینہ نے محسوس کیا کہ ایاز ہچکچا رہا ہے۔ شاید وہ اس آدمی کے بارے میں پر یقین نہیں تھا۔ امینہ کو وہ مشکوک لگ رہا تھا۔ ایاز جن حالات سے گزر رہا تھا، اس میں کسی جاننے والے سے اچانک ملنے کا امکان بہت کم تھا۔ پھر ایاز اور وہ شخص کھڑے ہو گئے اور سڑک پر آ گئے۔ اسی لمحے امینہ نے سڑک کے کونے سے سیاہ وین کو ان کی طرف آتے دیکھا۔ اسے خطرے کا احساس ہوا لیکن وہ اتنی دور سے ایاز کو خبردار نہیں کر سکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وین آ کر ایاز کے سامنے رکی۔ اوور کوٹ اس موقع پر ذرا پیچھے ہوا، اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور ایاز کی گردن سے لگا دی۔ اسے جھٹکا لگا اور وہ بے جان ہو کر نیچے گرنے لگا تھا کہ وین سے لمبا آدمی نکلا اور اس نے ایاز کو پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

ایک لمحے کو امینہ کا دل رک گیا۔ اسے خیال آیا کہ اوور کوٹ والے نے ایاز کو وہی زہریلا انجکشن لگا دیا تھا جو چند سیکنڈ میں آدمی کی جان لے لیتا ہے لیکن پھر ایاز کو وین میں ڈالتے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا اگر اوور کوٹ والے نے ایاز کو مار دیا ہوتا تو اسے ساتھ لے جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اسے وہیں چھوڑ کر آرام سے جا سکتے تھے، انہیں وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ جیسے ہی وین آگے بڑھی امینہ نے کار اسٹارٹ کی اور وہ وین کے متوازی چلنے لگی۔ بدقسمتی سے وہ سڑک کے دوسری طرف تھی اور وہاں وین سے خلاف نہیں جا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکتی تھی اور خوش قسمتی سے اس طرف سڑک روڈ تھی، وہ اسی پر ڈرائیو کر رہی تھی۔ وین تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ امینہ موقع کی تلاش میں تھی کہ کسی طرح اسے کٹ ملے اور وہ دوسری طرف آجائے مگر فی الحال یہاں کوئی کٹ نہیں تھا۔ بائی وے پر تیز رفتار وین رفتہ رفتہ اس سے دور جا رہی تھی۔

☆☆☆

ایاز کو کرنٹ کھانے کا پہلے بھی ایک تجربہ ہو چکا تھا اس لیے اس بار اس کے اعصاب جلد سنبھل گئے لیکن وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے ابھی تک ہوش و حواس سے بیگانہ ہو۔ شارپ نے اسے وین کے فرش پر ڈال دیا تھا جبکہ وہ اور پروفیسر ایڈورڈ سیٹوں پر تھے۔ پروفیسر ایڈورڈ اس کی طرف جھکا اور آہستہ سے بولا۔ ”لڑکے، تم نے مجھے بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اتنی بڑی ناکامی مجھے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔“

”صرف ناکامی نہیں۔“ شارپ نے مشتعل ہو کر ایاز کو ٹھوکر ماری۔ ”اس حرامزادے کی وجہ سے ہمارے چار قیمتی ساتھی بھی مارے گئے ہیں۔“

پروفیسر ایڈورڈ کو ساتھیوں کے قیمتی ہونے سے سروکار نہیں تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آدمی نہیں، ہمارے لیے مشن اہم ہے کیونکہ یہ ہماری ساکھ کا سوال ہے۔“

”یس سر... اس کا کیا کرنا ہے؟“ شارپ نے گڑبڑا کر پوچھا۔

”کسی پارکنگ بلڈنگ میں چلو۔“ پروفیسر ایڈورڈ نے جوزف کو حکم دیا اور ایاز کو پاؤں سے ٹھوکر ماری۔ ”وہاں ہم اس کا قصہ نمٹا لیں گے۔“

جوزف پستہ قد لیکن گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا اور وہ یقیناً اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا ورنہ اس کے سامنے یہ لوگ یوں کھل کر ایک انسان کو ختم کرنے کی بات نہ کرتے۔ پروفیسر ایڈورڈ ایاز کی طرف جھکا۔ ”وین، کائل اور میخائل قیمتی آدمی تھے۔ البتہ ہیلن اسی انجام کی مستحق تھی۔ مجھے یقین ہے وہ ہمیں ڈبل کراس کر رہی تھی اور اس کے دل میں تمہارے لیے ہمدردی تھی۔“

ایاز نے ہیلن سے آخری ملاقات میں یہی محسوس کیا تھا۔ امینہ اس سے ہوٹل کی لابی میں ملی تھی اور جب امینہ نے اسے بتایا کہ ایاز اس سے ملنا چاہتا ہے تو پہلے اس نے انکار کر دیا تھا۔ امینہ کے مطابق وہ سخت خوف زدہ نظر آنے لگی تھی لیکن جب امینہ نے دوبارہ کہا تو وہ مان گئی۔ امینہ نے بعد میں اس کے ہیلن سے تعلق کو کریدنے کی کوشش کی تھی لیکن ایاز خود ٹھیک سے نہیں جانتا تھا، وہ اسے کیا بتاتا۔ البتہ امینہ کے ایک سوال کا اس نے قطعی جواب دیا تھا جب امینہ نے پوچھا تھا۔

”وہ تمہاری بیوی نہیں ہے لیکن تم اس سے محبت کرتے ہو؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ مجھے اچھی لگتی ہو لیکن میں اس سے محبت نہیں کرتا۔“ ایاز نے جواب دیا تھا اور پوری سچائی سے دیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا جواب سن کر امینہ خوش ہوئی تھی لیکن اس نے یہ بات ایاز سے چھپانے کی کوشش کی تھی پھر بھی اس نے محسوس کر لی تھی۔ ایاز چالیس برس کا پختہ کار آدمی تھا اور وہ جانتا تھا کہ دنیا کی کوئی عورت کسی غیر آدمی کا یوں بے غرض ساتھ نہیں دیتی... جب تک وہ اس کے لیے اپنے دل میں خاص جذبہ محسوس نہ کرے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا امینہ اس سے جدا ہو کر چلی گئی ورنہ وہ بھی ان لوگوں کے بھتے چڑھ جاتی اور جو انجام اس کا ہونے والا تھا وہی امینہ کا ہوتا۔

سیاہ وین ایک کثیر المنزلہ پارکنگ بلڈنگ کی طرف گھومی اور اس کے گول چکر کھاتے راستے پر اوپر کی طرف جانے لگی۔ یہ عام پارکنگ تھی اس لیے کسی نے سیاہ وین کو نہیں روکا۔ ویسے وہاں روکنے کے لیے کوئی نہیں تھا اور اتنی صبح سویرے پارکنگ مکمل طور پر ویران تھی۔ جوزف وین کو آخری منزل تک لے گیا جس کے بعد صرف کھلی چھت تھی۔ یہ جگہ کسی کی نگرانی اور مداخلت سے محفوظ تھی۔ یہاں وہ آرام سے اپنا کام کر سکتے تھے۔ وین بالکل آخری حصے میں رکی۔ یہ عمارت کا عقبی حصہ تھا جس کے ساتھ نیچے گہرائی میں ایک برساتی پانی نکالنے والا نالا تھا۔ یہاں دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ سب نیچے اتر آئے۔ ایاز کو بھی شارپ نے دھکا دے کر نیچے اتار دیا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر تھی لیکن وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے ابھی تک اس کا جسم مفلوج ہو۔ پروفیسر ایڈورڈ اس کے پاس بیٹھا۔

”تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟ میرا خیال ہے تم حواس میں آچکے ہو۔“

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ ایاز نے بڑی مشکل سے کہا۔

”کیونکہ میں یہی کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”میرا کام یہی ہے۔“

”تم کون ہو اور میں کون ہوں؟“ ایاز نے براہِ راست پوچھ لیا۔

”میں قاتل ہوں۔“ پروفیسر ایڈورڈ نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اچانک ایاز کے منہ پر گھونسا مارا۔ ”پیشہ ور قاتل... معاوضے لے کر لوگوں کو قتل کرتا ہوں۔ تم بھی قاتل

ہو لیکن ایک فرق ہے۔ میں باس ہوں اور تم میرے کارندے ہو۔ لڑکے، میں نے تمہیں تلاش کیا تمہارے اندر چھپے قاتل کو پہچانا اور پھر تربیت دے کر تمہیں اس مقام تک پہنچایا جہاں تم نے میرا ہی ایک مشن ناکام بنا دیا۔“ پروفیسر نے پھر اسے گھونسا مارا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر ایاز کے خلاف کھول رہا ہو۔ ”تم میرے کارآمد ترین آدمی تھے لیکن اب تم صرف کچرا ہو۔“

”باس! اسے ٹھکانے لگا دیں؟“ شارپ نے کہا۔ وہ ایاز کو قتل کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

ایاز کسی حد تک معاملہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تم نے دوسرے آدمی کو میری شخصیت کیوں دی؟“

”وہ بیک اپ تھا۔ ٹرین حادثے کے بعد تم کو ہاسپٹل لے گئے اور کچھ پتا نہیں تھا کہ تم کب ہوش میں آتے۔ ہیلن حادثے میں بچ گئی تھی اور وہ پولیس کا سامنا کیے بغیر ٹرین سے نکلنے میں کامیاب رہی۔“

”اوہ... تو اسی نے میری تمام چیزیں نکال لی تھیں؟“

”سوائے اہم ترین چیز کے۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”وہ تمہاری اور اپنی تصویر بھول گئی تھی۔ اس کے خیال میں وہ پرس میں تھی لیکن وہ پرس میں نہیں تھی اور اس کے پیچھے.....“

”بم کو ایکٹیویٹ کرنے والا کوڈ درج تھا۔“ ایاز نے کہا۔

پروفیسر ایڈورڈ کسی ٹیچر لیے کی طرح مسکرایا۔ ”اب تمہیں یاد آرہا ہے۔ وہ تصویر میں نے لی تھی۔“

ایاز کے ذہن میں جھماکا ہوا اور اس کے ذہن میں جھلک ابھری۔ وہ ایک گودام نما عمارت میں تھیں۔ اس کی ایک دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی شاندار..... تصویر لگی ہے جس میں نیویارک کے آئرش چرچ کا منظر دکھایا گیا تھا۔ اس پر تیز روشنی یوں ڈالی گئی تھی کہ منظر بالکل اصل لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ریستوران جیسی میز سامان اور دو کرسیاں لگی تھیں۔ لیکن کرسی پر وہ شخص بیٹھا تھا جو اس کی جگہ ایاز درانی بنا تھا۔ ہیلن اس کی گود میں تھی اور پروفیسر ایڈورڈ ان کی تصویر لے رہا تھا۔ ہیلن اور وہ شخص محبت کرنے والے میاں بیوی جیسا پوز دے رہے تھے۔ پروفیسر نے تصویر لی اور پکار اٹھا۔

”میخائل بوائے! تمہاری باری ختم... اب ایاز کی باری ہے۔“

تب ایاز نے خود کو دیکھا، وہ آرکرسی پر بیٹھا اور ہیلن اس کی گود میں آگئی۔ انہوں نے ویسا ہی میاں بیوی والا پوز دیا اور پروفیسر نے ان کی تصویر بھی اتار لی۔ اس کے ساتھ ہی منظر ختم ہو گیا۔ اس نے سر جھٹکا۔ ”تو یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا؟“

”ہاں۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”ہم کسی بھی مشن کے لیے بیک اپ پلان تیار رکھتے ہیں تاکہ ناکامی کا خدشہ کم سے کم رہے۔ یہ پانچ ملین ڈالرز کی ڈیل تھی جو ناکام رہی اور اب مجھے پارٹی کا ایڈوانس واپس کرنا پڑے گا۔ رقم سے بڑا نقصان میری ساکھ کو پہنچا ہے۔“

”تم دوبارہ کوشش کر سکتے ہو۔“

”نہیں، اب اس کا موقع نہیں ہے۔ یہ کام بہرصورت کل رات ہو جانا تھا، اس کے بعد یہ ممکن نہیں ہے۔“ پروفیسر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے تم مجھے معاف نہیں کرو گے۔“ ایاز نے کہا۔ ”لیکن تم مجھے میرے ماضی کے بارے میں تو بتا سکتے ہو۔“

”تم کیا جاننا چاہتے ہو؟“

”کیا میں واقعی ایاز درانی ہوں ایک زرعی سائنس داں؟“

”تم صرف ایاز درانی ہو اور تمہیں زرعی سائنس داں بنانے میں بہت محنت کی گئی ہے۔ تم دو مہینے تک ایک زرعی تحقیق کے انسٹی ٹیوٹ میں مشاہدہ کرتے رہے ہو۔ اگرچہ یہ مدت ناکافی تھی لیکن تم اور میخائل دونوں بہت ذہین ہو اور تم نے اس مضمون پر کافی حد تک عبور حاصل کر لیا تھا۔“

”تمہیں میرا سراغ کیسے ملا؟“

پروفیسر ایڈورڈ پہلی بار مسکرایا۔ ”تم نے اپنا سراغ خود دیا۔ تم نے پارسل سے ملنے والا موبائل فون آن کیا اور مجھے تمہارا سراغ مل گیا۔ موبائل میں ایک خاص چپ لگی ہے جو سگنل دیتی ہے۔“

”اوہ... تو اس طرح میرا سراغ ملا۔“ ایاز نے آہستہ سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے ہیلن نے مجھے دھوکا دیا۔ اسی نے مجھے اس پارسل کے بارے میں بتایا تھا۔“

”وہ غدار تھی۔ اسے صرف اس صورت میں تمہیں پارسل کے بارے میں بتانا تھا جب تم کسی وجہ سے مشن سے الگ ہو جاؤ اور میخائل تمہاری جگہ لے۔ اس کے بعد تمہیں واپس چلے جانا تھا۔ اسے موبائل میں لگی چپ کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔“

شارپ اس کے سر پر کھڑا تھا اور اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پروفیسر ایڈورڈ جواب دے کر وین میں جانے لگا تو ایاز نے اسے روکا۔ ”پلیز... بس ایک سوال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا جواب اور دے جاؤ۔ ہیلن سے میرا کیا تعلق تھا؟"

پروفیسر نے غور سے اسے دیکھا۔ "سب جانتے ہیں وہ تم سے محبت کرتی تھی۔"

"تھی ....؟" ایاز نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں، وہ اب نہیں رہی ہے۔ ہوٹل میں ہونے والے بلاسٹ میں ماری گئی۔ اس کا صرف ایک پاؤں دستیاب ہوا ہے۔" پروفیسر نے کہتے ہوئے شارپ کو اشارہ کیا اور وین میں چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی شارپ نے فرش پر بیٹھے ایاز کے گرد چکر لگایا اور اچانک اس کے سینے پر ٹھوکر ماری۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ شارپ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ "تم نے صرف مشن ہی تباہ نہیں کیا بلکہ ہمیں بہت سارے قیمتی ساتھیوں سے محروم کیا ہے۔"

ایاز تکلیف زدہ انداز میں مسکرایا۔ "بس تم بچ گئے۔"

"تم فکر مت کرو، تمہارے لیے میں کافی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے ایاز کو پھر ٹھوکر ماری تو وہ دوبارہ لڑھک گیا۔ پھر شارپ پر جنون طاری ہو گیا۔ وہ پے در پے اسے ٹھوکریں مارنے لگا۔ ایاز بچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی کوشش ناکام جا رہی تھی۔ گزشتہ رات کے ہنگاموں اور پھر کرنٹ کے شدید جھٹکے نے اسے جسمانی طور پر کمزور کر دیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود جوزف وین سے باہر نہیں آیا تھا۔ اس نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ایاز کے لیے شارپ ہی کافی تھا۔ جب وہ ٹھوکریں مارتے ہوئے تھک گیا تو اس نے پستول نکال لیا اور دانت پیس کر کہا۔

"تم ہمارے گروپ میں نمبر دو تھے لیکن اب تم کچھ بھی نہیں ہو۔ باس کے الفاظ میں صرف کچرا ہو۔ کیا تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں ہے؟"

ایاز نے اس کے تاثرات سے جان لیا کہ وہ اسے شوٹ کرنے جا رہا ہے لیکن اسے خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ جس دنیا کا باسی تھا، اس میں آدمی کو طبعی موت کم نصیب ہوتی ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے ذہنی طور پر مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ ماضی مجھے یاد نہیں ہے ورنہ اس پر پچھتاتا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے بہت سارے لوگوں کو مرنے سے بچالیا۔"

"اب خود کو نہیں بچا سکو گے۔" شارپ نے پستول اس کے سر کی طرف کیا۔ "گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔"

ایاز نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس وقت تم مجھ سے کوئی بات نہیں منوا سکتے... ہاں مجھے مار ضرور سکتے ہو۔"

لمبے آدمی کی آنکھوں میں قاتل چمک اور خوشی نمودار ہوئی جیسے وہ اپنا پسندیدہ کام کرنے والا ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا، کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ ایک کار نیچے سے آنے والے راستے سے گھوم کر تیزی سے ان کی طرف آ رہی تھی۔ چند لمحے وہ دیکھتا رہا پھر جیسے ہی اس کی نظر ڈرائیونگ سیٹ پر موجود امینہ پر پڑی، اس نے پستول کا رخ اس کی طرف کر کے فائرنگ شروع کر دی۔ پہلی گولی شیشے پر لگی تو امینہ چیخ مار کر جھک گئی۔ اس کی چیخ سن کر ایاز کا دل رک گیا لیکن کار کی رفتار میں کوئی کمی نہ پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ لمبے آدمی نے تین فائر کیے تھے۔ چوتھا فائر کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ کار اس سے ٹکرائی۔ وہ اوندھے منہ بونٹ پر گرا اور کار اسے لیتی ہوئی سیاہ وین سے جا ٹکرائی۔ اس تصادم نے یقیناً لمبے آدمی کی ٹانگوں کی ہڈیاں چور چور کر دی تھیں۔ اس کے منہ سے دردناک چیخ نکلی لیکن اس نے پستول نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس فکر میں تھا کہ امینہ سر اٹھائے تو وہ اسے شوٹ کر دے۔ ایاز اس کے عزائم بھانپ کر چلایا۔

"امینہ! سر اوپر مت کرنا۔ کار ریورس کرو۔"

امینہ نے یہی کیا اور کار پیچھے لے گئی۔ شارپ نیچے گر گیا اور کھڑے ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اس کے دونوں گھٹنے ٹوٹ گئے تھے اور اس حالت میں بھی وہ مقابلہ کر رہا تھا۔ تصادم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے جوزف کو جھٹکے سے دروازے سے پرے مارا۔ وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ پروفیسر ایڈورڈ پچھلے حصے میں محفوظ تھا اور اب چلا چلا کر جوزف کو وین نکالنے کو کہہ رہا تھا لیکن جوزف ہوش میں کہاں تھا جو اس کے حکم کی تعمیل کرتا۔ امینہ کار کو دس بارہ گز دور لے گئی۔ اس نے ابھی تک سر نہیں اٹھایا تھا لیکن وہ ایک نظر منظر دیکھنا چاہتی تھی۔ شارپ اب پستول کار کی طرف کیے گھٹنوں کے بل ساکن کھڑا تھا۔ وہ انتظار میں تھا کہ امینہ سر اٹھائے تو وہ اسے شوٹ کر دے۔ ایاز پھر چلایا۔

"امینہ! اوپر مت ہونا۔"

شارپ نے ایک گالی دی اور ہاتھ ایاز کی طرف گھما کر ایک فائر کیا۔ ایاز بروقت زمین پر گرا تھا۔ گولی اس کے پاس سے گزر گئی لیکن اس کے گرنے کے انداز سے شارپ سمجھا کہ گولی اسے لگ گئی ہے۔ ایاز کا رخ دوسری طرف تھا اس لیے وہ صرف کار کی آواز سن سکا۔ فائر کی آواز نے امینہ کو پاگل کر دیا اور اس نے نتیجتاً تیسرے گیئر میں کار دوڑا دی تھی۔ پیچھے

اور شارپ نے پے در پے فائر کیے۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا تھا اس لیے اس بار کار نے اسے سینے سے نشانہ بنایا اور ایک بار پھر لے جا کر وین سے ٹکرا دیا۔ شارپ کا حشر ہو گیا تھا اور وہ بے جان سا ہو کر بونٹ پر گر گیا۔

اس تصادم نے سیاہ وین کو جو بالکل کنارے پر کھڑی تھی، مزید دھکیلا اور وہ کنارے سے لگی ریلنگ توڑتی ہوئی نیچے برساتی نالے میں گرنے لگی۔ امینہ اب سیدھی ہو گئی تھی اور کار کو ریس دے رہی تھی۔ وین لٹک رہی تھی لیکن ابھی کنارے سے ذرا دور تھی۔ ایاز نے پلٹ کر دیکھا اور امینہ کا ارادہ بھانپ کر چلا کر اسے منع کرنے لگا۔ وین کو دھکیلنے کی کوشش میں کار کے گرنے کا خطرہ بھی تھا لیکن امینہ نے نہیں سنا۔ اس کے ہوش گم تھے اور وہ ایک خاص ذہنی کیفیت میں آ گئی تھی۔ اس نے دانت بھینچ کر کار کو پورا ایکسلریٹر دیا اور اس بار وہ وین کو کنارے سے دھکیلنے میں کامیاب رہی۔ ساتھ ہی اس نے بروقت بریک لگائے ورنہ وہ بھی یقیناً وین کے ساتھ ہی جاتی۔ چند لمحے بعد پہلے وین گرنے کی آواز آئی اور پھر دھماکے سے اس کا پیٹرول ٹینک پھٹ گیا۔ آگ کا گولہ پارکنگ کی اوپری منزلوں تک آیا۔ ایاز بمشکل اٹھا اور کار کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور ساکت بیٹھی امینہ کو سہارا دے کر باہر نکالا۔ وہ شاک کی کیفیت میں تھی۔ ایاز نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں۔" وہ جیسے خواب میں بولی۔ "اب میں بھی قاتل بن گئی ہوں۔"

"تم نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔" ایاز نے کہا۔ "تم نے جو کیا ہے، اپنے اور میرے دفاع میں کیا ہے۔"

"واقعی۔" امینہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "اب جلدی سے کار سے اپنے ہاتھوں کے نشانات صاف کرو۔ ہمیں پولیس کے یہاں آنے سے پہلے نکل جانا ہے۔"

☆☆☆

پروفیسر حبیب کا جسم کرسی پر ساکت پڑا تھا۔ صبح ہو چکی تھی اور کھڑکی کے باہر روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پروفیسر کی بلی ڈولی اس کے پاؤں کے پاس بیٹھی تھی اور اب اسے بھوک لگنے لگی تھی۔ وہ اچھل کر پروفیسر کے جسم پر چڑھی اور اس کے منہ کے پاس آ کر فریاد بھری میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اچانک پروفیسر کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کی سانس تیز اور نمایاں ہونے لگی اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر وہ خالی ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تو بلی نیچے کود گئی۔ پروفیسر اٹھ کر کچن میں آیا اور اس نے سنک کا نل کھول کر اس سے براہ راست پانی پینا شروع کر دیا۔ پانی پی کر اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے سب سے پہلے گھر کا معائنہ کیا۔ پروفیسر ایڈورڈ یا وہ جو کوئی بھی تھا، وہاں سے جا چکا تھا۔ پروفیسر حبیب نے اطمینان کا سانس لیا۔

ایسا وہ زندگی میں کم ہی پھنسا تھا اور جب اس نے پروفیسر ایڈورڈ کو اپنا کمپیوٹر کھنگالتے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ اسے نہیں چھوڑے گا۔ اس پر پروفیسر حبیب کو پہلے ہی شک ہو گیا تھا جب اس نے نقلی ایاز درانی کی اتنی شدومد سے حمایت کی تھی۔ پھر اس نے بوسنیا کا حوالہ دیا تو پروفیسر چونک گیا۔ اگر وہ اس کے اس ماضی سے واقف تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ دشمن کیمپ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا لہجہ بتاتا تھا کہ اس کا تعلق مشرقی یورپ سے ہے اور مشرقی یورپ ایک زمانے میں سوویت یونین کے زیر اثر تھا۔ بوسنیا میں سربوں کی پشت پر روس تھا۔

پروفیسر حبیب نے محسوس کیا کہ وہ اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ جسمانی طور پر کمزور تھا اور نہتا بھی جبکہ پروفیسر ایڈورڈ یقینی طور پر مسلح تھا۔ پھر وہ قاتل تھا۔ اب پروفیسر حبیب کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنا خاص حربہ استعمال کرے اور اپنی جان بچائے۔ اس پڑیا میں ایک خاص بوٹی کا سفوف تھا۔ اسے کسی گرم مشروب میں شامل کر کے پینے سے انسان تقریباً موت جیسی کیفیت میں چلا جاتا تھا اور اس کے دل کی دھڑکن بہت سست ہو جاتی تھی۔ چہرہ نیلا پڑ جاتا اور جسم سے کڑوے باداموں جیسی بو آنے لگتی تھی۔ اس سے یوں لگتا جیسے اس نے سائنائڈ کا زہر کھا لیا ہے۔ اسے امید تھی کہ پروفیسر ایڈورڈ دھوکا کھا جائے گا اور اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ جائے گا۔ اس کی توقع پوری ہوئی۔ سفوف کا اثر پانچ چھ گھنٹے بعد ختم ہو جاتا تھا لیکن وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا، اس لیے اثر ختم ہونے میں زیادہ وقت لگ گیا۔

پروفیسر نے ڈولی کو اس کا کھانا دیا اور خود ٹی وی آن کر کے یونیورسٹی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ناشتا وہ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں کرتا تھا۔ جب وہ شیو بنا رہا تھا تو نیوز کاسٹر ایک واقعے کی خبر دے رہا تھا۔ ایک پارکنگ بلڈنگ میں شدید فائرنگ کے بعد ایک وین آخری فلور سے نیچے جا گری تھی۔ دو افراد اس کے اندر مارے گئے تھے اور ایک کی لاش وین سے باہر ملی تھی۔ وین میں ملنے والی لاشیں جل کر ناقابل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شناخت ہوگئی تھیں۔ پروفیسر حبیب واش روم سے باہر آیا تو ٹی وی پر جائے حادثہ کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ کیمرے نے ایک بیت کو فوکس کیا جو حیرت انگیز طور پر جلنے سے بچ گیا تھا اور پروفیسر حبیب کو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ مسکرایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر سلطان، حمید الغزالی اور نور پاشا کے ساتھ ایک پریس کانفرنس میں اپنی ایجاد کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میری تیار کی ہوئی گندم جیناتی طریقوں سے تیار کردہ ہائی برڈ گندم سے مختلف اور کہیں بہتر ہے۔ یہ اپنا بیج خود پیدا کرتی ہے۔ ہر موسم اور ہر زمین پر اُگ سکتی ہے اور اس پر بیماریوں کا حملہ کم ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ساری دنیا کے غریب کسانوں کے لیے نہایت کم قیمت پر دستیاب ہے۔ افرو ایشیا کمپنی اس گندم کا دس ہزار ٹن بیج تیار کر چکی ہے جو کل سے دنیا کے کئی ممالک میں عام اور سستے داموں دستیاب ہو گا۔ غریب کسانوں اور تیسری دنیا کے ممالک کے لیے یہ سائنس دان جناب حمید الغزالی اور جناب نور پاشا کا تحفہ ہے۔''

پریس کانفرنس میں موجود تمام شرکا جوش سے تالیاں بجانے لگے۔ پریس کانفرنس استنبول کے ایک اور معروف ہوٹل میں ہو رہی تھی۔ استنبول ائرپورٹ پر بڑی ٹی وی اسکرین پر پریس کانفرنس لائیو دکھائی جا رہی تھی۔ پورے ایک ہفتے بعد آج ائرپورٹ پروازوں کے لیے کھول دیا گیا تھا۔ ایاز نے کہا۔ ''یہ تحفہ ان استعماری طاقتوں کے لیے جھٹکا ہے جو دنیا کے خوراک کے وسائل پر قابض ہو کر غریب ملکوں کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہیں۔''

''کیا انھوں نے ہی ہوٹل میں بلاسٹ کی سازش کی تھی؟'' امینہ نے پوچھا۔ گولڈن کرل بالوں اور آئی بروز کے مختلف انداز سے وہ مشکل سے ہی امینہ کے طور پر پہچانی جا رہی تھی۔

''یقین سے کہنا مشکل ہے۔'' ایاز نے کہا۔ ''آندرے (پروفیسر ایڈورڈ) اس قسم کے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ پارٹی کون ہے اور کس کام کا کیا معاوضہ دے رہی ہے اور اس کی کس سے کیا دشمنی ہے، ہم اس سے بے خبر ہوتے تھے۔ یہ باتیں صرف آندرے جانتا تھا۔ ہمارا کام اس کے دیے ہوئے پلان کے مطابق مشن کو انجام دینا ہوتا تھا۔''

''اب اس گروہ کا کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں، آندرے کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ اس کے سارے ہی اہم ارکان مارے جا چکے ہیں اور جو چند ایک معمولی درجے کے لوگ بچے ہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

ایک پورا دن ایاز اور امینہ کے لیے بہت مصروف گزرا تھا۔ ایاز کو اپنا ماضی یاد آ گیا تھا۔ اس نے ایک واقف کار سے امینہ اور اپنے لیے میاں بیوی کی حیثیت سے نقلی پاسپورٹ بنوائے تھے۔ ان کی مدد سے وہ افریقا جاتے اور وہاں جنوبی افریقا پہنچ کر دوسرے پاسپورٹ بنواتے اور پھر آسٹریلیا کا سفر اختیار کرتے۔ ایاز کا ارادہ وہ حالات دیکھ کر وہیں رہائش اختیار کرنے کا تھا اور اگر کوئی مشکل ہوتی تو پھر وہ ایشیا یا اوشیانا کے کسی چھوٹے ملک نکل جاتے جہاں وہ دولت کے بل بوتے پر سکون سے باقی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ایاز کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس گروپ کے ساتھ اس نے بہت کمایا تھا۔ یہ ساری دولت اس نے دنیا کے مختلف بینکوں میں جمع کرا رکھی تھی اور وہ دنیا میں کہیں سے بھی ان اکاؤنٹس سے رقم نکلوا سکتا تھا۔ استنبول میں بھی بینک اکاؤنٹ کام آئے تھے کیونکہ دونوں پاسپورٹ بنوانے اور کچھ دوسرے کاموں پر ان کے بیس ہزار ڈالرز سے زیادہ خرچ ہوئے تھے۔ پولیس اسے اور امینہ کو دوسرے معاملات میں تلاش کر رہی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر کوپاک پیلس ہوٹل کے منیجر شہابت پاشا نے پولیس کو ان کے بارے میں نہیں بتایا تھا اس لیے وہ بم بلاسٹ کیس میں شامل نہیں تھے۔ اگر اس کیس میں ان کا نام آ جاتا تو یقیناً استنبول سے ان کا نکلنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

لاؤنج میں مصر جانے والی پرواز کا اعلان ہوا تو ایاز اور امینہ اپنے بیگ سنبھالتے ہوئے تیار ہو گئے۔ ان کے پاسپورٹ اور بورڈنگ کارڈ ان کے ہاتھ میں تھے۔ امینہ نے اپنا نام پڑھا۔ ''نورینہ غیاث... کیا یہ تمہارا اصل نام ہے؟''

''نہیں۔'' ایاز نے کہا۔ ''میرا اصل نام ایاز درانی ہی ہے۔ تمہیں برا تو نہیں لگا کہ تمہارا پاسپورٹ میری بیوی کی حیثیت سے بنا ہے؟''

امینہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر مسکرائی۔ ''نہیں، اس کے برعکس مجھے اچھا لگا... بہت اچھا لگا۔''

ایاز نے اس کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ حمائل کر دیا اور دونوں شانہ بشانہ طیارے میں سوار ہونے کے لیے چل پڑے۔ ان کا ماضی تاریک تھا لیکن انھیں یقین تھا کہ ان کا آنے والا کل ضرور روشن ہوگا۔

وہ دونوں اس وقت میڈم ایلی روز کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے جس کی دیواروں پر ہلکے گلابی رنگ کا وال پیپر لگا ہوا تھا۔ اس کا بغلی دروازہ بیڈ روم میں کھلتا تھا جہاں سے سبز رنگ کے وال پیپر کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی اور شاید اسی مناسبت سے میڈم روز اس کمرے کو بار بار گرین روم کہہ رہی تھی۔ ''جینٹلمین۔'' میڈم روز نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تقریباً رات دو بجے کا وقت ہوگا۔ میں گہری نیند سو رہی تھی اچانک ہی...''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ رات والے واقعے کو دہراتے ہوئے اس پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ لفظ ''اچانک'' پر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں افراد بھی چونک گئے۔ شاید وہ میڈم روز کی زبانی مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مقامی پولیس کا انسپکٹر جین مارٹن اور دوسرا پرائیویٹ سراغ رساں مائیکل جینز تھا۔ وہ اس انشورنس کمپنی کے لیے کام کرتا تھا جہاں سے میڈم روز نے بیمہ پالیسی لے رکھی تھی تاکہ آگ لگنے یا چوری ہونے کی صورت میں اس کے نقصان کا ازالہ ہو سکے۔

اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے لیکن ہیوس کے اس مضافاتی علاقے میں نسبتاً خاموشی تھی۔

''اچانک ہی...'' میڈم روز نے اپنی بات جاری رکھتے

برعکس

جمال دستی

عام معمولات تو زندگی کو غیر معمولی انداز فکر سے دیکھنے کا... ہنر ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا... ایک ایسے ہی سراغرساں کی کھوج و جستجو جس نے چوری کی ایک واردات کا سراغ لگا لیا تھا...

اس شخص کا قصہ جسے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔ ”راہداری میں کسی کے قدموں کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کمرے کی لائٹ جلائی اور بہ آوازِ بلند بولی... کون ہے۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا پھر میں نے یہ الفاظ دوبارہ دہرائے لیکن پھر بھی خاموشی رہی کیونکہ میں اکیلی رہتی ہوں اور یہاں کوئی الارم بھی نہیں لگا ہوا۔ اس لیے مجھے بستر سے اتر کر کمرے کے دروازے تک جانا پڑا۔ وہاں ایک نقاب پوش شخص میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں شور مچاتی، وہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔“

پولیس انسپکٹر اور پرائیویٹ سراغ رساں کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ اس عورت کی بہادری اور اس کے ساتھ پیش آنے والے ممکنہ وحشیانہ سلوک کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ میڈم روز کے چہرے پر بھی ابھی تک خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں کسی اجنبی کو اس میں کوئی جسمانی کشش محسوس نہ ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو چالیس سال کا ظاہر کرتی تھی لیکن میک اپ کی دبیز تہ کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کسی طرح بھی پچاس سے کم کی نہیں تھی۔

”تم کہہ رہی تھیں کہ وہ اجنبی شخص تم پر جھپٹا اور اس نے تمہیں نیچے گرا دیا۔“ پرائیویٹ سراغ رساں مائیکل نے اسے بولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔“ میڈم روز نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، اس نے مجھے نیچے نہیں گرایا بلکہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر مجھے راہداری میں پڑی ہوئی کرسی سے باندھ دیا۔“

”پھر وہ تمہارے بیڈروم یعنی گرین روم میں چلا گیا ہوگا؟“ انسپکٹر مارٹن نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں۔“ میڈم روز نے ایک بار پھر تصحیح کی۔ ”وہ گرین روم میں نہیں بلکہ ڈائننگ روم میں چلا گیا جہاں سے اس نے میرے چاندی کے برتن اٹھائے پھر وہ اس کمرے میں آیا جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں اور یہاں سے اس نے دیوار گیر گھڑی اور دو عدد چاندی کے فانوس اتارے۔ اس کے بعد...“

میڈم روز اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے کمرے کی ایک دیوار پر لگا ہوا پردہ ہٹا دیا جس کے پیچھے ایک چھوٹا سا سیف نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے زبردستی کھولا گیا ہو۔

”اس سیف میں خاندانی کاغذات کے علاوہ تیس ہزار فرانک بھی رکھے ہوئے تھے۔ چور وہ بھی لے گیا۔“

”تمہارے زیورات کہاں ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میں احتیاطاً انہیں یہاں نہیں رکھتی کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ چور اس طرح کی الماریوں پر شہد کی مکھیوں کی طرح لپکتے ہیں۔ اس لیے اپنے قیمتی زیورات اور دیگر اشیا بیڈ سائڈ کی دراز میں رکھتی ہوں۔“

”ایڈگر ایلن نے بھی کچھ ایسی ہی بات کی ہے کہ کسی چیز کو چھپانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے نہ چھپایا جائے۔“ سراغ رساں مائیکل بولا۔ ”اس کے بعد وہ یقیناً گرین روم میں گیا ہوگا اور اس نے تمہارے زیورات بھی چرا لیے ہوں گے؟“

”خدا کا شکر ہے کہ میرے زیورات محفوظ ہیں۔“ میڈم روز ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”چور میرے بیڈروم میں نہیں گیا۔ اس نے محض راہداری پر ایک نظر ڈالی اور جو سامان سمیٹ چکا تھا اسے لے کر چلا گیا۔ میں اسی حالت میں کرسی پر بندھی بیٹھی رہی۔ صبح آٹھ بجے گھر کے کام کرنے والی ملازمہ آئی تو اس نے میری رسیاں کھولیں اور منہ سے کپڑا نکالا۔“

یہ کہہ کر میڈم روز اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مائیکل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چور نے بیڈروم کا رخ کیوں نہیں کیا؟ یہ تو چوری کے اصول کے خلاف ہے۔ اکثر لوگ اپنی قیمتی اشیا بیڈروم میں ہی رکھتے ہیں۔“

”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ چور کے لیے بھی کمرے ایک جیسے ہیں۔ بس وال پیپر کا فرق ہے۔ اسے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ بیڈروم میں کوئی الماری یا سیف نہیں ہوتا جہاں سے کوئی قیمتی چیز مل سکے۔“

”زیورات کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ مائیکل نے پوچھا۔ ”یہ بات بہت سے لوگوں کے علم میں ہے کہ میڈم روز کے پاس انتہائی قیمتی پرل کا نیکلس اور ہیروں کا ہار ہے جس کی مالیت تقریباً ستّی لاکھ فرانک بنتی ہے۔“

”واقعی یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔“ مارٹن نے کہا۔

”میڈم روز خوش قسمت ہے کہ اس کے زیورات چوری ہونے سے بچ گئے۔ یہ زیورات اسے اتنے عزیز ہیں کہ اس نے زندگی گزارنے کے لیے اپنے گھر کی ہر چیز مثلاً قالین، فرنیچر اور پینٹنگ وغیرہ بیچ دیں لیکن زیورات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ یقیناً چور کو بھی یہ بات معلوم ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“ مارٹن بیزار ہوتے ہوئے بولا۔ ”لگتا ہے کہ یہ چور کوئی نوآموز ہے اور اس کا دھیان بھی اس جانب نہیں گیا ہوگا کہ زیورات بیڈ سائڈ کی دراز میں بھی رکھے جا سکتے ہیں۔“

انسپکٹر اور پرائیویٹ سراغ رساں کے تفتیش کرنے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ مارٹن اپنے حلیے اور صورت سے ہی پولیس والا نظر آتا تھا۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اس کے رعب میں اور اضافہ کرتی تھیں۔ وہ تفتیش کے سلسلے میں انہی اصولوں پر چلنے کا عادی تھا جو اس نے تربیت کے دوران سیکھے تھے۔ یہاں بھی اس نے اسی روایتی طریقے پر عمل کیا۔ اس نے بڑے غور سے فرنیچر، آتش دان، سیف اور سنگھار میز کا معائنہ کیا۔ فرش، دیواروں اور دروازے کے ہینڈل کو دیکھا۔ تاکہ کہیں اسے چور کی انگلیوں کے نشانات مل جائیں لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہا۔ یقیناً چور نے ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں ربڑ کے جوتے پہن رکھے تھے۔

اس کے برعکس مائیکل ہر کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر وہاں موجود تمام چیزوں کو اپنی نوٹ بک میں لکھتا رہا۔ وہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا اور چہرے پر چشمہ لگانے کے بعد سراغ رساں سے زیادہ کوئی ادیب نظر آتا تھا۔ ان دونوں کے انداز میں نمایاں فرق یہ تھا کہ اگر مارٹن کسی سراغ کی کھوج میں تھا تو مائیکل چور کے مقصد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ سوچنا سنسنی خیز تھا کہ چور نے محض دیوار گیر گھڑی، فانوس، چاندی کے برتنوں اور تیس ہزار فرانک کے لیے یہ خطرہ مول لیا ہوگا۔

اس دوران میں مارٹن، نوجوان سراغ رساں پر گہری نظر ڈالتا رہا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ مائیکل اپنا کام جلدی سے نمٹائے تاکہ وہ دونوں اس گھٹن زدہ ماحول سے نکل سکیں۔ اسے شدت سے تمباکو کی طلب ہو رہی تھی اور بار بار اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں رکھے ہوئے پائپ سے ٹکرا رہا تھا لیکن اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو باز رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف تو اسے میڈم روز کے جذبات کا خیال تھا تو دوسری جانب اس پر اس قدیم پُرشکوہ عمارت کی ہیبت طاری تھی جس کی برسوں پہلے تزئین و آرائش کی گئی تھی۔ گو کہ اب وہاں کچھ بھی نہ بچا تھا لیکن دیواروں پر لگے گلابی اور سبز وال پیپرز پرانے دور کی یاد دلا رہے تھے اور اس جیسے عام آدمی کو متاثر کرنے کے لیے یہی کافی تھا۔

اچانک مائیکل اس کے پاس آ کر بولا۔ ”کیا تم نے ہیسٹن لیروکس کی ’مسٹری آف یلو روم‘ پڑھی ہے؟“

مارٹن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح کی کتابیں پڑھنے میں اپنا وقت ضائع کر سکتا ہوں؟“

”ضروری نہیں کہ ہر کتاب کو پڑھ کر وقت ضائع ہونے کا احساس ہو۔“

مارٹن نے کندھے اچکائے لیکن کچھ نہیں بولا۔

”اس کتاب میں مصنف نے وہ سب طریقے بیان کیے ہیں جو کسی بھی بند کمرے کی نگرانی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔“ مائیکل نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

”میں نے بھی ایک فلم میں ایسا ہی کچھ دیکھا تھا۔“ مارٹن نے کہا۔ ”جس میں کوئی شخص کسی کمرے یا گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو فوراً پکڑا جاتا لیکن یہ سب کچھ فلموں اور کتابوں میں ہی اچھا لگتا ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہاں اس کتاب کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟“

”اس گرین روم کو دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کتاب میں جس کمرے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بند تھا جبکہ میڈم روز کے بیڈروم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چور بڑی آسانی سے وہاں جا سکتا تھا۔“

مارٹن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ اس لیے نہیں گیا کہ اسے پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ کہیں وہ نگرانی کرنے والے کیمرے کی زد میں نہ آ جائے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس خستہ حال فلیٹ میں ایسے کسی کیمرے کی موجودگی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟“

مائیکل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہا تھا۔ تبھی مارٹن نے وہ ہیرے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ واقعی بہت دلکش تھے۔ انسپکٹر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کھڑکی سے آنے والی سورج کی روشنی نے ان ہیروں کی چمک دمک میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ مائیکل بھی ان ہیروں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا البتہ اسے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ میڈم روز نے ان قیمتی ہیروں کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا تھا۔

اس کے بعد ان دونوں کے وہاں مزید رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ واپسی میں مارٹن خاصا افسردہ نظر آ رہا تھا اور اسے اس کیس میں بالکل بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسے سنگین جرائم مثلاً قتل، اغوا اور بینک ڈکیتی وغیرہ کی تفتیش میں مزہ آتا تھا جہاں اسے اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا بھرپور موقع ملتا اور دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے۔ نقب زنی کی یہ واردات اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور اسے کوئی نوآموز انسپکٹر بھی حل کر سکتا تھا بلکہ اس کے لیے تو شاید کوئی کانسٹیبل ہی کافی ہوتا۔

دوسری جانب مائیکل خاصا الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”حیرت کی بات ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود نیکلس کی خوب صورتی اور ہیروں کی چمک میں کوئی کمی نہیں آئی۔“

مارٹن حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کچھ نہیں، میں صرف اس کتاب کا ایک جملہ یاد کر کے محظوظ ہو رہا تھا۔"

مارٹن نے ہمدردی سے نوجوان سراغ رساں کو دیکھا اور بولا۔ "مجھے تو تمہارے بارے میں پریشانی شروع ہو گئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم کسی ماہر نفسیات سے اپنا معائنہ کرواؤ۔" پھر اس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ "ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ ایک ڈرنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کچھ دیر بعد وہ ایک قریبی کیفے کے ٹیرس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مائیکل نے اپنے پسندیدہ مشروب کا ایک گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ "فرض کرو کہ میڈم روز کے کمرے میں رکھے ہوئے ہیرے نقلی ہیں۔"

"کیا... کیا کہا تم نے؟" مارٹن چونکتے ہوئے بولا۔

"ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ماضی میں کسی وقت ہیروں کی جگہ ان کی ہو بہو نقل رکھ دی گئی ہو جس کا علم میڈم روز کو بھی نہ ہو اور اب ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ گزشتہ رات نقب زن کو کسی طرح یہ بات معلوم ہو گئی ہو۔ اس طرح اب ہمارے سامنے دو مفروضے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس نے گرین روم میں جانے کی زحمت کیوں گوارا نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ ہیرے نقلی ہیں۔"

"تم محض مفروضوں کی بنیاد پر یہ سب کہہ رہے ہو۔ بالفرض محال اگر یہ ہیرے نقلی بھی ہوں تو چور کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی؟"

مائیکل نے اس پر ایک نگاہ ڈالی جس میں ناگواری کا تاثر نمایاں تھا پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

وہ دونوں اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد انسپکٹر نے مڑ کر دیکھا۔ نوجوان سراغ رساں پرانی کتابوں کی ایک دکان پر کھڑا ہوا تھا۔ فرصت کے اوقات میں یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ ان دکانوں پر کھڑے ہو کر پرانی کتابیں چھانتا، ان کی ورق گردانی کرتا اور پھر ان میں سے ایک دو کتابیں منتخب کر کے انہیں خرید لیتا۔ مارٹن کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"کتابیں پڑھ پڑھ کر یہ شخص ایک نہ ایک دن پاگل ہو جائے گا۔"

اس رات مارٹن نے گشت کے دوران کئی دکانوں کا معائنہ کیا لیکن اس کا میڈم روز کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے ان دکانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ سب کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور وہاں کوئی گاہک نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ کھلے ہوئے دروازے کا بھی مسئلہ ہے کہ کوئی شخص اس میں داخل ہونا نہیں چاہتا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں میڈم روز کے گرین روم کا نقشہ گھومنے لگا۔

☆☆☆

ابھی میڈم روز والے معاملے میں کوئی پیش رفت نہ ہونے پائی تھی کہ اس میں ایک نیا موڑ آ گیا اور انسپکٹر مارٹن کو تسلیم کرنا پڑا کہ نوجوان سراغ رساں کا اندازہ درست تھا۔ میڈم روز اس واقعے کے بعد بہت خوف زدہ ہو گئی تھی چنانچہ اس نے ان جواہرات کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی جیولر کے پاس گئی جس سے کئی برس پہلے اس نے یہ زیورات خریدے تھے لیکن جیولر کا جواب سن کر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ہیرے نقلی ہیں۔

میڈم روز نے نامعلوم افراد کے خلاف اس واقعے کی شکایت درج کروائی اور اس کے ساتھ ہی انشورنس کمپنی کو اس نقصان کی تلافی کرنے کا نوٹس بھی بھیج دیا۔

"مجھے شک ہے کہ کمپنی اتنی آسانی سے ادائیگی کرے گی۔" مائیکل نے مارٹن کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ اب یہ معاملہ اس کتاب میں بیان کردہ واقعے سے اور قریب ہوتا جا رہا ہے جس کا ذکر میں نے تم سے کیا تھا۔ البتہ اس کیس میں اس کے برعکس عمل کیا گیا۔"

"اچھا لطیفہ ہے۔" مارٹن نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔"

"اچھا تو پھر اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

"بالکل سادہ سی بات ہے۔ یہ دونوں کیس ایک دوسرے کے برعکس لیکن ملتے جلتے ہیں۔ لیوہ کس کے تصوراتی ایڈونچر میں چور تمام مشکلات کے باوجود کمرے میں داخل ہو جاتا ہے لیکن اس کیس میں چور....."

"دروازہ کھلا ہونے کے باوجود کمرے میں قدم نہیں رکھتا۔" مارٹن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ تو تم مجھے پہلے بھی بتا چکے ہو۔ اب اس میں نئی بات کیا ہے؟"

"نئی بات یہ ہے کہ ناول میں چور کمرے میں داخل ہونے کے بعد اپنی کارروائی کرتا ہے لیکن اس کے برعکس اس کیس میں کمرے میں داخل ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ اصلی ہیرے پہلے ہی غائب کر دیے جا چکے ہیں۔"

"وہ کون ہو سکتا ہے جس نے یہ حرکت کی ہوگی؟"

"مجھے پورا یقین ہے کہ یہ کام میڈم روز کا ہے۔"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"انسپکٹر مارٹن! اس نکتے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔" مائیکل نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میڈم روز قلاش ہو چکی ہے اور اسے پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔ اب تک وہ ایک ایک کر کے گھر کا سامان بیچتی رہی اور وہ سارا فرنیچر ٹھکانے لگا دیا جو بڑے شوق سے اس اپارٹمنٹ کی تزئین و آرائش کے لیے خریدا گیا تھا۔ اب اسے پھر پیسوں کی ضرورت پڑی لیکن اس کے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہیں تھا لہٰذا اس نے ان قیمتی جواہرات کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا جو وہ نہیں چاہتی تھی چنانچہ اس کے لیے اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔"

"وہ کیا؟" مارٹن کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"اس نے بڑے خفیہ طریقے سے ان جواہرات کی نقل بنوائی پھر ایک مصنوعی ڈکیتی کا ڈراما تخلیق کیا جو اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھی۔ اس نے خود ہی اپنا سیف توڑا اور وہاں سے تیس ہزار فرانک نکالنے کے علاوہ ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی گھڑی، فانوس اور کچھ چاندی کے برتن بھی سمیٹ لیے پھر جب ہم وہاں پہنچے تو اس نے ہماری توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کرائی کہ نقب زن، گرین روم میں نہیں گیا تھا۔ یہ بھی اس کی ایک چال تھی۔ شاید وہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرنا چاہ رہی تھی کہ چور کو ان ہیروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس طرح ہم شک میں پڑ جائیں کہ آیا وہ ہیرے نقلی تو نہیں تھے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ اصلی ہیرے بہت عرصہ پہلے چرائے جا چکے ہیں۔"

"لیکن چور کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ بیڈ روم کی دراز میں رکھے ہوئے جواہرات نقلی ہیں؟"

"پہلے میری پوری بات تو سن لو پھر یہ نکتہ بھی تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ اس کے بعد واقعات اسی ترتیب سے آگے بڑھتے گئے جس طرح میڈم روز نے منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ اپنے ہیرے لے کر جیولر کے پاس گئی اور وہاں یہ انکشاف ہوا کہ وہ ہیرے نقلی ہیں۔ اس نے نامعلوم افراد کے خلاف شکایت درج کروائی کہ کسی نے اس کے ہیرے چرا کر نقلی ہیرے رکھ دیے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے انشورنس کمپنی سے اپنے مطلوبہ معاوضے کا مطالبہ بھی کر دیا۔ اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہی تھی۔ اصلی ہیرے تو اس نے پہلے ہی ادھر ادھر کر دیے تھے۔ اب ان کی چوری کا واویلا مچا کر وہ ایک بڑی رقم بٹورنا چاہ رہی ہے۔"

"تمہاری تھیوری کافی پیچیدہ ہے لیکن اسے مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" مارٹن نے کہا۔ "اس کے علاوہ میری نظر میں ایک اور مشتبہ شخص بھی ہے۔ ہم اس جیولر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جس نے ماضی میں میڈم روز کے ہاتھ یہ ہیرے فروخت کیے تھے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں بہتر طور پر ان ہیروں کی نقل تیار کر سکتا تھا۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ اسی نے اس نقب زنی کا اہتمام کیا ہو۔ اسے صرف اتنا کرنا تھا کہ اس واردات کے بعد وہ میڈم روز کا انتظار کرے اور جب وہ اپنے ہیرے لے کر اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے آئے تو انہیں نقلی قرار دے دے۔ ان دونوں کے درمیان بھی طے ہوا ہوگا۔ اس طرح اس کی طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جا سکتا۔"

"یہ بھی ممکن ہے۔" مارٹن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن دونوں صورتوں میں ہم اسے کس طرح ثابت کر سکیں گے؟"

☆☆☆

چار دن بعد انسپکٹر مارٹن کو ثبوت بھی مل گیا۔ جیولر کے گودام کی تلاشی کے دوران اس نے خالی ڈبوں کے ڈھیر تلے میڈم روز کی دیوار گیر گھڑی، فانوس اور چاندی کے برتن دریافت کر لیے۔ توقع کے مطابق جوہری نے اپنی معصومیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے گودام میں ان اشیا کی موجودگی کے بارے میں لاعلم تھا اور یہ کہ کسی نے اسے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی گرفتاری کے باوجود اصلی ہیروں کا پتا لگانا ممکن نہ ہو سکا۔

مائیکل کو انسپکٹر مارٹن کی رائے سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ کسی طرح بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس واردات میں جیولر کا ہاتھ ہو سکتا ہے بلکہ وہ اب بھی میڈم روز پر ہی اپنے شبہے کا اظہار کر رہا تھا۔

"وہ اس جوہری کی پرانی واقف کار ہے اور اس کا وہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس لیے وہ بہ آسانی یہ اشیا اس کے گودام میں چھپا سکتی ہے۔"

مارٹن نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میڈم روز کا پیچھا چھوڑ دو۔ لگتا ہے کہ تم ان دنوں کچھ زیادہ ہی جاسوسی ناول پڑھ رہے ہو۔"

دو ہفتے گزر گئے۔ اس دوران میں مائیکل بڑی مستقل مزاجی سے میڈم روز کے گھر اور اس کے گرد و نواح کی نگرانی کرتا رہا۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتی تو اس کا تعاقب کرتا۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ میڈم روز کے معمولات کیا ہیں۔ وہ کن لوگوں سے ملتی ہے، کہاں جاتی ہے۔ خاص طور پر وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جوہری کے ساتھ اس کے رابطوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے اس کیس کے حل ہونے میں مدد مل سکتی۔ ایک دن مارٹن اس کے پاس آیا۔ وہ اس وقت بھی میڈم روز کے گھر کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''میں اب بھی تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کروں گا۔ تمہیں اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔''

''جب تک ہیرے دستیاب نہیں ہو جاتے، میرا خیال ہے کہ ہمیں اس جوہری کو شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دینا چاہیے۔'' مائیکل نے ایک بار پھر جوہری کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

مارٹن کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولا۔ ''میری یہاں آمد اتفاقیہ نہیں ہے بلکہ میں تمہیں اس ڈیوٹی سے فارغ کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' مائیکل چونکتے ہوئے بولا۔

''جوہری واقعی بے گناہ ہے اور اسے تھوڑی دیر پہلے رہا کر دیا گیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میڈم روز بھی بے قصور ہے۔''

''کیا تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟''

''ہاں، میں ان اصلی ہیروں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔''

''یہ تمہیں کہاں سے ملے؟'' مائیکل نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اب مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم واقعی ہم سے مذاق کر رہے تھے۔ یہ ہیرے تمہارے بیڈ روم سے ملے ہیں جنہیں بڑی احتیاط سے چوبی فرش کے نیچے چھپایا گیا تھا۔''

مائیکل کا چہرہ شیشے کی طرح سفید پڑ گیا۔

مارٹن نے ہاتھ کے اشارے سے ایک ٹیکسی کو روکا اور بولا۔ ''پولیس ہیڈ کوارٹر۔''

جب وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تو مارٹن بولا۔ ''تم نے بڑی ہوشیاری سے میری توجہ اس کتاب میں بیان کردہ قصے اور اس واردات کے متوازی پن کی جانب مبذول کرنے کی کوشش کی لیکن تم سے ایک غلطی ہو گئی۔ گو کہ میں نے ساری زندگی کوئی جاسوسی ناول نہیں پڑھا لیکن تمہارے توجہ دلانے پر مجھے یہ ناول خریدنا پڑا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اگر یہ واردات کتاب میں بیان کردہ قصے کے برعکس ہے تو پھر آخر تک یہ اختلاف برقرار رہنا چاہیے۔ مثلاً کتاب میں بیان کردہ واقعے میں بھی ایک سراغ رساں اور پولیس آفیسر کا ذکر ہے اور آخر میں وہی پولیس آفیسر مجرم ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حساب سے میڈم روز والی واردات میں پولیس آفیسر یعنی مجھ کو ایماندار اور پرائیویٹ سراغ رساں یعنی تمہیں مجرم ہونا چاہیے۔

''پہلے تو مجھے اس نتیجے پر بہت ہنسی آئی پھر میں نے اس بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ تمہارے لیے یہ سب کچھ کرنا بہت آسان تھا۔ پہلے تم نے میڈم روز کے ڈرائنگ روم سے گھڑی اور دوسرا سامان چرایا اور پھر جب ہم وہاں تفتیش کے لیے گئے تو تم نے بڑی ہوشیاری سے میری آنکھوں میں دھول جھونک کر عین میری ناک کے نیچے وہ ہیرے جیب میں ڈال لیے اور ان کی جگہ نقلی ہیرے رکھ دیے۔ پھر تم نے مجھے سنانے کے لیے وہ عجیب و غریب جملہ بولا کہ نیکلس کی خوب صورتی اور ہیروں کی چمک ابھی تک برقرار ہے۔ اس کے بعد تم نے میری توجہ ہٹانے کے لیے مختلف باتیں کرنا شروع کر دیں۔ کبھی کہا کہ یہ ہیرے بہت پہلے چوری ہو گئے تھے۔ اس کے بعد تم نے میڈم روز پر ہی شک کرنا شروع کر دیا۔ جب میں نے جوہری کے ملوث ہونے کا امکان ظاہر کیا تو تم نے میرا شک یقین میں بدلنے کے لیے چوری شدہ اشیا اس کے گودام میں رکھ دیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسے بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے اور دوسری طرف میڈم روز کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ تمہارا مقصد صرف یہ تھا کہ میں ان دونوں میں الجھا رہوں اور میرا دھیان کسی اور طرف نہ جا سکے۔ میں شاید کبھی اس نتیجے پر نہ پہنچ پاتا اگر تم خود مجھے ساتھ اس واردات کا موازنہ اس کتاب سے نہ کرتے اور مجھے اسے خریدنے پر مجبور نہ کرتے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس کہانی کا انجام بھی اس کتاب میں بیان کردہ واقعے کے برعکس ہو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' مائیکل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ غالباً وہ مارٹن کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''اس کتاب میں پرائیویٹ سراغ رساں سب کچھ جاننے کے باوجود پولیس مین کو قانون کی گرفت سے دور ہونے کی اجازت دے دیتا ہے، لہٰذا اب اس کے برعکس ہونا چاہیے۔ یعنی پولیس مین بے ایمان سراغ رساں کو بھاگنے کی اجازت نہ دے۔ تم اس کے لیے مجھے مورد الزام ٹھہرا سکتے ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ہتھکڑی نکالی اور پھرتی سے مائیکل کی کلائی میں پہنا دی پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب جان گیا ہوں کہ کتابیں پڑھنے میں ہمیشہ ہی وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی ان کی مدد سے کئی گتھیاں بھی سلجھ جاتی ہیں۔''

اعترافِ رقابت

سیریں نازش

جہاں کے تمام عناصر پر تغیر ہے حاوی... لیکن ایک محبت ہے جو ہر وقت جواں رہتی ہے... چاہے عمر رواں کتنے ہی سنگ میل عبور کر جائے... ایک محبت گزیدہ... ستم رسیدہ شخص کا ماجرا... جو ایک بار امانت کو نہایت مستقل مزاجی و جانفشانی سے رگ جاں بنائے بیٹھا تھا...

آزمائش مسلسل اور اذیت ناک دور سے فرار حاصل کرنے والے شخص کا اعترافِ حقیقت

جم لیسے بہت اداس تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جب وہ بس کے اسٹاپ پر بس سے اترا اور جان بوجھ کر گھر جانے کے لیے لمبا راستہ اختیار کیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے... لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اسے اپنی ذات کا غم نہیں تھا۔ وہ ارینا کے بارے میں فکر مند تھا۔ ارینا کی عمر انیس سال تھی۔ وہ بہت کھلنڈری، لاابالی، خودسر، ضدی اور مغرور لڑکی تھی۔ اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات بات پر غصہ آجاتا تھا۔ اکثر اس کی وجہ سے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہوجاتا تھا۔ یہ جم لیے کی ہی ذات تھی جس کی وجہ سے قصبے کے زیادہ تر لوگ ارینا کی غلطیوں کو درگزر کردیا کرتے تھے۔ جم جانتا تھا کہ قصبے والے اس کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کب تک چلے گا؟ آج وہ زندہ ہے اور ارینا کے سر پر چھتری کی طرح چھاؤں کیے کھڑا ہے۔ جب وہ نہ ہوگا، تب اس لڑکی کا کیا بنے گا؟ انہی سوچوں میں غلطاں وہ گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آج صبح وہ ڈسٹرکٹ اسپتال گیا تھا۔ کل شام ہی ڈاکٹر کارمیلا نے اُسے فون کرکے آنے کے لیے کہا تھا اور اب وہ وہیں سے لوٹ رہا تھا۔

جم لیے کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ وہ محنتی انسان تھا۔ اس کا جسم کسرتی اور صحت قابلِ رشک تھی لیکن چند ماہ سے اس کا وزن گرنے لگا تھا۔ چلتے ہوئے سانس پھولنے لگتی۔ اب اس کے ہاتھوں میں بھی وہ مضبوطی نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ اس نے اپنی جسمانی حالت کو بڑھتی عمر کا تقاضا سمجھا۔ ایک ماہ پہلے اسے سینے میں شدید درد اٹھا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ شاید گیس کا اثر ہوگا لیکن جب تکلیف کم نہ ہوئی تو اس کا ایک قریبی دوست آدھی رات کو اسے لے کر اسپتال پہنچا۔ ڈاکٹرز نے اسے وہ دن اسپتال میں رکھا اور مختلف طبی ٹیسٹ کیے تاہم یہ بتائے بغیر تیسرے دن اسے گھر بھیج دیا کہ اسے کیا مرض لاحق ہے۔ البتہ یہ ہدایت ضرور کی تھی کہ وہ ہفتے میں ایک بار معائنے کے لیے ضرور آتا رہے۔

اُس صبح جب وہ ڈاکٹر کارمیلا کے بلانے پر اسپتال گیا تو اس نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اسے پھیپھڑوں کا کینسر ہے اور یہ اتنا پھیل چکا ہے کہ اب نہ تو آپریشن ممکن ہے نہ دوا سے علاج کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ جو ٹیسٹ کیے گئے تھے، ان کے تفصیلی معائنے سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وہ اب صرف ایک دو ہفتوں کا ہی مہمان ہے۔ جم لیے نے نہایت سکون سے اپنی زندگی کے خاتمے کی پیش گوئی سنی اور پھر چند دواؤں کا پیکٹ تھامے ہوئے گھر لوٹ آیا۔ جب سے اسے چند ہفتوں کی بقایا زندگی کی بُری خبر سنائی گئی تھی، تب سے وہ بدستور ارینا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس نے ارینا کو باپ نہیں بلکہ ماں بن کر بھی پالا تھا اور اسے کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ جب جم اس قصبے میں آیا تھا تو اس وقت ارینا بمشکل دو سال کی تھی۔ جم کا کہنا تھا کہ جب ارینا پیدا ہوئی تو اس کے ایک ماہ بعد ہی اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ جم لیے اور ارینا میں بظاہر کوئی مشابہت نہیں تھی۔ اُسے دیکھنے والے سب یہی کہتے تھے کہ اس کے نین نقش بہت ہی پیارے تھے۔ لیکن جب اس کے مزاج کی بات کی جاتی تو اکثر لوگ یہ بات جم کے منہ پر ہی کہہ دیتے کہ کاش وہ باپ کی سیرت بھی لے لیتی۔ یہ سُن کر اسے بہت دکھ ہوتا لیکن وہ چُپ رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ بات تو تلخ ہے لیکن ہے حقیقت!

جم نے بیٹی کی پرورش نہایت پیار سے کی تھی۔ قصبے میں جو لوگ جم کو جانتے تھے، وہ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ اس نے ارینا کی محبت میں کبھی دوسری شادی کا نہیں سوچا۔ وہ بہت محبت اور پیار کرنے والا باپ ثابت ہوا تھا لیکن افسوس کہ اس نے باپ کی محبت کا مثبت اثر نہیں لیا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ شاید یہ میرے بے جا لاڈ پیار کا ہی اثر ہے کہ وہ اتنی بدتمیز ہوچکی ہے۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ تھوڑی سختی کرے لیکن جیسے ہی وہ اس کے سامنے آتی، یہ سب کچھ بھول بھال کر اس کی دل جوئی میں لگ جاتا۔

اسپتال سے لوٹتے ہوئے وہ ایک نہایت اہم بات پر غور کررہا تھا۔ جتنا وہ سوچ رہا تھا، اس کے دل پر اتنا ہی زیادہ بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ تلخ حقیقت ہے لیکن اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ آج ارینا سے اس موضوع پر ضرور بات کرے گا، چاہے اس کے نتائج کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ جب سے ڈاکٹر نے اسے سنگین نوعیت کے کینسر سے آگاہ کیا تھا، وہ بدستور یہی سوچ رہا تھا کہ اس وقت تو وہ بات کرسکتا ہے لیکن اگر کل مرض کی شدت میں اضافہ ہوگیا اور وہ بات کرنے کے بھی قابل نہ رہا تو پھر کیا ہوگا۔ طویل راستہ اختیار کرنے کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ ارینا سے جو بات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، اس پر اچھی طرح سوچ بچار کرلے۔

کافی دیر بعد جب وہ ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا تو ارینا سے بات کرنے کا حتمی فیصلہ کرچکا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے تئیں پختہ فیصلہ تو کرچکا تھا لیکن اس کے دل کے کسی چھوٹے سے گوشے میں کہیں ایک انجانا خوف بھی تھا۔ اُسے رہ رہ کر ایک خیال آرہا تھا کہ جب وہ ارینا سے تفصیلی بات کرے گا تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ یہ بات تو وہ جانتا تھا کہ اس کی فطرت عصبی ہے۔ ایسے میں وہ سخت ردِعمل ظاہر کرسکتی ہے لیکن پھر اُسے یہ خیال آتا کہ کیا وہ گزشتہ انیس برس کو بھول جائے گی؟ میری محبت کو بھول جائے گی؟ بس! یہی ایک موہوم سی امید تھی جس کا اسے سہارا تھا۔

جم گھر پہنچا تو حسبِ عادت ارینا موجود نہیں تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اس کا عادی تھا۔ اس نے اپنے اور

ارینا کے لیے لنچ تیار کیا۔ جب وہ لنچ کرنے جارہا تھا، اُس وقت تک وہ گھر نہیں لوٹی تھی۔ جم کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے سخت تھکاوٹ محسوس ہورہی تھی۔ شام کے پانچ بجے وہ اٹھا تو اسے ارینا کے کمرے سے گانے کی آواز سنائی دی۔ وہ مسکرا دیا۔ وہ خوش تھا کہ ارینا گھر پر ہے۔

رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ موسم سخت سرد ہوچکا تھا۔ دسمبر کے یخ بستہ شب و روز تھے۔ باہر برف پڑ رہی تھی۔ کرسمس کی آمد میں چند روز ہی باقی تھے۔ جب ڈنر کے بعد اس نے ارینا سے کہا کہ وہ اس سے بہت خاص بات کرنا چاہتا ہے تو وہ یہی سمجھی کہ شاید وہ کرسمس کے حوالے سے اس کی تیاریوں اور شاپنگ کی بات کریں گے۔ اس لیے اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔''

ڈنر کے آدھ گھنٹے بعد وہ دونوں لیونگ روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ آتش دان روشن تھا اور کمرے کا ماحول خوش گوار حد تک نیم گرم تھا۔ ارینا صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جم آتش دان کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا جھول رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بات کس طرح شروع کی جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں اچانک وہ اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے پردہ سرکایا۔ باہر ہلکی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی جو سڑک پر لگے لیمپ پوسٹ سے آرہی تھی۔ زرد روشنی میں گرتی ہوئی برف کے ذرات دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہوا میں بکھرتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ ''کتنا خوبصورت نظارہ ہے۔'' اس نے زیرِلب کہا اور واپس کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ''کرسمس آنے اور برف باری نہ ہو، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس نے ارینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔'' اس نے تائید کی۔ ''وہ بات بتائیے جس کا آپ کہہ رہے تھے۔ کوئی خاص بات ہے؟'' اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں تجسس نظر آرہا تھا۔

''تو تم تیار ہو؟'' جم کا لہجہ استفساریہ تھا۔

''میں بہت دیر سے اُس بات کو جاننے کے لیے بے تاب ہوں جو آپ بتانا چاہ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' جم نے کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ..... اور میرے پاپا کا نام کیا تھا؟'' جم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کو..... یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟''

''مجھے جواب چاہیے۔''

''رابرٹ لیمے۔'' ارینا نے یہ سنتے ہی فوراً جواب دیا۔ ''اب بتائیے کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمہارے جواب کو درست مان لیتا ہوں۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ تم اکثر سوال کرتی تھیں کہ میرے خاندان کی ہسٹری کیا ہے... ہم لوگ کون ہیں... یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" اریتا نے لقمہ دیا۔

"میں آج بھی سب کچھ بتانے والا ہوں۔ اس لیے اب خاموشی سے بیٹھ کر میری بات سنو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے بچوں کی طرح سر ہلا کر جواب دیا۔ وہ ہمہ تن گوش نظر آ رہی تھی۔ "یہ دوسری جنگِ عظیم کی بات ہے۔" جم نے اپنی کہانی شروع کی۔ "جنگ شروع ہوئے دوسرا برس ہو چکا تھا۔ میرے والد کا ملک پولینڈ بھی جنگ کا ایندھن بن چکا تھا۔ جرمن افواج پولینڈ کے لوگوں کو غلام بنا رہی تھیں۔ میرے والد نہایت شریف لیکن عقل مند آدمی تھے۔ ہم لوگ شہر سے بہت دور ایک گاؤں میں رہتے تھے اور جنگ ابھی وہاں سے بہت دور تھی لیکن وہ خوف زدہ تھے۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک اکلوتا بیٹا میں تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں کوئی نقصان پہنچے۔ آخر انہوں نے ایک مشکل فیصلہ کیا۔ ایک دن انہوں نے اپنے مختصر خاندان کے ہمراہ پولینڈ چھوڑا اور پھر کسی نہ کسی طرح امریکا پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یورپ کے مقابلے میں یہ خطہ جنگ کی تباہ کاریوں سے بڑی حد تک محفوظ تھا۔ انہوں نے ریاست الباما کا رخ کیا اور دریائے الباما کے قریب واقع گاؤں ووڈلے میں قیام پذیر ہو گئے۔ بنیادی طور پر وہ کاشت کار تھے لیکن ہجرت نے ان میں جذبہ بقا کو زیادہ اجاگر کر دیا تھا۔ وہ اپنے خاندان کی خوشحالی کے لیے صرف کاشت کاری پر انحصار نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

"ووڈلے کیسا گاؤں تھا؟" اریتا نے نہایت اشتیاق سے سوال کیا۔

"ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ تاہم دس میل کی مسافت پر واقع قصبہ علاقے کی تجارتی منڈی تھی۔" جم نے کہنا شروع کیا۔ "سب سے پہلے تو پاپا نے گاؤں کے زمینداروں کی زمینوں پر معاوضے کے عوض چھوٹے چھوٹے کام کرنا شروع کر دیے لیکن اس سے زیادہ آمدنی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے کئی اور چھوٹے موٹے کام شروع کر دیے۔"

"کیسے کام؟" اریتا نے پھر قطع کلامی کی۔

"چپ کر کے سنو۔" جم نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پاپا خاصے سمجھ دار آدمی تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ووڈلے میں بڑے پیمانے پر لیمو... کاشت ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس سے ایک اور فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے کچھ پیسے جمع کیے اور پھر انہوں نے علاقے کے متعدد کسانوں سے ایک قانونی معاہدہ کیا جس کی رو سے وہ اپنے لیمو... کی فصل کا کم از کم ایک تہائی حصہ آڑھتی کے نرخوں پر انہیں بیچنے کے پابند ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک اور کام بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ تھی چونا بھٹی۔ ان دنوں ریاست الباما کے اس علاقے کی آبادی بہت زیادہ نہیں تھی۔ دریا کے کنارے چونا پتھر کی پہاڑیاں تھیں۔ وہ پتھروں کو لا کر بھٹی میں پکاتے اور پھر تیار چونا دستکاروں اور رنگ و روغن کا سامان فروخت کرنے والی دکانوں کو بیچ دیتے۔ یوں انہیں ٹھیک ٹھاک آمدنی حاصل ہو جاتی۔ جو بچے انہیں چونا پتھر لا کر دیتا وہ مقدار کے حوالے سے اسے جیب خرچ بھی دیا کرتے تھے۔ قصبے کے لڑکوں کے لیے یہ پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس طرح انہیں بھی چار پیسے مل جاتے تھے جسے وہ اپنی پسند کے مطابق کھانے پینے کی چیزوں کی خریداری پر خرچ کر لیتے۔ اس کے علاوہ وہ بھٹی کو لیمو... کا رس کشید کرنے کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔" یہ کہہ کر جم سانس لینے کو رکا۔

"واہ... دادا تو بہت خوب آدمی تھے۔" اریتا بہت دلچسپی سے یہ قصہ سن رہی تھی۔ جب جم خاموش ہوا تو اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"پاپا وقت کے بہت پابند تھے۔" جم نے پھر اپنی بات شروع کی۔ "لیمو... کے سیزن میں وہ ہفتے میں چار دن لیمو... کی خرید و فروخت اور گھر پر ان کا رس کشید کرنے میں گزارا کرتے۔ دو دن وہ چونا بھٹی پر سفید پتھروں کو پکا کر انہیں پیسنے یا پھر چونا تیار کرنے میں گزارا کرتے تھے۔ وہ ہر اتوار کو باقاعدگی سے چرچ جاتے اور اس کے بعد سارا دن گھر پر رہتے یا پھر گاؤں میں اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے رہتے۔ گاؤں کی آبادی کم تھی لیکن زیر کاشت رقبہ بہت بڑا تھا۔ یہاں پچاس سے زائد زمیندار تھے۔ زیادہ تر کھیت مالکان اپنی زمینوں پر مونگ پھلی اور کپاس کاشت کرتے تھے۔ پاپا لیمو... کے عرق سے جراثیم کش دوا تیار کرتے تھے جنہیں یہ کسان اپنی فصلوں کو کیڑوں سے بچانے کے لیے ان پر چھڑکنے کی خاطر بڑے پیمانے پر خرید لیتے۔ انہوں نے اپنی ایک ذاتی مہر بھی بنائی ہوئی تھی جسے وہ لیمو... کے ٹوکروں، چونے کی بوریوں اور جراثیم کش دوا کی بوتلوں پر لگاتے تھے۔ یوں سمجھو کہ اس وقت یہ مہر ان کے برانڈ کی تصدیق کرتی تھی۔" یہ کہہ کر جم خاموش ہوا اور تپائی پر رکھی پانی کی بوتل اٹھا کر دو گھونٹ پانی پیا۔ چند لمحے تک وہ اپنے

حواس مجتمع کرتا رہا۔ اتنی دیر تک باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے اسے سینے میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ اریتا خاموشی سے اسے تک رہی تھی۔ اب اسے بھی اس قصے میں مزہ آنے لگا تھا۔

"چند برسوں کے دوران میں ہی پاپا گاؤں کی سرکردہ کاروباری شخصیت بن چکے تھے۔" کچھ دیر کے بعد جم نے ایک بار پھر قصہ شروع کیا۔ "پاپا بتاتے تھے کہ جب وہ پولینڈ سے نکلے تھے تو اس وقت میں بہت ہی چھوٹا تھا لیکن جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اس وقت تک ہوش سنبھال چکا تھا۔ ہماری گزر بسر نہایت آرام سے ہو رہی تھی۔ میرے والد نے گاؤں کے دیگر گھروں کے مقابلے میں چھوٹا ہی سہی لیکن آرام دہ گھر بنا لیا تھا۔ ان کے بوڑھے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ جب پہلی بار میرے والد ووڈلے آئے تو خالی ہاتھ تھے۔ ان کے پاس اہل خانہ اور ہمت کے سوا کچھ نہ تھا لیکن اسی ہمت کے بل بوتے پر انہوں نے زندگی کا نیا سفر شروع کیا اور پھر رفتہ رفتہ وہ وقت قریب آنے لگا جب وہ علاقے کی بڑی کاروباری شخصیت بننے کے قریب تھے لیکن خدا نے انہیں واپس بلا لیا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر گالوں پر آ کر ٹھہر گئے۔ اریتا نے بھی یہ دیکھ لیا۔ وہ بھی اداس ہو گئی۔ اس کے شوخ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ دونوں خاموش اور اداس بیٹھے ہوئے تھے۔

"دادا کی موت کیسے ہوئی تھی؟" کافی دیر کے بعد اریتا نے کمرے میں چھائے سکوت کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ موسم گرما کی ایک سہ پہر تھی۔" جم نے کافی دیر بعد گلوگیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "ہم گھر پر آرام کر رہے تھے۔ پاپا گھوڑا گاڑی لے کر لیمو... لینے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اچانک دس بارہ لوگ ہمارے گھر آئے۔ وہ پاپا کی گھوڑا گاڑی کے ساتھ آئے تھے۔ مما باہر گئیں۔ وہ لوگ ان سے باتیں کر رہے تھے۔ جب میں باہر نکل کر ان کے قریب پہنچا تو صرف ایک بات سنی کہ لاش دریا کے قریب سے ملی ہے۔ گھوڑا گاڑی بھی وہیں کھڑی تھی۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رکا اور کچھ سوچتا رہا اور پھر کہنے لگا۔ "قصہ مختصر یہ کہ کسی نے ان کا سر کچل کر ہلاک کر دیا تھا۔"

"اس وقت آپ کتنے بڑے تھے؟" اریتا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس وقت میری عمر بمشکل تیرہ برس تھی۔" جم نے جواب دیا۔ "پاپا کے بعد میں گھر کا واحد مرد تھا۔ اس ناتے خاندان کی ساری ذمے داری میرے ہی کندھوں پر عائد ہوتی تھی۔ اسے میں نے ہی نبھانا تھا مگر نہ تو میری عمر اتنی تھی کہ کاروبار سنبھال سکوں اور نہ ہی بہت زیادہ تجربہ۔ مگر پھر بھی میں نے ہمت کی اور پاپا کی موت کے کچھ دنوں کے بعد کام شروع کر دیا۔ میں پاپا کی زندگی میں اکثر ان کے ساتھ کام پر جایا کرتا تھا اس لیے کاروبار کے معاملات سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ میں نے کوشش تو بہت کی لیکن جو کام پاپا کرتے تھے وہ نہ کر سکا۔ یوں ان کا شروع کیا ہوا سارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ مصیبتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہو۔ پاپا کی موت کے دو سال کے اندر ایک ایک کر کے میری تینوں بڑی بہنیں اور پھر ان کے بعد مما بھی پراسرار طور پر انتقال کر گئیں۔ ان کی موت کے بعد میں بھرے گھر میں تنہا رہ گیا۔ اس دوران میں گاؤں کے سب سے بڑے اور بدمعاش زمیندار بورگیس نے ہمارے گھر پر زبردستی قبضہ کر لیا اور یوں میں بے گھر ہو گیا۔"

"اس نے گھر پر کیوں قبضہ کیا تھا؟" کافی دیر تک جب جم خاموش بیٹھا رہا تو اریتا نے سوال کیا۔

"یہ بات تو مجھے نہیں معلوم لیکن لوگ کہتے تھے کہ وہ خوامخواہ میرے والد سے جلتا تھا۔ میرے والد کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی لیکن جس طرح کے پراسرار حالات میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کی موت واقع ہوئی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں قتل کیا گیا تھا۔'' جم کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ وہ ہلکا سا کھنکھارا اور گلا صاف کر کے کہنے لگا۔'' پاپا کے کئی دوست کہتے تھے کہ انہیں بورگیس نے قتل کیا ہے لیکن میں بے بس تھا۔ ایک بارہ تیرہ سال کا کم عمر لڑکا کسی طرح بڑے اور طاقتور زمیندار کا کس طرح مقابلہ کر سکتا تھا۔ مما بھی پاپا کی موت کے بعد بہت خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ یوں پاپا کا قاتل کبھی نہیں پکڑا گیا۔'' جم نے ٹھنڈی آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھا۔'' پاپا کی موت کے دو تین سال کے اندر میں اپنے خاندان کا واحد شخص زندہ بچا تھا۔ مجھے نہ تو کوئی ہنر آتا تھا اور نہ ہی ووڈ لے میں کوئی خاص کام مل سکتا تھا لیکن میں یہاں سے نکل کر کہاں جاتا؟ یوں اپنے پاپا کے ایک غریب دوست کے اصطبل میں رہنے لگا۔ سب جانتے تھے کہ بورگیس نے ہمارا گھر زبردستی ہتھیایا تھا۔ وہ گھر میرے باپ نے اپنی محنت کی کمائی سے بنایا تھا۔ اس ظالم نے مجھ یتیم کو میرے ہی گھر سے بے دخل کر دیا لیکن اس ظالم کے خوف سے کوئی میری مدد کو نہ آیا۔'' اس کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی تھی۔

''کتنا ظالم تھا بورگیس...'' ارینا کے منہ سے نکلا۔ یہ سن کر وہ مسکرا دیا۔'' پھر آپ کی پرورش کیسے ہوئی؟''

''ایک دن میں گھوڑوں کی مالش کر رہا تھا کہ بورگیس گھر آیا۔'' جم نے کہنا شروع کیا۔'' میں اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ خیر، وہ کچھ دیر تک پاپا کے اس دوست سے باتیں کرتا رہا جن کے ہاں میں رہ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اصطبل میں آیا اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگا کہ آج سے تم میرے گھر پر رہو گے نوکر بن کر۔ مختصراً یہ کہ میں اس کے گھر آ گیا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور بوتل سے دو گھونٹ پانی پی کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔

''بورگیس بہت ظالم آدمی تھا۔'' اس نے چند لمحوں کے بعد دوبارہ قصہ شروع کیا۔'' انسانوں کو تو چھوڑو، وہ تو جانوروں کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ گھوڑوں پر اتنی بے رحمی سے چابک برساتا تھا کہ جیسے وہ بے جان ہوں۔ خیر... میں اس کے گھر پر رہنے لگا۔ دن بھر کی غلامی کے بعد دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لیے سرونٹ کوارٹر... یہی میری اُجرت تھی۔ وہ بے اولاد تھا۔ آخر شادی کے کئی برسوں کے بعد اس کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بچی بہت خوبصورت تھی۔ اس کے نین نقش بالکل اپنی ماں پر گئے تھے۔ وہ اپنی بچی سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ جوں جوں بچی بڑی ہوتی گئی، وہ اس کے پیار میں گم ہوتا چلا گیا۔ البتہ اس کے باوجود اس کی خباثت میں رتی بھر بھی کمی نہیں آئی تھی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اس کے ہاں کوئی ایسا دن گزرا ہو جب میرے گالوں پر اس کے مضبوط فولادی ہاتھ کا زوردار طمانچہ نہ پڑا ہو۔ وقت گزرتا رہا۔ بچی کی دیکھ بھال، اسے گھمانا پھرانا میری ذمے داریوں میں شامل تھا۔ بچی بھی مجھ سے بہت مانوس ہو چکی تھی۔ اسی دوران میں ایک دن اس نے ایک دن کی مسافت پر واقع اپنے دوست کے ہاں بیوی اور بچی سمیت جانے کا پروگرام بنایا۔ مقررہ دن ہم ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر صبح سویرے گھر سے نکل پڑے۔''

''دوپہر کا وقت تھا اور ہم ایک بنجر پہاڑی سلسلے کے آڑھے ٹیڑھے راستوں پر سے گزر رہے تھے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جم نے دوبارہ قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ ''اس وقت گھوڑا گاڑی میں بورگیس، اس کی بیوی، بیٹی اور صرف میں تھا۔ وہ راستہ بہت ویران تھا۔ ہم جب سے سفر کر رہے تھے، وہاں پر کسی دوسرے انسان کو نہیں دیکھا تھا۔ ہم چلتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اُس وقت ہم ایک پہاڑی کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھتے، اوپر سے بڑے بڑے پتھر گرنے لگے۔ اسی دوران میں گھوڑے کا پاؤں رپٹ گیا۔ اس کا گرنا تھا کہ گاڑی الٹ گئی۔ ہم ڈھلوان پر تھے۔ اس کی بیٹی میری گود میں تھی۔ گاڑی اُلٹی تو میں اس بچی کے ساتھ نشیب کی جانب لڑھکنے لگا۔ میں نے گرتے ہوئے بچی کو مضبوطی کے ساتھ اپنے سینے سے اس طرح چمٹا لیا تھا کہ اسے کم سے کم چوٹ پہنچے۔ کچھ دیر بعد میں ایک بڑے پتھر سے ٹکرایا۔ یوں لڑھکنی کھانے کا سلسلہ بند ہوا۔ میں نے بچی کو دیکھا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ البتہ میرا جسم جگہ جگہ سے چھل چکا تھا۔ میں بچی کو لے کر چڑھائی چڑھنے لگا۔ جب میں ہانپتا کانپتا جائے وقوعہ پر پہنچا تو دیکھا کہ لینڈ سلائڈنگ کے باعث گرنے والا ایک بڑا سا پتھر بورگیس کی دونوں ٹانگوں کو کچل چکا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ خود شدید تکلیف سے چلا رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ میں بورگیس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے آواز دی۔ اس نے بدقت تمام آنکھیں کھولیں اور بچی کو زندہ سلامت دیکھ کر اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے طمانیت چھا گئی۔ تب میں نے اس سے کہا کہ تم نے میرے باپ کو مارا۔ میری ماں اور بہنوں کی موت کے پیچھے بھی تمہارا ہاتھ تھا۔ یہ سُن کر اس نے اقرار میں سر ہلایا اور بدقت تمام وہ میرے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا کہ میں اسے ووڈ لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک پہنچا دوں مگر میں نے اس کی مدد نہیں کی۔ میں نے بچی کو ساتھ لیا اور گھوڑے کی طرف آیا۔ وہ زندہ اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ میں نے اسے ٹوٹی ہوئی گاڑی سے الگ کیا۔ بچی کو ایک کپڑے کی مدد سے اپنی کمر کے ساتھ باندھا اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر بورگیس کے سامنے پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر جو تاثرات آئے، اس نے مجھے مسرور کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہیں اپنی بچی سے بہت پیار تھا۔ اب میں اسے لے کر بہت دور جا رہا ہوں۔ زندہ رہ گئے تو ڈھونڈ لینا۔ مل گئی تو بچی تمہاری اور موت میرا مقدر۔ اگر تم زندہ رہے تو پھر آخری سانس تک اپنی بچی کو یاد کر کر کے لمحہ لمحہ موت سہتے رہنا۔ یہی میرا انتقام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خلاؤں میں تکنے لگا۔

''بورگیس کی دادا سے کیا دشمنی تھی؟'' کافی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر ارینا نے سکوت توڑا۔

''وہ میرے باپ کا ہم وطن ہی نہیں بلکہ اسی گاؤں کا رہنے والا بھی تھا۔'' جم کی بات سن کر اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا مگر وہ بولتا رہا۔ ''بورگیس میرے باپ سے کئی سال بڑا تھا۔ وہ ایک بڑے زمیندار کا بگڑا ہوا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک دن اس نے طیش میں آ کر ایک فوجی کو قتل کر دیا۔ سر پر چڑھا خون جب اترا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے باپ کی جمع پونجی اٹھائی اور بھاگ گیا۔ اس نے اس لڑکی کو بھی ساتھ چلنے کا کہا جس سے وہ بے حد پیار کرتا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بورگیس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے لڑکی کو سمجھانے پر وقت ضائع کرنے کے بجائے فرار ہونا مناسب سمجھا۔ وہ ڈلے میں میرے باپ سے اس کی ملاقات اتفاقی تھی۔ پاپا کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہاں پہنچ چکا ہے۔ خیر بات یہ ہے کہ اس کی محبوبہ بعد میں میری ماں بنی۔ جب یہ بات اس کے علم میں آئی تو وہ پاپا کا دشمن بن گیا۔ آخر اس نے سب کو مار کر اور مجھے غلام بنا کر اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کر لی لیکن میں نے جو دکھ اسے دیا ہے، اگر اب بھی وہ زندہ ہے تو یقیناً روز جیتا اور روز مرتا ہوگا۔''

ارینا نہایت حیرت سے یہ ماجرا سن رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بظاہر پُرسکون زندگی بسر کرنے والے اس رحم دل انسان نے زندگی کے کن کن مصائب کو جھیلا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ کافی دیر تک وہ افسردہ رہی۔ اسے دیکھ کر یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی حرکتوں سے پورا قصبہ عاجز ہے۔ آج وہ بالکل ہی بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کافی دیر تک کمرے میں خاموشی کا راج رہا۔ ''آپ کو یہ بات کس نے بتائی تھی؟'' اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''میری ماں نے مرنے سے دو دن پہلے۔''

''اور اس بچی کا کیا ہوا... کہاں گئی وہ؟'' یہ سن کر جم چونک گیا۔ اس کا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حلق خشک ہو چکا تھا... آخر وہ لمحہ آ پہنچا تھا جس کے خوف نے اسے برسوں بے چین کیے رکھا تھا۔ ارینا جواب کی منتظر تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ بچی کہاں گئی مگر وہ خاموش رہا۔

یونہی کافی وقت بیت گیا۔ جم بدستور خاموش تھا۔ آخر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب پہنچا اور پٹ کھول دیے۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آکسیجن دہکتے پھیپھڑوں میں پہنچی تو اسے لمحہ بھر کے لیے سکون میسر آیا۔ سرد ہوا کا جھونکا ارینا کے چہرے سے بھی ٹکرایا تھا۔ اس نے جھرجھری لے کر شال کو اپنے گرد اور سختی سے لپیٹ لیا۔ باہر برف گر رہی تھی۔ زمین پر برف کی سفید چادر تن چکی تھی۔

''بتایا نہیں آپ نے... اس بچی کا کیا ہوا؟'' اس نے ایک بار پھر سوال کیا۔

جم یہ سن کر پلٹا اور چند لمحے تک اسے گھورتا رہا۔ وہ بھی پلکیں جھپکائے بغیر اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور شہادت کی انگلی اس کی سمت کی۔ ''وہ تم ہو۔''

یہ سنتے ہی ارینا سکتے میں رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بول نہیں پا رہی تھی۔ پھر اچانک اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ چلائی۔ ''نہ... نہیں...''

جم نے اس کی بات اَن سنی کر دی۔ ایک بار پھر اس کے سینے کے اندر جیسے آگ دہکنے لگی تھی۔ اس نے گردن کھڑکی سے باہر نکالی تھی کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ کھڑکی سے گردن باہر نکال کر کھانسنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد کھانسی کے ساتھ ساتھ منہ سے خون آنے لگا۔ اگلے ہی لمحے اسے خون کی بڑی سی الٹی آئی۔ چند لمحوں بعد وہ کھڑکی پر گر چکا تھا۔ باہر برف کی چادر پر خون پھیلتا جا رہا تھا۔ جم کی آنکھیں بے نور ہوتی جا رہی تھیں۔ ارینا بدستور صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اس پر سکتہ طاری تھا۔ اچانک وہ چلاتی ہوئی اٹھی۔ ''پاپا!'' وہ جا کر جم کے بے جان وجود سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

••
••

ایک تصویر کی گمشدگی سے نیا رخ اختیار کر لینے والی کہانی کے تانے بانے

تصویریں... وقت کی دبیز تہوں میں دھندلا جانے والے عکس کو زندہ رکھنے کا نہایت دیرپا ذریعہ ہیں... زمانے کی بے ثباتی... عروج و زوال کی داستانوں کے نقوش اس تصویری خاکے میں ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں... لیکن کبھی کبھی یہ قیمتی سرمایہ لالچی و کم مایہ ہاتھوں میں چلا جاتا ہے...

گمشدہ تصویر

مختار آزاد

ڈیوڈ ویمبر ایک غیر معروف انشورنس کمپنی کا ایریا منیجر تھا۔ جز وقتی طور پر وہ سراغ رسانی کا کام بھی کرتا تھا۔ وہ لوگوں کی گمشدہ اشیا کی تلاش میں مدد دیا کرتا تھا۔ یہ کام وہ بہت چھوٹے پیمانے پر کرتا تھا۔ اس کی وجہ اس کی تنخواہ کم تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ عمر کے جس حصے میں تھا، اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اب کبھی بھی بہت زیادہ دولت حاصل کر پائے گا۔ انشورنس کے کام سے اس کی دال روٹی چل رہی تھی۔ اس لیے اس نے نجی طور پر سراغ رسانی کا کام شروع کر رکھا تھا۔ اس کے کلائنٹس میں زیادہ تر وکیل شامل تھے جو اکثر مقدمات کے حوالے سے اس کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ اس نے سراغ رسانی کا باقاعدہ لائسنس بھی اس لیے حاصل نہیں کیا تھا کہ ایک تو بھاری فیس ادا کرنی پڑتی اور دوسرے دفتر کا ہونا لازمی تھی۔ ان دونوں لازمی عناصر کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس بہت زیادہ پیسا نہیں تھا۔ اس لیے جو لوگ اسے جانتے تھے، وہی اس کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ اس کے کلائنٹس میں ایک وکیل چارلی بھی تھا۔ وہ وکالت کے علاوہ بھی کئی اور کام کرتا تھا۔ یہ کالج کے زمانے میں اس سے جونیئر تھا۔ اس لیے ان دونوں میں اچھی خاصی دوستی بھی تھی۔ وہ کبھی کبھار کسی مقدمے کے حوالے سے اس کی خدمات حاصل کر لیا کرتا جس کا اجرا سے چند سو ڈالر کی شکل میں مل جاتا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ صبح سویرے چارلی کا فون آ گیا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ دوپہر میں کسی وقت اس سے مل لے۔ اس کے لیے ایک کام ہے اور معاوضہ بھی بہت بھاری

ہے۔ اس وقت وہ چارلی ایون کولنز کے شان دار دفتر میں بیٹھا ہوا کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی غور کر رہا تھا کہ ایک وکیل اور انشورنس کمپنی کا منیجر... دونوں کی روزی روٹی دوسروں کے مسائل اور غلطیوں سے چلتی ہے لیکن ان دونوں کے حالات میں عموماً زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ خیال اسے اس دفتر میں آنے کے بعد آیا تھا۔ چارلی کا دفتر نہایت شان دار تھا۔ اس وقت بھی وہ قیمتی اور بڑی سی میز کے پیچھے عمدہ چمڑے سے تیار کی گئی، آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے دفتر کی بیرونی سمت کی دیوار شیشے سے بنی ہوئی تھی۔ جس سے سڑک اور اوپر کی جانب نیلا آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ فرش پر مہنگا قالین بچھا ہوا تھا۔ قیمتی صوفے اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر بیٹھا ہوا ڈیوڈ اپنا اور اس کا دل ہی دل میں معاشی تقابل کر رہا تھا۔

''ارے... تم نے کینڈی اسکاٹ کے بارے میں سنا ہے۔'' اس نے قلم ہولڈر میں رکھتے ہوئے کرسی کو ذرا سا پیچھے کی طرف کیا اور کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہ وہی مصور تو نہیں ہے جس کی کار ایک مرتبہ وادی پولز کے لے آرہے تھے اور پھر وہ ایک درخت سے ٹکرائی ہوئی ملی تھی۔''

چارلی کی بات سن کر ڈیوڈ نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل... میں اُسی کی بات کر رہا ہوں۔'' چارلی نے تصدیق کی۔

''وہ تو اب ماضی کا قصہ ہے۔ اُسے تو مرے ہوئے بھی بیس پچیس سال ہو گئے ہوں گے... یہ ہماری جوانی کا واقعہ ہے۔ اب تو ہم بھی بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' ڈیوڈ نے ہلکی سے مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بے چارہ...'' چارلی نے افسوس سے کہا۔ ''وہ آج بھی زندہ ہوتا لیکن...''

''شراب نوشی کی لت اُسے لے ڈوبی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ اکثر نشے کی حالت میں آئے دن کہیں نہ کہیں اپنی گاڑی ٹکرا دیتا تھا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''اُن دنوں میں انشورنس کے کام میں نیا نیا آیا تھا۔ مہینے میں ایک دو بار اس کا کلیم میرے پاس ضرور آتا تھا۔'' ڈیوڈ نے بیتے ہوئے ایام یاد کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' چارلی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر اُس نے یہ بات کبھی بھی تسلیم ہی نہیں کی کہ وہ کثرتِ شراب نوشی کے باعث شدید نوعیت کے جسمانی اور نفسیاتی مسائل کا شکار ہو چکا ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ مریض بن چکا تھا۔''

''بھئی یہ آرٹسٹ لوگ اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے کافی کا مگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''انہیں اُن کے حال پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔''

''یہ بات تو درست ہے۔ ان کی اپنی ہی ایک دنیا ہوتی ہے۔''

''ہاں... خیالی دنیا... جس میں سب کچھ اُن کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔'' ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے لقمہ دیا۔ اُن دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کینڈی اسکاٹ کا تذکرہ صرف وقت گزاری کے لیے کر رہے ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ چارلی نے اسے ایک خاص مقصد کے لیے بلوایا تھا۔

چارلی اور ڈیوڈ بہت اچھے دوست تھے لیکن اُن دونوں کی مالی حیثیت میں بہت کا فرق تھا۔ چارلی کھاتا پیتا اور خوشحال وکیل تھا۔ اس کا کام بھی ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ اس نے اپنا دفتر بنالیا تھا۔ وہ ذاتی گھر میں رہتا تھا۔ اس کی مالی خوشحالی اس کی صحت سے بھی جھلکتی تھی۔ وہ پچپن چھپن برس سے زیادہ کا تھا لیکن اس کے باوجود اب تک اس کا جسم کسی ایتھلیٹ کی طرح مضبوط اور چست تھا۔ اس کے جسم پر واحد نمایاں شے اس کی سرخی ہوئی لمبی سی وہ ناک تھی جو کم از کم ایک بار ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے برعکس ڈیوڈ کی عمر ساٹھ برس ہونے کو آئی تھی۔ وہ ایک انشورنس کمپنی میں کام کرتا تھا جس میں تنخواہ کے بجائے آمدنی کا دارومدار کمیشن پر تھا۔ اس کا کوئی باقاعدہ دفتر بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی کار کو ہی دفتر بنالیا تھا۔ اس کی مالی حیثیت کبھی بھی اتنی مستحکم نہیں ہو پائی تھی کہ وہ ایک دفتر خرید کر اُسے اپنی مرضی سے چلا سکے۔ وہ سمندر کے کنارے، شہر کے مضافات میں واقع ایک تین منزلہ پرانے گھر میں اپنی بوڑھی بیوی اور تین پالتو بلیوں ٹام، ڈک اور ہیری کے ساتھ زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ ڈیوڈ کا سارا کام زبانی کلامی اور موبائل فون کے سہارے چل رہا تھا۔ وہ چرب زبان تو نہیں تھا لیکن اس کے الفاظ میں تاثیر تھی۔ وہ لوگوں کو قائل کر لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ ایمان دار آدمی تھا۔ نہایت مندی کے سیزن میں بھی کچھ نہ کچھ کما لینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

''کبھی تم نے کینڈی کے فن پارے دیکھے ہیں؟'' کافی

دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد چارلی نے ڈیوڈ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر گفتگو کا رُخ کینڈی کی طرف موڑ دیا۔ دراصل وہ بات کرنے سے پہلے راہ ہموار کرنے کا قائل تھا۔ اس لیے تفصیلی تمہید باندھ رہا تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس نے جس کام کے لیے ڈیوڈ کو بلوایا تھا، کینڈی سے اس کا خاص تعلق بنتا تھا۔

''نہیں بھئی... مجھے کوئی بہت زیادہ شوق نہیں ہے اس طرح کی چیزوں کا۔'' ڈیوڈ نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تمہیں اس میں کیوں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''پینٹنگ... تم شاید یہ نہیں جانتے کہ وہ ایک بہت بڑا مصور تھا۔'' چارلی نے بات شروع کی۔ ''وہ اس شہر میں 1975ء کے موسم سرما میں اُس وقت آیا تھا، جب اس نے اپنی پینٹنگ 'انٹرلاک نمبر تین' مکمل کی تھی۔'' چارلی نے کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ اچانک وہ اٹھا اور میز کی دراز کھولنے لگا۔ پھر اس نے پوسٹ کارڈ سائز کا ایک فوٹو نکال کر ڈیوڈ کی طرف بڑھایا۔ ''یہ اس پینٹنگ کا فوٹو ہے جو آج اس کا سب سے شاہکار فن پارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔''

''انٹرلاک نمبر تین۔'' یہ کہتے ہوئے ڈیوڈ نے اس کے ہاتھ سے فوٹو لیا اور کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر اٹھایا اور چارلی سے پوچھا۔

''اچھی پینٹنگ ہے۔ کام میں پختگی، برش اور رنگوں پر مکمل دسترس نظر آتی ہے۔'' ڈیوڈ نے تبصرہ کیا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے...'' اس نے مختصراً کہا۔ ''یہ اس کی زندگی کے آخری دنوں میں بنائی گئی پینٹنگ ہے۔ بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں وہ عام آدمی نہیں، دنیائے مصوری کے چوٹی کے نقاد اور ماہر ہیں۔'' چارلی نے بات مکمل کی۔

''ویسے سائز کے لحاظ سے یہ کتنی بڑی پینٹنگ ہوگی؟'' ڈیوڈ نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''چوبیس ضرب تیس انچ۔'' چارلی نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ پینٹنگ کینوس پر بنائی گئی ہے۔''

''بہت عمدہ پینٹنگ ہوگی۔'' ڈیوڈ نے ایک بار پھر پینٹنگ کا فوٹو دیکھتے ہوئے کہا۔ تصویر میں روشن رنگ استعمال کیے گئے تھے۔ برش اسٹروک کے ذریعے اندھیرے اور اُجالے کو باہم مدغم کیا گیا تھا۔ ''شاید یہی وجہ ہوگی اس تصویر کا نام انٹرلاک رکھنے کی۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

''تم تو جانتے ہی ہو کہ مجھے نوادرات جمع کرنے کا کتنا شوق ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' چارلی کی بات سن کر ڈیوڈ نے کہا۔ ''سکے، قدیم زیورات، ڈاک ٹکٹ... بہت کچھ پتا ہے مجھے تمہارے شوق کے بارے میں۔ بڑے نرالے شوق پال رکھے ہیں تم نے۔ سچ ہے پیسا اور فراغت ہو تو وقت گزاری کے لیے شوق پالنے ہی پڑتے ہیں۔'' اس کے لہجے سے حسرت جھلک گئی۔ ''یہاں تو خود کو پالنا دوبھر ہوتا جا رہا ہے، شوق کہاں سے پالوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر فوٹو چارلی کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھے تم سے ایک مدد چاہیے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد چارلی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہو... کیا کر سکتا ہوں تمہارے لیے؟'' ڈیوڈ نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے یہ پینٹنگ چاہیے اور تم اسے لا کر دو گے۔''

''مجھے کیا معلوم اس کے بارے میں؟'' ڈیوڈ نے حیرت سے کہا۔

''لیکن مجھے معلوم ہے۔'' چارلی نے کہنا شروع کیا۔ ''سائز کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹی سی پینٹنگ ہے لیکن قیمت کے لحاظ سے خاصی مہنگی ہے۔ شاید تم نہیں جانتے کہ فنِ مصوری کے نقاد کینڈی اسکاٹ کو عصرِ حاضر کا کتنا بڑا مصور قرار دیتے ہیں۔''

''یہ ہے کہاں پر؟'' ڈیوڈ نے چارلی کی میز پر سے پینٹنگ کا فوٹو اٹھا کر ایک بار پھر اُسے غور سے دیکھنا شروع

مگر

تین غیر حاضر دماغ پروفیسر ریلوے اسٹیشن پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ باتوں میں اتنے محو تھے کہ گاڑی آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ چند منٹ بعد سیٹی بجی تو وہ چونکے اور گھبرا کر ایک ڈبے کی طرف دوڑے۔ دو تو کسی نہ کسی طرح چڑھ گئے لیکن تیسرے صاحب نہ چڑھ سکے۔

ایک قلی نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں صاحب جی! دوسری گاڑی سے چلے جانا۔''

پروفیسر بولے۔ ''وہ تو میں چلا ہی جاؤں گا مگر ان دونوں کا کیا ہوگا جو مجھے چھوڑنے آئے تھے۔''

ام ثمامہ، پنجاب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ تم اسے ڈھونڈ کر لا سکتے ہو۔" چارلی نے کہا۔

"ہوا کیا ہے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"یہ تصویر غائب کی جا چکی ہے اور اب تمہیں اسے تلاش کرنا ہے۔"

"بات کیا ہے، ذرا کھل کر بتاؤ۔" ڈیوڈ نے پوچھا۔ وہ اب تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس پینٹنگ کے ساتھ کیا معاملہ پیش آ چکا ہے۔

"یہ پینٹنگ جس شخص کے پاس موجود تھی، اس کے مرنے کے بعد اس کے گھر سے غائب کی جا چکی ہے۔ اب تمہیں یہ پتا چلانا ہے کہ یہ کس کے پاس ہے۔ مجھے اتنا یقین ہے کہ اس کو چرانے والا ضرور اسی شہر کا رہنے والا ہے بھی تو جس شخص کی ملکیت میں یہ پینٹنگ تھی، اس کی موت کے فوری بعد یہ پینٹنگ اس کے گھر سے غائب کر دی گئی۔" چارلی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ کام تھوڑا مشکل ہے لیکن اس محنت کا پھل بہت ہی زیادہ میٹھا ہے۔" اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"کام تو ہو سکتا ہے۔" ڈیوڈ پورے انہماک سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو اس نے مختصر سا جواب دیا اور کچھ سوچنے لگا۔ وہ اس سے پہلے بھی چارلی کے لیے کئی کام کر چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہ کام بھی کر سکتا ہے لیکن اب اسے معاوضے کی فکر تھی۔ "مجھے اس کام کے عوض کیا ملے گا؟"

"اچھی بات کہی تم نے۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔" چارلی نے اس کی رضامندی کو بھانپتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "پینٹنگ کی مارکیٹ ویلیو چوبیس لاکھ ڈالر ہے اور تمہیں اس کی کل قیمت کا دس فیصد یعنی دو لاکھ، چالیس ہزار ڈالر بطور معاوضہ ملے گا۔"

"اوہ...." یہ کہتے ہوئے ڈیوڈ کے ہونٹ گول ہو گئے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ پینٹنگ اتنی مہنگی ہو سکتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بہت اچھا معاوضہ ہے تمہارے لیے... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" چارلی نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہے۔" ڈیوڈ نے خواب ناک آواز میں کہا۔ معاوضہ سن کر وہ دل و جان سے خوش ہو گیا تھا۔ "ایک بات ہے...."

"کہو... میں سن رہا ہوں۔" چارلی نے فوراً جواب دیا۔

"پینٹنگ کی مالیت بہت زیادہ ہے۔ اگر یہ مل گئی تب بھی تم اسے گھر میں تو رکھو گے نہیں، نیلام ہی کرو گے۔"

"بالکل درست...." چارلی نے کہا۔

"اگر پینٹنگ دو اعشاریہ چار ملین ڈالر سے زیادہ میں نیلام ہوئی تو...."

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔" چارلی نے جلدی سے کہا۔ "ایسا ہوا تو تمہیں اضافی رقم سے دس فیصد مزید ملے گا... اب تو مطمئن ہو گئے ہو نا۔"

"ایک اور بات...." ڈیوڈ نے پھر سوال کیا۔ "تم اس چکر میں کس طرح ملوث ہو گئے ہو؟" ڈیوڈ نے استفسار کیا۔

"کینڈی بہت مال دار آدمی تھا۔" چارلی نے تفصیل سے اسے پس منظر بتانا شروع کیا۔ "اس کی بہت بڑی جاگیر تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ مرنے کے بعد چاروں سابق بیویاں جائداد سے حصہ مانگنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ویسے تو اس کا ایک ہی سگا رشتے دار تھا اور وہ تھا کینڈی اسکاٹ کا فرسٹ کزن برکر مگر وہ لالچی آدمی نہیں تھا۔ اس نے کینڈی کے ترکے سے صرف ایک چیز لی اور وہ تھی اس کی یہ پینٹنگ۔ کینڈی نے مرنے سے کچھ دنوں پہلے ہی یہ پینٹنگ مکمل کی تھی۔ برکر کینڈی کی بیماری کے دنوں میں یہ پینٹنگ دیکھ چکا تھا۔ اسے یہ بہت زیادہ پسند آئی تھی۔ اسی لیے برکر نے جائداد کے بجائے وہ پینٹنگ مانگ لی، جس کی اس وقت ہم بات کر رہے ہیں۔ اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ سب خوش تھے کہ اس فیصلے سے ان کا حصہ بڑھ جائے گا۔ انہوں نے خوشی خوشی یہ پینٹنگ اسے دے دی۔ اگرچہ اس وقت یہ پینٹنگ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن پھر بھی اسے وہ پسند تھی اس لیے اس نے اسی پر اکتفا کیا۔ میری معلومات کے مطابق کینڈی اسکاٹ کی چاروں سابق بیویاں مر چکی ہیں اور ایک ماہ قبل اس کا وہ کزن بھی سڑک حادثے میں وفات پا چکا ہے جس کے پاس یہ پینٹنگ تھی۔ اب ایسا کوئی شخص زندہ نہیں ہے جو اس پینٹنگ کی نیلامی پر کینڈی کی دولت کا دعوے دار بن سکتا ہو...."

"اس پینٹنگ کی اہمیت کیسے سامنے آئی؟" ڈیوڈ نے ایک اور اہم سوال کیا۔

"مصوری کے کچھ محققین نے کینڈی کے کام پر تحقیق کی ہے۔" چارلی نے جواب دینا شروع کیا۔ "وہ برکر سے ملے تھے۔ وہیں انہوں نے پینٹنگ دیکھی اور پھر ان کی تحقیق سے ہی یہ گم نام پینٹنگ فن مصوری کے ماہرین کی نظروں میں آ گئی اور دھوم مچا گئی۔"

"تمہیں اس پینٹنگ کا کیسے علم ہوا؟" ڈیوڈ دم سادھے یہ قصہ سن رہا تھا، جب چارلی لمحہ بھر کے لیے پانی پینے کو رکا تو اس نے سوال کیا۔

"کینڈی کی موت کے بعد اس کی جائداد کے بٹوارے کا کیس میرے پاس آیا تھا اسی لیے یہ ساری باتیں جانتا ہوں۔" اس نے وضاحت کی اور ایک فائل اٹھا کر اخبار کا ایک تراشہ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ خبر پڑھو۔ اس کیس کو سمجھنے میں تمہاری مدد کرے گا۔"

"اٹھاسی سالہ بوڑھا اور معمر عورت کی کار سے ٹکرا کر ہلاک ہو گیا۔" ڈیوڈ خبر پڑھنے لگا۔ تراشے پر لکھی تاریخ کے مطابق یہ ایک ماہ پرانی خبر تھی۔ "مرنے والے شخص کا نام بڈ برکر تھا۔ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا، اس وقت متوفی نارتھ سینٹرل ایریزونا ایونیو کے مقام سے پُرہجوم ہائی وے 99 عبور کر رہا تھا جو قانونی طور پر غلط ہے۔ جس وقت حادثہ پیش آیا، اس وقت آندھی چل رہی تھی اور رات کا وقت تھا، جس کی وجہ سے کار چلانے والی چوبیس سالہ ڈرائیور برتھا اسے دیکھ نہ سکی اور تیز رفتار کار اس سے ٹکرا گئی۔ برکر موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ مرحوم کو جاننے والوں نے بتایا ہے کہ وہ ایک ریٹائرڈ شخص تھا اور تنہا رہتا تھا۔ پولیس کے مطابق مرحوم بے اولاد تھا۔ پولیس نے تفتیش کے بعد برتھا کو بے قصور قرار دے کر رہا کر دیا ہے۔"

"تو یہ بات ہے۔" خبر پڑھنے کے بعد ڈیوڈ نے ہنکارا بھرا اور چارلی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس کا کیا تعلق تھا کینڈی اسکاٹ سے؟"

"اس پوری دنیا میں یہ واحد شخص تھا جو کینڈی کا خونی رشتے دار تھا۔ یہ اس کا وہی کزن تھا جو اس ایک پینٹنگ کے عوض اپنے حصے کی ساری جائداد سے دستبردار ہو گیا تھا۔"

"اچھا...." ڈیوڈ نے چارلی کی بات سن کر حیرت سے کہا۔ "تم اسے بھی جانتے تھے؟"

"ہاں... اسکاٹ کی جائداد تقسیم ہونے کے بعد میں اس سے کئی بار ملا تھا۔" چارلی نے بتانا شروع کیا۔ "برکر تین [illegible] شان دار گھر میں رہتا تھا۔ وہ پینٹنگ اس نے لیونگ روم کی دیوار پر لٹکا رکھی تھی، وہیں میں نے اس کا یہ فوٹو کھینچا تھا۔ جب میں نے اس سے فوٹو کھینچنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس وقت وہ بہت خوش [illegible] کہہ رہا تھا کہ میں اس پینٹنگ کو [illegible] دوں۔ بعد کے برسوں میں جب نقادوں نے کینڈی کے فن کی اہمیت کا اعتراف کیا تو کئی لوگوں نے اس سے پینٹنگ خریدنے کے لیے رابطہ کیا مگر اس نے نہیں بیچی۔ وہ کہتا تھا کہ یہ اس کے مرحوم کزن کی نشانی ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی نے جان بوجھ کر اسے قتل کروا دیا ہو تاکہ وہ پینٹنگ ہتھیا سکے۔" ڈیوڈ کے لہجے سے شک کا اظہار ہو رہا تھا۔

"نہیں نہیں...." یہ سنتے ہی چارلی نے جلدی سے کہا۔ "پولیس کا کہنا ہے کہ وہ تقریباً ہر روز رات کے اس وقت ہائی وے عبور کر کے، اپنی ضرورت کی اشیا خریدنے کے لیے دوسری طرف واقع دکانوں کی طرف جاتا تھا۔ دو ایک دکان داروں نے اس بات کی تصدیق بھی کی ہے۔ پولیس نے تفتیش مکمل کرنے کے بعد اسے ایک اتفاقی حادثہ قرار دے کر کیس داخل دفتر کر دیا ہے۔" چارلی ایک وکیل تھا اس لیے وہ ڈیوڈ کو مطمئن کرنے کے لیے اس طرح وضاحت کر رہا تھا جیسے جج کو مطمئن کرنے کی خاطر ٹھوس دلائل دے رہا ہو۔

"کس کس دکان دار نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ روزانہ وہاں آتا جاتا تھا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"کئی تھے۔ ان میں ایک لارسن نامی شخص بھی تھا جو وہاں کے ایک ریستوران میں کام کرتا تھا۔ پولیس کے مطابق لارسن نے ہی لاش کو شناخت کیا تھا۔ وہ ریستوران میں بطور کلرک کام کرتا ہے۔" چارلی نے وضاحت سے جواب دیا۔

"تم نے آخری بار اس کے پاس یہ پینٹنگ کب دیکھی تھی؟" ڈیوڈ نے سوال کیا۔

"یہی کوئی پانچ چھ سال ہو رہے ہوں گے۔" چارلی نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ موت کے وقت تک یہ پینٹنگ برکر کے پاس ہی تھی؟" اس نے ایک بار پھر سوال کیا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ وہ تصویر اس نے نہ تو بیچی اور نہ ہی کسی کو دی ہے۔" چارلی نے کہنا شروع کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ اگر اسے اپنی موت کا یقین ہوتا تو شاید وہ یہ تصویر کسی کو تحفتاً دے دیتا لیکن اس کی حادثاتی موت ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پینٹنگ اس کے سامان میں ضرور موجود ہوگی۔"

"تم برکر کی موت کے بعد اس کے گھر گئے تھے؟"

"ہاں...." چارلی نے کہا۔ "اس نے وہ گھر لائبریری کو عطیہ کر دیا تھا۔ اس کی موت کے بعد قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کی وجہ سے میں ایک بار اس کے گھر گیا تھا۔ ایلس بھی ساتھ گئی تھی۔"

"یہ ایلس کون ہے؟" ڈیوڈ نے قطع کلامی کی۔

"لائبریری کی ڈائریکٹر ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مسٹر برکر نے بعد از مرگ یہ گھر لائبریری کو عطیہ کرنے کی وصیت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی تھی۔ عدالت نے معاملہ نمٹانے کے لیے بطور وکیل میری خدمات حاصل کی ہیں۔ اسی لیے میں گھر کا جائزہ لینے کے لیے گیا تھا۔“ چارلی نے جواب دیا۔

”تم نے وہ تصویر وہاں نہیں دیکھی؟“ ڈیوڈ نے سوال کیا۔

”نہیں... میں جان بوجھ کر لیونگ روم میں گیا، جہاں وہ پینٹنگ لگی ہوئی تھی لیکن وہ دیوار بالکل خالی پڑی تھی۔ البتہ دیوار پر پینٹنگ کے فریم کا ہلکا سا نشان پڑا ہوا تھا، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ بدستور وہیں پر لگی رہی تھی۔“

”تم نے ایلس سے کوئی بات کی ہے اس بارے میں؟“ ڈیوڈ نے ایک بار پھر سوال کیا۔

”نہیں... میں اسے شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ چارلی نے جواب دیا۔

”مجھے وہ مکان دیکھنا ہے۔ میں اس مکان میں کیسے داخل ہوں گا؟“ لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ اب مکمل طور پر کام کو سمجھ چکا ہے۔ اب اسے ہدف حاصل کرنے کی جلدی تھی۔

”اس کا بھی انتظام ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور میز کی دراز کھول کر ایک چابی نکالی۔ ”ویسے تو یہ اس گھر کی چابی ہے لیکن تمہارے لیے مالی خوشحالی کی کنجی ثابت ہوگی۔“

”شکریہ۔“ چارلی نے اس کے ہاتھ سے چابی لیتے ہوئے کہا۔ ”بہت جلد کام ہو جائے گا مگر میرا...“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔“ چارلی نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ”یہ میرا وعدہ ہے دو اعشاریہ چار ملین ڈالر کا دس فیصد کام ہونے پر اور پینٹنگ مہنگے داموں نیلام ہوئی تو مزید دس فیصد۔“

”ٹھیک ہے۔ کام ہو جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے ڈیوڈ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”جلد ملتے ہیں۔“

”مگر پینٹنگ کے ساتھ۔“ چارلی نے مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ڈیوڈ کا ہاتھ تھام کر گرمجوشی سے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا۔“ وہ مسکرا دیا۔

اگرچہ ڈیوڈ چاہتا تو کئی اور سوال بھی کر سکتا تھا لیکن وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔ اسے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ اگر مسٹر برگر غیر شادی شدہ اور بے اولاد تھے تو وہ کون ہے جو اس پینٹنگ کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اب چارلی کو وکیل کر کے گمشدہ پینٹنگ تلاش کروا رہا ہے۔ یا پھر یہ کہ چارلی اگر از خود اس پینٹنگ کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو پھر وہ یہ غیر قانونی کام یقیناً پیسے کے لیے کر رہا ہے جو اخلاقی اور قانونی، دونوں لحاظ سے سراسر غلط ہے مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس حوالے سے کچھ پوچھنا چاہتا ہو لیکن بھول گیا ہو۔ شاید یہ بڑھتی عمر کا اثر تھا کہ بہت سی باتیں اسے وقت گزرنے کے بعد ہی یاد آتی تھیں۔

☆☆☆

ڈیوڈ کا گھر سیٹل بندرگاہ سے تھوڑا فاصلے پر ایپلی ایونیو پر واقع تھا۔ پرانی طرز کے اس مکان سے کچھ فاصلے پر سمندر تھا۔ اکثر سرد راتوں کے سناٹے میں اس کی آنکھ سمندری موجوں کے شور سے کھل جاتی تھی۔ اگرچہ یہ کافی بڑا مکان تھا اور ڈیوڈ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیڈروم کی کھلی کھڑکی سے سمندر دیکھا کرے لیکن اس پرانے مخدوش گھر کا جو حصہ قابل استعمال تھا اُس سے باہر کا منظر دیکھنا ناممکن تھا۔

ڈیوڈ کی بیوی ڈولرس کروز اسپینش تھی۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی لیکن وہ پچاس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اسے اپنے حسب نسب پر بہت فخر تھا۔ وہ اپنا شجرۂ نسب مایا تہذیب کے باسیوں سے جوڑتی تھی۔ اسے قدیم تہذیبوں، فنون اور ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ انہی موضوعات پر وہ مقامی کالج میں پڑھاتی تھی۔ برسوں سے یہی شوق اب اس کی روزی روٹی کا بھی ذریعہ تھا۔ وہ اسپینش زبان پر اتھارٹی سمجھی جاتی تھی۔ جب سے اس نے کالج میں پڑھانا چھوڑا تھا تب سے وہ گھر پر ہی لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتی تھی۔ اُن دنوں بھی وہ ایک قدیم اسپینش زبان میں لکھی گئی شاعری کی ایک کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ اس نے گھر کے ایک کمرے کو ہی دفتر بنا رکھا تھا، جہاں وہ گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر لکھنے پڑھنے میں مشغول رہا کرتی تھی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ڈیوڈ گھر واپس آیا تو سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ ڈولرس حسب عادت کمپیوٹر پر کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔

”مل آئے وکیل سے۔“ ڈیوڈ پر نظر پڑتے ہی اس نے کی بورڈ پر انگلیاں چلانا بند کیں اور اس کی طرف دیکھ کر پیار بھرے لہجے میں مخاطب ہوئی۔

”ہاں...“ یہ کہتے ہوئے ڈیوڈ صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ۔ کیا کام پڑ گیا تم سے اُسے؟“ ڈولرس نے روایتی بیویوں والا سوال کیا۔

”بڑی لمبی کہانی ہے یہ۔“ اس نے تھکن سے چور لہجے میں کہا۔

”کافی پیو گے؟“ ڈولرس نے پوچھا۔

”لے آؤ۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ شاید یہ بڑھاپے کا تقاضا تھا کہ اب وہ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہانپ جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی اکھڑی سانسیں درست

کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہاں اب بتاؤ کیا کہہ رہا تھا چارلی۔“ کچھ دیر بعد میاں بیوی بیٹھے کافی پی رہے تھے، جب ڈولرس نے پھر وہی سوال دہرایا۔

”یہ لو...“ ڈیوڈ نے کوٹ کے اندر کی جیب سے پینٹنگ کا فوٹو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ڈولرس نے فوٹو تھام لیا اور وہ اسے چارلی سے ہونے والی ملاقات کا قصہ سنانے لگا۔ جتنی دیر تک وہ بولتا رہا، ڈولرس نظریں گڑائے فوٹو دیکھتی رہی۔

”بہت خوبصورت پینٹنگ ہوگی۔ اس کے رنگ بڑے شاندار ہیں اور خیال بھی اچھوتا ہے۔“ ڈولرس بدستور تصویر دیکھے جا رہی تھی۔

”ابھی تو اس کی مالیت دو اعشاریہ چار ملین ڈالر بتا رہا تھا وہ۔“

”یہ غلط ہے۔“ ڈولرس نے نظریں اوپر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بھی فن پارہ اپنے دیکھنے والے کی نظر سے اہمیت پاتا ہے اور خریدار کی جیب اسے قیمتی بناتی ہے۔“

”خیر... تم بھی ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”ایک بات سمجھ نہیں آرہی۔“ ڈولرس ایک بار پھر تصویر دیکھ رہی تھی۔

”اس نے جو کام تمہیں سونپا ہے، وہ سیدھا سادہ چوری کا معاملہ لگتا ہے۔“ ڈولرس نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا کہہ رہی ہو تم... کیا میں چوری کروں گا؟“ چوری کے نام پر ڈیوڈ تلملا کر رہ گیا اور جلدی سے کہنے لگا۔

”سوچنے کی بات یہ ہے کہ...“ ڈولرس نے دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ ”کینڈی اسکاٹ کا کوئی خونی رشتے دار موجود نہیں۔ مسٹر برگر اس دنیا میں نہیں ہیں اور ان کی کوئی اولاد بھی نہیں۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کون شخص ہے جس نے اس پینٹنگ کو حاصل کرنے کے لیے اسے وکیل کیا ہوا ہے؟ دوسرے یہ کہ چارلی یا کسی اور شخص نے اس پینٹنگ کی قیمت کا تعین کس بنیاد پر کیا ہے؟ اگر تم خود ہی سوچو دو اعشاریہ چار ملین ڈالر کم نہیں ہوتے۔ یہ پینٹنگ بہت اچھی ہے لیکن میرا خیال نہیں کہ اس کی اتنی قیمت ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے یہ اس سے کہیں زیادہ مالیت کی ہو۔“

”یہ سوال میرے ذہن میں بھی ابھرا تھا لیکن میں دوسری باتوں میں الجھ کر اس سے یہ پوچھنا ہی بھول گیا۔“ ڈیوڈ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے اب میں تم سے اس کام کے بارے میں مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔“

”فون اٹھاؤ اور پوچھو چارلی سے۔“ ڈولرس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”رہنے دو ابھی۔“ ڈیوڈ نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ”میں خود اس بات کا پتا چلا لوں گا کہ یہ پینٹنگ واقعی اتنی قیمتی ہے یا پھر اس کے پیچھے کوئی اور کہانی ہے۔“ ڈیوڈ اب اپنے ذہن میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے ذہن میں کام کرنے کا پورا نقشہ تیار کر چکا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح ناشتا کرنے کے بعد اس نے گاڑی نکالی اور ویسٹ سیٹل کی طرف چل پڑا۔ ڈولرس نے بتایا تھا کہ وہاں کی لائبریری میں کینڈی اسکاٹ کے کام کے بارے میں متعدد باتصویر کتابیں موجود ہیں۔ تقریباً گھنٹا بھر بعد وہ لائبریری کے ایک سنسان گوشے میں بیٹھا ایک کتاب کے ورق پلٹ رہا تھا۔ اس بڑے سائز کی باتصویر کتاب میں کینڈی اسکاٹ کی تمام پینٹنگز کی تصاویر اور ان پر لکھے ہوئے مختصر تبصرے موجود تھے۔ ڈیوڈ کو فن مصوری سے کوئی خاص لگاؤ تو نہیں تھا البتہ اس فن کے بارے میں خاصی شدبد ضرور تھی۔ وہ پہلی بار کینڈی اسکاٹ اور اس کے کام کے بارے میں مطالعہ کر رہا تھا۔ اسے سخت حیرت ہوئی کہ کینڈی اسکاٹ کا ابتدائی کام غیر معمولی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ ویسے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ عام طور پر زیادہ تر مصوروں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسے خاصی حیرت ہوئی کہ اپنے فن کی ابتدائی زندگی میں اس نے پکاسو، مائیکل اینجلو جیسے کئی بڑے مصوروں کی نقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ویسے ڈیوڈ نے اس بات پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ تو صرف یہ جاننے کے لیے یہاں آیا تھا کہ اگر کینڈی اسکاٹ نے ’انٹرلاک نمبر تین‘ بنائی ہے تو پھر انٹرلاک نمبر ایک اور دو کے عنوان سے بھی تصاویر ہوں گی۔ چارلی نے بتایا کہ اسے جس تصویر کی تلاش ہے، وہ کینڈی نے اپنی موت سے کچھ عرصے قبل ہی مکمل کی تھی، اس کا مطلب ہے کہ وہ پینٹنگ کسی نمائش میں رکھی نہیں گئی ہوگی البتہ اس سے پہلے کی وہ دو تصویریں تو ہونی چاہئیں، جن کی مناسبت سے اس نے اپنی آخری پینٹنگ کو سیریل نمبر تین کا حوالہ دیا ہے۔ ڈیوڈ نے کئی کتابیں دیکھیں لیکن کہیں بھی اسے ایسی تصویر نظر نہیں آئی جس کے عنوان سے سیریل نمبر کا تاثر ابھرتا ہو۔ ڈیوڈ نے لائبریری میں کینڈی اسکاٹ کے کام پر موجود لگ بھگ تمام کتابوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درق گردانی کرلی لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ نمبر ایک دو نہیں تو پھر نمبر تین کیوں؟'' لائبریری سے نکلتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ ''کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جو چارلی نے مجھ سے چھپایا ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔ اب وہ مسٹر برکر کے گھر کی طرف جارہا تھا۔

مسٹر برکر کا گھر بظاہر بہت خوبصورت تھا۔ یہ چاروں طرف سے وسیع و عریض سبزہ زار کے بیچوں بیچ بنا ہوا تھا۔ باہر سے تین منزلہ گھر بظاہر بالکل صاف ستھرا نظر آرہا تھا۔ لان کی گھاس بھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھی۔ درختوں سے ٹوٹے ہوئے پتے بھی گھاس پر پڑے ہوئے نظر نہیں آرہے تھے۔ مسٹر برکر کی زندگی میں تو اس صفائی ستھرائی کی وجہ سمجھ میں آتی ہوگی لیکن ان کی موت کے بعد وہ کون شخص ہے جو لان کی صفائی ستھرائی پر توجہ دے رہا ہے۔ وہ کچھ دیر تک لان کے پاس کھڑا سوچتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اگر مسٹر برکر کی موت کے بعد لان کی دیکھ بھال پر توجہ نہ دی گئی ہوتی تو اب تک گھاس کا رنگ سبز کے بجائے زرد پڑ چکا ہوتا۔ پتیاں بڑھ چکی ہوتیں اور اس پر شاخ سے ٹوٹے زرد پتے بکھرے ہوتے لیکن یہاں ایسا کچھ نہ تھا۔

کافی دیر تک مکان کا باہر سے جائزہ لینے کے بعد وہ ڈرائیو کی طرف بڑھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اور ادھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے گھر کے سرکزی دروازے پر کھڑے ہوکر کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ سب بند تھیں اور ان کے پردے گرے ہوئے تھے۔ اس نے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

گھر اندر سے بھی بہت شان دار اور صاف ستھرا تھا۔ لکڑی کے بنے ہوئے فرش چمک رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ڈیڑھ دو ماہ پہلے ہی ان پر پالش کی گئی ہو۔ وہ ایک کے بعد ایک کمرے کو دیکھتا رہا۔ سب خالی پڑے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ گھر کا سارا سامان باندھ کر اسٹور روم میں منتقل کیا جاچکا ہے۔ ضرور یہ کام ایلس کے کہنے پر کیا گیا ہوگا۔ جس کے لیے چارلی نے اسے بتایا تھا کہ برکر نے گھر اس کے ادارے کو عطیہ کردیا تھا۔

وہ لیونگ روم میں پہنچا۔ یہاں ایک دیوار پر اسے مستطیل شکل کا ایک نشان نظر آیا۔ وہ قریب ہوکر اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس نشان کو دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ وہ پینٹنگ خاصے طویل عرصے تک یہاں لگی رہی تھی، جس کی چارلی کو تلاش ہے۔ ''مسٹر برکر ریٹائرڈ آدمی تھے۔ ان کی عمر بھی زیادہ تھی۔ شاید اسی لیے وہ اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے گھر کی صفائی ستھرائی پر زیادہ توجہ دیتے ہوں گے۔'' ڈیوڈ نے سوچا۔ گھر خاصا بڑا تھا۔ وہ پورا گھر دیکھ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسٹور روم گھر سے باہر بنا ہوگا۔ وہ بقیہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ وہ اسٹور کی تلاش میں تھوڑا سا آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ پڑوس والے لان کو ایک بوڑھا شخص پانی دے رہا ہے۔ اس کا رُخ اسی طرف تھا جہاں سے ڈیوڈ آرہا تھا۔ پڑوسی نے اسے دیکھ کر پانی والے پائپ کا رُخ نیچے کی طرف کردیا۔ شاید وہ اسے چھینٹوں سے بچانا چاہتا تھا۔

''گڈ نون سر!'' ڈیوڈ اس کے قریب پہنچ کر خوشدلی سے بولا۔ اس نے بھی گرمجوشی سے جواب دیا۔ ''اگر آپ برا نہ منائیں تو کیا میں کچھ سوالات پوچھ سکتا ہوں؟'' یہ کہہ کر اس نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''بالکل پوچھ سکتے ہو۔ یہ ایک آزاد ملک ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا تو ڈیوڈ کا حوصلہ بڑھا۔

''حال ہی میں اس گھر پر کوئی آیا تھا کیا؟'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ بات کون جاننا چاہتا ہے؟'' اس نے مسکرا کر اُلٹا سوال کردیا۔

''میں لوگوں کی گمشدہ چیزیں تلاش کرنے کا کام کرتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ اس دوران میں مسٹر برکر کا وہ بوڑھا ہمسایہ اسے مشتبہ نظروں سے گھورتا رہا۔

''میں باب براؤن ہوں۔'' ڈیوڈ کے خاموش ہونے پر اس نے اپنا گیلا ہاتھ ٹی شرٹ سے پونچھتے ہوئے کہا اور چند قدم آگے بڑھ کر ڈیوڈ کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''کیا آپ اور مسٹر برکر دوست تھے؟'' اس نے باب سے ہاتھ ملاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں...'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں ایک دوسرے کو پچھلے تیس برسوں سے جانتے تھے لیکن ہم اچھے دوست کبھی نہیں رہے اور نہ ہی ہمارے درمیان کبھی کسی قسم کی کوئی رنجش ہوئی۔'' اس نے بتانا شروع کیا۔ ''وہ میرے یہاں منتقل ہونے سے کئی سال پہلے سے ہی اس گھر میں رہائش پذیر ہوچکے تھے۔'' اس نے خوشدلی سے بتایا۔ لگتا تھا کہ وہ اب اسے شک کی نظر سے نہیں دیکھ رہا...

''کبھی ان کے گھر تمہارا آنا جانا ہوا؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''کئی بار...''

''ان کے لیونگ روم کی دیوار پر ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ تمہیں کچھ یاد پڑتا ہے اس بارے میں؟'' ڈیوڈ نے اس سے سوال کیا۔

''میرے ذہن میں نہیں ہے۔'' باب نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بے یقینی سے کہا۔ ''کیا تم اسی کی تلاش میں ہو؟''

''ہاں...'' اس نے جواب دینا شروع کیا۔ ''وہ پینٹنگ اسی جگہ پر لگی ہوئی تھی لیکن اب نہیں ہے۔''

''ویسے مجھے تو کچھ یاد نہیں آرہا، اس بارے میں۔ اگر تمہیں تو وہیں ہوگی۔ تم اسے گھر کے اندر تلاش کرو۔ کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔'' باب نے اس طرح کہا جیسے وہ گھر کی کسی چھوٹی موٹی چیز کے نہ ملنے پر گھر والی کو مشورہ دے رہا ہو۔

''مسٹر برکر کے گھر پر کس کس کا آنا جانا تھا۔ خاص کر ان کی موت والی رات یا اس سے ایک دو دن پہلے تم نے ان کے ہاں کسی کو آتا جاتا دیکھا؟'' ڈیوڈ نے وہی سوال ذرا بدل کر ایک بار پھر باب سے کیا جو اس سے پہلے ہی پوچھ چکا تھا مگر جواب نہیں مل پایا تھا۔

''تم کس کے لیے اس پینٹنگ کو تلاش کررہے ہو؟'' باب نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کردالا۔

''اُن کے لیے جو اس جائداد کی منتقلی کا معاملہ دیکھ رہے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اسے مطمئن کرنے کی خاطر گول مول جواب دیا اور پوچھا۔

''یہاں مسٹر برکر کا کوئی قریبی دوست تھا؟''

''یہاں زیادہ تر وہ لوگ رہتے ہیں جو یونگ کمپنی میں ملازم تھے۔ مسٹر برکر بھی اسی کمپنی سے ریٹائر ہوئے تھے۔'' باب نے بتانا شروع کیا۔ ''میں بھی یونگ کمپنی میں کام کرتا تھا لیکن مجھے یاد نہیں کہ یہاں مسٹر برکر کے پرانے ساتھیوں میں کوئی ان کا قریبی دوست ہے۔ وہ تنہائی پسند تھے۔ وہ کسی سے زیادہ ملتے جلتے نہیں تھے۔ بس اپنے آپ میں مگن رہتے تھے۔'' باب ایک لمحے کے لیے رکا۔ ''کیا اس گھر کو فروخت کیا جارہا ہے؟'' اچانک اس نے ڈیوڈ سے سوال کیا۔

''مجھے علم نہیں اس بارے میں۔'' ڈیوڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے گفتگو کرکے اچھا لگا۔ آپ کی باتوں سے مجھے کیس کو سمجھنے میں خاصی مدد ملی ہے۔ بس! ایک آخری سوال۔'' اس نے اپنے لہجے کو مزید شائستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر برکر کی موت کو ایک ماہ سے زیادہ ہوچکا ہے لیکن ان کا لان بہت صاف ستھرا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی دیکھ بھال باقاعدگی سے کی جارہی ہے۔ یہ کام کون کرتا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور باب کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''ایک سروس کمپنی کا ٹرک ہر ہفتے آتا ہے۔'' باب نے اس کے سوال کا جواب دینا شروع کیا۔ ''ایک دو مالی آتے ہیں اس ٹرک میں۔ وہی لان کی صفائی ستھرائی، گھاس تراشنے اور پانی دینے کا کام کرتے ہیں۔ جب سے مسٹر برکر کا انتقال ہوا ہے، وہ باقاعدگی سے ہر ہفتے آتے ہیں۔ ویسے وہ پہلے بھی آیا کرتے تھے۔'' باب نے تفصیل سے جواب دیا۔

''وہ کس رنگ کے ٹرک میں آتے ہیں؟'' ڈیوڈ نے وضاحت چاہی۔

''نیلے اور سفید رنگ کا ٹرک ہے۔ تم دور سے بھی دیکھو گے تو پہچان لوگے۔'' باب نے بتایا۔

''وہ کس دن آتے ہیں؟'' ڈیوڈ نے ایک سوال کیا۔

''ہر بدھ کو۔'' اس نے کہا۔ ''ارے آج منگل ہے۔ وہ کل آئیں گے۔''

''آپ نے میری بہت مدد کی ہے... شکریہ۔'' ڈیوڈ نے اس سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گیا۔ باب ایک بار پھر لان میں پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگا۔

''ارے رکو...'' ابھی ڈیوڈ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ اچانک باب نے اسے پکارا۔

''کیسے...'' ڈیوڈ پلٹا اور اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''وہ تم پوچھ رہے تھے نا کہ کون کون ان کے گھر آتا تھا۔'' اس نے پانی چھڑکنا بند کردیا۔

''جی ہاں...'' اس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

''اکثر اس کے پاس لارین نامی ایک شخص آیا کرتا تھا کچھ سامان وغیرہ لے کر۔ شاید مسٹر برکر اسے فون کردیتے ہوں گے تو وہ ان کی ضرورت کا سامان لے آتا ہوگا۔''

''یہ کون ہے؟'' ڈیوڈ نے چونکتے ہوئے قطع کلامی کی۔

''میں اسے جانتا ہوں۔ وہ کوئینس ریستوران میں کلرک ہے۔'' باب نے بتانا شروع کیا۔ ''جس رات ان کا انتقال ہوا ہے، اس رات بھی میں نے اسے گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ بس اتفاق سے اس پر نظر پڑ گئی تھی۔ اُس وقت میں ڈنر کے بعد لان میں چہل قدمی کررہا تھا۔'' اس نے بات مکمل کرکے ڈیوڈ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ''وہ مجھے بھول جانے کی بیماری ہے۔ فوری طور پر بات یاد نہیں آتی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد یہ بات یاد آئی۔''

''بہت بہت شکریہ مسٹر باب... واقعی آپ نے میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت مدد کی ہے۔'' یہ کہہ کر ڈیوڈ باہر کی طرف جانے والے راستے پر چل دیا۔ اسے یقین تھا کہ اب اسٹور روم میں مسٹر برکر کے سامان کا جائزہ لینے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

ڈیوڈ نے کار میں بیٹھ کر لیپ ٹاپ آن کیا اور اسے موبائل انٹرنیٹ سے کنیکٹ کر کے سرچ کرنے لگا۔ آخر اسے اپنے مطلب کا مواد مل گیا۔ یہ ایک تفصیلی رپورٹ تھی جو مسٹر برکر کی موت کے بارے میں ایک مقامی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق جس عورت کی گاڑی کی ٹکر سے برکر کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس کا نام برتھا ہے اور وہ جائے حادثہ سے کئی میل دور رہتی تھی۔ جہاں حادثہ پیش آیا، وہ کافی مصروف علاقہ تھا۔ یہاں ہائی وے پر سفر کرنے والوں کے لیے کئی موٹیل، ریستوران، پیٹرول پمپ اور اشیائے ضرورت فروخت کرنے والی متعدد دکانیں موجود تھیں۔ یہ دکانیں ہائی وے کے دونوں اطراف کی آبادی کی ضروریات پورا کرنے کا ذریعہ بھی تھیں۔ یہی وجہ تھی ان دکانوں اور ریستورانوں پر اکثر رش رہتا تھا۔

یہ علاقہ دراصل پہلے ایک قصبہ تھا۔ تاہم اس کے بیچوں بیچ ... ہائی وے گزرنے کی وجہ سے یہ قصبہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ آج بھی جس جگہ دکانیں اور موٹیل وغیرہ واقع ہیں، ان میں سے کئی اب بھی 1930ء کی دہائی میں بنائی گئی عمارتوں میں قائم ہیں۔ زیادہ تر دکانیں ہائی وے بننے سے پہلے بھی موجود تھیں۔ انہی میں سے ایک کولنس موٹیل بھی ہے، جہاں حادثے کے وقت مسٹر برکر جا رہے تھے۔ وہ عموماً رات کو اس موٹیل کے ریستوران میں کافی پینے جاتے تھے اور واپسی پر ضرورت کی اشیا خریدتے ہوئے گھر لوٹ آتے تھے۔

کچھ دیر بعد ڈیوڈ ہائی وے 99 کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی منزل کولنس ریستوران سے لارسن نامی اس شخص کی تلاش تھی جو مسٹر برکر کی موت والی رات اُن کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے باہر کھڑا تھا۔

یہ پرانی وضع قطع کی عمارت تھی جو انگریزی کے حرف 'یو' کی شکل میں تعمیر کی گئی تھی۔ مرکزی دروازے کے سامنے تار کول کی پختہ سڑک موجود تھی اور دونوں جانب گاڑیاں پارک کرنے کے لیے وسیع جگہ موجود تھی۔ ساتھ ہی چوڑی سی فٹ پاتھ بنی ہوئی تھی، جس پر میزیں لگی ہوئی تھیں۔ اس دن دوپہر موسم بہت اچھا تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دن ہونے کے باوجود اکثر میزوں پر بے فکرے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کئی میزوں کے سامنے کرسیوں پر ایسی لڑکیاں بھی تنہا بیٹھی ہوئی ساتھی کی منتظر تھیں جن کے اسکرٹ چھوٹے اور جوتے گھٹنے تک پہنچے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی یہ ہائی وے تھا۔ اس طرح کے علاقے ان جیسی لڑکیوں کی وجہ سے ٹرک ڈرائیوروں کے لیے نہایت کشش کے حامل ہوتے ہیں۔

وہ ارد گرد نظریں ڈالتا ہوا جب ریستوران کے داخلی دروازے پر پہنچا تو وہاں 'اسامی خالی ہے' کا ایک چھوٹا سا اشتہار بھی چسپاں تھا۔ جس پر لکھا ہوا تھا کہ ''موٹیل کی نائٹ شفٹ کے لیے استقبالیہ کلرک کی ضرورت ہے۔'' اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر کیش کاؤنٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

''تم بے وقوف ہو گیا؟'' ریستوران کے استقبالیہ کلرک نے ڈیوڈ کی بات سن کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ میری یادداشت ایسی ہے کہ جس میں یہاں آنے والے ہر شخص کی تصویر محفوظ ہو جاتی ہوگی۔''

''لیکن پھر بھی...''

''بھئی مجھے کس طرح یاد رہ سکتا ہے کہ ایک ماہ پہلے تمہارا دوست یہاں آیا تھا، یا وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔'' اس نے ایک بار پھر اس کا مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''یہاں روزانہ سیکڑوں لوگ آتے ہیں۔'' اس نے ہاتھ سے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کس کس کا چہرہ یاد رکھوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''مجھے تو صرف نوٹ یاد رہتے ہیں جو مجھے ان سے لینے ہوتے ہیں اور بس...'' یہ کہہ کر اس نے گردن موڑی اور بل وصول کرنے لگا۔

''یہ لو ایک سو ڈالر کا کرارا نوٹ...'' جس وقت وہ ایک گاہک سے بل وصول کر رہا تھا، ڈیوڈ نے بٹوا کھول کر نوٹ نکالا اور جیسے ہی وہ فارغ ہوا اس کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ اس نے نوٹ پکڑنا چاہا لیکن اس نے نیچا دے دیا۔

''ایسے نہیں... بل لے کر کچھ تو دینا ہوگا۔'' ڈیوڈ نے لہجے کو عیارانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ویسے میں شرط لگاتا ہوں، جس شخص کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، تم سے یقیناً جانتے ہو۔'' نوٹ بدستور ڈیوڈ کے ہاتھوں میں تھا اور لالچی کلرک مال مفت سمجھ کر نظریں نوٹ پر اور کان اس کی بات پر لگائے ہوئے تھا۔

''اب کچھ نہ کچھ تو ضرور بتاتا ہوں گا۔'' اس نے نوٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر جلدی سے اسے جھپٹ کر شرٹ کی اوپری جیب میں اُڑس لیا۔ ''بڑے اُستاد ہو تم۔ کوئی جاسوس تو نہیں ہو، ویسے بڑے تجربہ کار لگتے ہو۔'' اس نے ہنستے ہوئے ڈیوڈ سے کہا۔

''کام کی بات کرو۔'' اب اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''میں اپنے دوست کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو ایک ماہ پہلے تک اکثر یہاں آیا کرتا تھا مگر ایک رات ہائی وے پر وہاں ایک گاڑی کی ٹکر سے اس کی موت ہو گئی۔ اس کا نام بڈ برکر تھا۔''

''جانتا ہوں۔'' اس نے قطع کلامی کی۔

''صرف برکر نہیں، لارسن کے بارے میں بھی معلومات چاہئیں۔'' ڈیوڈ نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور چوٹ لگائی۔

''بتا دوں گا لیکن جو کچھ بتاؤں گا، اس کے بیچ میں کہیں بھی میرا نام نہیں آنا چاہیے۔'' اس نے رازدارانہ لہجے میں ڈیوڈ سے سرگوشی میں کہا۔

''نہیں آئے گا۔'' اس نے یقین دلایا۔ اس کے بعد کلرک نے مزید سو ڈالر کے ایک نوٹ کا مطالبہ کر دیا۔ ڈیوڈ نے بنا تردد کے بٹوا نکالا اور نوٹ اس کے حوالے کر دیا۔ جیب میں دو سو ڈالر جانے کے بعد اس کے جسم میں بجلی بھر گئی تھی۔ اس نے پُرجوش لہجے میں وہ سب کچھ اسے بتانا شروع کر دیا جو وہ برکر اور لارسن کے بارے میں جانتا تھا۔

کلرک نے جو معلومات فراہم کیں، وہ ڈیوڈ کے لیے نہایت کارآمد تھیں۔ کلرک کے مطابق وہ صبح دس بجے سے رات دس بجے تک بارہ گھنٹوں کی ڈیوٹی کرتا تھا۔ رات آٹھ بجے نائٹ کلرک لارسن ڈیوٹی پر آ جاتا تھا۔ ریستوران کا مالک نہایت کنجوس فطرت شخص ہے۔ اس نے ہر چیز کا ریکارڈ کمپیوٹر پر رکھا ہوا ہے۔ کمپیوٹر ریکارڈ اور کلرک کی یادداشت کے مطابق جس رات مسٹر برکر کی گاڑی کی ٹکر سے موت ہوئی، اس سے ایک رات پہلے وہ یہاں آئے تھے۔ وہ وقت کے پابند تھے۔ ہمیشہ خاص وقت پر پہنچتے، کافی پیتے اور اٹھ کر چل دیتے تھے۔ اب یہ شاید اتفاق ہی تھا کہ جس رات مسٹر برکر کی موت ہوئی، اس کے دوسرے دن لارسن نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ ڈیوڈ، لارسن سے ملنا چاہتا تھا لیکن کلرک یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔ استقبالیہ کلرک کا کہنا تھا کہ وہ کئی سالوں سے یہاں کام کر رہا تھا۔ مسٹر برکر سے اس کی اچھی جان پہچان شناسائی تھی۔ عموماً وہ فون کر کے لارسن کے ہاتھوں چیزیں بھی منگوا لیتے تھے۔

''کمپیوٹر دیکھ کر بتاؤ کہ پچھلے مہینے کی پانچ تاریخ کو مسٹر نے فون پر ریستوران کو کوئی آرڈر لکھوایا تھا۔'' یہ وہ تاریخ تھی جس رات برکر کی موت ہوئی اور باب نے لارسن کو اس کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

''نہیں... بلکہ اس سے پچھلی کئی تاریخوں میں ان کا کوئی آرڈر نہیں آیا تھا۔'' اس نے کمپیوٹر ریکارڈ تفصیل سے چیک کرنے کے بعد کہا۔

''اچھا۔'' ڈیوڈ نے کہا اور دل ہی دل میں کچھ سوچنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ برکر کی موت، پیننگ اور لارسن کے درمیان کوئی تعلق ضرور موجود ہے، تاہم وہ اب تک اس تعلق کو کوئی نام دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے لیے ابھی بہت کچھ جاننا باقی تھا۔ اس نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

''لارسن نے ملازمت کیوں چھوڑی، اس کی وجہ کیا تھی؟''

''نہ تو اس نے بتایا اور نہ ہی میں نے پوچھا۔'' کلرک نے اس کے سوال کا سادگی سے جواب دیا۔ ''بس آیا، جلدی میں استعفیٰ دیا۔ سامان سمیٹا اور چلا گیا۔ وہ بہت جلدی میں تھا، جاتے ہوئے تنخواہ بھی نہیں لے کر جا سکا۔''

''وہ یہاں سے نوکری چھوڑ کر کہاں گیا ہوگا؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس کے پاس گاڑی تھی؟''

''ہاں... سرخ رنگ کی پرانی فلیٹ کار تھی اس کے پاس۔''

''اس کا نمبر...''

''یہ تو مجھے یاد نہیں۔'' کلرک نے جواب دیا۔

''اس کا لائسنس نمبر...'' ڈیوڈ نے پھر سوال کیا۔

''نہیں ہے...''

''وہ اپنے پیچھے کچھ تو چھوڑ کر گیا ہوگا؟''

''ہاں...''

''وہ کیا ہے؟'' ڈیوڈ نے بے تابی سے پوچھا۔

''ایک ہفتے کا کچرا۔'' یہ کہہ کر وہ پورا منہ کھول کر زور زور سے ہنسنے لگا۔

''وہ کہیں رہتا تھا نا۔'' ڈیوڈ نے اس کے بھونڈے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ یہ سن کر اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ ''جس کمرے میں وہ رہتا تھا، اب وہاں کون ہے؟'' ڈیوڈ نے فوراً سوال کر دیا۔

''کوئی نہیں۔''

''کیا میں وہ کمرا دیکھ سکتا ہوں۔''

''بالکل۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''وہاں کچھ تو ایسا ہوگا کہ جس سے اس کا کچھ اتا پتا مل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکے۔'' ڈیوڈ کے لہجے سے امید جھلک رہی تھی۔

''ہاں... کچھ کا تھ کباڑ تو ہے وہاں پر بھی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور اپنا منہ اس کے کان کے پاس لاتے ہوئے بولا۔ ''پر اس کام کے عیوض مجھے کیا ملے گا؟'' اس کے دل میں ایک بار پھر ڈالر ملنے کی امید جاگ گئی تھی۔

''یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ مجھے وہاں سے کیا ملتا ہے؟'' ڈیوڈ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا اس لیے اس نے بھی گول مول جواب دیا۔ وہ پہلے ہی اسے دو سو ڈالر دے چکا تھا۔ اب وہ اسے پھوٹی کوڑی بھی دینے کا روادار نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے... تم کچھ دیر یہاں بیٹھ کر انتظار کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کچرے میں تمہیں مطلب کی کوئی شے مل ہی جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈیوڈ مڑا اور یہ کہتے ہوئے ایک میز کی طرف بڑھا۔ ''ایک کپ کافی بھجوا دو۔''

''ابھی بھیجتا ہوں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

☆☆☆

''تم نے صرف ایک شخص پر دو سو پچاس ڈالر خرچ کر دیے۔'' ڈورس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے اور وہ دونوں اسٹڈی میں بیٹھے دن بھر کی رُوداد ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ ''ویسے لارسن کے کمرے سے کچھ کام کی بات پتا چلی؟''

''ہاں...'' ڈیوڈ نے مختصر جواب دیا۔

''کیا...؟''

''کمرا بے ترتیبی سے پھیلا ہوا تھا۔'' ڈیوڈ نے بتانا شروع کیا۔ ''ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں تھا۔ شاید اسے عجلت میں جانا پڑا تھا۔ اس لیے اس نے صرف نہایت ضروری چیزیں ہی اپنے ساتھ لی ہوں گی۔ بھی تو اس کے استعمال کی کئی چیزیں وہیں فرش پر بکھری ہوئی پڑی تھیں۔''

''لگتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔'' ڈورس نے پوری بات سنے بنا کہا۔

''وہاں سے ایک ہی کام کی چیز مل پائی ہے اور وہ ہے کینوس کٹر۔'' ڈیوڈ نے کہا۔ ''پینٹنگ ایک لکڑی کے فریم میں تھی اور جو کٹر ملا ہے وہ کینوس کو کاٹنے کے کام آتا ہے۔ لگتا ہے وہ تصویر اسی نے چرائی ہے کسی کے ایما پر۔ پھر اس کٹر سے تصویر کو کاٹ کر علیحدہ کیا اور رول کر کے لے گیا۔ بعد میں پکڑے جانے کے خوف سے فرار ہو گیا۔ پینٹنگ چوری کرنے والے ہمیشہ اسی طرح سے واردات کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھیں پھیلائیں اور لمبی سانس لی۔

''یہ ریسٹوران سے کب غائب ہوا تھا؟'' ڈورس نے اسے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

ریسٹوران کے کلرک نے جو تاریخ اور وقت بتایا ہے وہ برکر کے قتل کے دوسرے دن کا ہے۔''

''قتل...'' یہ سنتے ہی ڈورس چونکی۔ ''تم تو بتا رہے تھے کہ پولیس کے مطابق وہ حادثہ تھا۔''

''بظاہر ایسا ہی ہے لیکن اسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ٹکر مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ پینٹنگ نے اس کی جان لی ہے۔ وہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔'' ڈیوڈ نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ ''پہلے اسے قتل کیا گیا۔ اس کے بعد برکر کے گھر سے پینٹنگ چرائی گئی۔ پھر اسے ریسٹوران میں لارسن کے کمرے میں فریم سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا اور اس کے بعد مجرم فرار ہو گئے۔ مجھے تو یہ خاصا پیچیدہ چکر لگ رہا ہے۔ یقیناً وہ تصویر بہت خاص ہوگی۔ اس پورے قضیے میں لارسن تنہا نہیں ہوگا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ شخص ایک کارندہ تھا۔ اصل لوگ کچھ اور ہی ہوں گے۔'' ڈیوڈ تفصیل سے وہ نتائج اپنی بیوی کو بتا رہا تھا جو اب تک کی گئی تفتیش سے اس نے اخذ کیے تھے۔

''کچھ اور بھی خاص چیز ملی ہے وہاں سے۔'' ڈورس نے سوال کیا۔

''ہاں ایک کان کی بالی ملی ہے جس میں سرخ رنگ کے نقلی موتی لگے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے اس کے ساتھ کوئی عورت بھی شریک ہو۔ یا پھر وہ اس کی کسی دوست کا بھی ہو سکتا ہے۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔

''خاصی تیز مچھلی ہے۔'' ڈورس نے محاورے میں تبصرہ کیا۔ یہ سن کر ڈیوڈ نے نظریں اٹھا کر لمحہ بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر جیب سے سگار نکالنے لگا۔

☆☆☆

دوسرے دن بدھ تھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے، جب ڈیوڈ مسٹر برکر کے گھر پہنچا۔ اس وقت نیلے اور سفید رنگ کا چھوٹا سا ایک ٹرک باہر کھڑا تھا۔ اندر لان میں دو لڑکے کام کر رہے تھے۔ یہی وہ دونوں لڑکے تھے، جن کے بارے میں اسے باب نے بتایا تھا۔ وہ دونوں غریب طالب علم تھے۔ اس کام سے طرح انہیں اتنی رقم حاصل ہو جاتی تھی جس سے وہ ایونگ کالج کی فیس ادا کر سکتے تھے۔ یہاں آتے ہوئے ڈیوڈ نے راستے سے دو برگر، ایک چپس کا پیکٹ اور تین سوفٹ ڈرنک خریدے تھے۔ وہ ان لڑکوں کو یہ چیزیں تحفتاً پیش کر کے راہ و رسم بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ برکر کی موت کے بعد انہیں اس کام کی فیس کون ادا کر رہا ہے۔

جب وہ ان لڑکوں کے پاس پہنچا تو وہ اپنا کام تقریباً ختم کر چکے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کا تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ باہمی تعارف جب تک اختتام پر پہنچا، اس وقت ان کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ وہ یہ جان کر مطمئن ہو گئے تھے کہ ڈیوڈ کا بالواسطہ تعلق اس مکان سے تھا۔

''یہ لو تمہارے لیے۔'' وہ لڑکے جب اپنے کام سے پوری طرح فارغ ہو گئے تو اس نے شاپر ان کی طرف بڑھایا۔ ''ادھر بینچ پر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔'' ان میں سے ایک لڑکے نے تھوڑا سا ہچکچانے کے بعد شکریے کے ساتھ پیکٹ قبول کر لیا۔ کچھ دیر بعد وہ لان کے کنارے، ایک درخت کے نیچے رکھی ہوئی بینچ پر بیٹھے ہوئے بے تکلفی سے کھا پی رہے تھے اور ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔

''گھر کا مالک تو اب اس دنیا میں رہا نہیں، تمہاری فیس کون ادا کرتا ہے؟'' ڈیوڈ نے جب دیکھا کہ ان تینوں کے درمیان اعتماد کی فضا قائم ہو چکی ہے تو اس نے سوال کیا۔

''پہلے کی طرح۔'' ان میں سے ایک لڑکے نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ڈیوڈ چونکا۔

''ہمیں ہر پندرہ دن کے بعد سی ای سی انٹرپرائزز کمپنی کی طرف سے ڈاک کے ذریعے معاوضے کا چیک مل جاتا ہے۔''

ڈیوڈ سی ای سی کا مفہوم جانتا تھا۔ وہ 'چارلس ایون کولنز انٹرپرائزز کمپنی' کا مخفف تھا۔ اس کی کمپنی کے سیکڑوں کلائنٹ تھے۔ یہ کمپنی خدمات فراہم کرنے اور اسے حاصل کرنے والوں کے درمیان پل کا کام کرتی تھی۔ لوگ کمپنی کی معرفت خدمات حاصل کرتے اور اسے ادائیگی کرتے۔ کمپنی اپنا مخصوص حصہ رکھ کر طے شدہ معاوضہ کام کرنے والوں کو ادا کر دیتی تھی۔ جب لڑکوں نے 'سی ای سی کمپنی' کا نام لیا تو وہ یہ سمجھ گیا کہ مسٹر برکر نے بھی اس کام کے لیے اپنی زندگی میں ہی کمپنی کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔ وہ زندہ ہوتے تو پوچھنے کی بات نہ تھی۔ یقیناً وہ باقاعدگی سے فیس ادا کرتے ہوں گے لیکن ان کی موت کے بعد کمپنی کم سے کم دو سے زائد بار ان لڑکوں کو معاوضے کی ادائیگی کر چکی ہے۔ اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کمپنی کس کی طرف سے یہ ادائیگی کر رہی تھی۔ اگر یہ ادائیگی کمپنی کر رہی تھی تو وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ یہ بات اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''ہو سکتا ہے کہ چارلی کو کسی نے ایسا کرنے کی ذمے داری دی ہو۔'' ممکن ہے اس ابھری، جسے چارلی کے بقول مسٹر برکر نے یہ گھر عطیہ کر دیا تھا، اس کی انتظامیہ نے یہ فریضہ اسے سونپا ہو۔'' وہ کافی دیر تک امکانات پر غور کرتا رہا اور آخر کسی نتیجے پر پہنچے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں لڑکے جا چکے تھے۔ وہ لان میں خاصی دیر تک تنہا بیٹھا رہا۔ اب وہ گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ڈیوڈ نے مرکزی داخلی دروازے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے ...... ہاتھ بڑھا کر بلب روشن کیے اور چند لمحے تک کھڑا ہو کر ادھر اُدھر غور سے دیکھتا رہا۔ سب کچھ کل جیسا ہی تھا۔ اس بار وہ نہایت سکون سے پورے گھر کی تلاشی لینے کا تہیہ کر کے آیا تھا۔ اس نے پورا گھر چھان مارا۔ نہایت باریک بینی سے ہر در و دیوار کا جائزہ لیا مگر اسے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس سے گمشدہ پینٹنگ کے بارے میں کوئی ثبوت مل سکتا۔ وہ کافی دیر تک لاحاصل تلاش میں مصروف رہا۔ آخر تھک ہار کر واپس لیونگ روم میں آیا اور خالی کمرے میں رکھی ہوئی واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھا اور بیڈ روم میں جا پہنچا۔ اگرچہ چارلی کے مطابق گھر کا ساز و سامان اسٹور میں منتقل کیا جا چکا تھا تاہم وہاں ایک رائٹنگ ٹیبل اور بیڈ ابھی تک موجود تھا۔ اس نے میز کا جائزہ لیا۔ اس میں دو دراز بنی ہوئی تھیں۔ اس نے اوپر کی دراز کھولی۔ اس میں کچھ بینک کے کاغذات، ایک چیک بک موجود تھی۔ اس نے چیک بک کھولی اور پھر بینک اسٹیٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ برکر نے چیک بک سے کاٹے گئے ہر چیک کے برابر میں موجود چھوٹے سے حصے پر رقم اور تاریخ کا مکمل اندراج کر رکھا تھا۔ ان کاغذات کا تفصیلی جائزہ لینے سے اسے پتا چلا کہ اسے مجموعی طور پر ہر ماہ اٹھائیس سو ڈالر ملتے تھے۔ یہ رقم ہوٹل کمپنی سے بطور پنشن اور سوشل ویلفیئر فنڈ سے آتی تھی۔ نچلی دراز میں چند چھوٹی موٹی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے دراز نکال کر میز پر انڈیل لی۔ اس دوران میں کوئی چیز چھناکے کی آواز پیدا کرتی ہوئی فرش پر گری۔ ڈیوڈ جھکا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ سونے کا بنا ہوا شادی کا چھلا تھا۔ اسے تو یہ بتایا گیا تھا کہ برکر نے شادی نہیں کی تھی لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر یہ چھلا اس کے پاس کیوں تھا۔ اس نے کافی دیر تک ہر چیز کا جائزہ لیا لیکن اس چھلے کے سوا کوئی اور خاص چیز اسے نہ ملی۔

اس کا شک اب اور پختہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شام کے تین بج رہے تھے۔ وہ ہیمل کے شیرف آرتھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میک کے ہمراہ ایک ریستوران میں لنچ کر رہا تھا۔ وہ دونوں کالج کے دنوں کے ساتھی تھے اور ان میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ شیرف جانتا تھا کہ ڈیوڈ جزوقتی طور پر سراغ رسانی کرتا ہے لیکن جان بوجھ کر اس نے کبھی اسے روکنے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ ایک تو ان کی دوستی تھی، دوسرا یہ کہ اس نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جو پولیس کے لیے قابل دست اندازی ہو۔ دوپہر کو جب اس نے شیرف کو فون کر کے ملنے کا کہا تو اس نے دفتر کے بجائے اسے ریستوران پہنچنے کو کہا۔ اصل میں ڈیوڈ اس کے پاس ایک کام سے آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیرف اس معاملے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ یہ بات تو جانتا تھا کہ حادثے کے بعد گاڑی چلانے والی عورت برتھا فرار ہونے کے بجائے موقع پر ہی موجود رہی تھی۔ دوسرا یہ کہ اطلاعات کے مطابق لارسن نامی شخص نے ہی برکر کی لاش کو تلاش کیا۔ اس لیے ان کے مکمل کوائف پولیس ریکارڈ میں ہونے چاہئیں۔ تیسرا یہ کہ اسے اس گاڑی کا نمبر، ماڈل اور تصویر چاہیے تھی، جو برکر سے ٹکرائی تھی۔ کھانے کے دوران اس نے ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد آخر اپنے آنے کا مدعا بیان کر ڈالا۔

"یہ معلومات ریکارڈ میں ہیں اور خوش قسمتی سے ان دونوں کی تصویریں بھی ہیں۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ شام تک تمہیں یہ معلومات ای میل کروا دیتا ہوں۔" ڈیوڈ کا مدعا سن کر آرتھر نے فوراً معلومات اسے فراہم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ "ویسے تمہیں ان چیزوں کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" آرتھر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں ایک کیس پر کام کر رہا ہوں۔"

"کیا مسٹر برکر کی موت کسی کے خیال میں مشکوک ہے؟" یہ سن کر وہ چونک گیا تھا۔

"کسی کے لیے بھی مسٹر برکر کی موت مشکوک نہیں۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پولیس کے خیال میں بھی وہ ایک حادثہ ہی تھا۔" شیرف نے کہا۔

"بات کچھ اور ہے جس کی وجہ سے میں واحد شخص ہوں جو یہ سمجھتا ہے کہ مسٹر برکر کی موت حادثہ نہیں بلکہ قتل کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔"

"یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟" ڈیوڈ کی بات سنتے ہی شیرف کو زوردار جھٹکا لگا۔

"مجھے ایک کیس سونپا گیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ میرے کلائنٹ نے نہ صرف غلط بیانی کی ہے بلکہ جس شے کی تلاش کا ذمے سونپا گیا، وہ بہت قیمتی ہے اور اس کا تعلق مسٹر برکر کی ذات سے ہے۔"

"تم کھل کر بتاؤ، اگر یہ قتل کی واردات تھی تو پھر مجرم بچ نہیں سکتے۔" شیرف نے مٹھیاں بھینچتے اور دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے مگر فی الوقت اتنی ہی گزارش کر چکا ہوں۔" ڈیوڈ نے یہ دیکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہنا شروع کیا۔ "ابھی لوہا پوری طرح گرم نہیں ہوا ہے۔ جب مجھے لگے گا کہ واقعی اب ضرورت ہے تو پھر میں لوہے پر چوٹ مارنے کے لیے تمہیں ہی کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ قانون کے لیے تمہاری بے لوث مدد ہوگی۔" شیرف نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

ڈیوڈ کی تفتیش کا رخ بدل چکا تھا۔ اب وہ کیس کی کئی جہتوں پر تفتیش کر رہا تھا۔ پینٹنگ کی تلاش، اس کا اصل مصور، برکر، لارسن، ایلس، گاڑی ٹکرانے والی برتھا اور پھر چارلی... وہ ان سب کو جوڑنے والی زنجیر کی کڑیاں تلاش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ معاملہ اتنا سیدھا سادہ نہیں جیسا کہ چارلی نے اسے بتایا تھا۔ ڈیوڈ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں خون خرابا تو پہلے ہی ہو چکا مگر اب بھی قانون کی دھجیاں بکھیرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے پینٹنگ مل گئی تو بھاری رقم ملے گی لیکن اب اسے اپنے منافع سے زیادہ کسی اور چیز کی فکر تھی۔ وہ نادر و نایاب فن پارے کو لٹیروں سے بچانے کے ساتھ ساتھ برکر کے قاتلوں کو بھی ان کے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا۔

☆☆☆

ڈولرس اور ڈیوڈ ہمیشہ شام کی چائے ساتھ پینے کے عادی تھے۔ اس دوران میں وہ دونوں ایک دوسرے سے دن بھر کی روداد بھی شیئر کر لیتے تھے۔ اس دن بھی جب ڈیوڈ گھر پہنچا تو اس کی بیوی کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں لیونگ روم میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"اور سناؤ... دن بھر کیا کرتی رہی ہو؟" ڈیوڈ نے بیوی سے پوچھا۔

"بس! میرا کام بھی کسی حد تک مکمل ہو چکا ہے۔"

"چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

"تم بتاؤ... تلاش کس حد تک پہنچی؟" ڈولرس نے سوال کیا تو ڈیوڈ نے جواب میں سارے دن کی روداد تفصیل سے بیان کر دی۔

"اب مجھے یقین ہو گیا کہ معاملہ خاصا گڑبڑ ہے۔ چارلی

واقعی کچھ اور ہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور ڈرائنگ ٹیبل سے ایک کاغذ اٹھا کر اس کے سامنے آ گئی۔ "یہ لو... اسے پڑھ لو۔" ڈیوڈ نے فوراً کاغذ اس کے ہاتھ سے لیا اور پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتا جا رہا تھا، اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ پڑھنے کے بعد اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

"دیکھا... مجھے تو وہ فوٹو دیکھتے ہی شک ہو گیا تھا۔" ڈولرس نے اسے خاموش دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ "میں کئی روز سے اس پر کام کر رہی تھی۔ آخر آج.... حقیقت معلوم ہو ہی گئی۔" اس نے فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میرا شک درست تھا۔" ڈیوڈ نے آہستہ سے کہا۔ "چارلی یہ بہت بڑی زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوگا۔"

"یہ قومی اثاثہ ہے۔ اسے عجائب گھر میں ہی ہونا چاہیے۔" ڈولرس نے یقین کر لقمہ دیا۔ "مگر ان دولت مندوں کو کون سمجھائے۔ یہ تو دولت کے بل بوتے پر آرٹ کے نادر نمونے اپنے ڈرائنگ روم میں رکھ کر خود کو مہذب اور تہذیب یافتہ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ بدتہذیبی ہی نہیں چوری ہے، چوری، وہ بھی کسی قوم کے تہذیبی اثاثوں کی۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔

شیرف نے حسب وعدہ شام تک اسے ای میل پر مطلوبہ معلومات فراہم کر دی تھیں۔ ڈنر سے پہلے تک وہ ان معلومات کی بنیاد پر کچھ نوٹس بناتا رہا۔ آخر اس نے دوسرے دن کے لیے اپنی تفتیش کا خاکہ تیار کر لیا۔

☆☆☆

دن کے گیارہ بجے تھے۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے ایک قصبے میں پہنچا۔ اسے لارسن کی تلاش تھی۔ آخر اس کی کوشش رنگ لائی اور اسے لارسن کا گھر مل گیا۔ اس کے گھر کے باہر سرخ رنگ کی نئی اور قیمتی کار کھڑی تھی۔ جس علاقے میں اس کا گھر تھا، وہ معاشی لحاظ سے پسماندہ لوگوں کا علاقہ تھا۔ خود لارسن کا گھر بھی بہت اچھی حالت میں نہیں تھا۔ اس کے گھر کے عین سامنے کھڑی سرخ رنگ کی نئی چمچماتی گاڑی دیکھ کر پہلے تو وہ چونکا اور پھر مسکرا دیا۔ ریستوران کے کلرک نے بتایا تھا کہ لارسن کے پاس سرخ رنگ کی پرانی فیئٹ گاڑی تھی مگر یہ تو بالکل نئی تھی۔ لگتا تھا کہ ہفتہ دس دن پہلے ہی اسے شوروم سے نکالا گیا ہو۔ لارسن ایک کلرک تھا اور اس گاڑی کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ اتنی مہنگی کار خریدنے کی استطاعت رکھتا ہوگا۔ ڈیوڈ کا شک یقین میں بدل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک شخص گھر سے نکلا۔ وہ بہترین لباس میں ملبوس تھا اور جس انداز سے وہ باہر نکلا تھا اس سے پتا چلتا تھا کہ خوش بھی بہت ہے۔ "یقیناً جیب میں مال بھرا ہوا ہے۔" ڈیوڈ نے اسے دیکھ کر زیر لب تبصرہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔ ڈیوڈ اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہ اسے پہچان چکا تھا۔ یہ لارسن ہی تھا۔ اس نے اس کی تصویر شیرف کی بھیجی والی ای میل میں دیکھی تھی۔ تصویر کا پرنٹ اس وقت بھی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے سرخ کار نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد پرنٹ نکالا اور لارسن کی تصویر دیکھنے لگا۔ "سو فیصد وہی ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اب وہ برتھا کے گھر جا رہا تھا۔ اسے آدھا گھنٹے کی ڈرائیو کرنا تھی۔

برتھا کے متعلق اس نے جو معلومات حاصل کی تھیں، اس کے مطابق اس کا چال چلن اچھا نہیں تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے جرائم پیشہ گروہوں کے ساتھ تعلقات تھے اور وہ تھوڑے سے معاوضے کی خاطر ان کے بڑے بڑے کام کر دیا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ کئی بار پکڑی گئی لیکن اکثر عدم ثبوت پر رہا ہو جاتی تھی۔ جب ڈیوڈ اس کے گھر کے سامنے پہنچا تو شاید وہ اندر تھی۔ اس کا گھر لارسن کے مقابلے میں خاصا معقول تھا۔ گھر کے سامنے پورچ میں نیلے رنگ کی کار کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ پورچ اتنا چھوٹا تھا کہ وہاں دو گاڑیاں کھڑی نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لیے وہ حیران تھا کہ جس گاڑی کو وہ مبینہ حادثے کے وقت چلا رہی تھی وہ سرخ رنگ کی پرانی فیئٹ کار تھی لیکن اس کے گھر کے سامنے نیلے رنگ کی گاڑی کھڑی تھی جو زیادہ پرانی بھی نہیں لگتی تھی۔

برتھا کے گھر کی نگرانی کرتے ہوئے اسے لگ بھگ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ گھر سے نکلی۔ ڈیوڈ نے اسے پہچان لیا۔ اس کی تصویر بھی اسے پولیس ریکارڈ سے مل گئی تھی۔ چند لمحوں میں اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شہر جانے والے راستے پر چل دی۔

اب تک جو کچھ ہو رہا تھا، وہ ڈیوڈ کے اس شک کو مضبوط کر چکا تھا کہ برکر کو قتل کیا گیا ہے۔ برتھا کے جانے کے بعد وہ ہائی وے 99 کی طرف چل دیا۔ اب صرف ایک بات کی تصدیق کرنا باقی رہ گیا تھا۔ وہ کوئنس ریستوران کے اس کلرک سے ملنا چاہتا تھا جس نے کل اس سے دو سو پچاس ڈالر کمائے تھے۔ ڈیوڈ اسے مزید ایک سو ڈالر کمانے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں گفتگو کر رہے تھے۔

"مجھے صرف ایک بات کی تصدیق کرنا ہے اور سو ڈالر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے۔'' ڈیوڈ نے اس کی آنکھوں کے سامنے نوٹ لہراتے ہوئے کہا۔

''پوچھو... مگر میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے؟'' اس نے حفظ ماتقدم کے باعث ایک بار پھر اپنی کل والی شرط دہرائی۔

''منظور ہے... بس یہ بتا دو یہ گاڑی کس کی ہے؟'' اس نے سرخ رنگ کی اس پرانی فلیٹ کار کی تصویر اس کے سامنے رکھی جسے شیرف نے بھیجا تھا۔ یہی وہ گاڑی تھی، جس کی ٹکر سے برکر کی موت واقع ہوئی تھی۔

کلرک نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور پھر ڈیوڈ کے ہاتھوں سے نوٹ اُچک کر بولا۔ ''یہ تو لارسن کی گاڑی ہے۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور ریستوران سے باہر نکل گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے جیب سے موبائل نکالا اور شیرف کا نمبر ملانے لگا۔ ''لوہا گرم ہے۔ مل لو، پھر چوٹ لگانے کا منصوبہ بناتے ہیں۔'' اس نے فون اٹھاتے ہی بنا تمہید کے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ فوراً پہنچو۔ کل والے ریستوران میں ملتے ہیں۔'' شیرف کا لہجہ پرجوش ہو رہا تھا۔

دوپہر کے ڈھائی بجے ہوں گے۔ شیرف آرتھر اور ڈیوڈ لنچ سے فارغ ہو چکے تھے۔ ڈیوڈ نے اسے ایک ایک بات تفصیل سے بتا دی تھی۔ وہ کاغذ بھی اسے دے دیا تھا، جو ڈولرس نے کل اسے پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ اس دوران میں شیرف کا چہرہ غصے کے مارے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ کافی دیر کے غور و خوض کے بعد اب وہ دونوں اس بات کو آخری شکل دے رہے تھے کہ گرم لوہے پر کیسے چوٹ لگائی جائے گی۔ تھوڑی دیر میں ہی سب کچھ طے ہو گیا۔

☆☆☆

رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے۔ ڈیوڈ اور ڈولرس ڈنر کے بعد لیونگ روم میں بیٹھے بے چینی سے شیرف کے فون کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈولرس ساری رُوداد سن چکی تھی۔ اسے بھی اب شدت سے اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے شوہر کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ڈیوڈ نے لپک کر فون اٹھایا۔

''گرم لوہے پر چوٹ لگ چکی ہے اور ہتھوڑے کی متواتر چوٹوں سے اس کی اصل شکل نکلنا شروع ہو گئی ہے۔'' شیرف کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ خاصا پرجوش ہے۔

''میرے لیے کیا حکم ہے۔'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''آج کی رات بہت اہم ہے۔ کل صبح تم دفتر پہنچو۔ مجھے یقین ہے کہ ہر چیز صاف ہو چکی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے تو پھر کل صبح ملتے ہیں... بائے۔'' ڈیوڈ نے فون رکھ دیا اور وہ دونوں سونے کے لیے بیڈ روم کی طرف چل دیے۔ پچھلے چار پانچ دن میں پہلی بار ڈیوڈ اتنا پرسکون نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ ڈیوڈ ناشتے سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہا تھا جب اسے شیرف کا فون ملا۔ ''دس بجے تک دفتر پہنچو اور ڈولرس کو بھی لیتے آنا یاد سے۔'' اس نے کہا اور فون رکھ دیا۔

''آپ نے بھی بڑا کام کر دکھایا ہے ورنہ یہ لٹیرے تو ہیرے لوٹ کر لے جاتے۔'' جب وہ دونوں شیرف کے دفتر میں داخل ہوئے تو اس نے ڈولرس کو دیکھ کر کہا۔ کمرے میں دو پولیس سراغ رساں بھی موجود تھے۔

''اصل قصہ سناؤ۔ مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔'' ڈیوڈ نے کافی کا مگ تھامتے ہوئے بے تکلفی سے شیرف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی سراغ رساں جارج... یہ تمہارا کام ہے۔'' شیرف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد جارج نے سارا ماجرا سنانا شروع کر دیا۔

''نیویارک نیشنل میوزیم سے ایک کیوریٹر کو بھیجا جا رہا ہے۔ پینٹنگ اس کے حوالے کر دی جائے گی۔'' جب جارج خاموش ہوا تو شیرف نے کہا۔

''کیا میں وہ پینٹنگ دیکھ سکتی ہوں؟'' ڈولرس نے شیرف سے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور الماری کھول کر ایک گول ڈبا نکالا۔ کچھ دیر بعد ڈولرس نہایت اشتیاق سے پینٹنگ دیکھ رہی تھی۔

''بہت خوبصورت ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈولرس نے اپنے ہینڈ بیگ سے کیمرا نکالا اور پینٹنگ کی کئی تصویریں بنائیں۔ آدھا گھنٹے بعد وہ دونوں گھر لوٹ رہے تھے۔

☆☆☆

پولیس نے دھوکا دہی، جائداد ہتھیانے، قتل اور قومی اثاثے کی چوری کے الزام میں سینٹل لائبریری کی ڈائریکٹر اور نجی آرٹ گیلری کی مالک ایلس تھامسن، چارلی، لارسن اور برتھا کو حراست میں لے لیا تھا۔ پولیس سراغ رساں نے اس جرم کی جو کہانی سنائی، وہ بہت دلچسپ تھی۔

ایلس بڈ برکر کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش کے وقت برکر نے اپنی بیوی کو بدچلنی کے سبب طلاق دے دی تھی۔ بڈ برکر کے دادا کے پاس نوادرات کا بیش قیمت خزانہ تھا جو انہوں نے اسپین میں محکمۂ آثار قدیمہ کی ملازمت کے دوران میں جمع کیے تھے۔ اسی دوران انہیں یہ پینٹنگ ملی جو برکر کے گھر سے چوری ہوئی تھی۔ یہ تصویر اسپین کے مصور پابلو فرڈیننڈ کی بنائی ہوئی تھی جو انیسویں صدی کا ایک مفلوک الحال مصور تھا لیکن اس کا کام بیسویں صدی میں کلاسک کہلایا۔

بڈ برکر اس تصویر کے پس منظر سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ البتہ یہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ تین سال پہلے ایلس نے اپنے باپ کو تلاش کر لیا۔ جب وہ اس سے ملنے کے لیے پہلی بار اس کے گھر پہنچی تو وہ لیونگ روم کی دیوار پر آویزاں اس تصویر کو پہچان گئی۔ وہ چالاک عورت تھی۔ یہ نہایت ہی مہنگی تصویر تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر یہ تصویر اسے مل گئی تو وہ اسے وہاں کی آرٹ مافیا میں بیچ کر بھاری دولت کما سکتی ہے۔ اس نے یہ تصویر مانگی لیکن برکر نے دینے سے انکار کر دیا جس پر اس نے اسے ہتھیانے کا منصوبہ بنایا۔

ایلس دل پھینک عورت تھی۔ دوسرے دن جب وہ اتفاق سے کولنس ریستوران میں ڈنر کے لیے آئی تو اس کی ملاقات لارسن سے ہوئی۔ وہ عیاش طبع تھی، اس کی مردانہ وجاہت پر مر مٹی۔ چند روز میں ہی ان دونوں کے درمیان نہایت گہرے تعلقات استوار ہو گئے۔ جب ایلس کو یہ پتا چلا کہ وہ اکثر مسٹر برکر کے گھر کھانا وغیرہ پہنچانے جاتا ہے تو اس نے بھاری رقم کا لالچ دے کر اسے بتائے بغیر ایک کام پر آمادہ کر لیا۔ وہ غریب شخص تھا۔ دولت کی خاطر ہامی بھر لی اور پھر برکر کے قتل کا بے داغ منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ لارسن نے اس کام کے لیے نہ صرف اپنی گاڑی فراہم کی بلکہ برتھا کا انتظام بھی کر دیا، جسے گاڑی کی ٹکر سے برکر کو ہلاک کرنا تھا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق برکر کو قتل کر دیا گیا۔ لارسن نے واردات کے فوراً بعد اس کے گھر سے پینٹنگ چرائی اور اسے ایلس کے حوالے کر کے اپنا حصہ وصول کر لیا۔

دوسری طرف چارلی بھی اس پینٹنگ کی اہمیت سے واقف تھا۔ وہ بھی اس پر نظریں لگائے بیٹھا تھا۔ ایلس سے چارلی کے بھی مراسم تھے۔ پینٹنگ کے بعد اس نے چارلی کو ساتھ ملایا اور گھر ہتھیانے کا منصوبہ بنایا۔ جعلی وصیت تیار کی گئی اور چارلی نے اسے یقین دلایا کہ اس طرح اسے برکر کی جائداد مل جائے گی۔ اگرچہ قانونی طور پر وہ برکر کی بیٹی ہونے کے حوالے سے براہ راست جائداد پر دعویٰ کر سکتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہ اپنی زندگی میں قانونی طور پر مطلقہ بیوی اور بیٹی کو جائداد سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ ملنے کا انتظام کر گیا تھا۔ بیوی تو مر چکی تھی۔ رہ گئی بیٹی تو اس نے چارلی کے ساتھ مل کر بندر بانٹ کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

چارلی کو اس پینٹنگ کی بہت فکر تھی۔ برکر کی موت کے بعد جب اسے وہ پینٹنگ گھر میں نہ ملی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ ایلس آرٹ اور فن پاروں کی قدر و قیمت کے حوالے سے بہت کچھ جانتی تھی اس لیے چارلی نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس بات کا پتا چلے۔ یہی وجہ تھی کہ چارلی نے گمشدہ پینٹنگ تلاش کرنے کے لیے کینڈی اسکاٹ کے حوالے سے پینٹنگ کا فرضی عنوان تیار کر کے ایک بچی جھوٹی کہانی گھڑی اور یوں ڈیوڈ اس کی تلاش میں لگ گیا۔ اب اس کا انجام سب بھگت رہے تھے۔

☆☆☆

ڈنر کے بعد ڈیوڈ اور ڈولرس کافی پی رہے تھے۔ ''تمہیں کیسے شک ہوا کہ وہ پینٹنگ کینڈی اسکاٹ کی نہیں تھی؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اس کے رنگ بہت شوخ تھے اور تجریدیت کے پردے میں اندھیرے اُجالے کا جو مفہوم پنہاں تھا، یہ صرف اسپینش مصوروں کا ہی خاصہ ہے۔'' یہ کہہ کر ڈولرس نے گہری سانس لی۔ ''ویسے کینڈی اسکاٹ شوخ رنگ استعمال نہیں کرتا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ ''شکر کرو تم چوری کرنے نہیں گئے ورنہ آج میں تمہیں چھوڑ دیتی۔'' یہ سن کر ڈیوڈ ہنسنے لگا۔

اسی دوران میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ''ہیلو...'' اس نے فون اٹھایا۔

''تم نے اچھا نہیں کیا۔'' دوسری طرف سے چارلی بول رہا تھا۔

''تم چھوٹ گئے۔'' ڈیوڈ نے حیرت سے کہا۔

''میں وکیل ہوں۔ خود کو بچانے کا راستہ محفوظ رکھتا ہوں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''ویسے بھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد تم سے کوئی کام نہیں لوں گا۔ تم بھوکے مرنا چاہتے ہو تو مرو۔ میں تو تمہاری مدد...''

''تم نے تھوڑی دیر کر دی یہ فیصلہ کرنے میں۔'' یہ سنتے ہی ڈیوڈ نے قطع کلامی کی۔ ''میں نے تم سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہے کہ چور کہلوانے سے بہتر ہے کہ صرف انشورنس کی آمدنی پر قناعت کروں... بائے۔'' اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر فون رکھ دیا۔ یہ سن کر ڈولرس مسکرانے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسط 28

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ
ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں   مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی
کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و
تشریح ٹھہرتی ہے   یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر
ہوتی ہے   ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا
نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی
جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے
پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو محبت
نہ تو روایتوں کو مانتی ہے   نہ طبقوں میں
تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب
کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے دل طبقوں کی پروا کرتا ہے
اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے
آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے زندگی کی بساط اور وقت کے
دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں   کبھی بازی پلٹ بھی
جاتی ہے   بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ لے جاتا ہے   اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے   جرم
افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا
آزمائشوں کا ایک ایسا پھیلا متنا ہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کے کھیل سے اور بکھر جانے والوں کی کہانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں بیج آباد کا چودھری افتخار المعروف بشارت ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ بیج آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو مدرسے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر [illegible] مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ [illegible] ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹتی ہے اور ڈھلوان پر پھسلتی ہوئی لڑھکتی چلی جاتی ہے۔

وہ تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے جارہی تھی اور اس کی انگلیاں خودکار انداز میں زمین کو ٹٹولتی کسی ایسی شے کو تلاش کر رہی تھیں جسے گرفت میں لے کر وہ اپنے لڑھکتے جسم کی حرکت کو روک سکے لیکن ہر بار سنگ ریزوں اور نکیلے پتھروں کی چبھن مایوسی کا پیغام دیتی تھی۔ نرم و نازک ہتھیلیوں میں کئی زخم لگ چکے تھے لیکن فی الحال وہ اتنی دہشت زدہ تھی کہ اس تکلیف کو محسوس نہیں کرسکتی تھی۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا۔ شاید اس کی زندگی کے چند سیکنڈ ہی باقی رہ گئے تھے۔ اگر وہ یونہی لڑھکتی رہتی تو یقینی طور پر کسی گہری کھائی میں جاگرتی اور اتنی بلندی سے کسی گہری کھائی میں گرنے کا مطلب تھا کہ اس کی ہڈیاں اتنے حصوں میں تقسیم ہوتیں کہ ان کی گنتی کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔

وہ زندگی جو بار بار موت کے منہ سے نکل کر اسے واپس ملتی رہی تھی، آخرکار ان پہاڑوں میں ساتھ چھوڑنے والی تھی۔ زندگی باوفا تھی تو اسے چودھری کے چنگل سے بھی نجات ملتی رہی تھی اور وہ ڈاکوؤں کے ڈیرے سے بھی نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ بلتستان کے برفانی پہاڑوں میں واقع دہشت گردوں کے کیمپ میں بھی اس کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکی تھی اور وہ وہاں سے فرار کی کوشش میں اس ایوالانچ سے بھی بچ نکلی تھی جس میں وہ ستم رسیدہ لڑکا عمران بخش کر اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ مرنے سے پہلے عمران نے اسے زندگی سے مایوس نہ ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ احساس دلایا تھا کہ اللہ اس کی زندگی کی بار بار حفاظت اس لیے کررہا ہے کہ یقینی طور پر اس سے کچھ خاص کام لینا چاہتا ہے۔ وہ خاص کام ابھی تک اس کے سامنے نہیں آسکا تھا اور وہ یہ بات بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی لیکن عمران کی وہ بات یاد آتے ہی اس کے موت کے ڈر سے بجھتے ذہن کو امید کی حرارت میسر آگئی اور مایوسی کی تاریکی سے نکل کر امید کی روشنی میں سانس لینے کے پہلے ہی لمحے میں قدرت نے اس کی مدد کا بندوبست کردیا۔ وہ کوئی مضبوط جھاڑی تھی جو اچانک ہی اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت میں آگئی تھی۔ جھاڑی گرفت میں آئی تو اس کا تیزی سے نیچے جاتا جسم جھٹکا کھا کر رک گیا۔ اس اچانک لگنے والے جھٹکے نے اس کے پورے شانے میں درد کی لہر دوڑا دی لیکن وہ درد زندگی کی امید بن کر آیا تھا اس لیے قابلِ برداشت تھا۔ اس نے بایاں ہاتھ بھی بڑھا کر جھاڑی پر اپنی گرفت مضبوط کرلی اور اپنے معلق پیروں کو اس ڈھلوان پر کہیں ٹکانے کی کوشش کرنے لگی۔ موجودہ حالت میں بھی وہ کوئی اتنی محفوظ و مامون نہیں تھی لیکن کسی کھائی میں گر کر ہڈیوں کے چور چور ہوجانے کے مقابلے میں یہ حالت بہت بہتر تھی کہ امید کی کوئی کرن تو نظر آئی تھی۔

اندھیرے میں چمکتی ان سرخ آنکھوں کو دیکھ کر گھبراہٹ میں پاؤں رپٹنے سے لے کر یہ عارضی سہارا میسر آجانے تک مشکل سے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے، پر ان چند سیکنڈوں میں ہی وہ ایک ایسے تجربے سے روشناس ہوئی تھی جس نے اس کی روح کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے جانا تھا کہ زندگی کی محبت اور موت کا خوف اللہ نے انسان کی جبلت میں اس حد تک شامل کیا تھا کہ مشکل ترین حالات میں بھی جینے کی خواہش دم نہیں توڑتی تھی۔ اس نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے تھے جو ذرا سی مصیبت پڑنے پر اپنے لیے موت کی بددعائیں مانگتے تھے لیکن اسے یقین تھا کہ ان لوگوں میں سے اگر کسی کو بھی اس پہاڑی ڈھلوان سے دھکا دے دیا جاتا تو وہ موت کو سامنے دیکھ کر بالکل اسی طرح ہاتھ پاؤں چلاتا جس طرح وہ خود کو بچانے کے لیے کوشش کرتی رہی تھی۔ اسے یہ بھی یقین ہو چلا تھا کہ خودکشی کے ذریعے موت کو گلے لگانے والے بھی آخری لمحوں میں موت کے پنجوں سے بچ نکلنے کی خواہش کرتے ہوں گے۔ یہ اور بات کہ بازی ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ان کی یہ خواہش تکمیل کے مراحل سے گزر نہ پاتی ہو۔ اس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ عام طور پر ایک بار خودکشی کی کوشش میں ناکام ہونے والے کو دوبارہ ایسی کوشش کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ کوئی ایک آدھ خصوصی کیس ہو تو بات الگ تھی۔ بہرحال وہ دنیا کے دوسرے انسانوں کے طرزِ فکر سے قطع نظر اس وقت اپنی زندگی بچنے کی امید پیدا ہونے پر خوش تھی اور دل سے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوئی اس قابل ہوچکی تھی کہ اپنے اطراف میں ابھرتی دو تین آوازوں کو سن سکے۔ وہ چونکہ لڑھکتی ہوئی کافی نیچے آگئی تھی اس لیے یہ آوازیں بہت واضح نہیں تھیں البتہ وہ یہ اندازہ ضرور قائم کرسکتی تھی کہ ان آوازوں میں کسی جانور کی غراہٹیں اور ایک سے زیادہ انسانوں کے بولنے کی آوازیں شامل تھیں۔ جانور تو یقیناً وہی تھا جس کی سرخ آنکھیں اچانک نظر آنے پر وہ گھبرا گئی تھی البتہ انسانوں کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ دوست تھے یا دشمن۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنائی دینے والی ان آوازوں میں سے کوئی ایک آواز اسلم کی بھی ہو سکتی تھی کیونکہ یہ تو کسی طور ممکن نہیں تھا کہ جانور کی غرائیں اور اس کی اپنی اضطراری چیخیں اسلم کی نیند میں مخل نہ ہوئی ہوں اور وہ بے سدھ پڑا سوتا رہا ہو۔ یہ خیال دل میں آتے ہی اس نے اسلم کو پکارنے کا ارادہ کیا تا کہ کم از کم وہ اتنا تو جان لے کہ ماہ بانو زندہ ہے اور مدد کی منتظر ہے۔ بے سروسامانی کے عالم میں وہ اس کی کس طرح مدد کرتا یہ سوال اپنی جگہ تھا لیکن یہ زندگی بچانے کی وہی جبلی خواہش تھی جو اسے اسلم کو پکارنے پر اکسا رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسے پکارتی، اوپر سے اسلم کی تشویش میں ڈوبی ہوئی پکار سنائی دی۔ وہ اس کا نام لے کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس کی آواز ماہ بانو کے لیے زندگی کا بلاوا تھی چنانچہ اس نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے اسلم کی پکار کا جواب دیا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا ماہ بانو؟'' اس کے جواب سے اس کے زندہ ہونے کا یقین ہو جانے پر اسلم کی آواز میں خوشی کی چمک سی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں مگر یہاں پھنسی ہوئی ہوں۔ زیادہ دیر گزری تو میرا ہاتھ چھوٹ جائے گا اور میں نیچے کھائی میں گر جاؤں گی۔'' اس نے کوشش کی کہ مختصر الفاظ میں اسلم کو اپنی حالت سے باخبر کر سکے کیونکہ ان دونوں کے مابین جتنا فاصلہ تھا، انہیں ایک دوسرے تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے خاصی قوت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔

''پریشان مت ہو۔ میں تمہارے پاس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اسلم نے اسے تسلی دی۔ اس کے بعد اوپر سے اسے بہت مدھم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ اسلم کسی سے مشاورت کر رہا ہو۔ وہ دوسرا شخص کون تھا جس سے اسلم مشاورت کر رہا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان پہاڑوں میں ان کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ وہ جس جانور سے ڈری تھی اور بعد میں بھی جس کی غرائیں سنتی رہی تھی، اب اس کے بارے میں بھی اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ کوئی کتا تھا جس کی خوفناک غرائیں اب دوستانہ ''بھوں بھوں'' میں بدل چکی تھیں۔ سارا ماحول اندھیرے کی لپیٹ میں ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی اور صرف سماعت پر زور دے کر ہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ کچھ دیر کی بھنبھناہٹوں کے بعد اسے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے سخت زمین میں کوئی چیز ٹھونکی جا رہی ہو۔ وہ لوگ خود تو بے سروسامانی کے عالم میں ڈیرے سے نکلے تھے اس لیے وہ یہ امید نہیں کر سکتی تھی کہ اسلم اوپر سے کوئی رسی پھینک کر اسے کھینچ لینے کا ارادہ رکھتا ہو البتہ دل میں یہ خوش فہمی ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ شاید وہاں موجود دوسری پارٹی کے پاس ایسا سازوسامان موجود ہو۔

وہ اپنی بصارت پر زور دیتے ہوئے اندھیرے میں گھور گھور کر ایسی کسی شے کو تلاش کرنے لگی جس پر رسی کا گمان ہو سکے لیکن کامیاب نہیں ہو سکی البتہ کچھ ٹھوکے جانے کی آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ معلوم نہیں اسلم اسے یہاں سے نکالنے کے لیے کیا تدبیر کر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن اپنے بازوؤں میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتے اس درد سے بے چین ہونے لگی تھی جو لٹکے رہنے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ ایک جھاڑی کے سہارے پورے جسم کا بوجھ اٹھانے والے اس کے بازو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ پاؤں کسی جگہ ٹکا کر کچھ بوجھ ان کے سہارے بھی برداشت کر سکے لیکن پیروں کو کوئی ایسی سطح نہیں مل رہی تھی جس پر وہ مسلسل انہیں ٹکا کر رکھ سکے بس لمحہ بھر کے لیے ہی کہیں ٹک پاتے اور پھر ہوا میں معلق ہو جاتے۔ اوپر سے وقفے وقفے سے سنائی دینے والی ہلکی ہلکی آوازیں اگر زندگی کا پیغام نہ سنا رہی ہوتیں تو اتنی تکلیف دہ حالت میں لٹکنا مزید دشوار ہو جاتا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ گزرتے وقت کے ساتھ وہ آوازیں نزدیک آتی جا رہی ہیں پھر اسلم کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

''ہمت سے کام لینا ماہ بانو! بس تھوڑی دیر کی بات اور ہے پھر میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔'' پہلے کے مقابلے میں وہ اس کے کافی نزدیک سے بولتا ہوا اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

''میری فکر نہ کرو، میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے اسلم کی تسلی کروانی چاہی لیکن اس کی آواز اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ جس مشکل میں گرفتار تھی، اس کا عکس اس کی آواز میں بھی جھلک رہا تھا۔ بازوؤں کی طاقت کے بل بوتے پر اپنے پورے جسم کا بوجھ اٹھانا اتنا دشوار کام تھا کہ موسم گرم نہ ہونے کے باوجود بھی اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ پڑا تھا۔ ہتھیلیوں پر پھوٹنے والے پسینے کے قطرات سب سے زیادہ تکلیف دہ تھے کہ ان کی وجہ سے اسے جھاڑی کو اپنی گرفت میں رکھنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ گزرتا وقت جہاں اس کی ہمت کو کم کر رہا تھا، وہیں اندھیرے کی دبیز چادر ہلکی ہونے لگی تھی اور بہت آہستگی سے نمودار ہوتے سپیدۂ سحر میں دھندلے دھندلے سے مناظر نظر آنے لگے تھے۔

ان مناظر میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ وہ ہیولا تھا جو آہستہ آہستہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ یقیناً اسلم تھا اور اس کے طریقۂ کار اور جرأت کو دیکھ کر وہ حیرت سے ششدر رہ گئی تھی۔ وہ کسی کوہ پیما کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پاس جانے وہ کون سی شے تھی جسے وہ زمین میں گاڑ کر ٹھونکتا اکھاڑتا اس پر ہاتھ یا پیر کا بوجھ ڈالتا نیچے اتر رہا تھا۔ اس کا کام کسی پیشہ ور کوہ پیما کے مقابلے میں زیادہ دشوار تھا کیونکہ ایک تو وہ اوپر سے نیچے کی طرف آ رہا تھا، دوسرے اس کے پاس سہارا لینے کے لیے کوئی رسی بھی موجود نہیں تھی۔

اس بے سروسامانی کی وجہ سے اس کی نیچے اترنے کی رفتار بھی بہت کم تھی۔ اسلم کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو یہ طریقہ ہرگز بھی استعمال نہ کرتا۔ اسلم نے بھی شاید خود کو اس لیے اتنی مشکل میں ڈالا تھا کہ یہ ماہ بانو کی زندگی کا معاملہ تھا اور وہ اس کی زندگی کو ہمیشہ اپنی زندگی پر ترجیح دیتا آیا تھا۔ اس کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اسے ہمیشہ یہی محسوس ہوا تھا کہ شاید وہ اپنی جان اس پر نچھاور کرنے کے لیے ہی اس دنیا میں آیا ہے۔ اب بھی وہ جس خطرناک طریقے سے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ بڑے دل گردے کی بات تھی۔ اسے ایک بار پھر ٹوٹ کر دل سے اسلم کی بے پناہ محبت کا قائل ہونا پڑا۔ وہ خود شہر یار سے محبت کرتی تھی اور کئی بار یہ بھی محسوس کیا تھا کہ شہر یار بھی اس کی ذات میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ کبھی شہر یار بھی اس کے لیے ایسی جاں نثاری دکھا سکے گا۔ موت اور زندگی کے مابین جھولتے اپنے وجود کے لیے اسلم کی وہ بے تحاشا محبت محسوس کر کے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ ان آنسوؤں نے دھندلاتے ہوئے منظر کو کچھ اور بھی دھندلا دیا لیکن وہ مجبور تھی کہ ہاتھ اٹھا کر ان آنسوؤں کو صاف نہیں کر سکتی تھی چنانچہ چپ چاپ انہیں بہنے دیا۔

''اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ ماہ بانو۔'' جانے کتنے لمحے اور بیت گئے تھے جب اس نے اپنے بالکل قریب سے اسلم کی آواز سنی۔ اس نے سر اٹھا کر اسلم کی سمت دیکھا۔ آنکھوں سے ساون برس جانے کے بعد اب سامنے کا منظر زیادہ واضح تھا۔ اس نے اسلم کا اپنی جانب بڑھا ہوا ہاتھ بالکل واضح طور پر دیکھا اور پھر پہلی بار اس ہاتھ کو پورے خلوص سے تھام لیا۔

''تمہیں اپنے بازو میرے گرد لپیٹ کر میری پیٹھ پر سوار ہونا ہو گا کیونکہ میرے لیے اپنے ہاتھوں کو آزاد رکھنا ضروری ہے۔'' بے ترتیب سانسوں کے ساتھ اسلم نے اسے ہدایت دی جسے سمجھتے ہوئے اس نے پورا پورا عمل کیا۔ ان لمحات میں وہ اسلم سے اتنی قریب ہو گئی تھی کہ ان دونوں کی سانسیں آپس میں الجھنے لگی تھیں اور جس طرح اس کے دھڑدھڑاتے دل کی آواز اسلم کی سماعتوں میں اتر رہی تھی، اسی طرح وہ اس کے جسم کے گرد اپنے بازو حائل ہونے کے باعث اس کے سینے پر رکھے اپنے ہاتھ پر اس کے دل کی ایک ایک دھڑکن محسوس کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ نمودار ہوتی روشنی میں اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اسلم اب تک کس چیز کو زمین میں ٹھونک کر اس کی مدد سے نیچے اترتا رہا تھا۔ وہ دو عدد خنجر تھے جن میں سے ایک تو یقینی طور پر اسلم کا ہی تھا اور دوسرا لازماً اس نے اوپر موجود افراد یا فرد سے حاصل کیا تھا۔ ان خنجروں کو وہ ایک پتھر کی مدد سے زمین میں ٹھونک رہا تھا اور ایک چھوٹے سے رسی کے ٹکڑے میں پھندا لگا کر اکھاڑتا جا رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ پہاڑی علاقہ ہونے کے باوجود ڈھلان کی زمین زیادہ سخت نہیں تھی اور ڈھلوان بھی اتنی عمودی نہیں تھی کہ سیدھے نیچے جا پڑنے کا شدید خطرہ ہو۔ ہلکی سی روشنی میں وہ یہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ جس جھاڑی کو اس نے تھاما تھا، اس کے علاوہ بھی کئی جھاڑی نما پودے وہاں موجود ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کی مدد سے ڈھلوان پر اترنا یا چڑھنا ممکن نہیں تھا۔

اسلم کی پیٹھ پر سوار اس کے اعضا سے اپنے اعضا پیوست کیے اس کا اوپر کی سمت سفر جاری رہا۔ اسلم کا جسم بھی اسی کی طرح سخت مشقت کے باعث پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے کے پسینے کی بو محسوس کرتے وہ اس کشش کو بھی محسوس کر رہے تھے جو اللہ نے آدم و حوا کے مابین تخلیق کی ہے۔ سخت مخدوش حالات میں بھی ان کے جسم سنسنا رہے تھے۔ ماہ بانو کے لیے یہ تجربہ بہت عجیب تھا۔ صنفِ مخالف سے اس قدر قربت کا یہ اس کی زندگی میں پہلا انوکھا موقع تھا اور وہ اندر ہی اندر سکڑنے کے باوجود خود کو اسلم سے جدا کرنے سے قاصر تھی۔ اس موقع سے قبل ایک بار چودھری نے بھی اس کے وجود کو اپنے جسم تلے روندنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے ذہن پر چودھری کے بدبودار اور وحشی لمس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد ہوشے کے ایک کیمپ میں ڈیوڈ نامی غیر ملکی سیاح اور بلتستان کے پہاڑی کیمپ میں زیر تربیت ایک دہشت گرد نے اور ڈیرے پر بھرو نے بھی اسے پامال کرنے کی کوشش کی تھی۔ خوش قسمتی سے ایسے ہر موقع پر اس کی عزت کا موتی محفوظ رکھنے کے لیے قدرت نے کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیا تھا لیکن وہ مرد کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قربت کے دوبیت جانے کے تصور میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

آج کا تجربہ اس کے پچھلے ہر تجربے سے مختلف تھا۔ آج جو مرد اس کے قریب تھا وہ اپنے کسی سفلی جذبے کی تسکین کے لیے اس کے قریب نہیں آیا تھا بلکہ اس کے لیے زندگی کا پیامبر بن کر آیا تھا۔ ان کی آپس کی یہ قربت بھی اتفاقاً اور ضرورتاً تھی لیکن وہ...... بھرپور طریقے سے اس قربت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس لمس میں بڑی مٹھاس اور چاشنی تھی۔ یہاں تک کہ شہریار کے خیال نے بھی اسے اسلم سے نہیں بھڑکایا تھا ورنہ اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ اسلم کے اتنے قریب ہو کر شہریار سے کسی قسم کی بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ یہ شاید اسلم کی بے پناہ محبت تھی جس نے اس کے دل پر شہریار کا قبضہ ہونے کے باوجود بھی وہاں چپکے سے نقب لگا کر کسی گوشے میں جگہ بنالی تھی۔ ان لمحات میں وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس نے شہریار کی شادی کا سن کر محض جذبات میں اپنی زندگی کو کارآمد بنانے اور اسلم کو سدھارنے کے خیال سے...... شادی کا جو فیصلہ کیا تھا، آج اس فیصلے میں اس کی دلی رضا بھی شامل ہو گئی تھی۔ اگر وہ دونوں ان مہیب حالات سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ یقیناً بہت خوشی سے اسلم کے گھر میں بسنا قبول کر لیتی۔

"آجاؤ دوست! مبارک ہو کہ تم دونوں کو ایک نئی زندگی مل گئی ورنہ میں تو ڈر ہی رہا تھا کہ کہیں تم بھی اپنی ساتھی کے ساتھ کھائی میں نہ جا گرو۔" وہ اپنی سوچوں اور تجزیوں میں منہمک تھی اس لیے واپسی کا سفر سست ہونے کے باوجود وقت گزرنے کا احساس نہیں کر سکی اور قریب سے سنائی دینے والی اجنبی مردانہ آواز سن کر چونکی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے سہارے کے لیے اسلم کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اسے ہموار سطح پر پہنچنے کے لیے مدد دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ لوگ ہموار سطح پر پہنچے، ماہ بانو اسلم سے الگ ہو گئی۔ اسلم زمین پر گر کر ہانپنے لگا۔ وقت کے اس گزرنے والے دورانیے میں اس نے زندگی اور موت کی جنگ لڑی تھی۔ اس جنگ میں اس کے مقابل اپنے جیسا کوئی انسان نہیں تھا بلکہ وہ پہاڑی ڈھلوان تھی جس پر اگر ایک بار بھی قدم غلطی کر بیٹھتے تو اس کا اور ماہ بانو کا ٹھکانا اس کھائی میں ہی ہوتا جہاں سے ان کی ہڈیاں بھی ملنی مشکل تھیں۔

ماہ بانو خود بھی اسلم کے قریب ہی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اگرچہ واپسی کے سفر میں اسے خود کوئی جسمانی مشقت نہیں اٹھانی پڑی تھی اور اسلم نے ہی اس کا سارا بوجھ اٹھایا تھا لیکن موت کے پنجوں سے بچ نکلنے کی بے یقینی کی خوشی نے اعصاب کو شل کر رکھا تھا۔

"لو پانی پی لو۔" چند لمحے گزرنے کے بعد اسے اپنے قریب سے وہی اجنبی آواز سنائی دی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بڑھے ہوئے بالوں اور لمبی داڑھی والا ایک سرخ و سفید جواں سال آدمی تھا جو اس کی طرف پانی کی بوتل بڑھا رہا تھا۔ اسلم کو اس نے شاید اس کی سانسیں سنبھل جانے کا موقع دینے کے لیے پانی کی پیشکش نہیں کی تھی۔ ماہ بانو نے اس کی بڑھائی ہوئی بوتل فوراً ہی جھپٹ لی اور بے تابی سے بڑے بڑے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگی۔ تقریباً آدھی بوتل پانی پینے کے بعد اس کے حواس ذرا یکجا ہوئے تو اس نے کھسیانے پن کے ساتھ اجنبی کو بوتل واپس کر دی جسے اس نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ وصول کر لیا۔ اس دوران میں اسلم بھی خود کو سنبھال چکا تھا اور اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ مرد نے پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی تو وہ بھی کافی سارا پانی پی گیا لیکن اس کے انداز میں ماہ بانو کے مقابلے میں کافی ٹھہراؤ تھا۔ کچھ دیر قبل شدید مشقت سے گزرنے کے باوجود اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا تھا۔ یہ سخت جانی ڈیرے پر گزرنے والی زندگی کی دین تھی۔ وہ برسوں ایک ڈاکو کی حیثیت سے اپنے شب و روز گزارتا رہا تھا۔ اس زندگی میں مار پیٹ، بھاگ دوڑ اور پیدل سے لے کر موسم کی سختیاں سہنے تک سب کچھ شامل تھا اس لیے اس کی قوت برداشت ایک عام انسان سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ پھر کچھ کمال اس کی فطری صلاحیتوں کا بھی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں جب جو کام انجام دینا پڑے اسے بہت احسن طریقے سے انجام دیتے ہیں۔ جب وہ ایک طالب علم تھا تو اس حیثیت سے بھی اپنی ذہانت کا لوہا منواتا رہا تھا۔ ڈاکو بنا تو برسوں پرانے اپنے سے کہیں زیادہ تجربہ کار ڈاکوؤں پر بازی لے گیا اور اب ماہ بانو کے محافظ کی حیثیت سے بھی وہ اپنا کردار بہ خیر و خوبی نبھا رہا تھا۔

"میرے خیال میں یہاں سے ہٹ کر تمہارے پڑاؤ کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں الاؤ جل رہا ہے، ہمیں حرارت بھی ملتی رہے گی اور کسی درندے کے حملے کا خوف بھی نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ میں تمہیں مزیدار سی چائے بھی بنا کر پلاؤں گا۔" ان دونوں کی حالت سنبھلتے دیکھ کر اجنبی مرد نے ان سے کہا۔ اس کے لہجے میں موجود نرمی نے ماہ بانو کو سمجھا دیا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، دوستانہ عزائم رکھتا ہے۔ یوں بھی اگر وہ دوستی کے بجائے دشمنی کا مظاہرہ کرتا تو وہ اور اسلم نہ تو اتنے سکون سے بیٹھ پاتے اور نہ ہی وہ انہیں پینے کا پانی پیش کرتا۔

اسلم نے اجنبی کی تجویز قبول کر لی تھی چنانچہ وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا اور پھر وہ سہ رکنی قافلہ پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کے ساتھ بڑے بالوں والا وہ جسیم کتا بھی تھا جس کے اندھیرے میں اچانک سامنے آجانے سے وہ اتنی خوف زدہ ہوئی تھی کہ اس کا پاؤں ڈھلوان پر پھسل گیا تھا۔ پڑاؤ قریب ہی تھا چنانچہ وہ لوگ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے فوراً ہی وہاں پہنچ گئے۔ اسلم کے جلائے گئے الاؤ کی آگ کافی کم ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے پھیلتے صبح کے اجالے میں اب آگ میں مزید اضافے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر اور گزرتی تو ٹھنڈک کا احساس بھی ختم ہو جاتا اور اندھیرے میں کسی درندے کے حملے کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔ اب بھی موسم بہت شدید ٹھنڈا نہیں تھا لیکن پہاڑی علاقہ ہونے اور سحر کی وجہ سے گرمائش کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج نکلتا تو صورت حال یکسر تبدیل ہو جاتی۔

"تم دونوں میں سے کسی کو گڑ ناپسند تو نہیں ہے۔ میں چائے میں میٹھے کے لیے گڑ استعمال کروں گا۔" اجنبی نے الاؤ کے قریب پہنچ کر اپنی پیٹھ پر لدا بڑے سائز کا تھیلا اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی پتیلی اور دیگر سامان نکال کر چائے بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے پوچھے گئے سوال پر اسلم نے گڑ کے استعمال پر کوئی اعتراض نہ ہونے کا عندیہ دیا تو وہ مطمئن ہو کر ایک بار پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں جس بے سروسامانی کا شکار تھے، اس میں کھانے پینے کے لیے جو کچھ بھی مل جاتا انہیں نعمت ہی لگتا۔ پسند ناپسند کی عیاشی تو صرف ان لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو اپنے پرسکون گھروں میں بہتر وسائل کے ساتھ شب و روز گزار رہے ہوں۔

"یہ کون ہے؟" اجنبی پوری تندہی سے چائے بنانے میں مصروف ہو گیا تو ماہ بانو نے اسلم سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ میں تو تمہاری چیخ سن کر جاگا تھا اور پھر آواز کی سمت میں دیوانہ وار بھاگ کر وہاں تک پہنچا تو یہ شخص اپنے کتے سمیت نظر آیا۔ تمہیں غیر موجود پا کر شاید میں وحشت کے عالم میں اس سے ٹکرا جاتا لیکن اس نے خود ہی آگے بڑھ کر اپنے دوست ہونے کا اعلان کیا اور پھر بتایا کہ تمہارا ساتھی میرے کتے سے گھبرا کر نیچے پھسل گیا ہے اور ہمیں آپس میں الجھے بغیر پہلے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ میرے لیے یہ آدمی اتنا قابل بھروسا نہیں تھا لیکن تمہاری زندگی میرے لیے ہر خطرے سے بڑھ کر اہم تھی۔ میں نے اس کے کہنے پر تمہیں پکارا اور جواب میں تمہاری آواز سن کر مجھ سے جی اٹھا۔ اب سوال یہ تھا کہ تمہیں وہاں سے کیسے نکالا جائے۔ میرے پاس کوئی ایسا انتظام بھی نہیں تھا۔ اس شخص نے خود ہی مجھے تدبیر سجھائی کہ کوہ پیماؤں کے طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے تم تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ایک خنجر میرے پاس تھا، دوسرا اس سے مل گیا۔ بس پھر میں تم تک پہنچنے کے لیے دیوانہ وار میدان عمل میں کود گیا۔ اس شخص نے پیشکش کی تھی کہ وہ یہ کام انجام دے سکتا ہے لیکن میں تمہارے سلسلے میں کسی پر اعتماد کیسے کر سکتا تھا۔ وہ اگر نیچے اترتا تو اس کے پیش نظر ایک دوسرے انسان کی جان بچانے کا کام ہوتا اور وہ کوئی کوتاہی بھی کر سکتا تھا جبکہ میرے لیے تو یہ اپنی زندگی بچانے والی بات تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم خیریت سے اوپر آنے میں کامیاب ہو گئیں۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میرے پاس بھی اسی اندھی کھائی میں کودنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔" اس نے ساری داستان مختصراً سناتے ہوئے آخر میں اپنے جذبات کا بھی اظہار کر دیا تھا جن کے سچ ہونے میں ماہ بانو کو کوئی شک نہیں تھا۔

"یہ لو بھئی گرما گرم چائے پیو اور اس کے ساتھ یہ روکھی روٹیاں بھی کھاؤ۔ اس ویرانے میں، میں تمہاری بس اتنی ہی مہمان نوازی کر سکتا ہوں۔" جتنی دیر میں اسلم نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا، اجنبی نے چائے تیار کر لی اور اپنے تھیلے میں سے پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹی روٹیاں نکال کر چائے کے ساتھ پیش کیں۔ وہ دونوں یہ نعمتیں سامنے پا کر کھل اٹھے۔ پچھلی رات ان دونوں نے کھانے کے نام پر جو کچھ کھایا تھا، وہ سانسوں کی ڈور جوڑے رکھنے کے کام تو آ سکتا تھا لیکن شکم پری بہرحال نہیں ہو سکی تھی۔

"تم بھی تو ہمارا ساتھ دو نا۔" منہ میں پانی بھر آنے کے باوجود اسلم نے کھانا شروع کرنے سے پہلے اجنبی سے کہا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ چائے صرف ان دونوں کو پیش کی گئی ہے اور خود اس نے اپنے لیے چائے نہیں نکالی۔

"میرے پاس چائے کی مزید پیالیاں موجود نہیں اس لیے میں اچھے میزبان کی طرح مہمانوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پسند کروں گا۔" اس نے نہایت صاف گوئی سے وجہ بتا دی۔ اس مرحلے پر وہ لوگ یہ شک نہیں کر سکتے تھے کہ اجنبی نے ان کی چائے میں کچھ ملا کر انہیں بے ہوش یا ہلاک کرنے کا انتظام کیا ہوگا۔ وہ شخص بالکل اچانک ان سے ٹکرایا تھا۔ اس سے نہ تو ان کی دشمنی تھی اور نہ ہی دوستی۔ اگر وہ کوئی لٹیرا یا ڈاکو ہوتا تو بھی ان لوگوں کی بے سروسامانی دیکھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے پاس سے اسے کچھ نہیں مل سکے گا چنانچہ اس پر کوئی شک کرنے کے بجائے وہ پیٹ کی آگ بجھانے میں مصروف ہو گئے۔

''اگر ہمارا میزبان اس دوران اپنا تعارف بھی کروا دے تو اچھا ہوگا۔ اس ویرانے میں ملنے والے اتنے مہربان میزبان سے تعارف حاصل کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔'' دو تین لقمے حلق سے نیچے اتارنے کے بعد اسلم نے اس سے فرمائش کی۔

''میرا نام شفقت راؤ ہے۔ میں نالی والا پنڈ کا رہنے والا ہوں پیشے کے اعتبار سے تاجر ہوں اس لیے مستقل اپنے پنڈ میں نہیں رہ پاتا اور زیادہ وقت شہر میں گزارتا ہوں۔'' اس نے اپنا جو مختصر تعارف کروایا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس کا لہجا اتنا رواں اور زبان اتنی صاف کیوں ہے، ورنہ اتنی دیر سے اسلم کو اس کی زبان کی وجہ سے ہی اسے کسی گاؤں کا رہائشی سمجھنے میں تامل تھا اور کسی دور دراز شہر سے آنے والے کا ان پہاڑوں میں موجود ہونا سمجھ سے بالاتر۔ ویسے تو کسی گاؤں کے رہائشی کو بھی اس طرف آنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ نامساعد حالات میں اپنے بچاؤ کے لیے اس پہاڑی سلسلے کے ساتھ واقع کسی گاؤں کا باشندہ اس طرف کا رخ کر سکتا تھا۔

''تعارف کچھ ادھورا سا ہے راؤ صاحب! ان پہاڑوں میں تو آپ اپنے کسی تجارتی دورے پر نہیں ہو سکتے۔'' چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے اسلم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ویسے چائے شفقت راؤ کے دعوے کے مطابق واقعی مزیدار تھی اور انہیں اس لیے اور بھی زیادہ مزے کی لگ رہی تھی کہ کافی طویل وقفے کے بعد ایسی کوئی نعمت میسر آسکی تھی۔

''ابھی تو ملے ہیں۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان لیں گے۔ آپ فرمائیں، آپ دونوں کون ہیں؟ اتنا تو میں بھی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ دونوں بھی عام حالات میں اس طرف نہیں آنکلے ہوں گے۔'' شفقت راؤ نے نہایت سہولت سے گفتگو کا رخ ان دونوں کی طرف موڑ دیا۔

''میں اسلم حنیف ہوں اور یہ میری بیوی ماہ بانو ہے۔ آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا کہ ہم عام حالات میں اس طرف نہیں آئے ہیں بلکہ ایک حادثے کی وجہ سے راستہ بھٹک کر یہاں آنکلے ہیں اور اب ان پہاڑوں سے نکلنے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔'' اسلم نے محتاط الفاظ میں اپنا تعارف کروایا۔ اسلم کے خود کو بیوی قرار دیے جانے پر ماہ بانو کے چہرے پر سرخی کی لہری دوڑ گئی۔ وہ پہلے ہی چست جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ہونے کی وجہ سے بدن چرائے کچھ جھینپی ہوئی بیٹھی تھی، اس تعارف پر مزید جھینپ گئی لیکن موجودہ حالات میں یہی تعارف سب سے مناسب بھی تھا۔ اگر اسلم اسے بیوی کے بجائے کوئی دوست قرار دیتا تو اس کے کردار کو مشکوک سمجھا جا سکتا تھا۔ مرد و زن کی دوستی معاشرے کے بہت زیادہ مغرب کے نقش قدم پر چل پڑنے کے باوجود ایک مخصوص طبقے کو چھوڑ کر مشرق میں ابھی تک معیوب ہی سمجھی جاتی تھی اور خصوصاً دیہاتوں میں تو اس کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

''اندھیرے میں تمہاری بیوی کو میں لڑکا سمجھا تھا اور بات چیت کے خیال سے اپنے کتے سمیت ان کی طرف بڑھا تھا۔ وہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ نیچے پھسل جانے والا شخص لڑکا نہیں بلکہ کوئی خاتون ہیں۔ میں بھابی جی سے معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے انہیں اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔'' وہ بڑے مہذبانہ انداز میں وضاحت پیش کرتا ہوا معذرت کرنے لگا۔

''کوئی بات نہیں راؤ صاحب! کبھی کبھی انسان کسی ایسی غلطی میں ملوث ہو جاتا ہے جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ آپ بس یہ شکر ادا کریں کہ یہ محفوظ ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں آپ کے بے قصور ہونے کے باوجود بھی آپ کو معاف نہیں کر پاتا۔'' اس بار بھی اسلم نے جواب دیا اور ہلکے پھلکے انداز میں اپنے لیے ماہ بانو کی اہمیت بھی جتا دی۔

''بہت خوش نصیب ہیں بھابی جی کہ انہیں تمہارے جیسا چاہنے والا آدمی ملا۔ یہ تو بتاؤ تم انہیں لے کر یہاں کہاں نکلے ہوئے تھے۔ وضع قطع سے تو اس علاقے کے رہنے والے نہیں لگتے؟'' شفقت راؤ عمر میں اسلم سے بڑا تھا چنانچہ اس کے ساتھ ذرا بے تکلفانہ طرز تخاطب سے کام لے رہا تھا۔ ساتھ ہی ان کے بارے میں جاننے کے لیے بھی متجسس تھا اس لیے ایک بار پھر گھما پھرا کر اپنا سوال کر ڈالا۔ اسلم اس دوران میں اپنے ذہن میں ایک کہانی تیار کر چکا تھا لہٰذا اس بار اس کے سوال کو ٹالنے کے بجائے اطمینان سے بولا۔

''ہم کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میں وہاں ایک کراٹے کلب چلاتا ہوں۔ ماہ بانو کو پنجاب کی دیہی زندگی دیکھنے کا بہت شوق تھا اس لیے میں اسے ان علاقوں میں گھمانے کے خیال سے لے کر نکلا تھا۔ اتفاق سے ہم شروع میں ہی حادثے کا شکار ہو گئے۔ ہوا کچھ یوں کہ ہم پیر آباد

کے گاؤں میں گھومتے گھومتے جنگل کی طرف نکل پڑے اور وہاں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ انہوں نے ماہ بانو کے زیورات سمیت ہمارا کیمرا اور دوسری قیمتی اشیا چھین لیں۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی کہ چلو مال گیا تو گیا جان و آبرو تو محفوظ ہے لیکن وہ بہت ہی حرام خور تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں چنانچہ مجھے اپنے جوڈو کراٹے کے کمالات دکھانے پڑے۔ میری خاموشی پر وہ لوگ مجھے کاٹھ کا الو سمجھ بیٹھے تھے اس لیے اچانک حرکت میں آنے پر بوکھلا گئے۔ ان کے دو ساتھیوں کو تو میں نے اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔ ان کی رائفلیں بھی چھین لی تھیں لیکن وہ تعداد میں زیادہ تھے اور مسلح بھی چنانچہ پہلے گھبرا کر بھاگے پھر پلٹ کر فائرنگ کرنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اکیلا ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ماہ بانو رائفل چلا لیتی ہے لیکن اس کا نشانہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ بس یہی سوچ کر میں فائرنگ کا ہلکا پھلکا جواب دیتا ہوا اسے لے کر بھاگ نکلا۔ بھاگتے ہوئے سمت کا تعین کرنا ممکن نہیں تھا چنانچہ ہم بے خبری میں ان پہاڑوں کی طرف آنکلے۔ یہاں سے واپس جنگل میں گھس کر پیر آباد پہنچنے کی کوشش کرنے میں خدشہ تھا کہ دوبارہ ڈاکوؤں سے سامنا نہ ہو جائے اس لیے ہم نے سوچا کہ ان پہاڑوں سے گزر کر کسی اور طرف کی آبادی میں نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کوشش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔'' اس نے شفقت راؤ کو ایک ایسی کہانی سنا ڈالی جو ان کی وضع قطع کے ساتھ میل کھا گئی۔

''تم خوش قسمت ہو بھائی کہ ان ڈاکوؤں سے بچ نکلے ورنہ لوٹ مار کرنے اور عورتوں کے معاملے میں ان کی شہرت بڑی خراب ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک خوش خبری سنا ڈالوں پولیس نے جنگل میں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن شروع کیا ہے۔ میں جب نالی والا سے نکلا تھا اس وقت یہ خبر ریڈیو پر سنی تھی۔ آگے کیا حالات و واقعات پیش آئے اس کا مجھے معلوم نہیں۔'' شفقت راؤ نے ڈیرے پر پولیس آپریشن کی تصدیق کر ڈالی جسے سن کر اسلم نے سکون کا سانس لیا کہ وہ خوش قسمتی سے آپریشن شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا ورنہ دوسری صورت میں یا تو وہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا یا پھر جیل کی تاریک کوٹھری میں پڑا ہوتا۔۔۔ اور اب جو یہ نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا روشن خواب آنکھوں میں کروٹیں لینے لگا تھا، اس کا کوئی نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔

''آپ اپنے بارے میں بتائیں کہ آپ کیسے ان پہاڑوں میں آنکلے؟'' شفقت راؤ کو اپنی طرف سے کافی حد تک مطمئن کرنے کے بعد اس نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

''میں بھی کچھ مشکل حالات میں ہی اس طرف آیا ہوں لیکن تم میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ میں بے سروسامانی کے عالم میں نہیں نکلا بلکہ پوری تیاری کے ساتھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نکلا ہوں اور ان پہاڑی راستوں سے خاصا واقف بھی ہوں۔ بس حالات ایسے تھے کہ میرا نالی والا میں رہنا ممکن نہیں رہا تھا لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں وہاں سے کچھ ایسا کر کے نکلا ہوں کہ میرے پیچھے میرے دشمن اپنے زخم چاٹتے پھریں گے بلکہ ان میں سے کئی نیست و نابود ہو گئے ہوں گے۔'' شفقت راؤ کے لہجے میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور آنکھیں غم و غصے کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''کیا کوئی خاندانی دشمنی کا معاملہ تھا؟'' اس سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اسلم نے اندازے کی بنیاد پر سوال کیا۔ گفتگو کے اس سلسلے میں نہ صرف وہ اور ماہ بانو کھانے پینے سے فارغ ہو چکے تھے بلکہ شفقت راؤ بھی پیالی خالی ہو جانے کے بعد چائے پی چکا تھا۔ اس نے صرف چائے پینے پر ہی اکتفا کیا تھا اور روغنی روٹیوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

''خاندانی دشمنی تو نہیں تھی لیکن ایسے شخص سے دشمنی تھی جس نے میرے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔'' شفقت راؤ کی آنکھوں کی اداسی اس کے لہجے میں بھی اتر آئی اور بھڑکیلی آواز مدھم پڑ گئی۔

''زخم خوردہ لگتے ہو۔ کچھ ہمیں بھی بتاؤ کہ تم پر کیا گزری؟'' اسلم نے شفقت راؤ کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ماہ بانو بھی شروع ہی سے ان دونوں کی گفتگو توجہ سے سن رہی تھی اور اس وقت اس کے اندر بھی تجسس جاگ اٹھا تھا کہ شفقت کے حالات سے آگاہ ہو سکے تاہم اس نے زبان سے کچھ کہنے سے گریز ہی کیا تھا اور بلامداخلت شفقت کی کہانی سننے کی منتظر تھی۔

''چھوڑو یار! کیا کرو گے میرا دکھ سن کر؟ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہیں اپنے پنڈ تک پہنچنے کا راستہ سمجھا دیتا ہوں۔ میں تمہیں ان پہاڑوں میں اتنی واضح نشانیاں بتاؤں گا کہ تم آرام سے نالی والا تک پہنچ جاؤ گے۔ وہاں میری بہن کا گھر ہے۔ اس کا خاوند میرا جگری دوست ہے۔ تم ان کے گھر چلے جانا اور انہیں بتانا کہ شفقت راؤ کے مہمان ہو۔ وہ تمہارا ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح سے خیال رکھیں گے اور انتظام کر دیں گے کہ تم اپنے گھر یا جہاں تمہیں بھی چاہو جا سکو۔'' شفقت راؤ نے موضوع کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں ایک پُرکشش پیشکش کی۔

''آپ کی اس مہربانی کا شکریہ راؤ صاحب! آپ کا ہم پر یہ بہت بڑا احسان ہوگا لیکن دل میں ایک خلش سی رہے گی کہ ہم اپنے محسن کا دکھ بھی نہ جان سکے۔'' اسلم نے بہت محتاط الفاظ میں اصرار کیا جس کا راؤ پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ افسردہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔

''میں دکھوں کی تشہیر کا قائل نہیں ہوں لیکن تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو میں مسلسل انکار کر کے تمہاری دل آزاری نہیں کر سکتا۔'' وہ جیسے خیالوں میں ڈوب گیا اور اس کے چہرے پر چھائی اداسی کے بادل مزید گہرے ہونے لگے۔ اس کھوئی کھوئی کیفیت میں اس نے اپنی داستان کا آغاز کیا۔

''میں ایک خوش حال اور خوش و خرم گھرانے کا مالک تھا۔ ورثے میں زمینیں ملی تھیں لیکن میں نے زراعت کا پیشہ اپنانے کے بجائے تجارت سے روزی کمانا پسند کیا اور ورثے میں ملی ہوئی زمینیں بیچ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھا اور کچھ قسمت بھی مہربان تھی کہ اللہ نے روزی میں برکت دی۔ والدین نے گاؤں کے رواج کے مطابق کم عمری میں ہی شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ میری بیوی میری چچازاد تھی اور ہر اعتبار سے ایک اچھی عورت تھی۔ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کئی کئی دن گھر سے باہر رہتا لیکن وہ اللہ کی بندی زبان پر حرفِ شکایت نہ لاتی بلکہ جب بھی میں چند دن واپس آتا، ہر ہر طرح سے میری خدمت کرتی۔ اللہ نے ہمیں ایک بیٹی اور بیٹے کی نعمت سے نوازا تھا۔ بیٹی کو میں نے کم عمری میں ہی اپنی بہن کے بیٹے سے بیاہ دیا۔ بیٹا اس سے چار سال چھوٹا تھا اور اس سال میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ میں نے اکلوتے بیٹے کی تعلیم پر خاص توجہ دی تھی اور اسے بورڈنگ میں رکھ کر پڑھوا رہا تھا۔ وہ بس چھٹیوں میں گاؤں آتا تھا اور سب کا بہت لاڈلا تھا۔ تم یقین جانو کہ اس جیسا ہونہار اور ذہین لڑکا پورے پنڈ میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں اس کا باپ ہونے کی وجہ سے یہ بات نہیں کہہ رہا بلکہ سارا پنڈ یہی کہتا تھا کہ شفقت راؤ کے پتر کا کوئی اور جوڑی دار نہیں ہے۔ میں جب اس کی تعریفیں سنتا تو میرا سینہ فخر سے پھول جاتا لیکن پھر وہ ہوا جس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔'' وہ دونوں دیکھ سکتے تھے کہ بیٹے کا ذکر آتے ہی شفقت راؤ کی آنکھوں کا کرب کچھ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ پھر وہ اپنے بیٹے کے لیے مستقل ''تھا'' کا صیغہ استعمال کر رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کی دردبھری داستان کا سرا اس کے بیٹے سے ہی جڑا ہوا ہے۔ ان دونوں کی خود پر جمی نظروں سے بے خبر شفقت راؤ اپنے ہی دکھ میں ڈوبا بولتا رہا۔

''سولہ سال کی عمر کچھ اتنی زیادہ نہیں ہوتی اور والدین اس عمر کی اولاد کو عموماً بچہ سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں لیکن حقیقت میں عمر کا یہی دور سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے اور انہونیاں دکھاتا ہے۔ میرے بیٹے صداقت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پتا نہیں کیسے اور کیوں وہ اپنے اسکول میں آنے والی ایک نئی ٹیچر کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ سولہ سال کے ایک لڑکے کی خود سے چھ سات سال بڑی لڑکی سے وہ محبت بڑی عجیب تھی۔ وہ ایک بار چھٹیوں پر گھر آیا تو گھر پر بھی اپنی اس ٹیچر کا ذکر کرتا رہا۔ اسے اس کا ہنسنا بولنا، پہننا اوڑھنا سب کچھ بہت بھاتا تھا اور وہ بات بات پر اپنی رعنا مس کا ذکر نکال بیٹھتا تھا۔ ہم نے اس کی باتیں سنیں لیکن اس تعلق کو استاد و شاگرد کے گہرے تعلق سے بڑھ کر اہمیت نہیں دی۔ اصل کہانی تو اس وقت پتا چلی جب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ آخری بار صداقت چھٹیوں میں گھر پر رہنے کے لیے آیا تو بہت بجھا بجھا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میں ان دنوں گاؤں میں نہیں رک سکا اور ایک اہم کاروباری معاملے کی وجہ سے شہر چلا گیا۔ میرے پیچھے صداقت کو دورے پڑنے لگے اور وہ الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا۔ کبھی راتوں کو اٹھ کر ننگے پاؤں گھر سے نکل جاتا اور کیڑوں سمیت ہی تالاب کے ٹھنڈے پانی میں نہانے لگتا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے رونے لگتا اور اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگتا۔ میری بیوی اس کی حالت دیکھ کر بہت گھبرائی۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں سے بھی کچھ چھپا ہوا نہیں تھا۔ سب نے یہی رائے دی کہ صداقت پر کسی جن بھوت کا اثر ہو گیا ہے اور اسے علاج کے لیے کالی والے پیر سائیں کے ڈیرے پر لے جانا چاہیے۔

''پیر سائیں کی وہ خانقاہ زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن اس کے عقیدت مند بہت سارے تھے۔ میری گھبرائی ہوئی پریشان بیوی نے سب کی رائے کو مانتے ہوئے ادھر کا رخ کیا۔ میری بیٹی اور داماد نے تھوڑی سی مخالفت بھی کی لیکن گاؤں کا واحد ڈاکٹر صداقت کی بیماری سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے دعا دم میں کوئی حرج نہ سمجھتے ہوئے بالآخر انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور صداقت کی بربادی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ بظاہر صداقت درگاہ پر حاضری کے بعد سنبھل گیا اور دیوانوں والی حرکتیں چھوڑ کر سکون سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینے لگا۔ اس کی شوخی روٹھ جانے کے باوجود بھی کافی سمجھا گیا کہ وہ اب دیوانوں کی سی حرکتیں نہیں کرتا۔ میں کاروباری دورے سے واپس آیا تو مجھے بھی یہ ساری اطلاعات ملیں لیکن آنکھوں سے دیکھنے اور سننے میں فرق ہوتا ہے۔ پیر سائیں پر عقیدہ نہ ہونے کے باوجود میں نے صداقت کی صحت یابی کی وجہ سے خاموشی اختیار کرلی اور صداقت چھٹیوں کے باقی ماندہ دن گزار کر واپس بورڈنگ چلا گیا۔ وہ جتنے عرصے گاؤں میں رہا، پابندی سے پیر سائیں کے پاس جاتا رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا یہ تو بہت بعد میں سمجھ آیا اور بہت سی باتیں بھی بعد میں اس وقت سامنے آئیں جب مجھے اس کے بورڈنگ سے فوری طور پر پہنچنے کے لیے کال کی گئی۔ میں اس وقت لاہور میں تھا۔ بورڈنگ اسکول سے کال آنے پر میں فوراً وہاں پہنچا۔ مجھے سخت پریشانی تھی کہ آخر اس طرح اچانک بلانے کی کیا وجہ ہے؟ میں صداقت کی ساری فیسیں وغیرہ پابندی سے ادا کرتا تھا اور صداقت بھی ایسا بچہ نہیں تھا کہ اس کی طرف سے کسی کو شکایت کا موقع ملے۔ بہرحال میں حیران پریشان وہاں پہنچا تو پرنسپل سے ملاقات کے پہلے ہی لمحے میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ پرنسپل کے چہرے کے تاثرات بہت گمبھیر تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملا کر ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے دیکھا کہ وہاں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک شخص اور بھی بیٹھا ہوا ہے لیکن میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ اس پولیس والے کی وہاں موجودگی اور میرے بلاوے کے درمیان کوئی تعلق بنتا ہے۔ میں نے اسے بھی پرنسپل کا کوئی ملاقاتی تصور کیا جو میری طرح اپنے بچے کے سلسلے میں بلایا گیا تھا لیکن جب پرنسپل نے گفتگو کا آغاز کیا تو میری یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس بار جب صداقت چھٹیوں میں گھر گیا تھا تو کیا میں نے اس میں کوئی غیر معمولی پن محسوس کیا تھا؟ اس سوال کو سن کر میں سمجھا کہ شاید صداقت کے دوروں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا ہے چنانچہ میں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے پرنسپل کو سب کچھ بتا دیا اور اس سے پوچھا کہ کیا صداقت نے وہاں کسی قسم کی پریشانی کھڑی کر دی ہے؟ پرنسپل نے میرے سوال کا براہِ راست جواب نہیں دیا بلکہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا کہ راؤ صاحب مجھے افسوس ہے کہ آپ اپنے بیٹے کے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہے اور بہت سے حقائق نہیں جان سکے۔ پھر انہوں نے مجھے صداقت کے اپنی ٹیچر کے عشق میں مبتلا ہونے کا قصہ سنایا۔ انہیں یہ ساری معلومات اس کے ایک ایسے کلاس فیلو سے حاصل ہوئی تھیں جس سے صداقت کی بہت دوستی تھی۔ کچھ باتیں مس رعنا نے بھی بتائیں۔

''ان دونوں کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق صداقت، مس رعنا کی اسکول میں آمد کے پہلے دن سے ہی ان پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مس رعنا سے بات چیت کے مواقع نکال سکے۔ وہ اسے ریاضی پڑھاتی تھیں اور صداقت ریاضی میں اچھا خاصا ذہین ہونے کے باوجود کلاس میں سوال سمجھ نہ آنے کا بہانہ کر کے فری پیریڈ یا بریک ٹائم وغیرہ میں بھی ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ مس رعنا اکثر حیران ہوتی تھیں کہ صداقت کو جس اتنی مشکل سے سمجھ آتا ہے لیکن وہ ہر ٹیسٹ میں پورے پورے نمبر لیتا ہے لیکن یہ بات ان کے لیے زیادہ عرصہ معما نہیں رہی اور اسٹاف روم میں دوسری ٹیچرز سے گفتگو کے دوران میں انہیں پتا چل گیا کہ صداقت تو ہمیشہ سے ہی ریاضی میں بہت اچھا ہے اور ایسا شاذونادر ہی ہوا ہے کہ صداقت کے اس مضمون میں پورے نمبر نہ آئے ہوں۔ اس حقیقت کے سامنے آنے کے بعد مس رعنا نے صداقت کے دیگر رویوں پر غور کیا تو انہیں سمجھ آگئی کہ وہ صرف ان سے قریب رہنے کے لیے ریاضی کے سوالات کلاس میں سمجھ نہ آنے کا عذر کر کے فارغ اوقات میں ان کے پاس چلا آتا ہے۔ صداقت تقریباً ہر روز انہیں سرخ گلاب کا پھول دیا کرتا تھا جسے وہ ایک شاگرد کی استاد سے گہری وابستگی کا اظہار سمجھ کر قبول کر لیتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ موقع پا کر ان کے لباس، چلنے کے انداز یا آنکھوں کی رنگت وغیرہ کی تعریف بھی کر دیا کرتا تھا لیکن مزاجاً قدرے لاابالی ہونے کی وجہ سے مس رعنا نے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن جب ایک بار وہ صداقت کی طرف سے کھٹکیں تو انہیں اس کا ہر رویہ سمجھ آنے لگا اور اندازہ ہو گیا کہ صداقت کی ان کے لیے پسندیدگی استاد کے لیے شاگرد کی عمومی پسندیدگی نہیں ہے بلکہ وہ کسی اور ہی زاویے سے انہیں دیکھتا ہے۔ اس اندازے کے بعد وہ اس پر ظاہر کیے بغیر تھوڑی سی محتاط ہو گئیں اور حفظ ماتقدم کے طور پر اسے موقع پا کر اپنی منگنی اور عنقریب ہونے والی شادی کے بارے میں بھی اطلاع دے دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس بارے میں جان کر صداقت ان کی طرف سے مایوس ہو جائے گا لیکن اس نے بالکل ہی مختلف ردعمل کا مظاہرہ کیا اور نہایت بے باکی سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے اپنی منگنی توڑ ڈالنے کی استدعا کی۔

''مس رعنا نے اسے بہت سمجھایا۔ سختی اور نرمی دونوں سے کام لے کر دیکھا۔ اسے اپنے اور اس کے درمیان موجود تعلق کی نوعیت کے علاوہ عمروں کے فرق کا بھی احساس دلایا لیکن صداقت کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ مس رعنا چاہتیں تو اسکول انتظامیہ سے صداقت کی شکایت بھی کر سکتی تھیں لیکن انہیں معلوم تھا کہ اس شکایت کے نتیجے میں صداقت کو بورڈنگ اسکول سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ ان کی نرم دلی نے یہ منظور نہ کیا کہ صداقت جیسا ذہین اور لائق طالب علم اپنے اتنے اہم تعلیمی سال میں کسی مشکل سے دوچار ہو چنانچہ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر خود جاب چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ صداقت کی دیوانگی انہیں بدنام نہ کروا دے۔ بات اسکول کی حدود سے نکل کر اگر ان کے گھر یا ہونے والے سسرال تک پہنچ جاتی تو ان کے لیے بڑی شرمندگی کا مقام ہوتا۔ ان کے اسکول چھوڑنے کا سن کر صداقت بہت مضطرب ہوا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح مس رعنا سے رابطہ کر کے انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دے لیکن اس موقع پر مس رعنا نے بہت سختی سے کام لیا اور صداقت کے رابطہ کرنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ اتفاق سے اسی عرصے میں چھٹیوں کا بھی آغاز ہو گیا اور صداقت کو پنڈ آنا پڑا۔ آنے سے پہلے اسے یہ اڑتی خبر بھی مل گئی تھی کہ مس رعنا کی عنقریب شادی ہونے والی ہے چنانچہ وہ بہت زیادہ ذہنی دباؤ کے ساتھ گھر واپس آیا تھا۔

''اس ذہنی دباؤ نے جہاں اس پر خاموشی طاری کر دی وہیں اسے دورے بھی پڑنے لگے۔ پنڈ کے لوگوں نے اپنی کم علمی میں ان دوروں کو کسی جن یا بھوت پریت کا سایہ سمجھ کر پیر سائیں کے ڈیرے کی راہ دکھائی اور حیرت انگیز طور پر صداقت کے دوروں میں افاقہ بھی ہو گیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں پر صداقت کا کوئی روحانی علاج نہیں ہوا تھا بلکہ اسے نشے کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ اداس اور دل گرفتہ صداقت کو نشے سے حاصل ہونے والی خود فراموشی میں عافیت محسوس ہوئی اور وہ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد پنڈ سے بورڈنگ جاتے ہوئے خاصا ذخیرہ ساتھ لے گیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی ماں سے اپنی پسندیدہ ٹیچر کی شادی پر قیمتی تحفہ دینے کے بہانے خاصی رقم حاصل کر لی تھی پھر میری طرف سے اسے کھلا جیب خرچ بھی ملتا تھا جس کا کافی حصہ اس کے پاس جمع تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اس نے اپنی تباہی کا سامان جمع کر لیا اور بورڈنگ جا پہنچا۔ اس کے قریبی دوست نے اسے چوری چھپے سگریٹ پیتے دیکھ کر کئی بار ٹوکا اور اس بری عادت کو ترک کرنے کی نصیحت کی لیکن صداقت ہر بار وعدہ کر کے مکر جاتا۔ درحقیقت وہ اگر کوشش کرتا بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ نشے کے عفریت سے پیچھا چھڑانا اچھے اچھوں کے لیے مشکل ہوتا ہے وہ تو پھر رنج میں مبتلا ایک نوعمر لڑکے کا معاملہ تھا۔ اس کا دوست بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ صداقت نشہ کرنے لگا ہے۔ وہ تو بس اسے سگریٹ نوشی کا عادی ہی سمجھتا رہا اور اس عادت کو مس رعنا کے غم سے منسوب کر کے گزرتے وقت کے ساتھ صداقت کے سدھر جانے کی امید کرتا رہا لیکن صداقت کیسے سدھر سکتا تھا؟ اس کی تعلیمی کارکردگی بھی متاثر ہونے لگی جس پر اساتذہ نے اس سے بازپرس کی تو اس نے چھٹیوں کے دوران میں اپنی طویل علالت کی کہانی سنا کر ابھی تک ذہنی اور جسمانی طور پر فٹ نہ ہو سکنے کا بہانہ بنا دیا۔

''صداقت کا ریکارڈ اچھا تھا اس لیے اس بہانے کو قبول کر لیا گیا۔ ویسے بھی اس کی گرتی ہوئی صحت خود بھی اس کے بہانے کو تقویت دے رہی تھی۔ یہ حالات شاید لمبے عرصے تک جاری رہتے لیکن ہوا کچھ یوں کہ مس رعنا کو ان کی شادی کی خوشی میں ان کے شوہر کے ساتھ اسکول میں ایک دعوت دی گئی۔ یہ دعوت اسٹاف ممبران کی طرف سے تھی اور اس کا طالب علموں سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن بچے اپنی ٹیچر کو نئے سنورے روپ میں ان کے شوہر کے ساتھ دیکھنے کے لیے کلاس روم سے بے تاب ہو کر نکلنے لگے تو پرنسپل نے مس رعنا کو اجازت دے دی کہ وہ جن کلاسز میں پیریڈ لیتی تھیں، ان میں وہ دو منٹ کے لیے چکر لگا لیں۔ وہ صداقت کی کلاس میں بھی گئیں اور اس کے لیے ان کا وہ بنا سنورا روپ دیکھنا غضب ہو گیا۔ اس نے یہ مشکل اسکول ٹائم گزارا اور پھر خود کو نشے میں ڈبو کر اذیت سے نجات حاصل کرنے کے چکر میں اتنی اوور ڈوز لے لی کہ برداشت کی حد ہی جواب دے گئی۔ اسے بہت دیر تک غائب پا کر اس کا دوست جب اسے ڈھونڈتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں بیٹھ کر اس کی دانست میں صداقت محض سگریٹ نوشی کرتا تھا تو وہاں اسے صداقت اس حال میں ملا کہ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور ہاتھ پیر ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ اس نے فوراً انتظامیہ کو خبر دی اور ان لوگوں نے فوراً اسے اسپتال منتقل کر دیا لیکن کوئی تدبیر کام نہ آئی اور صداقت نے اسپتال میں دم توڑ دیا۔'' اس مقام پر آ کر شفقت راؤ کا حوصلہ دم توڑ گیا اور وہ کہانی کے تسلسل کو جاری رکھنے سے محروم ہو کر رونے لگا۔ اسلم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب گیا اور شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے خاموش دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ایک ایسے باپ کے سامنے ہمدردی اور تسلی کے سارے الفاظ ہیچ تھے جس نے اپنے اکلوتے اور ہونہار بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہو۔ وہ باتو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی یہ المناک داستان سن کر دل گرفتہ ہو گئی تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے پھر بھی اس نے ضبط کا مظاہرہ کیا اور شفقت راؤ کے سامان میں ہی سے پانی کی بوتل نکال کر اسے پانی پیش کیا۔ چند گھونٹ پانی پی کر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لیا اور کچھ دیر لب سی کر بیٹھ گیا۔

اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے ان دونوں میں سے کسی کو حوصلہ نہ ہو سکا کہ اسے داستان آگے بڑھانے کے لیے کہیں۔ ویسے انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ شفقت کی داستان کسی ایک فرد سے حاصل کردہ معلومات پر مشتمل نہیں ہے اور اس نے مختلف لوگوں کے بیانات کے علاوہ اپنے قیاسات کی مدد سے بھی اپنے بیٹے کی دردناک داستان کے تانے بانے جوڑے ہیں۔ آخرکار اس نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے ایک بار پھر داستان کا منقطع ہو جانے والا سلسلہ جوڑا۔

”تم لوگ شاید اندازہ لگا سکو کہ پرنسپل کی زبانی صداقت کی موت کی اطلاع سن کر مجھ پر کیا گزری ہوگی؟ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ صداقت کی موت نشے کی اوور ڈوز کی وجہ سے واقع ہوئی ہے اور موت کے طبعی نہ ہونے کی وجہ سے پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنا پڑا ہے۔ اس وقت مجھے پرنسپل کے کمرے میں پولیس والے کی موجودگی کا سبب سمجھ آیا۔ وہ مجھ سے جاننا چاہتا تھا کہ کیا میں صداقت کے نشہ استعمال کرنے سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ کن ذرائع سے نشہ حاصل کر رہا ہے؟ میں صداقت کی موت کی خبر سن کر اتنا حواس باختہ ہو گیا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی جواب دے گئی تھیں۔ میں انسپکٹر کو اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا اور صداقت کا جسد خاکی لے کر پنڈ واپس آ گیا۔ پورے پنڈ میں کہرام سا مچ گیا۔ صداقت کی ماں بیٹے کی لاش دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس کا ذہنی توازن اب تک درست نہیں ہوا ہے اور وہ سارا وقت یا تو گم صم بیٹھی رہتی ہے یا پھر خیالوں میں صداقت سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں خود بھی کئی دن تک ہوش میں نہیں آ سکا تھا۔ بعد میں دوستوں، رشتے داروں کے حوصلہ دینے پر ذرا سنبھلا تو پھر بیٹھ کر سارا حساب کتاب جوڑا۔ میں نے تم لوگوں کو صداقت کے نشے کا عادی ہونے کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا لیکن درحقیقت یہ بات مجھے بعد میں سمجھ آئی تھی کہ وہ اس لت میں کیسے مبتلا ہوا۔

”چھٹیوں میں اسے پڑنے والے دوروں اور پیر سائیں کے ڈیرے پر لے جانے اور وہاں جا کر سنبھل جانے والا معاملہ یاد آنے پر مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ ایسی جگہوں پر بھنگ، چرس اور افیون جیسے نشوں کا استعمال عام ہے۔ پھر میں کھوج میں پڑ گیا۔ میں نے اپنے کاروبار سمیت ہر شے کو چھوڑ کر اس معاملے کی تحقیق شروع کر دی اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہاں پر دیسی نشوں کے علاوہ ہیروئن بھی دستیاب ہے جس میں ایسے افراد کو جکڑا جاتا ہے جو صاحب حیثیت ہوں اور اس کی منہ مانگی قیمت ادا کر سکیں۔ صداقت کی موت کے ذمے داروں کو کھوج نکالنے پر مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ مس رعنا کا عشق تو بس ایک بہانہ تھا۔ نوعمری میں لڑکے اس طرح کے معاملات میں پڑ ہی جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ سنبھل بھی جاتے ہیں۔ بالفرض اگر صداقت خود سے نہ سنبھل پاتا تو میں کسی بڑے ماہر نفسیات سے اس کا علاج بھی کروا سکتا تھا لیکن جعلی پیر سائیں نے اس کی ذہنی ابتری کا فائدہ اٹھا کر اسے اور میرے خاندان کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا، میں اسے کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں خود کو تباہ کرنے والے کو بھی تباہ کر ڈالوں گا اور ایسی اذیت ناک موت سے دوچار کروں گا کہ وہ بھی میرے بیٹے کی طرح تڑپ تڑپ کر مرے۔ میرے نزدیک پیر سائیں کے ساتھ ساتھ ڈیرے کے دوسرے افراد بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے اس لیے ان سب ملعونوں کے ساتھ اس جگہ کا وجود بھی مٹا دیے جانے کے قابل تھا۔“ شفقت راؤ کی آنکھیں یہ سب کہتے ہوئے لہو رنگ ہو گئی تھیں اور لہجے میں آتش فشاں کا سا قہر تھا۔ طویل عرصہ مار دھاڑ اور لوٹ مار میں گزارنے والے اسلم کو بھی اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔

”اس جگہ کو تباہ کرنے کا منصوبہ تیار کرنے کے بعد میں کاروبار کی دیکھ بھال کے بہانے پنڈ سے روانہ ہو گیا لیکن اسی رات خاموشی سے واپس بھی آ گیا۔ یہ میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اپنا کام نمٹانے کے بعد عام راستے سے پنڈ سے نکلنے کے بجائے اس پہاڑی سلسلے کا راستہ استعمال کروں گا۔ اپنے اس منصوبے کی وجہ سے میں نے ضرورت کا سارا سامان جمع کر لیا تھا۔ بہانے سے بیٹی سے روغنی روٹیاں بھی پکوائی تھیں۔ یہ سارا چکر اس لیے تھا کہ کوئی کارروائی مکمل ہونے کے بعد مجھے گاؤں سے جاتا ہوا نہ دیکھے۔ میں بیٹا کھو چکا تھا لیکن بیوی اور بیٹی کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ بیٹی اپنے گھر کی تھی اور بیوی بھی فی الحال اس کے ساتھ ہی رہ رہی تھی لیکن میں یہ بات سمجھتا ہوں کہ عورت کے لیے شوہر اور باپ دونوں کے گھر اہمیت رکھتے ہیں۔ شوہر کے گھر رہ کر اگر معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے تو میکے کا مان اسے تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ میں اپنی بیٹی اور بیوی کو اس عزت اور تحفظ سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ ڈیرے کو تباہ کرنے کے بعد علی الاعلان ذمے داری قبول کر لوں۔ بہرحال اپنے تحفظات کا خیال رکھتے ہوئے میں نے رات کے آخری پہر پیش قدمی کی اور ایک کنستر میں پیٹرول لے کر ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ میرا وفادار کتا اس وقت بھی میرے ساتھ تھا۔ اگر کہیں سے کوئی مداخلت ہونے کا خطرہ ہوتا تو یہ بھونک کر مجھے پیشگی باخبر کر دیتا لیکن خیر گزری اور کوئی رکاوٹ سامنے نہیں آئی۔ میں نے پیر سائیں کے ڈیرے کے اطراف پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ رات کے اس آخری پہر میں وہاں سناٹا طاری تھا۔ دوسرے یہ بھی ڈر نہیں تھا کہ پیر سائیں اور اس کے چیلوں کے علاوہ دوسرے افراد بھی موجود ہوں گے اسی لیے میں نے اس وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اپنے سامان کا تھیلا میں پہلے ہی پہاڑی سلسلے کے آغاز میں ایک محفوظ جگہ پر چھپا کر رکھ چکا تھا اس لیے وہاں سے بھاگ کر سیدھا اسی طرف گیا۔ سفر کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے دیکھ لیا تھا کہ ڈیرے میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ اس آگ نے میرے دل میں لگی آگ کو کافی ٹھنڈک پہنچائی اور اب مجھے یہ اطمینان ہے کہ میں نے نہ صرف اپنے بیٹے کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا بلکہ ایک ایسے ٹھکانے کو بھی تباہ کر ڈالا جہاں سے میرے بیٹے جیسے اور نہ جانے کتنے نوجوانوں کو تباہ و برباد کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔“ یہ الفاظ کہتے ہوئے شفقت راؤ کے لہجے میں اطمینان در آیا تھا اور اب وہ یوں چپ بیٹھا تھا جیسے کہنے کو کچھ بھی باقی نہ بچا ہو۔ داستان مکمل ہو گئی تھی اور داستان گو کے خاموش ہونے کے بعد ہی سامعین کو بھی اردگرد کا ہوش آ سکا تھا۔ پو پھٹنے سے شروع ہونے والی اس داستان کی طوالت نے اتنا وقت لے لیا تھا کہ سورج سروں پر چڑھ آیا تھا اور مسافروں کو یاد دلا رہا تھا کہ یونہی بیٹھے رہنا ان کی منزل کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

لندن پہنچ کر چودھری نے ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق میٹرو ہوٹل میں کمرا بک کروا لیا لیکن اب انتظار کی کوفت میں مبتلا سخت بوریت کا شکار تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ڈیوڈ کا نمائندہ اس سے کب ملنے آئے گا؟ وہ کسی بھی وقت آ سکتا تھا اور اس کی آمد تک وہ ہوٹل کے کمرے تک محدود رہنے پر مجبور تھا۔ یہ صورت حال اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس کا حکمرانی کا عادی ذہن اس صورت حال کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ ہی چڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے احکامات اور ہدایات جاری کرنے کا عادی تھا لیکن یہاں اسے دوسروں کی ہدایات کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہ خواری اس نے دولت کی حرص میں مول لی تھی حالانکہ دولت کی اس کے پاس کوئی کمی بھی نہیں تھی۔ وہ اتنے اثاثوں کا مالک تھا کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی تھیں لیکن حرص اور لالچ کے دوزخ کا پیٹ کہاں بھرتا ہے۔ دولت کے لیے اس نے ساری زندگی کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ غریب مزارعوں کا خون چوسنے سے لے کر لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ تک ہر کام وہ بے کھٹک کرتا رہا تھا کہ اس کے خزانوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس جیسے شخص کے لیے ہیروئن کے کاروبار میں شامل ہو کر خطیر دولت کمانے کا موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے نظرانداز کر دے۔ اس موقع سے مستفید ہونے کے لیے اس نے اپنی بالادستی کو قربان کرنا بھی منظور کر لیا تھا اور اب میٹرو ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہا تھا۔

وہ فی الحال لندن کی رنگینیوں سے محظوظ ہونے سے معذور تھا اس لیے ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے شباب اور جام نے رنگین شراب کی بوتل سے ہی دل بہلانے پر مجبور تھا۔ پرتعیش کمرے میں موجود بڑی سی گلاس ونڈو سے باہر کا نظارہ صاف نظر آ رہا تھا۔ رم جھم برستی برسات میں لندن شہر کے باسیوں کے معمولات جاری تھے۔ وہ برسات کے ساتھ ساتھ لمحہ لمحہ بھیگتی رات سے بھی بے نیاز نظر آتے تھے۔ دنیا کے ہر بڑے شہر کی طرح لندن کے باسیوں کے لیے بھی دن اور رات کا فرق بہت زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا۔ البتہ چودھری مضطرب تھا۔ یوں تنہائی میں وقت گزارنا اس کے لیے کٹھن ہو رہا تھا کہ نہ یہاں جاہ و جلال دکھانے کے لیے غلام و خدام تھے اور نہ ہی دل بہلانے کے لیے وہ عورتیں جو اپنی بے بسی کی وجہ سے یا پھر دولت کے لالچ میں وقتاً فوقتاً اس کے بیڈ روم کی زینت بنتی رہتی تھیں۔ تیز اثر وہسکی اور ٹی وی اسکرین پر نظر آتے جلوؤں نے اس کے جذبات کو اور بھی زیادہ برانگیختہ کر دیا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ انتظار کو ترک کر کے باہر نکل کھڑا ہو کہ اسی دم اس کے کمرے کے دروازے پر دھیمی اور مہذبانہ دستک ابھری۔

”کون؟“ اس نے چونک کر محتاط انداز میں پوچھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ دروازے پر ڈیوڈ کا نمائندہ ہی موجود ہوتا۔

”ویٹر سر!“ باہر سے نہایت دھیمی آواز میں اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوال کا جواب دیا گیا۔
''کم ان۔'' اس نے الجھن آمیز انداز میں ویٹر کو اندر آنے کی اجازت دی۔ فوراً ہی آہستگی سے دروازہ کھول کر ایک خوش شکل اور بے داغ وردی والا نوجوان اندر داخل ہوا۔ چودھری زبان سے کچھ کہے بغیر استفسار بھری نظروں سے اسے گھورنے لگا۔
''آپ ہمارے ہوٹل میں کسی قسم کی بے آرامی تو محسوس نہیں کر رہے سر؟'' باوردی ویٹر نے خلیقانہ لہجے میں سوال کیا۔
''اگر مجھے تکلیف ہوئی تو ہوٹل انتظامیہ کو آگاہ کر دوں گا۔ تمہیں مجھے اس طرح ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' چودھری نے بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور وِھسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔
''سوری سر! آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن آپ تنہا ہیں اور جب سے آئے ہیں کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے تو میں نے سوچا کہ آپ کو یہیں کوئی تفریح فراہم کرنے کے بارے میں پوچھا جائے۔'' ویٹر کا مودبانہ جواب خاصا معنی خیز تھا جسے سن کر چودھری چونک پڑا۔
''کیسی تفریح۔۔۔؟'' اس نے ویٹر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔
''تنہائی میں شراب کی بوتل کے ساتھ ساتھ اگر کوئی خوب صورت ساتھی بھی مل جائے تو اس سے بہتر تفریح کیا ہو گی؟''
اس کا جواب بڑا واضح تھا۔ انتظار کی کوفت میں مبتلا چودھری سوچ میں پڑ گیا۔ ڈیوڈ کے نمائندے کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ اگلے چند گھنٹوں میں اس سے ملنے آ جاتا۔ وہ آئندہ روز بھی آ سکتا تھا اور بالفرض اگر جلدی بھی آ جاتا تو اس سے نیچے ہال میں ملاقات کی جا سکتی تھی۔ اگر وہ کمرے کی تنہائی میں ملاقات پر مصر ہوتا تو بھی اس کو کچھ دیر انتظار کروا کر وہ ویٹر کی فراہم کی گئی تفریح کو فارغ کر سکتا تھا۔ یہ سب سوچنے کے بعد اس نے ویٹر کی طرف پہلی بار دوستانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا اور بولا۔
''او کے، تم اسے لے آؤ۔ اگر واقعی تمہاری فراہم کردہ تفریح نے میرا دل خوش کر دیا تو تمہیں کمیشن کے علاوہ بھی انعام ملے گا۔''
''مجھے یقین ہے سر کہ آپ مایوس نہیں ہوں گے۔'' ویٹر نے اعتماد سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد چودھری کو خیال آیا کہ لندن جیسے آزاد شہر میں ہوٹل کے ویٹر کو اس طرح کی دلالی کی کیا ضرورت پیش آئی ہے؟ یہاں دوستی کے نام پر بھی سب کچھ ہو جاتا ہے اور پیشہ ور عورتیں بھی اپنا شکار تلاش کرنے میں ماہر ہوتی ہیں۔ ہوٹل کا یہ ویٹر شاید خاص طور پر ایشیائی افراد کی تاک میں رہتا تھا کہ ان کی اس قسم کی خدمت سرانجام دے کر اپنا کمیشن کھرا کر سکے۔ معاملہ جو بھی تھا بہرحال، اب تو وہ ویٹر سے ہامی بھر چکا تھا چنانچہ وِھسکی کے ساتھ شغل کرتے ہوئے آنے والی کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کے یہ لمحے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئے اور جلد ہی دروازے پر دستک کی آواز ابھری پھر اس کی خمار آلود ''کم ان'' کے جواب میں آہستگی سے دروازہ کھولا گیا۔ چودھری کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا لیکن وہ براہِ راست اس طرف دیکھنے کے بجائے جھک کر اپنے لیے پیگ تیار کر رہا تھا۔ گلاس میں برف کے کیوبس ڈالتے ہوئے اس کی نظروں نے دو سڈول ٹانگوں کو حصار میں لیا۔ سیاہ نازک پٹیوں والی اونچی ایڑی کی سینڈل میں قید پاؤں کسی بھی قسم کے کپڑوں سے آزاد تھے اور سیاہ سینڈل پیروں کی گوری رنگت کو بے حد نمایاں کر کے دکھا رہی تھی۔ چودھری کی نظروں نے آہستگی سے اوپر کا سفر طے کرنا شروع کیا۔ ایڑی سے لے کر گھٹنوں تک وہاں بنا کسی رکاوٹ کے نظارہ ہی نظارہ تھا۔ گھٹنوں سے اوپر کا سفر شروع ہوا تو سیاہ اسکرٹ کی جھلک دکھائی دی اور پھر اوپر کی سمت سفر کرتے ہوئے اسکرٹ کا بلاؤز بھی یکدم ہی اختصار اختیار کر گیا۔ ٹانگوں ہی کی طرح بے حد خوب صورت بازو نہ صرف آستین کی جھنجٹ سے آزاد تھے بلکہ شانوں پر بھی کپڑے کی کسی دھجی کا نام و نشان نہیں تھا۔ لمبی صراحی دار گردن میں موجود نقرئی نیکلس میں جڑے سیاہ پتھر گردن کے نیچے کے حصے میں جھولتے ہوئے نہ صرف اس حصے کو مزید نمایاں کر رہے تھے بلکہ اپنی خوش نصیبی پر رشک کرتے دکھائی دے رہے تھے۔
صراحی دار گردن سے اوپر ایک بے حد حسین چہرہ وقف تھا جسے چومتی بالوں کی سیاہ لٹیں شرارت پر مائل نظر آتی تھیں۔ اس چہرے کو دیکھتے ہی چودھری ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور سیاہ مسکراتی ہوئی آنکھوں کو حیرت و مسرت سے تکتے ہوئے کچھ کہنے کی خواہش میں ہونٹوں کو بے ڈھنگے پن سے جنبش دے کر رہ گیا۔ وہ ایک کال گرل کی حیثیت سے اس کے سامنے آئی تھی اور آنکھوں اور بالوں کی بدلی ہوئی رنگت کی وجہ سے کافی مختلف لگ رہی تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے سامنے موجود اس قتالہ کو پہچان نہ سکے۔ بلاشبہ وہ لنڈا ہی تھی جس کے حسن و شباب سے وہ امریکا کی رنگینیوں میں رہ کر لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔
''ہائے۔'' لنڈا نے ایک ادا سے کہا اور دروازہ بند کر کے لہراتی ہوئی اس کے قریب آ کر سامنے والی کرسی سنبھال لی۔
''ہیلو، واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہوٹل کے اس کمرے میں تم سے ملاقات ہو سکے گی۔'' اپنی بے تحاشا خوشی کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے چودھری نے گلاس واپس میز پر رکھا اور لنڈا کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
''آپ جیسا سچا چاہنے والا ہو تو ملاقات کا موقع تو نکالنا ہی پڑتا ہے۔'' گہری سرخ لپ اسٹک سے سجے اس کے تراشیدہ ہونٹ مسکرائے اور اس نے چودھری کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو پُرجوش انداز میں تھام لیا۔ چودھری تو گویا اسے سامنے پا کر ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔
''موقع تو تم نے خوب نکالا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے جس نمائندے سے ملاقات کے لیے لندن بلایا جا رہا ہے وہ تم ہو گی، وہ بھی اس انداز اور روپ میں۔'' چودھری نے اپنی حیرت و خوشی کا اظہار کیا اور ایک دوسرا پیگ تیار کر کے لنڈا کی طرف بڑھایا۔
''میں پانی کی طرح ہوں چودھری صاحب! کسی بھی روپ میں ڈھل جاتی ہوں اور ایک نیا نام اپنا لیتی ہوں۔ یہاں آپ کو مجھے پامیلا کے نام سے بلانا ہو گا۔ رہی اس نمائندے کی بات جس سے آپ کو ملاقات کرنی ہے تو وہ میں نہیں ہوں۔ مجھے آپ درمیانی پارٹی سمجھ لیں۔ اصل معاملات آپ کو کسی اور سے طے کرنا ہوں گے۔'' گلاس سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے جواب دیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اس انداز سے بیٹھ گئی کہ چودھری کو اپنا دل اچھل کر حلق میں آتا ہوا محسوس ہوا۔
''تم درمیان میں رہو گی میرے لیے یہ کافی ہے۔ میری طرف سے سارے معاملات تم ہی طے کر لینا۔'' چودھری نے قدرے لاڈ بھرے لہجے میں جواب دیا۔
''معاملات وہ آپ سے ہی طے کریں گے کیونکہ آپ کو ہی ان کی ہدایات پر عمل کرنا ہو گا۔ میں بس دونوں طرف سے ضامن ہوں۔ آپ کو بے منت کرنے کی ذمے داری ہماری ہو گی جبکہ دوسری پارٹی کو میں آپ کی طرف سے یہ یقین دہانی کرواؤں گی کہ آپ کام ان کے مطلوبہ معیار کے مطابق ہی کریں گے۔'' لنڈا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''او کے، جیسا تم مناسب سمجھو ویسا کر لیں گے۔ یہ بتاؤ کہ ابھی کیا پروگرام ہے؟ اگر ڈنر نہیں کیا ہے تو میں روم سروس سے کہہ دیتا ہوں۔ ڈنر کے بعد اطمینان سے پرانی یادوں کو تازہ کریں گے۔ ڈنر سے بریک فاسٹ تک کا وقت یادوں کو تازہ کرنے کے لیے بہت مناسب ہوتا ہے۔ ویسے بھی سنا ہے کہ اس ہوٹل میں بڑا زبردست بریک فاسٹ سرو کیا جاتا ہے۔'' کال گرل کے روپ میں اپنے کمرے تک آنے والی لنڈا کو وہ بڑے سلیقے سے شب بسری کی دعوت دے رہا تھا یا پھر کنفرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آیا ویٹر نے اسے جس تفریح کو فراہم کرنے کا وعدہ کر کے اسے اس کے کمرے تک پہنچایا تھا اب اس کا کوئی امکان رہا تھا یا نہیں۔
''ڈنر میں نے نہیں کیا ہے۔ وہ میں آپ کے ساتھ ہی کروں گی لیکن یہاں نہیں۔ ہم لوگ ڈنر کے لیے کہیں اور چل رہے ہیں وہیں کام کی بات بھی ہو گی۔'' لنڈا کا جواب اس کے لیے مایوس کن تھا۔ اس جواب سے ظاہر تھا کہ وہ کال گرل کے روپ میں یہاں آئی ضرور ہے لیکن شب بسری کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ اس کی اولین ترجیح کام ہی ہے۔
''ٹھیک ہے، میں تیار ہوتا ہوں۔'' چودھری نے وِھسکی کا خالی گلاس میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ عمدہ ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا۔ مغربی لباس زیب تن کیے اس کا یہ روپ اگرچہ بہت سوں کے لیے اجنبی تھا لیکن درحقیقت وہ اس سے قبل بھی یورپی ممالک میں قیام کے دوران ڈنر پارٹیز وغیرہ میں اس لباس کو پہننا پسند کرتا تھا۔
''ویری اسمارٹ۔'' لنڈا نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے اس کی تعریف کی۔
''تھینک یو۔'' چودھری تفاخرانہ انداز میں مسکرایا۔ پھر اس سے پوچھنے لگا۔ ''ابھی کچھ دیر بیٹھنا ہے یا پھر چلیں؟''
''ابھی تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔ پہلے آپ ویٹر کو بلا کر اس کے سامنے میرے لیے پسندیدگی کا اظہار کر دیں اور اسے یہ بھی بتا دیں کہ آپ مجھے شاپنگ کے لیے لے جا رہے ہیں۔'' وہ اپنا تیار کردہ پیگ پورا پی چکی تھی اور اب لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگا رہی تھی۔
چودھری نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہی ویٹر کو بلا لیا اور اس سے وہی کچھ کہا جو لنڈا نے اس سے کہنے کو کہا تھا۔ ساتھ ہی طے شدہ کمیشن کے علاوہ کچھ اور رقم بھی اسے عنایت کر دی۔ طے شدہ رقم سے زیادہ ملنے پر وہ خوش ہو گیا اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بناتی لنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مجھے یقین تھا سر کہ آپ مجھ سے خوش ہوں گے، اگر آپ کہیں تو میں آپ کے واپس ہوٹل آنے سے پہلے آپ کے کمرے میں ریڈ وائن کی بوتل پہنچادوں؟ بارہ بجے کے بعد شفٹ چینج ہوجائے گی اور شاید واپسی میں آپ کی مجھ سے ملاقات نہ ہوسکے۔''

''نہیں، ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوئی روم سروس سے خود ہی منگوالیں گے۔ ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مس پامیلا کیا پینا پسند کریں گی۔'' اس نے ویٹر کو غیر ضروری طور پر بے تکلف کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی اسے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ لنڈا واپسی میں اس کے ساتھ ہوٹل آئے گی یا ڈنر سے ہی رخصت ہوجائے گی۔

''او کے سر! انجوائے یور ڈش۔'' ویٹر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی بے نیازی سے سگریٹ پیتی لنڈا نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی اور کھڑی ہوگئی۔ رواج کے مطابق چودھری نے دروازہ کھول کر اسے پہلے باہر نکلنے کا موقع دیا اور پھر خود بھی باہر آنے کے بعد اس کے شانے پر بازو پھیلا کر اسے خود سے نزدیک کرلیا۔ بازو کے حصار میں موجود لنڈا کا ریشم سا جسم اس کے ڈھلتے وجود میں برق سی دوڑا گیا۔

''تم چاہتیں تو مجھ سے براہِ راست بھی ملنے آسکتی تھیں۔ اتنا لمبا چوڑا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟'' اپنی بے اعتدال ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے لنڈا سے پوچھا۔

''بس احتیاطی تدبیر سمجھ لیں۔ ہم جو نازک کام کررہے ہیں اس میں ہر لمحے احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ میدان میں موجود حریف پارٹیوں اور اینٹی نارکوٹکس کے عملے سے بچنے کے لیے احتیاط ہی سب سے مناسب ہے۔ میں جس طرح ویٹر کو گھیر کر آپ تک پہنچی ہوں، کوئی تصور بھی نہیں کرسکے گا کہ یہ عورت کال گرل کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتی ہے۔ واپسی میں میرے پاس موجود ڈھیر سارے شاپنگ بیگز مزید اس امر کی یقین دہانی کروادیں گے کہ ایک چالاک کال گرل نے اپنی اداؤں کے جال میں پھانس کر بے وقوف ایشیائی کو مزید بے وقوف بنا ڈالا۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنے عمل کی توجیح پیش کررہی تھی۔ لفٹ میں ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں تھا اس لیے وہ اطمینان سے بات کررہے تھے۔ یہ الگ بات کہ لنڈا نے اسے جو وضاحت پیش کی تھی، وہ بالکل درست نہیں تھی۔ اس نے جو بہروپ بھرا تھا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو موساد کی ٹاپ ایجنٹ لنڈا پارکر کی لندن میں موجودگی کا علم ہوسکے۔ وہ اور ڈیوڈ موساد کے وسیع مقاصد کے لیے کام کرنے والے دو اسپیشل ایجنٹ تھے جو ظاہری طور پر منشیات کے کاروبار میں ملوث تھے اور اسی حیثیت سے چودھری سے ملتے بھی رہے تھے لیکن درحقیقت ان کا اس بزنس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کررہے تھے اور چودھری کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی کہ ان کا موساد سے کوئی تعلق ہے۔

''تم میں یہی تو خوبی ہے کہ تم حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو ورنہ عورت کے اندر ان دونوں خوبیوں کا یکجا ہونا مشکل ہوتا ہے۔'' لنڈا کے قرب سے پگھلتے چودھری نے بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے اس کی تعریف کی جسے اس نے ایک پُریقین مسکراہٹ کے ساتھ وصول کیا۔

''ہم ٹیکسی میں سفر کریں گے۔'' باہر نکل کر چودھری نے پارکنگ کی طرف رخ کرنا چاہا تو لنڈا نے اسے ٹوک دیا۔

''ٹیکسی میں۔۔۔ مگر کیوں؟''

''احتیاط کی وجہ سے ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے ہوٹل میں کمرا بک کروانے کے ساتھ ہی ایک شان دار کار بھی کرائے پر لے لی ہے اور ہم چاہتیں تو اس کار میں سفر کرسکتے تھے لیکن میں اسے محفوظ نہیں سمجھتی۔'' اس نے بجلیاں گراتی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف رخ کیا۔ اگلے پون گھنٹے میں چودھری نے دیکھا کہ وہ کتنی محتاط ہے۔ ہوٹل سے وہ جس ٹیکسی میں چلے تھے، اسے ایک جگہ چھوڑنے کے بعد انہوں نے مزید دو ٹیکسیاں اور تبدیل کی تھیں، تب کہیں جاکر اس تنگ و تاریک اپارٹمنٹ میں پہنچے تھے جہاں ایک کرخت صورت آدمی ان کا منتظر تھا۔ اس آدمی نے بہت لیے دیے انداز میں ان کا استقبال کیا یہاں تک کہ وہ لنڈا کے بے تحاشا حسن سے بھی متاثر نظر نہیں آرہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں فضول تکلفات میں پڑنے کے بجائے براہِ راست کام کی بات شروع کردوں تو تم لوگ برا نہیں مانو گے۔'' کمرے میں پڑے بوسیدہ صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے کھردرے لہجے میں کہا اور پھر ان کی طرف سے کوئی جواب آنے کا انتظار کیے بغیر خود ہی بولنا شروع کردیا۔

''ہم منشیات کی تجارت میں نمایاں ترین مقام رکھنے والی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں اور ہماری تنظیم کی برتری کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم آنے والے وقت اور حالات کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شمالی علاقے افیون کی کاشت کے لیے بہترین ثابت ہوتے رہے ہیں اسی لیے ہم نے ان علاقوں میں ہیروئن تیار کرنے کی لیبارٹریاں وغیرہ بھی تعمیر کروائی تھیں لیکن بدلتے ہوئے حالات میں تنظیم کے بڑوں کو یہ خدشہ لاحق ہوگیا ہے کہ ہماری فصلیں اور لیبارٹریاں بھی اب حکام کی نذر میں آسکتی ہیں۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا ہے کہ اب یہ کاروبار کہیں اور شفٹ کیا جائے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ہمارے پاس کوئی متبادل انتظام ہو اور اسی کے لیے کثیر سرمایہ خرچ کرکے تحقیق کے بعد تمہارے گاؤں سے متصل جنگل میں افیون کی کاشت کروائی گئی۔ تین مختلف قسم کے ارضی ماحول یکجا ہوجانے کی وجہ سے وہ جنگل ہماری نظر میں آیا تھا اور ہم نے کچھ معمولی جینیاتی تبدیلیوں کے بعد وہاں افیون کی کاشت کروائی تھی۔ فصل تیار ہوجانے کی وجہ سے ہم پہلے مرحلے میں کامیاب رہے۔ لیکن اصل کامیابی تب ہوتی جب اس افیون سے مطلوبہ معیار کی ہیروئن تیار ہوپاتی۔ اس لیے پہلی فصل تیار ہوتے ہی اسے سب سے پہلے قبائلی علاقے کی لیبارٹری میں پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ وہاں ہمارے ماہرین نے اس پر کام کیا اور یہ خوش خبری سنائی کہ معمولی سے فرق کے ساتھ اس افیون سے کامیابی کے ساتھ ہیروئن تیار کرلی گئی ہے۔ اس کامیابی کے بعد ہم دوسرے مرحلے میں داخل ہوچکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح تمہاری زمین پر افیون کاشت کی گئی ہے، اسی طرح وہیں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیبارٹری بھی قائم کی جائے۔ اس سلسلے میں تمہارا جوتوں کا کارخانہ پہلے ہی سے ہماری نظر میں تھا۔'' اس کا مخاطب چودھری تھا اور اپنی پوری گفتگو کے دوران میں وہ لنڈا کو نظرانداز کرکے مسلسل اسی کی طرف متوجہ رہا تھا۔ اس کی یہ خود اعتمادی اور بے نیازی چودھری کو بے چین کررہی تھی۔ اس کے نزدیک تو لنڈا ہی بڑی طاقتور عورت تھی لیکن اگر کوئی شخص اسے نظرانداز کررہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سے بھی اونچی پوزیشن پر ہے۔ ایسے شخص سے یہ امید تو کی ہی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ اسے کوئی اہمیت دیتا اور یہی بات چودھری کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

''مجھے ان میں سے بیشتر باتوں کا علم ہے اور میں پوری کوشش کروں گا کہ اپنے کارخانے میں آپ کے معیار کے مطابق لیبارٹری تعمیر کرواسکوں۔'' احساسِ کمتری سے نکلنے کے لیے اس نے خود کو حالات سے واقف ظاہر کرکے خود ہی اپنے آپ کو مورال سپورٹ دینے کی کوشش کی۔

''تمہیں اس سلسلے میں زحمت کرنے کی ضرورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں۔ لیبارٹری کی تعمیر اور عملے کی بھرتی ہمارا دردِ سر ہے۔ تمہیں صرف ہماری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ فی الحال یہ جان لو کہ تمہارے کارخانے میں آگ لگ گئی ہے جس میں چار ورکرز سمیت سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا ہے۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں جو اطلاع دی اسے سن کر چودھری اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ بے ساختہ موبائل نکالنے کے لیے اپنی جیب کی طرف بڑھا۔ لنڈا کی ہدایت پر وہ ہوٹل سے نکلنے سے قبل اپنا موبائل آف کر چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ اگر کسی نے پاکستان سے اسے اطلاع دینے کی کوشش بھی کی ہوگی تو کامیاب نہیں ہو سکا ہوگا۔

''موبائل واپس جیب میں رکھ لو۔ تمہارے لوگوں سے زیادہ بہتر اطلاعات میں تمہیں دے سکتا ہوں کیونکہ وہاں آگ میرے کہنے پر ہی لگائی گئی ہے۔'' اس نے سرد آواز میں چودھری کو حکم دیا لیکن مال سے بے حد محبت کرنے والا چودھری اتنے بڑے نقصان کا سن کر ابھی تک تلملایا ہوا تھا۔

''تم نے وہاں آگ کیوں لگوائی؟ تمہاری اس حرکت سے مجھے بھاری مالی نقصان اٹھانا پڑے گا۔'' چودھری نے احتجاج کیا۔

''مجھے علم ہے کہ وہاں کی ہر شے انشورڈ ہے اس لیے تم قطعی نقصان میں نہیں رہو گے۔ اس کے باوجود ہم تمہیں اس کے بدلے معقول رقم فراہم کر دیں گے۔'' اس نے اپنی مستقل بے نیازی کے ساتھ جواب دیا جسے سن کر چودھری کا چہرہ کھل اٹھا۔

''لیبارٹری کی خفیہ تعمیر کے لیے ضروری تھا کہ کارخانے کے عملے کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ تم بلا جواز عملے کو زیادہ دن کی چھٹیاں نہیں دے سکتے تھے۔ آگ لگنے کے بعد عملے کو گھر بٹھانے کے علاوہ کارخانے کی از سرِ نو تعمیر کا بہانہ بھی ہاتھ آ گیا ہے۔ تعمیرِ نو کی آڑ میں ہم زیرِ زمین لیبارٹری آرام سے تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے اعتماد کے بندے فراہم کرنا البتہ تمہاری ذمے داری ہوگی۔ چاہے جتنی بھی رقم خرچ کرنی پڑے پر تم اعتماد کے آدمیوں کی مدد سے یہ کام کروا لینا۔ ہم اپنے مستقبل کے لیے کام کر رہے ہیں اس لیے نفع کے بغیر بھی سرمایہ کاری کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' وہ بہت نپے تلے انداز میں بات کر رہا تھا۔ چودھری جیسے دبنگ آدمی کی بھی مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے زیادہ بول سکے۔ ویسے بھی اس نے کثیر معاوضے کے عوض ان لوگوں کے لیے کام کرنے کا معاہدہ کر کے ایک طرح سے خود کو ان کی ملازمت میں دے دیا تھا اس لیے عادت کے برخلاف تابع داری تو کرنی ہی تھی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر اس آدمی کی ہدایات سننے لگا جس نے اسے اپنا نام تک بتانا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس شخص نے ایک فولڈر نکال کر درمیان میں رکھی میز پر پھیلا لیا تھا اور نقشہ دکھا کر اسے سمجھا رہا تھا کہ کس طرح سے کارخانے کے نیچے لیبارٹری کی تعمیر ہونی ہے۔ چودھری اس نقشے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ساتھ ہی اسے ان لوگوں کے وسیع وسائل کا اندازہ بھی ہو گیا تھا جنہوں نے اس کی مدد کے بغیر اس کے کارخانے کے ایک ایک انچ کے بارے میں نہ صرف معلومات حاصل کر لی تھیں بلکہ ایک نیا تعمیراتی نقشہ بھی بنوا کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''تمہیں اپنے آدمی کی مدد سے صرف تعمیراتی کام کروانا ہوگا۔ مشینوں اور حفاظتی آلات کی تنصیب کا کام میرے اپنے آدمی کریں گے۔ ہیروئن کی تیاری کے لیے کام کرنے والے ماہرین بھی ہم ہی بھجوائیں گے البتہ نچلا عملہ تمہیں خود بھرتی کرنا ہوگا۔ اس بات کا انتظام میں کر دوں گا کہ تمہیں ایک ایسے آدمی سے ملوا دوں جو کام کے افراد کی بھرتی میں تمہاری مدد کر سکے۔'' وہ پوری تیاری کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ چودھری خلافِ عادت اس کی ایک ایک ہدایت ذہن نشین کرتا رہا۔

''میں اپنی بات مکمل کر چکا ہوں۔ مزید ہدایات ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً تم تک پہنچتی رہیں گی۔ اگر تم کوئی سوال کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔'' فولڈر چودھری کی طرف کھسکا کر وہ خود سیدھا بیٹھ گیا اور صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔

''میں ضرورت پڑنے پر تم سے کہاں رابطہ کر سکوں گا اور یہ بھی بتا دو کہ تمہیں کس نام سے پکاروں؟'' چودھری نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

''فی الحال تمہیں مجھ سے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے تمہیں مکمل تیار پلان دیا ہے۔ تعمیر کے لیے رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دی جائے گی۔ اگر رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں خود تمہیں فون کر لوں گا۔ رہی نام کی بات تو ہمارے ہاں نام نہیں ہوتے، البتہ تم مجھے مسٹر الفا کے نام سے یاد رکھو۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ کوڈ نیم ہے اور کام چلانے کے لیے کافی ہے۔ ایک دوسرے کے اصل نام جاننا ہمارے لیے غیر ضروری ہے۔''

اس نے اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں جواب دیا جسے سن کر چودھری اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور ردِعمل میں خود بھی اسی کی طرح کا سرد لہجہ اپناتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے

ہماری ملاقات کا مقصد پورا ہو گیا ہے اور اب مزید کوئی بات باقی نہیں رہی ہے اس لیے اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک، اب تم یہاں سے جا سکتے ہو البتہ مس پامیلا کو رکنا ہوگا۔'' مسٹر الفا نے شانے اچکاتے ہوئے جو جواب دیا اسے سن کر چودھری کو زبردست جھٹکا لگا۔

''لیکن پامیلا میرے ساتھ آئی ہے اور اصولاً اسے میرے ساتھ ہی واپس جانا ہوگا۔'' فوری جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے احتجاج کیا۔

''ساتھ آنے والے ساتھ واپس جائیں، یہ کوئی اصول نہیں ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ دنیا میں ایک ساتھ آنے والے جڑواں افراد بھی کبھی ایک ساتھ دنیا سے واپس نہیں جاتے تو پھر تمہارا اور مس پامیلا کا اس اپارٹمنٹ سے ایک ساتھ واپس جانا کیا ضروری ہے؟ یہ یہاں سے میرے ساتھ بھی واپس جا سکتی ہے۔ مجھے اس سے کچھ اہم معاملات طے کرنے ہیں جن پر میں تمہاری موجودگی میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔'' وہ عجیب سلگانے والے انداز میں بولا تو چودھری کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ پڑ گیا۔

اس کی کیفیت محسوس کر کے لنڈا نے دخل اندازی کی اور نرمی سے اسے مخاطب کر کے بولی۔ ''چودھری صاحب! آپ واپس چلے جائیں۔ بعد میں کسی وقت میں خود آپ سے رابطہ کر لوں گی۔''

''اور تمہاری اس احتیاط کا کیا ہوگا؟ میں ویٹر سے کہہ کر آیا ہوں کہ ہم شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں اور واپس ہوٹل ہی آئیں گے۔'' لنڈا کو رکنے پر آمادہ دیکھ کر چودھری تنک کر بولا۔

''آپ یہاں سے سیدھے ہوٹل جانے کے بجائے راستے میں کسی پب پر اتر جائیے گا اور وہاں وقت گزار کر ہوٹل پہنچئے گا۔ اس سے ویٹر کو یہ تاثر ملے گا کہ ہم نے ہوٹل سے باہر ہی کہیں اپنے معاملات نمٹا لیے ہیں اور آپ اکیلے واپس آ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کسی کال گرل کو کوئی بھی ہمیشہ تو اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔'' لنڈا نے نرم لہجے میں اسے تدبیر بتائی۔

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں یاہری رک کر تمہارا انتظار کروں اور تم مسٹر الفا سے تنہائی میں بات کر کے مجھ سے آ ملو۔'' وہ کسی صورت لنڈا کو وہاں چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تم نے شاید میری بات غور سے نہیں سنی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ مس پامیلا میرے ساتھ یہاں سے جائے گی اور ظاہر ہے اس دوسری جگہ میں تمہیں اپنا نام چلاتا کر نہیں لے جاؤں گا۔ دوسری بات یہ کہ اپارٹمنٹ میں نے صرف ایک ہفتے کے لیے کرائے پر لیا تھا اور کچھ دیر میں مجھے اسے چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ اور تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ہمارے کام میں بحث مباحثے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تم بے شک لینڈ لارڈ ہو لیکن اب تنظیم میں شامل ہونے کے بعد تمہیں حکم سننے اور اسے بے چون و چرا تسلیم کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی ورنہ سخت نقصان میں رہو گے۔'' چودھری کی تجویز کا جواب لنڈا کے بجائے مسٹر الفا کی طرف سے آیا جو کہ خاصا سخت اور اہانت آمیز تھا۔ چودھری دانت کچکچا کر رہ گیا البتہ لنڈا نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی بھی ردِعمل کے اظہار سے منع کر کے بے دست و پا کر دیا تھا اس لیے اس بار اس کی زبان بند ہی رہی۔

''او کے چودھری صاحب تو پھر آپ روانہ ہوں۔ میں ابھی لندن میں ہی ہوں، آپ سے دوبارہ رابطہ کر لوں گی۔'' چودھری کو پسپا ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے اسے تسلی کے چند حروف بھی پکڑا دیے جنہیں سن کر وہ خاموشی سے باہر نکل گیا لیکن غصے اور مایوسی سے مزاج سخت بگڑا ہوا تھا۔ کچھ گھنٹوں قبل رات لنڈا کے قرب میں گزارنے کے خیال سے طبیعت میں جو سرشاری سی پیدا ہو گئی تھی، اب اسے کسی اور کی بانہوں میں جاتا دیکھ کر سخت تکدر میں بدل گئی تھی۔

☆☆☆

شہریار کی ہدایت پر مشاہرم خان مسلسل بالے کے گھر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسے اس شخص کا انتظار تھا جو بالے کی بیوی کے بیان کے مطابق کسی پیر سائیں کا نمائندہ یا مرید تھا اور جسے اس سے وہ پڑیاں وصول کرنے کے لیے آنا تھا۔ بالے کی بیوی شہزادی نے تازہ قبر کھود کر اس میں دفن بچے کی لاش کے بال کاٹ کر حاصل کر لیے تھے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی پکڑی گئی اور قریب تھا کہ گاؤں والے اسے اس جرم میں مار مار کر ہلاک ہی کر ڈالتے کہ بار بار یا کے موقع پر پہنچ کر مداخلت کرنے سے اس کی جان بخشی ہو گئی۔ اس قبیح فعل پر آمادہ نہ ہونے کے باوجود شہزادی کو صرف اور صرف اس لیے ہی یہ کام کرنا پڑا تھا کہ ہر ماں کی طرح اس کے لیے بھی اپنے بچوں کی جدائی برداشت کرنا ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی ساس اور شوہر بچوں کو لے کر کس جگہ گئے ہیں اور اس طریقے سے علاج کرنے کے دعوے دار پیر سائیں کہاں پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے شہریار نے مشاہرم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ جیسے ہی پیر سائیں کا ہرکارہ بڈیاں وصول کرنے وہاں پہنچے، اسے گرفت میں لے لیا جائے۔

مشابرم خان نے گھر کی نگرانی کے لیے باہر رہنے کے بجائے دیوار پھاند کر اندر جانا پسند کیا تھا۔ اگر وہ باہر کے گھر کے باہر کھڑا ہو کر نگرانی کرتا تو فوراً ہی نظر میں آ جاتا اور گاؤں والوں کے سوال و جواب کا سامنا کرنا پڑتا چنانچہ اس نے دیوار پھلانگ کر اندر ہی جانا پسند کیا لیکن کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ کوفت زدہ سا ایک کمرے میں بیٹھ گیا۔ اگر کوئی آتا تو یقیناً دروازے پر ہی دستک دیتا اور وہ بے خبری میں اسے آسانی سے چھاپ سکتا تھا۔

بیٹھے بیٹھے جب بہت ہی زیادہ بوریت ہونے لگی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا اور اس میں سامان بھی مختصر ہی تھا اس لیے وہاں جائزہ لینے کے لیے کچھ خاص نہیں تھا۔ وہ اکتا کر باہر صحن میں نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ صحن میں سے دھپ کی آواز سنائی دی۔ صاف محسوس ہوا تھا کہ کوئی دیوار پھلانگ کر اندر کودا ہے۔ وہ دم سادھ کر اپنی جگہ رک گیا اور دروازے کی جھری میں سے جھانک کر صحن کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں کا منظر اس کے سمی اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا تھا جو محتاط انداز میں اسی کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں وہ موجود تھا۔ لڑکے کی پیش قدمی دیکھ کر مشابرم خان تیزی سے دروازے کے بائیں جانب کی دیوار سے چپک گیا۔ اب اگر دروازہ کھولا جاتا تو اسے فوری طور پر دیکھا جانا ممکن نہیں تھا جبکہ وہ آنے والے کو بآسانی عقب سے دبوچ سکتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد سب کچھ اس کی سوچ کے مطابق ہی ہوا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا لڑکا جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، اس نے جھپٹ کر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ لڑکے کے لیے وہاں کسی کی موجودگی قطعی غیر متوقع تھی اس لیے وہ بری طرح بھڑکا لیکن مشابرم خان نے اس کا منہ پہلے ہی اپنی ہتھیلی کی مدد سے بند کر دیا تھا اس لیے سوائے معمولی سی غراہٹ کے کوئی آواز بلند نہ ہو سکی۔

''میرے پاس پستول ہے، اگر تم نے کوئی بھی غلط حرکت کی تو تمہاری کھوپڑی میں سوراخ بنا دوں گا۔'' مشابرم خان دھیمی آواز کے باوجود خوفناک لہجے میں غرایا جس کے جواب میں لڑکے نے تیزی سے اپنے سر کو دائیں بائیں نفی میں جنبش دیتے ہوئے کسی بھی قسم کی غلطی نہ کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ اس کی خوف سے ابلی ہوئی آنکھیں بھی اس بات کی تصدیق کر رہی تھیں کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ مشابرم خان نے اس کا حال دیکھ کر اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور اسے اپنے پستول کی زد میں لینا کافی سمجھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے لڑکے سے سوال کیا۔

''عثمان۔'' لڑکے نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' مشابرم خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''ادھر ہی گاؤں کا ہوں جی۔ آپ اے سی صاحب کے ڈرائیور ہو نا، میں آپ کو پہچانتا ہوں۔'' لڑکے نے اس کی شناخت بتا کر گویا اپنے گاؤں کے رہائشی ہونے کا یقین دلانا چاہا۔

''یہاں اس گھر میں اس طرح کیوں گھسے ہو؟'' ان لوگوں کے سامنے حالات جس طرح آئے تھے اس کی روشنی میں یہی اندازہ تھا کہ شہزادی سے بڈیاں وصول کرنے گاؤں کے باہر کا کوئی آدمی آئے گا لیکن یہ تو کوئی گاؤں کا ہی رہائشی تھا اس لیے مشابرم خان کے سوال میں حیرت کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

''بس جی، وہ متھا خراب ہو گیا تھا۔ بندہ بشر ہوں نا اس لیے لالچ میں آ کر مت ماری گئی۔'' لڑکے نے آنکھیں جھکا کر جواب دیا اور چہرے کے تاثرات سے بھی شرمندہ سا نظر آنے لگا۔

''صاف صاف جواب دو کہ ادھر کیا کر رہے تھے؟'' مشابرم خان نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''میں ادھر چوری کے ارادے سے آیا تھا جی۔ بالا اتنے عرصے چودھری صاحب کا خاص کارندہ رہا ہے، میرے دماغ میں تھا کہ اس کے گھر میں کچھ نہ کچھ قیمتی سامان تو ہوگا۔ اصل میں جی میری مالی حالت آج کل ذرا پتلی ہے تو ادھر گھر خالی دیکھ کر میں نے سوچا کہ کچھ چرا لوں لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ پہلے ہی ادھر موجود ہوں گے۔'' لڑکے نے جو کہانی سنائی اسے سن کر مشابرم خان ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یہاں کسی جعل ساز پیر سائیں کے مرید کو پکڑنے کے لیے بیٹھا تھا اور لالچ کے مارے اس نوجوان سے ملاقات ہو گئی تھی۔

''تمہیں ایسی حرکت کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔ ایک گاؤں میں رہنے والے لوگ تو ایک دوسرے کی جان و مال کے محافظ ہوتے ہیں اور تم موقع دیکھ کر یہاں لوٹ مار کرنے آ گھسے۔'' اس نے لڑکے کو لتاڑا۔

''معاف کر دو جی۔ تمہاڈی وڈی مہربانی ہوگی۔ میں نے بتایا نا کہ بس مجبوری کی وجہ سے دل میں لالچ آ گیا تھا۔ اب میں توبہ کرتا ہوں کہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔'' لڑکے نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر وعدہ کیا۔

''دوبارہ تم کیا کرو گے کیا نہیں، اس کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن ابھی تم نے میرے موڈ کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں یہاں ایک آدمی کا انتظار کر رہا تھا، اسے شہزادی سے ملنے کے لیے آنا تھا اور میرے خیال میں اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں وہ اب تک نہیں آیا۔'' مشابرم خان نے اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''اوہو۔۔۔ میرے خیال میں تو وہ آدمی آ کر واپس جا چکا ہے۔'' عثمان نامی لڑکا اس کی بات سن کر چونکا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟ کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟'' مشابرم خان نے عجلت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''میں اس سے ملا تھا۔ وہ کہیں باہر سے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے بھابالے کے گھر کا پتا پوچھا تھا اور اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس کا دوست ہے۔ میں نے سوچا بھابی جی مشکل میں ہے۔ اکیلی عورت ذات تھانے کچہری کے چکر کیسے کرے گی؟ پنڈ میں تو سب کے دل میں اس کے لیے اتنا غصہ ہے کہ اگر اے سی صاحب اور ان کی بیگم بیچ میں نہ پڑتے تو سارے مل کر اس کے ٹوٹے ٹوٹے کر ڈالتے۔ مجھے لگا کہ بھابالے کا دوست ان کے کام آ سکتا ہے اس لیے میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ پر وہ تو سن کر ایسا گھبرایا جیسے بھابی جی کی جگہ اسی کو سزا ملنے والی ہو۔ الٹے پیروں ہی واپس پلٹ گیا۔'' عثمان کی زبانی سارا قصہ سن کر مشابرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ نادانستگی میں مجرموں کے ایک ہرکارے کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر بیٹھا ہے۔ وہ اجنبی شخص جو بابالے کا پتا پوچھتا ہوا وہاں آیا تھا، یقیناً پیر سائیں کا بھیجا ہوا آدمی تھا جو شہزادی کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا سن کر سمجھ گیا کہ بازی الٹ چکی ہے اور اب کچھ بھی ہاتھ آنے والا نہیں بلکہ وہ گر زیادہ دیر گاؤں میں ٹھہرا تو خود بھی پھنس سکتا ہے اس لیے فوراً واپسی کی راہ اختیار کی۔

''یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟'' مبہم سی امید کے سہارے اس نے عثمان سے دریافت کیا۔

''تقریباً آدھا گھنٹا گزرا ہوگا۔''

''وہ آدمی اپنی سواری پر آیا تھا یا بس سے؟'' پیر آباد سے مختلف علاقوں کی طرف جانے والی گاڑیاں خاصے وقفے سے چلتی تھیں اس لیے اس نے اس امید پر کہ اگر وہ آدمی بس سے آیا تھا تو ممکن ہے ابھی یہاں سے نہ نکل سکا ہو، عثمان سے تفتیش کی۔

''میرے خیال سے بس سے ہی آیا تھا۔''

''چلو پھر بس اڈے چلتے ہیں۔ تم نے اس آدمی کو دیکھا ہوا ہے۔ اگر وہ اڈے پر موجود ہو تو تم پہچان کر مجھے بتا دینا۔'' مشابرم خان نے اس کا بازو تھام کر فوراً ہی باہر کا رخ کیا۔ اس وقت اس کے لیے سب سے اہم اس آدمی تک پہنچنا تھا اس لیے اس نے اس بات کو قطعی نظرانداز کر دیا تھا کہ عثمان وہاں چوری کی نیت سے آیا تھا۔ وہ دونوں تکنہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس اڈے تک پہنچے۔ اڈے پر ایک بس ابھی ابھی آ کر رکی تھی اور اس سے مسافر اتر رہے تھے۔ اس بس کے علاوہ وہاں دوسری کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اصل میں پیر آباد کا بس اڈا وہ روایتی بس اڈا نہیں تھا جہاں مسلسل کوئی نہ کوئی گاڑی موجود رہے۔ اس اڈے سے براہ راست کوئی بس چلتی بھی نہیں تھی بلکہ لاہور اور دوسرے شہروں تک آنے جانے والی بسیں اس طرف سے گزرتے ہوئے بس تھوڑی دیر کے لیے رکتی تھیں۔ اس مختصر وقت میں اگر کسی کو بس میں سوار ہونا ہوتا یا اس سے اترنا ہوتا تو یہ کام نمٹا لیا جاتا تھا ورنہ بعض اوقات تو بس بغیر رکے بھی گزر جاتی تھی۔ وہ دونوں بس اسٹاپ پر پہنچے تو انہیں بس سے اترنے والے مسافروں اور روزگار کے سلسلے میں مستقل اڈے پر بیٹھنے والوں کے سوا کوئی اور فرد نظر نہیں آیا جس سے یہی مطلب اخذ کیا جا سکتا تھا کہ مطلوبہ آدمی ان کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی کسی دوسری بس میں سوار ہو چکا ہے۔

مشابرم خان کف افسوس ملتے ہوئے اڈے پر بیٹھے ہوئے افراد کی طرف بڑھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ عثمان کی مدد سے پیر آباد کے گرد کا حلیہ بتا کر یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ اس حلیے کا آدمی کس روٹ کی بس میں سوار ہوا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ لمبے روٹ پر سفر کرنے والی ان بسوں کے مسافر راستے میں پڑنے والے قصبوں اور دیہاتوں میں بس رکوا کر بھی اتر جاتے ہیں لیکن کچھ نہ کر سکنے سے ممکنہ کوشش کر لینا بہتر تھا، ورنہ دوسری صورت میں اسے شہریار کے سامنے مکمل ناکامی کی خبر لے جاتے ہوئے شدید شرمندگی کا احساس ہوتا۔

''ڈبل ہے استاد۔'' وہ تین چار قدم ہی چلا تھا کہ اڈے پر چند لمحے قبل آنے والی بس کے کنڈیکٹر کی پکار سنائی دی۔ جس کا مطلب تھا کہ بس مسافروں کو اتارنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو رہی ہے۔ مشابرم خان نے یونہی بے ارادہ پلٹ کر بس کی طرف دیکھا تو اس کی نظر میں وہ آدمی آ گیا جو جانے اب تک کس کونے میں چھپا ہوا تھا اور اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوڑتا ہوا بس میں سوار ہونے کی کوشش میں تھا۔

''یہی ہے۔'' عثمان بھی اتنی دیر میں اس شخص کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسے دیکھتے ہی ہانک لگائی جسے سنتے ہی مشابرم خان کے پیروں میں پہیے لگ گئے۔ وہ برق رفتاری سے اس شخص کے پیچھے لپکا لیکن وہ بھی اپنی بچاؤ کی جدوجہد کر رہا تھا اس لیے اس کی رفتار بھی کچھ کم نہیں تھی۔ مشابرم خان کے دیکھتے دیکھتے وہ اچھل کر بس کے پائدان پر پیر رکھ چکا تھا۔ اسی لمحے بس حرکت میں آ گئی۔ مشابرم خان کے لیے یہ ایک فیصلہ کن گھڑی تھی اگر وہ پیچھے رہ جاتا تو اس شخص کو فرار کا موقع مل جاتا۔ اسے فرار ہونے سے روکنے کے لیے اس نے ایک لمبی جست لگائی اور بس کا ڈنڈا پکڑ کر پائدان پر کھڑے شخص کو پشت پر سے قمیص پکڑ کر کھینچتی بس سے گھسیٹ لیا۔ اس کی اس حرکت پر کئی لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ مشابرم خان کے کھینچنے کی وجہ سے وہ شخص نیم پختہ سڑک پر گر گیا تھا اور یقینی طور پر اسے کئی چوٹیں بھی آئی تھیں لیکن پھر بھی اس نے کوشش کی کہ خود کو مشابرم خان کی گرفت سے چھڑا کر بھاگ سکے مگر وہ اسے ایسا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اسے اپنے گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ اس ساری کارروائی میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ بس اڈے پر موجود لوگوں کے بھاگ کر ان تک پہنچنے تک مشابرم خان اس شخص کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کر چکا تھا۔

''چھوڑو یار! کیا کر رہے ہو تم؟ کیوں اس وچارے کو مار رہے ہو؟'' کئی افراد بولتے ہوئے ایک ساتھ بیچ بچاؤ کروانے کے لیے میدان میں اتر آئے۔ روانہ ہونے والی بس بھی ذرا سا آگے جا کر رک گئی تھی اور اس کے مسافر بھی اتر کر ان دونوں کے اطراف جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی جس کا فائدہ فرار ہوتے شخص کو پہنچ سکتا تھا اور وہ مشابرم خان کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا لیکن وہ اس بات کے لیے تیار نہیں تھا چنانچہ اپنا پستول نکال کر ہوا میں لہرایا اور تیز آواز میں بولا۔

''خبردار! اگر کسی نے درمیان میں آنے کی کوشش کی تو اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔'' لوگوں پر مزید دھاک بٹھانے کے لیے اس نے ایک ہوائی فائر بھی داغ دیا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس کے گرد جمع ہونے والا ہجوم ذرا فاصلے پر ہٹ گیا۔

''ارے یہ تو اے سی صاحب کا ڈرائیور ہے۔ یہ ایسی حرکت کیوں کر رہا ہے؟'' اس اثنا میں ہجوم میں سے کئی افراد نے اسے شناخت کر لیا تھا اور بلند آواز میں اظہارِ حیرت کرنے لگے تھے۔

''یہ آدمی اے سی صاحب کے بنگلے سے چوری کر کے بھاگا تھا۔ میں نے اس وقت بھی اسے دیکھا تھا لیکن پکڑ نہیں سکا تھا۔ آج دکھائی دیا تو پکڑ لیا۔ تم لوگ اس معاملے کے بیچ میں نہ پڑو، میں اسے اے سی صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ خود اس کا فیصلہ کر دیں گے۔'' اس نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو اس شخص کی حقیقت بتانے کے بجائے بہانہ تراشا۔ اگر وہ یہ بتا دیتا کہ یہ شخص اپنے پیر کے ایما پر شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے آیا ہے تو غم و غصے میں مبتلا وہ لوگ شاید اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیتے اور فی الحال اس شخص کا صحیح سلامت رہنا ضروری تھا تاکہ اس سے اس کے پیر کا صدود اربع معلوم کیا جا سکتا۔

''میں چور نہیں ہوں۔ میں تو ادھر کسی سے ملنے آیا تھا۔'' مشابرم خان کی گرفت میں موجود شخص نے اپنے بچاؤ کے لیے آواز بلند کی۔

''کس سے ملنے آئے تھے اس کا نام بتاؤ؟'' مشابرم خان نے اس کو گھورتے ہوئے بآوازِ بلند پوچھا تو وہ یک دم ہی چپ سادھ گیا۔ مشابرم خان کو خود بھی اندازہ تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں وہ کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکے گا کہ یہاں بابے کی بیوی سے ملنے کے لیے آیا تھا اور ظاہر ہے اس اجنبی گاؤں میں اس کا کوئی دوسرا شناسا بھی نہیں ہوگا کہ وہ اس کا نام لے سکے۔

''میں اسے اپنے ساتھ نور کوٹ لے جا رہا ہوں۔ وہاں اس کا فیصلہ اے سی صاحب خود کریں گے۔'' اس شخص کی خاموشی نے مشابرم خان کو خود بخود ہی یہ حق دے دیا کہ وہ حتمی فیصلہ سنا دے۔ اس بار وہاں موجود لوگوں میں سے بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ایک تو ویسے بھی مشابرم خان، شہریار کا ڈرائیور ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے شناسا اور قابلِ اعتبار تھا، دوسرے اس کے مقابل کی خاموشی نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

''ٹھیک ہے بھرا! تم اسے لے جاؤ۔ اے سی صاحب قانون کے مطابق کام کرنے والے آدمی نہیں ہوتے تو ان کے مجرم کو ہم خود بھی ٹھیک ٹھاک سبق دے سکتے تھے لیکن ہمیں علوم ہے کہ ہم نے اسے انگلی بھی لگائی تو اے سی صاحب ناراض ہوں گے اس لیے اس کا معاملہ ہم تم پر ہی چھوڑتے ہیں۔'' آخر ان میں سے ایک شخص نے وہاں موجود سب لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مشابرم خان کو یقین دہانی کروادی کہ اس کے کام میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔

''بہت بہت شکریہ کہ آپ لوگوں نے اس چور کے مقابلے میں میرا اعتبار کیا۔'' مشابرم خان نے ان سب کو مجموعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ اس لمحے اس کی توجہ بٹ گئی اور زیر ہو جانے والے حریف نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے یکدم ہی اس کے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہ حملہ اتنی اچانک تھا کہ مشابرم خان کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا اور ناک پر ایک زوردار مکا کھانے کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر مقابل کے ہاتھ میں چلا گیا۔

''اگر کوئی بیچ میں آیا یا میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں گولی چلا دوں گا۔ ابھی اس پستول میں پانچ گولیاں باقی ہیں۔ تم لوگوں کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے میں تم میں سے پانچ کی لاشیں گرا دوں گا۔'' کچھ دیر قبل چہرے پر مظلومیت طاری کیے کھڑے رہنے والا شخص یکدم ہی اپنے تیور بدل چکا تھا اور لوگوں کو دھمکا رہا تھا۔ گاؤں کے ان سیدھے سادے لوگوں کے لیے جن کی زندگی صرف دال روٹی کمانے کے چکر میں گزرتی تھی اور انہیں اس سے ہٹ کر ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی، ہتھیار ایک خوف ناک شے کا نام تھا جس کے مقابل آنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ غربت و افلاس کی چکی میں پسے ان لوگوں کے اندر اگر اس طرح کی کوئی جرأت ہوتی تو وہ دن رات چودھری کے مظالم نہ سہہ رہے ہوتے۔ چودھری آج تک طاقت کے بل پر ہی تو ان پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اگر ان میں جرأت ہوتی تو مقابلہ کرتے اور اپنے حقوق کے خود ہی محافظ بن جاتے لیکن ان کی بزدلی نے ان کے ساتھ ساتھ ان کی آنے والی نسلوں تک کے حقوق پامال کر دیے تھے۔ اب بھی وہ سب خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور وہ شخص پستول کے زور پر اتنے بڑے مجمع کو روکے رکھنے میں کامیاب ہو کر خود الٹے پیروں وہاں سے دور ہٹنے لگا۔

اس کی حرکت کی سمت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بس کی طرف جانا چاہتا ہے۔ شاید وہ اس بس سمیت یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ الٹے قدموں پیچھے کی طرف ہٹتے ہوئے اس نے مشابرم خان پر خاص نظر رکھی تھی جو کافی بے بس نظر آ رہا تھا۔ اس جیسے دلیر آدمی کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ پستول کی پروا کیے بغیر فرار ہوتے شخص پر حملہ کر دے لیکن اسے وہاں موجود دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔ اگر وہ شخص فائرنگ کر دیتا تو کئی بے گناہ زد میں آ جاتے۔ وہ بے بس اسے فرار ہوتا دیکھتا رہا لیکن یکدم ہی عجیب معاملہ ہوا۔ الٹے قدموں پیچھے ہٹتے شخص کو یکدم ہی ٹھوکر لگی اور وہ بری طرح پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ گرتے ہی اس کے ہاتھ سے پستول بھی نکل گیا۔ اصل میں ایک تو وہ الٹے قدموں چل رہا تھا، دوسرے اس نے اپنی ساری توجہ مشابرم خان اور ہجوم پر مبذول کر رکھی تھی اس لیے اچانک ہی اس بڑے پتھر کی زد میں آ کر الٹ گیا جو راستے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے گرتے ہی مشابرم خان چیتے کی سی پھرتی سے حرکت میں آیا اور اپنی جگہ سے جست لگا کر اسے چھاپ لیا۔ چھاپتے ہی اس نے اسے لاتوں اور گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ بے دردی سے پٹتا وہ شخص واویلا کرنے لگا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا جو اس سے ہمدردی کرتا۔ چند لمحوں میں کوئی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس شخص نے انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ اس وقت وہ اپنی دھمکی کا نتیجہ بھگت رہا تھا اور آنے والے وقت میں اسے

یک نہ شُد

ایک بہرا ایک دکان پر گیا اور ایک چیز کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ''کتنے کا ہے؟'' اتفاق سے دکان دار بھی بہرا تھا۔

اس نے کہا۔ ''پانچ کا۔''

گاہک نے کہا۔ ''میں یہ نہیں معلوم کر رہا ہوں کہ وہ کانچ کا ہے۔ قیمت بتاؤ؟''

دکان دار نے جھنجلا کر کہا۔ ''پانچ کا ہے پانچ کا۔''

گاہک بھڑک کر بولا۔ ''تین کا ہوگا پانچ کا نہیں ہو سکتا۔''

دکان دار نے غصے سے کہا۔ ''تین کا نہیں کانچ کا ہے۔''

پٹھان خان، پشاور

نشانہ باز

ایک ماہر نشانہ باز کے پاس ایک اخباری نمائندہ انٹرویو کرنے گیا۔ کمرے میں بہت سی آنکھیں بنی ہوئی تھیں اور ہر آنکھ پر صحیح نشانہ لگا تھا۔ اخباری نمائندے نے نشانوں سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔

''آخر آپ ایسا اچھا نشانہ کس طرح لگا لیتے ہیں؟''

''یہ کون سا مشکل کام ہے پہلے ہم نشانہ لگاتے ہیں اور پھر اس نشانے پر آنکھ بنا لیتے ہیں۔''

فیصل آباد سے ممتاز خان کا تعاون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک شقی القلب نامرد بہادر پیر کا گرگا ہونے کا مزہ چکھنا تھا۔

☆☆☆

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں گاؤں کے اندر جاتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ جلد از جلد واپس آسکوں لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ وقت لگ جائے گا۔ شفقت راؤ کے بہنوئی اور داماد کو مطمئن کیے بغیر میں انہیں اپنی مدد پر آمادہ نہیں کر سکوں گا اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے مجھے ان سے تفصیلی بات کرنی پڑے گی۔ تم بتاؤ تم یہاں اکیلی رکنے سے ڈرو گی تو نہیں؟" ابھی صبح نہیں ہوئی تھی اور آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ان تاروں کی مدھم روشنی میں ماہ بانو کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسلم نے اس سے پوچھا۔

"تم جاؤ، میری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالات کی سختیوں نے مجھے اتنا بہادر تو بنا ہی دیا ہے کہ کچھ وقت اس ویرانے میں تنہا رہ سکوں۔" ماہ بانو نے اسے تسلی دی۔ مسلسل سفر کی تھکان نے اس کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا لیکن اس وقت ایک انسانی آبادی کے قریب موجود ہونے کا احساس اتنا فرحت بخش تھا کہ وہ اپنے اندر ایک نیا حوصلہ اور امنگ محسوس کر رہی تھی۔ پہاڑی سلسلے میں اقتدار قائم ہوتے ہی والا شفقت راؤ ان کے لیے ایک نجات دہندہ ثابت ہوا تھا جس نے انہیں پہاڑی بھول بھلیوں سے نکلنے کی راہ دکھا دی تھی۔ اس کی راہنمائی کی وجہ سے وہ اس لائق ہو سکے تھے کہ اس وقت ایک گاؤں کے قریب موجود تھے۔

یہ شفقت راؤ کا گاؤں ہالی والا تھا جس کی راہ سجھاتے ہوئے اس نے اپنے خاندان والوں سے مدد مل جانے کی بھی امید دلائی تھی لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ ماہ بانو اپنے موجودہ حلیے میں گاؤں میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے ورنہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس لڑکی فوراً ہی سب کی نظروں میں آ جائے گی۔ اس نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک خاص حد پر پہنچنے کے بعد اسلم ماہ بانو کو وہیں چھوڑ کر خود گاؤں میں چلا جائے اور پھر اس کے بہنوئی تک پہنچ کر اسے شفقت راؤ کا حوالہ دے کر مدد کی درخواست کرے۔ اس کی تجویز معقول تھی اس لیے ان لوگوں نے اس پر عمل کرنا مناسب سمجھا تھا۔ شفقت راؤ سے الگ ہونے کے بعد وہ اس کی بتائی ہوئی نشانیوں کی مدد سے سفر کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گئے تھے اور یہاں سے آگے اسلم کو تنہا سفر کرنا تھا لیکن وہ ماہ بانو کو اس ویرانے میں چھوڑ کر جاتے ہوئے تذبذب کا بھی شکار تھا البتہ ماہ بانو اب کوئی عام لڑکی نہیں رہی تھی۔ مسلسل ہونے والے تجربات نے اسے عام لڑکیوں کے مقابلے میں کافی بہادر اور باہمت بنا دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار کرنے کے بجائے اسلم کو اپنی طرف سے بھرپور تسلی دے ڈالی۔

"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں لیکن تم ارد گرد سے ہوشیار رہنا۔ ہتھیار تمہارے پاس ہے۔ اگر کوئی مشکل سر پر آن پڑے تو اس کے استعمال میں جھجکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں جو بھی ہوگا، میں اس سے نمٹ لوں گا۔ بس تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔" اس کے لفظ لفظ سے ماہ بانو کے لیے محبت جھلک رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری ساری ہدایات یاد رکھوں گی لیکن اب تم جلدی سے روانہ ہو جاؤ۔ گاؤں دیہاتوں میں ویسے ہی اس پہر کھیتوں کے رکھوالے جاگ رہے ہوتے ہیں۔ کچھ دیر اور گزر گئی تو کھیتوں پر کام کرنے والے دوسرے لوگ بھی اپنے گھروں سے نکل آئیں گے اور تمہارا خاموشی سے شفقت راؤ کے داماد کے گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔" اس نے نرمی سے اسلم کو ٹوکا تو وہ آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ یہاں سے وہ ماہ بانو کو اسی صورت میں آگے لے جا سکتا تھا جب شفقت راؤ کے بہنوئی سے مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا کیونکہ وہی شخص اسے ماہ بانو کے لیے مقامی زنانہ لباس فراہم کر سکتا تھا۔ شفقت راؤ کے بہنوئی کا بھی عجیب معاملہ تھا۔ بہنوئی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اس کا کزن بھی تھا اور دوست بھی۔ ان رشتوں کے علاوہ اس سے اس کا ایک رشتہ بھی تھا۔ شفقت راؤ کی بیٹی کو اپنے بیٹے سے بیاہ کر وہ اس کا سمدھی بھی بن بیٹھا تھا لیکن رشتوں کی اس بھیڑ میں دوستی کا رشتہ سب سے نمایاں اور مضبوط تھا اور اسی رشتے پر بھروسا کرتے ہوئے اس نے اسلم کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کے بہنوئی کو ان تمام حالات و واقعات سے بھی آگاہ کر دے جن سے اس نے اسے مصلحتاً آگاہ نہیں کیا تھا۔

اسلم اسی مقصد کے لیے اس کے گھر جا رہا تھا۔ راستے یا گھر کے پتے کی اسے فکر نہیں تھی۔ ان دونوں چیزوں کے بارے میں بھی راؤ نے واضح نشانیاں سمجھا دی تھیں۔ وہ دونوں سفر کا پہلا مرحلہ بغیر بھٹکے طے کر لینے کے بعد خاصے پُراعتماد ہو گئے تھے اور امید تھی کہ دوسرے مرحلے میں قطعی نہیں بھٹکیں گے۔ ماہ بانو سے جدا ہو کر شفقت راؤ کے بہنوئی کے گھر جاتے ہوئے اسے وہ درد بھری داستان بھی یاد آ رہی جو راؤ شفقت نے اپنے بیٹے کی موت کے سلسلے میں سنائی تھی۔ اب وہ ایک ایسے گھرانے سے مدد مانگنے جا رہا تھا جہاں مرنے والے بدنصیب لڑکے صداقت کی ماں بھی موجود تھی اور بہن بھی۔ وہ لوگ اس کی مدد پر آمادہ ہوتے یا نہیں، اسے ان لوگوں سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ اس ماں سے ضرور ملے جو اپنے بیٹے کو کھو کر ہوش و حواس گنوا بیٹھی تھی۔ صداقت کی ماں کی اس بے تحاشا محبت نے اسے اپنی ماں کی یاد دلا دی تھی۔ وہ بھی تو اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کے حوالے سے ڈھیروں خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی۔ حالات کے جبر نے اسے کچھ اس طرح سے مجبور کیا کہ اس کی ماں کی آنکھوں میں سجے سارے خواب بکھر کر رہ گئے اور مایوس و دل گرفتہ ماں اس سے روٹھ گئی لیکن اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ روٹھنے کے باوجود اس کی ماں کا دل اس کے لیے تڑپتا ہوگا اور آنکھیں اسے دیکھنے کے لیے ترستی ہوں گی۔

اپنی اور صداقت کی ماں کی تڑپ اس کے لیے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ایک کا بیٹا منوں مٹی کے نیچے دفن ہو کر ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا تو دوسرا جرائم کی دلدل میں پھنس کر ماں کے سامنے جانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ لیکن اب ایک موہوم سی امید جاگی تھی۔ ماہ بانو وہ لڑکی تھی جس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اس دلدل سے باہر کھینچ لیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایک صاف ستھری زندگی شروع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی روٹھی ہوئی ماں کو بھی منا سکے گا۔ اس کی اصول پرست اور مذہبی ماں بے شک اس کے معافی مانگنے پر نہیں پسیجی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ ماہ بانو اسے منا لے گی۔ وہ اس کے لیے معافی کا در وا کروا دے گی اور وہ ایک بار پھر ماں کی محبت کی پناہوں میں بیٹھ سکے گا۔ اسے ماہ بانو کی اثر پذیری کا اندازہ تھا۔ اس لڑکی کو دلوں کے قفل کھولنے کا ہنر آتا تھا لیکن یہ سب ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اسی مقصد کے لیے وہ شفقت راؤ کے بہنوئی حامد راؤ کے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں نظر آنے والی نشانیوں سے ظاہر تھا کہ اس کے سفر کی سمت بالکل درست ہے۔ وہ بہت محتاط ہو کر چل رہا تھا اور اس کی پوری کوشش تھی کہ کھیتوں میں کام کرتے رکھوالوں میں سے کسی کی نظر میں نہ آئے۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے اسے اپنے مقصد میں آسانی مل رہی تھی۔ جہاں ذرا سا اندیشہ محسوس ہوتا وہ خود کو زمین پر گرا لیتا۔ بالآخر تقریباً بیس پچیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ دبیز چینٹ والے لوہے کے دروازے کے سامنے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک منزلہ مکان اچھا خاصا بڑا تھا اور اس کی پختہ تعمیر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مکین خاصے خوش حال ہیں۔ مکان کے سرسری سے جائزے کے بعد ہی یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ وہ بالکل صحیح جگہ پہنچا ہے، اس نے لوہے کے دروازے کی کنڈی بجا کر اندر والوں کو اپنی آمد سے باخبر کیا۔ اندر سے فوراً ہی ردعمل ظاہر ہوا۔

"کون ہے بھائی؟ آ رہا ہوں۔" قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی مردانہ آواز سنائی دی اور پھر بے دھڑک دروازہ کھول دیا گیا کہ شہروں کی طرح گاؤں کے اس مکان کے مکین کو اس پہر اپنے دروازے پر دستک سن کر یہ تشویش تو ضرور ہوئی ہوگی کہ اس کا کوئی پڑوسی مشکل میں نہ ہو لیکن یہ خدشہ نہ رہا ہوگا کہ کوئی لٹیرا یا ڈاکو اسے لوٹنے کے لیے آیا ہوگا۔

"میں حامد راؤ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" دروازہ کھول کر باہر آنے والا ایک جواں سال مرد تھا جو اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو پا کر حیران نظر آ رہا تھا۔ اس کی عمر دیکھ کر اسلم نے اندازہ لگا لیا کہ وہ حامد راؤ کا بیٹا اور شفقت کا داماد مقصود ہے لیکن شفقت راؤ نے اسے حامد سے مل کر حالات بیان کرنے اور مدد مانگنے کی ہدایت کی تھی اس لیے اس نے مقصود سے اپنا تعارف کروانے کے بجائے براہِ راست اس کے باپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"آپ اندر آ جائیں۔ اباجی تہجد پڑھ رہے تھے۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ فارغ ہو گئے ہیں تو آپ کے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟" مقصود کافی سعادت مند قسم کا برخوردار محسوس ہوتا تھا جس نے باپ کے ملاقاتی سے اس پہر ملاقات کا سبب دریافت کرنے کے بجائے عزت و احترام سے اندر لے جانا پسند کیا تھا۔

"میرا نام اسلم ہے لیکن تمہارے والد صاحب مجھے نام سے نہیں پہچانتے ہوں گے۔ میں ملاقات ہونے پر ہی ان سے اپنا تعارف کروا سکوں گا۔" اس نے جواب دیا جس پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر مقصود اسے ایک ڈرائنگ روم کی طرز پر سجے کمرے میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ یہاں بیٹھ کر اسلم کو چند منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور دروازے سے ایک باریش آدمی اندر داخل ہوا۔ اس آدمی کے چہرے میں شفقت راؤ کی ہلکی سی جھلک تھی لیکن وہ عمر میں اس سے چند سال بڑا معلوم ہوتا تھا۔

"السلام علیکم، میرے بیٹے نے مجھے بتایا کہ کوئی اجنبی آدمی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا مدد یا خدمت کر سکتا ہوں؟" شفقت راؤ کی طرح وہ بھی ستھرے لہجے میں ہی بات کر رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سب سے پہلے تو میں ناوقت آپ کو زحمت دینے پر معذرت چاہتا ہوں لیکن حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ مجھے آپ کو یہ تکلیف دینی پڑی۔" اسلم کے لہجے میں حقیقی شرمساری تھی۔

"ہمارے ہاں مہمان کو کبھی زحمت نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی اس کے آنے پر تکلیف محسوس کی جاتی ہے۔ ہم مہمان کو اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں اس لیے اس کی آمد پر ہمیشہ خوش ہوتے ہیں۔" حامد راؤ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"شکریہ حامد راؤ صاحب! مجھے آپ کے بارے میں شفقت راؤ صاحب نے ایسی ہی یقین دہانی کروائی تھی جب ہی میں یہاں اس وقت آنے کی ہمت کر سکا ہوں۔"

"اوہ! تو آپ کو شفقت نے میرے پاس بھیجا ہے۔ کیسا ہے وہ؟ اس کے جانے کے بعد ہم لوگوں نے بہت کوشش کی لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس نے اپنا موبائل بند کر رکھا تھا اور دفتر کے نمبر پر فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ وہاں پہنچا ہی نہیں۔ سب گھر والے اس کے لیے پریشان ہیں۔ آج میرا بیٹا مقصود اس کی خیر خبر لینے کے لیے جانے والا تھا۔" اس کی زبان سے شفقت راؤ کا نام سن کر حامد مضطرب ہوا تھا۔ اس کے اس انداز سے ظاہر تھا کہ شفقت راؤ کا اس کی دوستی پر مان یونہی نہیں ہے۔ وہ واقعی اس سے شدید محبت کرتا ہے جب ہی اتنا پریشان بھی نظر آ رہا ہے۔

"وہ ٹھیک ہیں لیکن ان کی تلاش میں مقصود کا شہر جانا بے کار ہوگا۔ وہ شہر میں موجود نہیں ہیں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ اسی پل مقصود کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے والد کو اطلاع دینے کے لیے گیا تھا تو ان کے ساتھ دوبارہ اندر نہیں آیا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے کو دیکھ کر سمجھ آ رہا تھا کہ وہ کس مقصد کے تحت رک گیا تھا۔

"چاچا جی شہر نہیں گئے تو پھر کہاں ہیں؟" ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے مقصود نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس کے لیے مجھے ذرا تفصیل سے سارے حالات بتانے ہوں گے۔" اس نے باری باری دونوں باپ بیٹے کی شکل دیکھی۔

"تو پھر بہتر ہے کہ پہلے تم کچھ کھا پی لو پھر ہمیں تفصیلات بتاؤ۔ تمہارے چہرے اور حلیے سے ظاہر ہے کہ تم بہت تھکے ہوئے اور بھوکے ہو۔" اس نازک موقع پر بھی حامد راؤ نے وضع داری کا دامن نہیں چھوڑا اور اس کی توجہ ٹرے کی طرف مبذول کرواتے ہوئے اسے کھانے کی دعوت دی۔

"آپ کا ہر اندازہ درست ہے لیکن میں اس وقت تک کچھ بھی نہیں کھا پی سکتا جب تک میری عزیز ترین ہستی بھی میرے ساتھ یہاں موجود نہ ہو اور اسے یہاں تک لانے کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" اس نے قطعیت کے ساتھ انکار کیا۔

"آپ بلاتکلف بتائیں کہ ہم کیسے آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟" اس کا جواب سن کر مقصود نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"میں کوشش کرتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ آپ کو حالات سے آگاہ کر دوں تاکہ آپ میری بات سمجھ سکیں۔" اس نے کہا اور پھر ان لوگوں کو اپنی اور شفقت راؤ کی ملاقات سے لے کر شفقت راؤ کے ڈیرے میں آگ لگنے تک سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

اپنے اور ماہ بانو کے بارے میں اس نے وہی کچھ بتایا تھا جو اس سے قبل شفقت کو بتا چکا تھا۔ وہ لوگ حیرت بھری پریشانی کے ساتھ سب کچھ سنتے چلے گئے۔ ظاہر ہے وہ گاؤں میں رہتے تھے اور آگ لگنے کا واقعہ ان کے علم میں بھی تھا لیکن اس حادثے کا ذمے دار شفقت راؤ ہے، یہ سن کر یقیناً انہیں شاک لگا تھا۔ اسلم ساری تفصیل سنا چکا تو حامد راؤ نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر بڑے وقار سے بولا۔ "ان سارے حالات پر ہم بعد میں غور و فکر کریں گے۔ بہتر ہے کہ سب سے پہلے تمہاری بیوی کو گھر لانے کا انتظام کیا جائے۔ تنہا عورت کا اتنی دیر تک ویرانے میں رہنا کسی طور مناسب نہیں۔" اس کا جملہ سن کر اسلم نے اپنے اندر ایک گہرا اطمینان سا اترتا ہوا محسوس کیا۔

"مقصود بیٹا! جاؤ جا کر اپنا کا کوئی جوڑا اور چادر لے آؤ۔ تمہاری بہن کو گھر لانے کا انتظام کرتے ہیں۔" وہ اپنا فیصلہ سنا کر فوراً ہی اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اپنے باپ کا حکم سن کر وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں وہ لوگ گھر سے باہر موجود تھے اور اس سمت میں جا رہے تھے جہاں وہ ماہ بانو کو چھوڑ کر آیا تھا۔ جب وہ لوگ اس مقام پر پہنچے تو صبح کا اجالا نمودار ہو چکا تھا اور منظر بہت واضح تھا لیکن اس منظر میں ماہ بانو کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسلم بے قراری سے اسے پکارتے ہوئے اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔

یہ پرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

غلط فہمی

محمد عفان آزاد

کسی بھی ملک کا استحکام معیشت پر ہوتا ہے... مضبوط معیشت... پائیدار ملک... لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بعض ممالک میں معاشی بحران سیلاب بلا کی صورت آیا... اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا... اسی تناظر میں بنی جانے والی کہانی... جہاں ہر شخص کا معاش داؤ پر لگا ہوا تھا...

چھوٹی سی غلط فہمی بڑے حادثات کا موجب بن جاتی ہے۔ ایک غلط فہمی کا دردناک خمیازہ

ڈیوڈ نکسن بچپن میں بھی اچھا بچہ کہلاتا تھا اور بڑے ہونے پر بھی نیک نامی اس کے حصے میں آئی تھی۔ اسی لیے جب یہ واقعہ ہوا تو اسے شدید حیرت ہوئی کہ یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیوں پیش آیا؟

وہ محنتی، ایماندار اور محنت کرنے والا انسان تھا۔ یہ اس کی سخت محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ مضافات دہلی کے ایک مہنگے علاقے میں پائی پائی کر کے ایک خوبصورت مکان میں رہتا تھا جس کے سامنے اس کے جیفورنیا اوک کے۔۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رویہ درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پورے شہر میں یہ سڑک انہی درختوں کی وجہ سے "شاہراہ بہار" کے نام سے مشہور تھی۔ لبِ سڑک واقع مکانوں کے مکینوں کو لوگ خوش قسمت کہتے تھے کہ انہیں ایسی خوب صورت جگہ پر رہنے کا موقع ملا ہے۔

وہ اپنے خاندان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کی بیٹی نے بیڈمنٹن کی ایک ٹیم بنائی ہوئی تھی اور ڈیوڈ ان کا کوچ تھا۔ وہ سردیوں میں اپنے دونوں بچوں اور بیوی کو ساتھ لے کر برف باری کا نظارہ کرنے نکل جاتا، جہاں وہ برف سے لطف اندوز ہوتے اور کئی دن وہاں گزار دیتے۔ موسم بہار میں وہ اپنے بیٹے کے ساتھ باقاعدگی سے مقامی گالف کلب جاتا تھا۔ اس کے بیٹے کو گالف پسند تھا اور وہ اسے کھیلنا سکھاتا تھا۔ جب بھی اس کی بیوی کی سالگرہ آتی، وہ اسے شان دار ڈنر کے لیے باہر لے جاتا اور چودہ قیراط سونے کا کوئی خوب صورت زیور اسے بطور تحفہ پیش کرتا تھا۔ اس نے بچپن سے لے کر ادھیڑ عمر تک بھی کسی کی کوئی چیز نہیں چرائی تھی۔ وہ ہمیشہ ایمان داری سے ٹیکس ادا کرتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ایسا کرنے کا سوچا۔ وہ ہمیشہ چست رہتا تھا اور اپنا کام نہایت انہماک سے کرتا تھا۔

اگرچہ ڈیوڈ ٹکسن میں اچھائیاں بہت تھیں لیکن چند ایک برائیاں بھی موجود تھیں لیکن یہ کوئی ایسی خامیاں نہیں تھیں جنہیں غیر معمولی کہا جاسکے۔ ایسی خامیاں تو تقریباً ہر مرد میں ہوا کرتی ہیں۔ راہ چلتی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اس کے دل میں پلٹ کر، دوبارہ اسے دیکھنے کی خواہش سر اٹھاتی تھی۔ کبھی کبھار کسی لڑکی کے پیچھے سیٹی بجانے کا بھی دل کرتا تھا۔ اس نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ کسی لڑکی یا عورت سے ایسے روابط قائم کرے جو معاشرے کی نظر میں معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ ویسے وہ پینتالیس سال کا ہونے کے باوجود اب تک وجیہہ نظر آتا تھا۔ اس کے ہم عمر لوگوں کے سر کے بال جھڑنا شروع ہو چکے تھے لیکن اس کے سیاہ بال اب تک گھنے تھے۔ کئی پُرکشش لڑکیوں نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھا۔ انہی خاصیتوں کی بنا پر ڈیوڈ کو ہر جگہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ملنے جلنے والے اس کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔

ڈیوڈ کے خاندان کی زندگی سکون سے گزر رہی تھی کہ اچانک حالات بدلنے لگے۔ اس میں ڈیوڈ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ افغانستان اور عراق کی جنگ میں الجھے واشنگٹن کے مالیاتی فیصلوں کے باعث امریکا پر بدترین معاشی بحران کے بادل چھانے لگے۔ مندی نے معیشت کو جکڑ لیا تھا۔ معاشی پنڈتوں نے پیش گوئی شروع کردی کہ بڑے پیمانے پر بے روزگاری پھیلے گی۔ روزانہ اخباروں میں خبریں آرہی تھیں کہ فلاں بڑی امریکی کمپنی نے مالی بحران کے باعث تین ہزار ملازمین کو فارغ کردیا۔ فلاں صنعت میں سے پانچ ہزار لوگ نکال دیے گئے۔ خدشہ ہے کہ اگلے ماہ امریکا میں کئی لاکھ افراد نوکری کی تلاش میں گھوم رہے ہوں گے۔ اس طرح کی خبروں نے ڈیوڈ اور اس کی بیوی کا سکھ چین بھی چھین لیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ بھی اس معاشی مندی کے بحران کی زد میں آسکتا ہے۔

ناشتے کی میز پر اخبار کا مطالعہ ڈیوڈ کی عادت بن چکا تھا۔ ملک کی بدترین معاشی صورتِ حال کے باعث اخبار میں جو خبریں شائع ہورہی تھیں، اس سے اس کی پریشانی اور بھی بڑھتی جارہی تھی۔ پورا دن فکر میں گزرتا تھا۔ اس کے بچے چھوٹے تھے۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ اگر وہ بے روزگار ہوگیا تو کیا کرے گا؟ اس کا گھر، گاڑی اور کئی دوسری چیزیں بینک سے قرض لے کر خریدی گئی تھیں۔ اگرچہ بینک کے قرض کی ادائیگی اقساط میں ہورہی تھی اور ادائیگی موجودہ حالات میں اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی لیکن وہ خوف زدہ تھا کہ اگر ملازمت نہ رہی تو وہ بہت زیادہ دنوں تک بے روزگاری کا مقابلہ نہیں کرپائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ یک دم پُرتعیش گھر سے سڑک پر آجائے گا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ اخبار پڑھنا ہی بند کردے لیکن وہ حقیقت پسند شخص تھا۔ جانتا تھا کہ خطرے کو سامنے پاکر آنکھیں بند کرلینے سے آفت ٹل نہیں جاتی۔ امریکا کے معاشی بحران نے اس کی ذاتی زندگی کو اُتھل پتھل کرکے رکھ دیا تھا۔ ان دنوں وہ بدترین نفسیاتی اور اعصابی دباؤ کا شکار تھا۔ ویسے بے روزگاری کا تصور ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ جب سے اس نے عملی زندگی کا آغاز کیا، تب سے لے کر اب تک وہ ایک دن کے لیے بھی بے روزگار نہیں رہا تھا۔ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ بے روزگاری کیا ہوتی ہے اور اپنے ساتھ ساتھ کیا کچھ بھیانک چیزیں...... لے کر آتی ہے۔

وہ دن اس کی زندگی کے خاصے پریشان کن تھے۔ پہلی بار اسے بے روزگار ہونے کا خدشہ تھا۔ اس کے لیے یہ بات بڑی افسردہ کرنے والی تھی کہ اگر وہ بے روزگار ہوا تو اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں ہوگا۔ ملازمت سے برطرفی اس کی کوتاہیوں یا نکمے پن کا نتیجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو ایسا تھا [illegible]۔ اسے تو ان لوگوں کے کیے دھرے کی سزا بھگتنی تھی

جن کے فیصلوں نے اس جیسے لاکھوں کروڑوں لوگوں کی پُرسکون زندگیوں کو اچانک طوفانِ بلاخیز سے دوچار کردیا تھا۔

اُس روز بھی وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوکر ناشتے کی میز پر اخبار ہاتھ میں تھامے بیٹھ گیا۔ "اخبار چھوڑو، پہلے ناشتا کرلو۔" کافی دیر تک جب وہ اخبار میں الجھا رہا تو اس کی خوب صورت بیوی لینا نے اس کے ہاتھ سے اخبار چھینتے ہوئے کہا۔ "ناشتا ٹھنڈا ہورہا ہے۔ کیا اچھی خبر ہوگی اخبار میں۔ کیوں پڑھ پڑھ کر ہلکان کررہے ہو اپنے آپ کو۔" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پیار سے کہا۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی صورتِ حال سے پریشان ہے لیکن اظہار کرکے شوہر کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ اسے ممکنہ خطرے کا اندازہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے بچوں کا مستقبل خطرے کی زد پر ہے۔ "جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ بس تم ناشتا کرو اور دفتر جاؤ۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"یہ حالت تو میری بھی ہے۔ سچ پوچھو تو میری جان بھی سولی پر لٹکی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔" لینا نے اداسی سے کہا۔ اس کے لہجے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔

"میری چھٹی حس خبردار کررہی ہے کہ کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔" ڈیوڈ نے ہاتھ بڑھا کر انڈے کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں تو سوچ رہی ہوں کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ہم کیا کریں گے؟ اس وقت تو حالات بھی ایسے نہیں ہیں کہ دوسری نوکری مل جائے۔" لینا نے کہا۔

"جمعرات کو مجھے ٹن گن ملی تھی کہ انتظامیہ نے کمپنی کو معاشی بحران سے بچانے کے لیے بڑی تعداد میں ملازمین کو نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔" ڈیوڈ نے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ انتظامیہ نے ہیومن ریسورس اور دیگر انتظامی افسران کو ہفتہ اور اتوار کو بھی دفتر میں آنے کا حکم دیا تھا۔ بس ٹھیک ہو۔" ڈیوڈ نے مرے مرے لہجے میں اسے بتایا۔ اس دن پیر تھا اور وہ ہفتہ وار تعطیلات کے بعد پہلے دن دفتر جانے والا تھا۔

"مجھے تو بچوں کی فکر ہے۔" لینا نے افسردگی سے کہا۔

ناشتے کے دوران میں وہ دونوں اسی موضوع پر بات کرتے رہے کہ اگر اس کی ملازمت ختم کردی گئی تو بے روزگاری کا کتنے عرصے تک مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ڈیوڈ کو بھی یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایسا وقت بھی آسکتا ہے اسی لیے اس نے ان سے نمٹنے کی کوئی منصوبہ بندی بھی نہیں کی تھی۔ اب جو اچانک اُفتاد سر پر پڑنے کا خطرہ سامنے آیا تو انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پل بھر میں آسمان سے زمین پر دھڑام سے گر پڑیں گے۔ آج صبح سے ہی ڈیوڈ کی چھٹی حس اسے کسی انجانے خطرے سے آگاہ کررہی تھی۔ وہ سخت ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔ اس نے نہایت بے دلی سے ناشتا کیا اور دفتر چلا آیا۔

اُس دن دفتر آنے کے بعد جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا، وہ اس کا قطعی مستحق نہیں تھا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شان دار تھا۔ بیس سالہ عرصۂ ملازمت میں اس نے مختلف بڑے بڑے اداروں میں کام کیا تھا۔ وہ جہاں بھی رہا، وہاں اُس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ وہ ایسا نکما شخص نہیں تھا کہ جسے مندی کی آڑ لے کر ملازمت سے فارغ کردیا جاتا۔ جس کمپنی میں وہ اب تھا، یہاں اس نے سات سال خدمات انجام دی تھیں اور اس طویل عرصے میں ایک بار بھی کسی نے اس کے کام پر انگلی نہیں اٹھائی تھی لیکن شاید یہ تقدیر کا لکھا تھا۔ اسے ان غیر معمولی حالات میں اُن چیزوں کا سامنا کرنا پڑا جن کا عام حالات میں وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

سوا دس بج رہے تھے، جب ہیومن ریسورس منیجر اس کے کمرے میں آیا۔ اس وقت وہ ایک ریسرچ پروجیکٹ پر کام کررہا تھا۔ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" منیجر نے شیشے کے دروازے پر انگلی سے دستک دی۔ ڈیوڈ نے اسے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔

"مجھے افسوس ہے مگر یہ انتظامیہ کا فیصلہ ہے۔" اس نے ایک سفید لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" ڈیوڈ نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"آپ کو فوری طور پر ملازمت سے فارغ کردیا گیا ہے۔" منیجر نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔ "اس میں برطرفی کا لیٹر ہے۔ دو دن بعد تمہارے واجبات بینک اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کردیے جائیں گے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ "آپ کو آدھے گھنٹے میں دفتر چھوڑ دینا چاہیے۔" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

منیجر اس کے اوپر بم گرا گیا تھا۔ اسے خطرے کا اندیشہ تو تھا لیکن پھر بھی وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ ہوسکتا ہے ایسا نہ ہو جیسا کہ وہ سوچ رہا ہے... لیکن وہ کچھ ہوگیا جو اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے لاکھوں لوگوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ امریکا کے مالیاتی بحران کا شکار بننے والا وہ پہلا یا آخری شخص نہیں تھا۔

صبح کے گیارہ بجے وہ مرے مرے قدموں سے اپنے دفتر سے باہر نکلا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھام رکھا تھا۔ اس میں ذاتی استعمال کی وہ اشیا تھیں جو اس نے دفتر میں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کسی سے نہیں ملا۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ برطرف کیے جانے کی شرمندگی لیے کسی اور سے مل سکتا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی کمپنی کی شان دار عمارت کے باہر پارکنگ میں کھڑا ہوا عمارت کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس معاشی بحران نے صرف اس کی نوکری ہڑپ نہیں کی تھی بلکہ اس کے پورے خاندان کے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

جس خطرے کے باعث وہ کئی ہفتوں سے پریشان تھا، وہ اب اس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو شاید اسے زیادہ فکر نہیں ہوتی لیکن وہ اپنے خاندان سے ٹوٹ کر محبت کرنے والا انسان تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے خاندان کو ہر ممکن عیش و آرام دینے کی کوشش کی تھی۔ "لیکن اب کیا ہوگا؟" رہ رہ کر یہ سوال اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ وہ سخت ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا کچھ پیش آسکتا ہے۔ وہ آنے والے دنوں میں پیش آنے والے ممکنہ حالات کا سوچ سوچ کر گھبرا رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبے جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ فون نکال کر لینا کو اس بات کی اطلاع دے لیکن پھر یہ سوچ کر فون کرنے سے باز رہا کہ بے روزگار ہو جانا کوئی خوش خبری نہیں کہ فوراً فون کر کے بیوی کو اس بات کی اطلاع دی جائے۔

وہ کافی دیر تک پارکنگ میں کھڑا اس عمارت کو تکتا رہا جس میں آدھ گھنٹے پہلے تک اس کا دفتر واقع تھا لیکن اب اسے نکال دیا گیا تھا۔ سات سال کی ملازمت کے دوران میں اسے اس عمارت سے اُنسیت ہو گئی تھی۔ آخر کافی دیر بعد اس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا جب لینا اسے بے وقت گھر میں داخل ہوتے دیکھے گی تو خود ہی سمجھ جائے گی کہ کیا حادثہ پیش آچکا ہے۔ ویسے بھی وہ اپنے اندر اتنی ہمت جمع نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ بری خبر خود اسے سنا سکے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ مندی کے اس شدید طوفان اور امریکا کے بدترین معاشی بحران میں وہ کیا کچھ ممکنہ طور پر کھو سکتا ہے۔ سب سے بڑا ڈر اسے نوکری کھو دینے کا تھا۔ وہ ڈر دور ہو چکا تھا۔ اب وہ سوچ میں غرق تھا کہ اور کیا کچھ اس کی زندگی سے دور جا سکتا ہے۔ گاڑی اور مکان بینک سے قرض لے کر خریدے گئے تھے۔ یہ بھی جا سکتے ہیں۔ موبائل فون، کیبل ٹی وی، پرسکون زندگی، باہر ڈنر کرنا، گرمی سردی کی تعطیلات پرفضا مقام پر گزارنا، گالف کلب کی رکنیت۔۔۔ یہ سب چیزیں اس کی زندگی سے دور جا سکتی ہیں لیکن ان سب سے بڑھ کر اس کا خاندان تھا۔ کیا لینا اسے چھوڑ کر چلی جائے گی؟ کیا اس کے پیارے بچے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے دور چلے جائیں گے؟ یک دم اسے امریکا کے مادہ پرست معاشرے سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب تک اس کی زندگی جس محور پر گھوم رہی تھی، وہ نوکری اور پرکشش تنخواہ کی وہ مقناطیسی کشش تھی جو اب ختم ہو گئی تھی۔ مادیت کے لٹو پر گھومتی امریکی معاشرے میں اس کی زندگی کا وہ شیرازہ اب شاید بکھرنے والا تھا جس کی بنیاد پر وہ اب تک خود کو خوش و خرم اور کامیاب انسان سمجھتا تھا۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اچانک اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور پاؤں کا پورا زور ایکسیلریٹر پر ڈال دیا۔ گاڑی کے پہیے چرچرائے اور وہ نہایت تیز رفتاری سے پارکنگ ایریا سے نکلتا ہوا سڑک پر آگیا۔ اس وقت سڑک پر خاصا رش تھا۔ اس نے گھر جانے کا ارادہ بدل دیا۔ وہ سخت پریشان تھا اور اب کسی بار میں بیٹھ کر کچھ وقت سکون سے گزارنا چاہتا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر کار کو سڑک پر دوڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اسٹینفورڈ یونیورسٹی روڈ کو کراس کر لیا۔ اس کی گاڑی اب بھی نہیں رکی۔ وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اب اس کا رخ ایسٹ پالو کی طرف تھا۔ یہ مضافاتی علاقہ تھا جہاں کم آمدنی والے لوگوں کے اپارٹمنٹس تھے۔ یہ علاقہ مجرمانہ سرگرمیوں کے حوالے سے بھی خاصا بدنام تھا۔ اگر وہ بے روزگار نہ ہوتا تو شاید یہاں آنے کا سوچتا بھی نہیں لیکن اس وقت وہ بدترین حالات کا تازہ تازہ شکار بنا تھا۔ اس کی حالت ماہی بے آب کی طرح تھی۔ اسے پب اور بار میں جانے کی عادت نہیں تھی لیکن اس وقت اس کے دل میں شدت سے خواہش مچل رہی تھی کہ وہ کسی بار میں بیٹھ کر خود کو نشے میں غرق کر کے اس صورت حال سے وقتی طور پر ہی سہی لیکن چھٹکارا حاصل کر لے۔ اسے یقین تھا کہ ایسٹ پالو میں اسے ایسی جگہ مل جائے گی۔ ویسے بھی اس علاقے میں منشیات فروشی کے اڈے بھی تھے اور گھٹیا بار بھی۔ اس وقت اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ بس وہ حالات سے فرار چاہتا تھا۔

عام حالات میں ڈیوڈ نہایت محتاط ڈرائیونگ کا قائل تھا لیکن اس وقت وہ غیر معمولی ذہنی صدمے سے دوچار تھا۔ وہ نہایت تیز رفتاری سے غیر ذمے دارانہ انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔ منتشر ذہنی حالت کے باعث کئی بار اس کی گاڑی دوسری گاڑیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ معاشی بحران کب تک جاری رہ سکتا ہے؟ اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ فوری طور پر حالات بدلنے والے نہیں لیکن پھر بھی اچانک اس کے دماغ نے پلٹا کھایا اور موہوم سی امید کا ایک چراغ جل اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ فی الوقت جو حالات ہیں، ان میں اس کی قابلیت کے مطابق معیاری ملازمت کا فوری طور پر ملنا محال تھا مگر پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ کب تک وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار رہ سکتا ہے۔ ایک ہفتہ، ایک ماہ یا ایک سال۔۔۔ وہ مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اپنے پرانے ساتھیوں سے رابطہ کرے۔ جان پہچان کے لوگوں سے ذکر کرے۔ ممکن ہے کہ تعلقات کے بل بوتے پر اسے مطلب کی کوئی ملازمت مل جائے لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔

وہ حقیقت پسند تھا۔ جانتا تھا کہ گزشتہ کئی عشروں کی غلط مالی پالیسیوں کے نتیجے میں جو معاشی بحران پیدا ہوا ہے، وہ اتنی جلدی ٹلنے والا نہیں۔ اسے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ مناسب وقت کب آئے گا، وہ اس بارے میں نہیں جانتا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر بھی بدستور پریشان تھا کہ کیا سازگار وقت کے آنے تک اس کے خاندان کی زندگی کی گاڑی اسی ڈھرے پر چلتی رہے گی جس پر آج صبح تک چلتی چلی آرہی تھی؟ اسے یقین تھا کہ شاید ایسا نہیں ہوگا۔ جیسے ہی یہ بات اس کے ذہن میں آئی، اس نے ایک بار پھر ایکسیلریٹر پر پیروں کا دباؤ بڑھا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایسٹ پالو کی مرکزی سڑک پر واقع ایک بار کے سامنے پارکنگ ایریا میں گاڑی روک رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ اس سڑک پر گھٹیا قسم کے کئی بار تھے۔ ادھر ادھر بے فکرے نوجوان ٹولیوں کی شکل میں گھوم رہے تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کس قسم کے ماحول میں پہنچ چکا ہے۔ گاڑی سے باہر نکل کر وہ چند لمحے تک کھڑا ہو کر اردگرد کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس نے سر جھٹک کر گویا اپنی پریشانیوں سے پیچھا چھڑانا چاہا اور سڑک پر واقع ایک بار کی طرف بڑھ گیا۔

بار کے اندر داخل ہو کر اس نے اپنا دھوپ کا چشمہ اتارا۔ شرٹ کا اوپری بٹن کھول کر دھوپ کا چشمہ اس میں

احساسِ کمتری

نئے نئے دولت مند ہونے والے ایک صاحب کی بیگم ایک سرجن کے پاس پہنچیں اور بولیں۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا آپریشن کر دیجیے۔"

"مگر کس چیز کا آپریشن؟" سرجن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کسی بھی چیز کا۔" خاتون نے بے پروائی سے کہا۔ "دراصل میرا ابھی کسی مرض کے سلسلے میں آپریشن نہیں ہوا۔ اس کی وجہ سے مجھے بیگمات کے درمیان بیٹھ کر بات چیت کرنے میں مشکل پیش آتی ہے اور احساسِ کمتری ہونے لگتا ہے۔"

اسکردو سے کلثوم باور کی خواہش

اٹکایا اور ایک خالی میز کی طرف بڑھنے لگا۔ اندر کا ماحول نیم تاریک تھا۔ اس وقت وہاں دو چار لوگ ہی موجود تھے۔ ویسے بھی اس طرح کے علاقوں کے ایسے گھٹیا بار کی رونقیں رات ڈھلے شروع ہوتی ہیں اور صبح تک عروج پر رہتی ہیں۔ یہ وقت ویسے بھی بار کے لیے مندی کا وقت ہوتا ہے۔ اکثر بار ٹینڈر لڑکیاں اس وقت فارغ بیٹھی اونگھتی رہتی ہیں۔

"بہت خوب۔" اس نے ایک میز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اوک بار کی خاموشی اسے پسند آئی تھی۔ وہ کسی ایسی ہی خاموش جگہ پر وقت گزارنا چاہتا تھا۔

"کیا لیں گے؟" اسے بیٹھے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ ایک بڑی عمر کی عورت اس کے قریب آکر پوچھنے لگی۔ اس نے شارٹ اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔

"لیمن سوڈا۔" اسے پیاس لگ رہی تھی۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے حلق کو تر کرنا چاہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کے لیے گلاس بھر کر لے آئی۔ گلاس کے ایک کونے پر لیمو۔۔۔ کا ٹکڑا بھی اٹکا ہوا تھا۔ اس نے گلاس تھامتے ہوئے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

وہ ایک فربہ عورت تھی۔ اس کے ہاتھ اور انگلیاں خاصی موٹی تھیں۔ گلاس تھامتے ہوئے ڈیوڈ کو اس صحت مند خاتون کے صحت مند ہاتھوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہاتھوں کے مقابلے میں اس کا باقی جسم اتنا زیادہ فربہ نہیں تھا۔ اس نے سر کے گھنے لیکن شانے تک آتے ہوئے چھوٹے بالوں کو پیچھے کی طرف کر کے کس کے باندھا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی چوڑی پیشانی خاصی نمایاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی رنگت کو برقرار رکھنے اور چہرے کو جھریوں سے بچانے کے لیے مختلف قسم کے کاسمیٹک تجربات کرتی رہتی ہے۔ وہ قدرے پستہ قد تھی اور اس کے کندھے خاصے چوڑے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کاؤنٹر کے قریب والی میز پر بیٹھ گیا۔ وہ عورت کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھی۔

"پلیز! ایک گلاس اور...." یہ سن کر وہ گلاس بنانے لگی۔ اسی دوران میں ایک شخص نے سینڈی کہا تو اس عورت نے فوراً پوچھا کیا ہے۔ ڈیوڈ سمجھ گیا کہ سینڈی اس کا ہی نام ہے۔

"سینڈی! ایک اور گلاس...." تھوڑی دیر بعد ڈیوڈ نے ذرا اونچی آواز میں اس کا نام لیتے ہوئے کہا۔ وہ گلاس بنانے لگی۔ اس نے کاؤنٹر کے نیچے سے ایک لیمو... اور چھری نکالی۔ اس نے نہایت صفائی سے لیمو کے چار ٹکڑے کیے۔ جس تیزی سے اس نے چھری چلائی اور لیمو... کاٹا تو اس سے ڈیوڈ اندازہ لگا چکا تھا کہ چھری کی دھار غیر معمولی طور پر تیز ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ گلاس اس کے سامنے میز پر رکھ رہی تھی۔ "پانچ ڈالر۔" اس نے گلاس رکھ کر ڈیوڈ کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے بل کا تقاضا کیا۔ وہ بٹوا کھول کر رقم نکالنے لگا۔ اسے جھٹکا لگا۔ بٹوے میں نقدی نہیں تھی۔ تب اسے یاد آیا کہ اسے اے ٹی ایم سے پیسے بھی نکلوانے تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ مسکرا دیا۔

"یہ لیجیے...." اس نے کریڈٹ کارڈ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" وہ مسکراتے ہوئے واپس چل دی اور ڈیوڈ گلاس سے گھونٹ بھرنے لگا۔ سینڈی غضب کی قیافہ شناس تھی۔ اس نے پہلا بل وصول کیا تھا لیکن وہ بھانپ گئی تھی کہ یہ شخص پریشان حال لگتا ہے۔ اس نے پانچ ڈالر کا پہلا بل ادا تو کر دیا ہے لیکن اسے امید تھی کہ یہ آخری نہیں ہے۔ دوپہر کا وقت دھندے میں مندی کا ہوتا ہے لیکن اسے یقین تھا کہ آج ایسا نہیں ہوگا۔

ڈیوڈ زندگی کے ہر معاملے میں میانہ روی اور شائستگی کا قائل تھا لیکن صبح صبح اسے جس اُفتاد کا سامنا کرنا پڑا تھا اس نے اس کے حواس معطل کر کے رکھ دیے تھے۔ وہ عادی شرابی نہیں تھا لیکن آج تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ ایک کے بعد ایک گلاس.... وہ جس طرح پیتا جا رہا تھا وہ سینڈی کے لیے تشویش کا باعث تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ شخص نہایت شدید صدمے سے دوچار ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ ڈیوڈ پر سکون [illegible]

احساس ہونے لگا۔ اس کا دماغ ہوا کی طرح ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ یہاں سے نکل کر اسے گھر جانا ہے۔ اس نے آستین کے بٹن کھول لیے، کف اوپر چڑھائے اور گہری سانس لی۔ اسے کمرے میں گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ وہ اپنے پھیپھڑوں کو تازہ آکسیجن سے بھر لینا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک پوری بوتل منگوائی۔ وہ گلاس بھر رہا تھا کہ اچانک بار کا دروازہ کھلا۔ اس کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ بار کی دیوار پر جگہ جگہ بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے۔ سورج کی تیز روشنی لمحہ بھر کے لیے کمرے میں لگے آئینوں سے منعکس ہو کر اس کی آنکھوں سے ٹکرائی۔ وہ کسمسا کر رہ گیا۔ آنکھوں پر پڑنے والی سورج کی روشنی سے اسے شدید چبھن کا احساس ہوا۔ اگرچہ وہ نشے میں تھا لیکن جب آنکھوں نے چندھیانا بند کیا اور سامنے نظر پڑی تو لمحہ بھر کے اندر اس کا دماغ ایک بار پھر کام کرنے لگا۔

بار کے اندر ایک نوجوان عورت داخل ہو رہی تھی۔ کمرے میں چھائی خاموشی میں اس کی اونچی ہیل والی سینڈلوں کی نکیلی ایڑیاں کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ دراز قد کی بھورے بالوں والی ایک دلکش لڑکی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی تنگ جینز اور میرون کلر کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا تھا۔ جینز کے پائنچے اس نے پنڈلیوں تک پلٹ رکھے تھے۔ لڑکی نے بہت زیادہ پرفیوم لگا رکھا تھا۔ پورے کمرے میں ہلکی ہلکی خوشبو مہک رہی تھی۔ اس کا چہرہ دلکش ضرور تھا لیکن اس نے خاصا گہرا لیکن کسی حد تک بھونڈا میک اپ کر کے خود اپنے ہاتھوں چہرے کی دلکشی ماند کر دی تھی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کمرے کے وسط میں کھڑی تھی اور نہایت عامیانہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ اس کی میز کے قریب آئی۔ "کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" اس نے کرسی پکڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔" ڈیوڈ کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے اشارہ کر کے اس کے لیے بھی ایک گلاس منگوا لیا۔

"شکریہ۔" اس نے کرسی کھینچی اور چہرہ اس کے منہ کے قریب کرتے ہوئے بولی۔ تھوڑی دیر بعد سینڈی اس کے سامنے گلاس اور بھنی ہوئی مونگ پھلی سے بھرا ہوا ایک چھوٹا سا پیالہ رکھ رہی تھی۔ اجنبی عورت کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے مونگ پھلی کا دانہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ چبانا شروع کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی تنہا پرندہ ہے [illegible] چگ رہی ہے۔ اس کے انداز سے

بے فکری اور فراغت جھلک رہی تھی۔ ڈیوڈ نشے میں تھا لیکن اس کے باوجود اس نے نہایت سلیقے سے ایک دانہ اٹھایا اور منہ میں ڈال کر اس اجنبی عورت کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ اچانک اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے میز پر سر ٹکا دیا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنی پیشانی پر کسی نازک سی انگلی کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ڈیوڈ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"دیکھنے میں تو تم نہایت عقل مند اور معقول آدمی لگتے ہو مگر تم اس بھری دوپہر میں یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے مسکرا کر شوخ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر نہایت آرام سے کہنے لگی۔ "تمہارا حلیہ دیکھ کر لگتا ہے کہ اس وقت تمہیں اپنے دفتر میں ہونا چاہیے تھا یا پھر گھر میں۔"

"پلیز! مجھے تنہا چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک گھونٹ بھرا۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس کی زبان پھسل گئی ہو۔

"بہت زیادہ پریشان ہو؟" اس کا منہ بنتا دیکھ کر لڑکی نے کہا۔ اس کے لہجے سے لگاوٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کچھ ایسا ہی ہے۔" ڈیوڈ نے ہمدردی کے دو بول سنے تو اس کا دل بھر آیا۔ اسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنا دل کھول کر اس اجنبی عورت کے سامنے رکھ دے۔

"کیوں، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" اس نے بھی ایک گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"وہ...." ڈیوڈ سوچ رہا تھا کہ اس سے دل کی بات بیان کرے اس لیے وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"ملازمت سے نکالے گئے ہو؟ کاروبار میں گھاٹا ہوا ہے یا پھر بینک نے دیوالیا قرار دے دیا ہے؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"کچھ ایسا ہی ہوا ہے؟"

"وہی تو پوچھ رہی ہوں کیا ہوا ہے؟" اس نے ایسے کہا جیسے کوئی ماں بچے کو رونے بسورنے کی وجہ پوچھتی ہے۔

"نوکری سے نکال دیا گیا۔" ڈیوڈ نے ایک ہی سانس میں جواب دیا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ اسے ایسا لگا جیسے سینے میں [illegible] ہو گیا ہو۔

"کھل کر کہو؟ دل کی بات زبان پر لانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

"میں سات سال سے ایک کمپنی میں کام کر رہا تھا۔" اس نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ "میں نے دل و جان سے کمپنی کی خدمت کی۔ میں اپنے پیشے میں نہایت کامیاب تصور کیا جاتا ہوں۔ مجھے اپنے کام پر دسترس حاصل ہے لیکن انہوں نے مجھے نوکری سے نکال دیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ اجنبی لڑکی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اب دیکھو.... میں قابل ہونے کے بعد بھی نکال دیا گیا جبکہ کئی لوگ ایسے ہیں جو قابلیت میں مجھ سے ہر لحاظ سے کم ہیں لیکن اب تک ان کی نوکری بچی ہوئی ہے۔" وہ خاصا جذباتی ہو چکا تھا۔ اس کی آواز قدرے تیز تھی۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ اجنبی لڑکی بھی خاموش تھی۔ "انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اب میرا کیا بنے گا۔ میرے خاندان کا کیا ہوگا.... بس! معاشی ابتری کا کہہ کر مجھے ایک خط تھما دیا اور میں ہو گیا بے روزگار۔" کچھ دیر بعد اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر میز پر سر ٹکا دیا۔ اس کا دل ہلکا ہونے کے بجائے اور زیادہ بوجھل ہو چکا تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ کافی دیر بعد اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کا سر اوپر اٹھا رہا ہو۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ نم آنکھوں سے اس نے سامنے دیکھا۔ اسے وہی اجنبی لڑکی نظر آئی۔ وہ ایک بار پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"دل چھوٹا مت کرو۔" وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لا کر کہنے لگی۔ "سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے اگر تم چاہو تو۔" اس نے ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ڈیوڈ کے لیے ہمدردی کا اظہار پوشیدہ تھا۔ "ویسے میں شرط لگاتی ہوں.... تم اب بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

'یہ کون ہے؟' اگرچہ ڈیوڈ کا دماغ نشے میں تھا لیکن پھر بھی اس نے اپنے دماغ کو اس بات پر مرکوز کر کے سوچا۔ 'یہ کیوں اسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ وہ ہمت نہ ہارے؟ کیا یہ مجھے نئی ملازمت تلاش کرنے پر آمادہ کر رہی ہے؟ اگر وہ ایسا سوچ رہی ہے تو بہت بے وقوف ہے۔ یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر کون جانتا ہے کہ معاشی ابتری کے اس دور میں جب لاکھوں لوگ بے روزگار کیے جا رہے ہوں، ایسے میں کون سی کمپنی مجھے ملازمت دے گی؟' اس کے دل میں اس لڑکی کی طرف سے وسوسے جنم لینے لگے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے دھیمی آواز میں اسے پکارا مگر وہ سنی اَن سنی کر گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی ایسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیوں کررہی ہے؟ وہ اسے جانتی تک نہیں ہے پھر اس کی دل جوئی پر کیوں تلی بیٹھی ہے؟ اچانک اس کے دماغ میں ایک جھماکا ہوا۔ ''یہ مجھ سے کیا چاہ رہی ہے؟'' وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنے چکراتے دماغ سے صرف اس لڑکی کے بارے میں ہی سوچ چار ہا تھا۔ جیسے ہی یہ خیال اس کے دماغ میں آیا، اس کے جسم کو ایسا جھٹکا لگا جیسے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہو۔ ''کہیں یہ مجھے رجھانے کی کوشش تو نہیں کررہی؟'' اس بات نے ایک دم اس کے اندھیرے دماغ کی ساری بتیاں روشن کردیں۔ ''نہیں نہیں... حالات کچھ بھی ہوں، مجھے اپنی بیوی سے ہر حال میں وفادار رہنا چاہیے۔'' ڈیوڈ کو ایسا لگا جیسے اس کے دل کے اندر کسی نے زور سے یہ بات کہی ہو۔ لینا کا خیال آتے ہی وہ پریشان ہوگیا۔ اس نے صبح سے ایک بار بھی اسے فون نہیں کیا تھا ورنہ اس کا معمول تھا کہ گیارہ بجے چائے کے وقفے پر ایک بار اسے ضرور فون کرتا تھا۔ اس نے جیب سے بلیک بیری فون نکالا اور اس کا نمبر ملانے لگا۔

''کہاں ہو... سب خیریت تو ہے؟'' اس نے پہلی گھنٹی پر ہی فون اٹھالیا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' اس نے لڑکھڑاتی زبان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا ہوا؟'' آواز سے وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ کمپنی سے لوگوں کو نکالا جانے والا ہے...''

''ہاں... تو پھر کیا ہوا ہے؟'' لینا نے قطع کلامی کی۔

''مجھے بھی ملازمت سے نکال دیا گیا ہے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اوہ نہیں...'' اس کی آواز ایسے سنائی دی جیسے وہ یہ سنتے ہی چلا اٹھی ہو۔

''پچاس سال میں بدترین معاشی بحران...'' اگرچہ وہ بہت زیادہ چڑھا چکا تھا لیکن لینا کی آواز سن کر اس میں ایک بار پھر ہمت آگئی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے بہت زیادہ پیار کرتا تھا۔ اس کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنی پریشانی بھول گیا ہے۔ اس کا لہجہ تسلی دینے جیسا تھا۔ ''یہ بحران ٹل جائے گا لیکن کب، اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ کمپنی نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔'' یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کا لہجہ روہانسا ہوگیا۔ ''میں ایک اعلیٰ درجے کا پروفیشنل اسٹاف تھا، پر انہوں نے مجھے اس طرح بے مروتی سے فارغ کردیا جیسے میں کوئی تیسرے درجے کا کلرک ہوں یا میں اچھا کام نہیں کرتا تھا... میں نکما تو نہیں تھا۔''

''تم کام تو بہت محنت سے کرتے تھے۔'' شاید لینا نے اس کے لہجے کی بے بسی کو محسوس کرلیا تھا۔ اس لیے اس نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ''فکر مت کرو۔ تم جو کچھ کررہے تھے، اس سے مزید بہتر کرسکتے ہو۔ ویسے تم اس وقت کیا کررہے ہو؟'' لینا کی آواز پر سکون تھی۔ محسوس ہورہا تھا کہ وہ اس خبر کے شاک سے نکل آئی ہے جو ڈیوڈ نے سنائی تھی۔ یا پھر وہ اسے مزید پریشان ہونے سے بچانے کے لیے ایسا کررہی تھی۔

''میں اس وقت کیا کرسکتا ہوں؟'' ڈیوڈ یہ سن کر طنزیہ ہنسی ہنسا اور اس کے بعد سوالیہ لہجے میں جواب دیا۔ پھر اس نے نظر اٹھائی اور سامنے بیٹھی اجنبی عورت کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈرنک کررہا ہوں۔''

''تم اس وقت کہاں پر ہو؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''ایک بات یقینی ہے کہ میں اس وقت دفتر میں نہیں ہوں۔''

''تم غصے میں کیوں بول رہے ہو۔'' لینا نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''تمہیں کیا لگ رہا ہے؟''

''تم اس طرح باتیں کررہے ہو جیسے زندگی بھر مجھ سے بیزار رہے تھے اور اب تمہیں مجھ سے اچھی کوئی اور مل گئی ہے جو اتنی بے رُخی برت رہے ہو۔'' وہ بگڑ کر بولی۔ ''یاد رکھو... میں تمہاری بیوی ہوں۔'' اس نے شاید شوہر کا دھیان بٹانے کے لیے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی تھی۔

''بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اس کا لہجہ بھی تھوڑا سا سخت ہوگیا۔

''کیا ہوا جو ملازمت نہیں رہی۔ دنیا تو ختم نہیں ہوئی ہے۔''

''تم شاید آج کل اخبار نہیں پڑھ رہی ہو۔'' ڈیوڈ نے سنجیدہ مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پوری دنیا کی معیشت امریکا پر انحصار کرتی ہے۔ یہ ختم تو دنیا ختم...'' یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔

''تم اس وقت شدید ذہنی تناؤ میں ہو۔'' لینا سمجھ گئی کہ اس وقت اس کا شوہر کس طرح کی ذہنی حالت سے دوچار ہوگا۔ اس لیے وہ ایک بار پھر نرم پڑ گئی۔ ''گھر آؤ تو پھر بات کرتے ہیں۔''

''جو بات فون پر ہوسکتی ہے، اسے کہنے کے لیے گھر آنے کا انتظار کیوں کیا جائے؟'' وہ ایک بار پھر اچانک اداس نظر آنے لگا۔ ''تم جانتی ہو کہ میری تنخواہ سے گھر ہی نہیں چلتا، تم سب پل رہے ہو۔ نوکری ختم تو تنخواہ ختم... اب تنخواہ نہیں ملے گی تو ہمارا کیا بنے گا؟''

''تم اتنے بددل نہیں ہو۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔'' لینا نے اسے سمجھایا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہی لیکن اس وقت ڈیوڈ کو بیوی کا سمجھانہ لہجہ بہت برا لگ رہا تھا۔ اس نے فون کانوں سے کچھ دور کیا، وہ اس کی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔

''بس اب چپ کرجاؤ۔'' چند لمحوں کے بعد اس نے موبائل فون منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''تم اس وقت ڈرنک کررہے ہو اور میرے خیال میں بہت پی چکے ہو۔'' لینا نے اس کی ہدایت نظر انداز کرتے ہوئے اندازے سے کہا۔ وہ اس کی بیوی تھی اور یقیناً اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ اس کا شوہر اس وقت کس طرح کی صورت حال سے دوچار ہے۔

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بہت پی چکا ہوں۔''

''ڈیوڈ... ڈیوڈ! یہ مسئلے کا حل نہیں ہے... ہوش! خود کو سنبھالو۔'' لینا کے لہجے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی بہکی بہکی باتیں سُن کر خاصی پریشان ہوچکی ہے۔ ''چلو... سیدھے گھر پہنچو۔''

''آجاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کال منقطع کردی۔ اس نے موبائل کی بیٹل بند کرکے اسے وائبریٹ پر لگادیا اور فون کو واپس جیب میں رکھ لیا۔ ابھی اس نے فون بند کیا ہی تھا کہ وائبریٹر آن ہوگیا لیکن اس نے نظر انداز کردیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لینا نے فون ملایا ہوگا۔ اس وقت وہ اس سے مزید بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے کئی بار موبائل پر وائبریٹر آن ہوا لیکن اس نے فون نہیں نکالا۔

''ایلن! کچھ چاہیے؟'' اسی دوران میں قریب سے گزرتی بارٹینڈر نے اُس اجنبی لڑکی کے خالی گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں..... پلیز ایک لیمن سوڈا۔'' اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کو آرڈر دیا۔

''ایلن...'' اس نے زیر لب کہا۔ ''یہی نام ہے تمہارا؟''

''ہاں...'' وہ مسکرادی۔ ''اور تم...''

''چھوڑو... اس نام میں کیا رکھا ہے۔ اہمیت کا حامل ہوتی ہے۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''میرا نام بے روزگار ہے۔'' اچانک اس نے مسکرا کر کہا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''بہت تھوڑے دن کے لیے یہ نام تمہارے ساتھ رہے گا۔''

''واقعی...'' ڈیوڈ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایسے کہا جیسے اسے اس کی بات پر یقین نہیں آیا ہو۔

''دیکھ لینا... میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' اس کی باتوں سے صاف لگ رہا تھا کہ داستانِ الم سننے کے بعد اس کے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی پیدا ہوگئی ہے۔

''فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ تم سچ کہہ رہی ہو یا...'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے جھوٹی کہہ دے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکا۔ اس دوران کئی بار وقفے وقفے سے اس کے موبائل پر کالز آتی رہیں لیکن وہ فون نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

''کس کا فون تھا؟'' اچانک ایلن نے سوال کیا۔

''تمہاری بیوی کا فون تھا نا؟'' پھر اس نے بات کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔

''تمہیں کیسے پتا؟'' ڈیوڈ نے یہ سنتے ہی چونک کر سر اٹھایا۔

''تمہاری باتوں سے اندازہ ہوا تھا۔''

''اوہ...''

''کیا کہہ رہی تھی وہ؟'' ایلن نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''تمہیں مطلب؟'' ڈیوڈ جھنجھلا کر بولا۔

''نہیں... کوئی خاص مطلب تو نہیں۔'' وہ بڑے سکون سے بولی۔ ''خیر چھوڑو اور وہ کیا کہہ رہی ہوگی... یہی پوچھ رہی ہوگی کہ تم کہاں ہو، کیا کررہے ہو۔ چلو اچھے بچوں کی طرح سیدھے گھر آجاؤ وغیرہ وغیرہ۔'' ایلن نے کچھ ادا سے یہ بات کہی کہ پہلی بار وہ ہلکا سا مسکرادیا۔

''تمہیں بہت باتیں بنانی آتی ہیں۔''

''سب یہی کہتے ہیں۔ اب تو یہ سن کر مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوتی۔'' ایلن نے ادائے بے نیازی سے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم بہت باتونی ہو۔'' ڈیوڈ نے ٹھیلی لگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ چھوڑو۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میرے خیال میں تم بہت پی چکے ہو۔ بہتر ہے کہ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھر کی راہ لو۔ ویسے بھی تم اچھے انسان لگتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رکی اور چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے بولی۔ "یہ جگہ تم جیسے اچھے انسانوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"میں تھک گیا ہوں اچھا انسان بنے رہنے سے۔" وہ بیزاری سے فیصلے لہجے میں کہنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ایلن کی بات سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔

"کیوں... ایسا کیا ہوا؟"

"ضروری تو نہیں کہ تمہیں ہر بات بتائی جائے۔" اس نے غصے سے جواب دیا۔ "ویسے بھی میرا تم سے کیا تعلق ہے؟"

"ضروری نہیں کہ تعلق وہی کہلائے گا جو پرانا ہو جائے۔" ایلن کی بات میں وزن تھا۔ "ویسے ہم لگ بھگ ایک گھنٹے سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ بھی تو ایک تعلق بن گیا نا۔" وہ بات مکمل کر کے مسکرائی۔ ڈیوڈ نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکائیں اور ان میں سر دے دیا۔ وہ کتنی دیر تک اس طرح بیٹھا رہا، اسے ہوش نہیں تھا لیکن جب اس نے سر اٹھایا تو وہ بدستور اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ اس کے ہاتھوں میں گلاس تھا اور وہ دھیرے دھیرے گھونٹ لے رہی تھی۔

"تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو... گئی نہیں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"مجھے تو ایسا کوئی خاص کام نہیں کہ جس کی وجہ سے جانے کی جلدی ہو لیکن اگر تم چاہو تو..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور معنی خیز انداز میں اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"کیوں ڈسٹرب کر رہی ہو انہیں۔" اچانک برابر سے گزرتی ہوئی سینڈی رک گئی اور ایلن کو دیکھ کر عجیب سے انداز میں کہنے لگی۔

"تم سے مطلب؟" ایلن نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

"یہ میرے بار کا گاہک ہے... سمجھیں۔" سینڈی کی آواز بھی بلند تھی۔

"تو پھر..." ایلن نے ایک بار پھر منہ پھٹ جواب دیا۔ "بہتر ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔"

"میں اپنے کام سے کام رکھتی ہوں اور اگر کوئی سر پر چڑھنے لگے تو اس کا کام بھی کر دیتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ مسکرائی اور چند لمحوں تک اسے معنی خیز نگاہوں سے گھورتی رہی۔ "مجھے یقین ہے تم میری بات سمجھ گئی ہو گی۔"

"بکواس بند کرو۔" ایلن نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"مگر تم اپنی بک بک کچھ کم کر دو۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"پلیز پلیز..." ڈیوڈ نے مداخلت کی۔ "بل بنا کر لے آؤ اور کریڈٹ کارڈ بھی۔"

"او کے سر!" یہ کہہ کر سینڈی نے پلٹ کر ایلن کی طرف دیکھا۔ "مفت خور لٹیری۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور آگے بڑھ گئی۔

"کمینی عورت۔" ایلن نے بھی دانت کچکچاتے ہوئے زیر لب کہا اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود کو ایک بار پھر پرسکون کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

سینڈی اسی علاقے کی رہنے والی تھی۔ وہ خالص کاروباری مزاج کی عورت تھی۔ یہ بار اس کے شوہر کی ملکیت تھا۔ دن میں وہ اسے چلاتی تھی اور شام کو شوہر کے آنے کے بعد یہاں سے واپس جاتی تھی۔ وہ یہاں آنے والے زیادہ تر لوگوں کو پہچانتی تھی۔ اس نے ڈیوڈ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ حلیے سے معقول اور کسی شدید صدمے سے دوچار لگ رہا تھا۔ سینڈی ہمدرد عورت تھی۔ جب اس نے ایلن کو اس کی میز پر بیٹھے دیکھا تو وہ چونک گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آفت کی پرکالہ جہاں ہوگی ضرور کوئی گل کھلا کر ہی اٹھے گی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ ڈیوڈ سے بےتکلف ہوتی جا رہی ہے تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس شریف آدمی کو اس کے شر کا شکار نہیں بننے دے گی۔ اسی لیے وہ ایلن پر نظریں رکھے ہوئے تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ بدستور اسے اپنے گھیرے میں لیے جا رہی ہے اور پانی سر سے اونچا ہونے لگا ہے تو اس نے مداخلت کی۔ ایلن کو اس کی یہ مداخلت قطعی پسند نہیں آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ دل ہی دل میں اسے کوسنے دے رہی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں ڈیوڈ نہ بھاگ کھڑا ہو۔

ایلن کئی ماہ سے اسی علاقے میں رہ رہی تھی۔ وہ یہاں کے تقریباً تمام بار میں بدنام ہو چکی تھی۔ ہر شخص اس کو جان چکا تھا۔ ویسے اس کے مشہور ہونے میں... بڑا ہاتھ اس کے بوائے فرینڈ اینڈریو کا تھا۔ ایلن آوارہ مزاج لڑکی تھی۔ کئی سال پہلے اس نے ہائی اسکول ادھورا چھوڑا اور اپنے گھر سے بھاگ گئی۔ اس کے بعد نہ تو اس نے اسکول کا رخ کیا اور نہ پلٹ کر اپنے گھر گئی۔ برسوں ہو چکے تھے، اس کی

روزی روٹی اسی طرح چل رہی تھی۔ جس نے گھر دیا، وہ اس کی ہو گئی۔ جس نے گلاس منگوا دیا، یہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ جس نے اس کے پرس میں نوٹ ڈالے، وہ اس کے ساتھ چل دی۔ وہ رات دیر گئے تک ادھر ادھر آوارہ پھرتی رہتی اور صبح دیر تک بستر پر پڑی رہتی تھی۔ وہ غضب کی اداکارہ تھی۔ جیسے لوگوں میں ہوتی، ویسا ہی انداز اختیار کر لیتی تھی۔

ان دنوں وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اینڈریو تیسرے درجے کا جرائم پیشہ تھا اور چھوٹی موٹی وارداتیں کر کے اپنی گزر بسر کرتا تھا۔ گزشتہ دو ماہ پہلے اس کی اچانک ایلن سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ اس علاقے میں نئی نئی آئی تھی کہ اینڈریو اسے مل گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد وہ اس کے بیڈ کو اپنا بنا چکی تھی۔ ویسے تو اینڈریو موج مستی کرنے والا شخص تھا لیکن طبیعت کا شکی تھا۔ اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ ایلن اجنبی مردوں سے میل جول بڑھائے مگر یہ بات اس لڑکی کے مزاج کے برعکس تھی۔ اسے اجنبی مردوں میں عجیب طرح کی کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ ان کی طرف جلدی راغب ہو جاتی تھی۔ اینڈریو اسے اپنی جاگیر سمجھنے لگا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایلن کٹی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولتی پھرے۔ شروع شروع میں ایلن کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ ایک شام وہ ایک اجنبی مرد کے ساتھ بیٹھی ہوئی ڈرنک کر رہی تھی کہ وہ بھی غیر متوقع طور پر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے اجنبی شخص کو تو تھپڑوں کی بارش سے نوازا مگر اسے بھی نہیں بخشا۔ ویسے ایلن اسی روز ہی اسے چھوڑ دیتی لیکن مجبوری تھی۔ اس نے مصلحت سے کام لیا اور سب کچھ برداشت کر گئی۔ اینڈریو کو نہ چھوڑنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کی اپنی جیب بالکل خالی تھی۔ وہ اس امید پر اس کے ساتھ رہ رہی تھی کہ اینڈریو کہیں سے لمبا مال مارے گا اور وہ اس مال پر ہاتھ صاف کر کے اسے سوتا چھوڑ کر کہیں اور نکل لے گی۔ اسی امید پر وہ دن گزار رہی تھی۔

اینڈریو دو دن سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے آج صبح جب وہ سو کر اٹھی تو گھر میں بیٹھنے کے بجائے بار میں چلی آئی۔ یہاں اسے ڈیوڈ مل گیا۔ وہ بھانپ گئی کہ اسامی تگڑی ہے اس لیے وہ اسے گھیرنے لگی۔ دوسرے یہ کہ اسے اینڈریو کا بھی ڈر نہیں تھا۔ اس لیے وہ بڑے سکون سے اپنا کھیل کھیل رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر یہ مچھلی اس کے جال میں پھنس گئی تو وہ شاید اینڈریو کی محتاج نہ رہے لیکن جب سینڈی نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کی تو وہ چڑ کر رہ گئی۔ وہ خوش ہو رہی

تھی کہ اینڈریو نے بل منگوایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب اٹھنا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جیسے ہی وہ اٹھے گا، وہ بھی اٹھ جائے گی اور پھر اسے اپنی اداؤں کے جال میں پھانس کر ساتھ لے جائے گی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوگی۔ ڈیوڈ نشے میں تھا اور اس حالت میں مردوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا ایک عورت کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔

سینڈی بل بنانے جا چکی تھی۔ اس کے پاس ڈیوڈ کا کریڈٹ کارڈ موجود تھا۔ وہ پہلے ہی کارڈ کو چیک کر کے اس کے کارآمد ہونے کا یقین کر چکی تھی۔ بل آنے میں کچھ دیر تھی۔ ڈیوڈ نے اپنی بوتل سے آخری دو گلاس بھرے، ایک اپنے لیے دوسرا ایلن کے لیے۔ "یہ تم سے کیوں لڑ رہی تھی؟" اس نے سینڈی کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان میں ایلن سے پوچھا۔

"یہ میری خوب صورتی سے جلتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ... یہ بات ہے۔" اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"سر بل... پلیز دستخط کر دیجیے۔" تھوڑی ہی دیر میں سینڈی بل لے کر آ چکی تھی۔ اس نے دستخط کیے اور پتلون کی جیب سے بٹوا نکال کر کریڈٹ کارڈ اس میں رکھنے لگا۔ اچانک فون میں تھرتھراہٹ ہوئی۔ اس نے نکال کر دیکھا تو اس کے بلیک بیری فون پر بارہ مسڈ کالز اور تین ای میلز آ چکی تھیں۔ اس نے بیزاری سے سر ہلایا اور فون رکھ کر گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا۔ وہ اٹھنے لگا تو ایلن بھی کھڑی ہو گئی۔ ڈیوڈ اپنی عادت کے برخلاف بہت زیادہ چڑھا چکا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا گیا۔ ایلن اس پر نظریں رکھے ہوئے تھی۔ اس نے لپک کر اسے بازو سے پکڑ لیا اور گرنے سے بچا لیا۔

"شکریہ۔" ڈیوڈ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"نو ہنی... ابھی سے شکریہ مت ادا کرو۔" اس نے ادائے دلبری سے کہا۔ "نہ تو تم ابھی کہیں اور جا رہے ہو اور نہ میں تمہیں تنہا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔" اس کا انداز خود سپردگی کا تھا۔

"لیکن مجھے جانا ہوگا۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"کہاں جاؤ گے؟" ایلن نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے اور اس نے پوری طرح ڈیوڈ کو اپنی بانہوں میں جکڑ رکھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ گھر... اور کہاں؟ ایک بے روزگار اس حالت میں صرف گھر ہی جا سکتا ہے۔" ڈیوڈ نے مخمور آواز اور اداس لہجے میں کہا۔

"تم اس وقت گھر ہی جا رہے ہو لیکن میرے گھر۔" یہ کہہ کر اس نے قدم اٹھایا۔ ڈیوڈ نے بھی اپنا خاصا وزن اس کے نازک شانوں پر ڈال رکھا تھا۔ سینڈی کاؤنٹر پر کھڑی لیمو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ رہی تھی۔ اس کی نظریں ایلین پر جمی ہوئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ ابھی انہوں نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ بار کا داخلی دروازہ کھلا۔ دروازے سے تیز روشنی کمرے میں داخل ہوئی اور دیوار پر لگے شیشوں سے ٹکرا کر منعکس ہوئی تو ڈیوڈ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کیں اور روشنی سے بچنے کے لیے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا لیکن ایلین کی آنکھیں کھلی تھیں۔ بار کے اندر داخل ہونے والے شخص کو وہ دیکھ چکی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے ڈیوڈ کی کمر... سے اپنا بازو نکالا۔ ڈیوڈ اس کے سہارے پر کھڑا تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور گرنے سے بچنے کے لیے اس نے کاؤنٹر کو تھام لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ ایلین سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اینڈریو اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے درشت لہجے میں ایلین سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے بھی فوراً جواب دیا۔

"اگر کچھ نہیں ہو رہا تو پھر تم اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہی تھیں۔" وہ غصے سے اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"میں تو بس..."

"اسے اپنے گھر لے کر جا رہی تھی، کچھ وقت گزارنے کے لیے۔" اینڈریو نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" وہ چلائی۔

"بکواس بند کر۔ تو خود غلط ہے اور مجھے بتا رہی ہے کہ میں سمجھنے میں غلطی کر رہا ہوں۔" اس نے ایک نظر ڈیوڈ کے سراپا پر ڈالی اور پھر ایلین کو گھورتے ہوئے کہا۔ ڈیوڈ پریشان تھا کہ یہ اجنبی شخص کون ہے۔ وہ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے سینڈی کھڑی تھی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ ایلین کا منصوبہ ناکام ہو گیا لیکن ساتھ ساتھ وہ ڈر بھی رہی تھی کہ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ وہ اینڈریو کو جانتی تھی۔ وہ غصے کا تیز اور جھگڑالو انسان تھا۔ سینڈی کو خدشہ تھا کہ کہیں ایلین کے چکر میں اس بے چارے شریف انسان کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ڈیوڈ کا نشہ بھی کسی حد تک ہرن ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کس نئی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔

"یہ شخص کون ہے؟" اینڈریو نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایلین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔ یہ لڑکھڑا کر گرنے لگا تو میں قریب سے گزر رہی تھی۔ بس میں نے اسے ذرا سا سہارا دیا، ورنہ تو میں گھر جا رہی تھی۔" اس نے صاف جھوٹ بولا۔

"اچھا... یہ بات ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ اٹھایا اور ایلین کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ وہ لڑکھڑا کر ڈھیری ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ ڈیوڈ کچھ سمجھ ہی نہ سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، اینڈریو تیزی سے اس کی طرف پلٹا اور اس کے جبڑے پر زوردار مکا مارا۔ وہ گرنے لگا لیکن اس وقت اس نے کاؤنٹر کا سہارا لیا ہوا تھا، اس لیے گرنے سے بچ گیا۔ زوردار مکے نے اس کا جبڑا ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک ہی وار میں اس کا سارا نشہ اتر چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ معاملہ اب گڑبڑ ہو گیا ہے۔ وہ مار پیٹ والا شخص تھا ہی نہیں۔ اسے بیک وقت بے عزتی، شرمندگی اور درد محسوس ہو رہا تھا۔ اینڈریو پلٹا۔ اس بار اس کا زوردار تھپڑ ایلین کے منہ پر پڑا۔ اس کے بعد بار کے اندر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایلین اور ڈیوڈ اس کی لاتوں اور گھونسوں کے نشانے پر تھے۔

سینڈی کو ڈر تھا کہ اب جھگڑا شروع ہو چکا ہے، کہیں اس کا بار اس توڑ پھوڑ کا نشانہ نہ بن جائے۔ وہ جھکی اور کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھ کر پولیس کو فون ملانے لگی۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ باہر صورت حال کتنا سنگین موڑ لینے والی ہے۔ اچانک گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ دو گولیاں چلیں۔

اینڈریو نے پہلی گولی ایلین پر چلائی لیکن وہ ایک تجربہ کار عورت تھی۔ جھکائی دے کر بچ گئی۔ اس نے اپنے نشانے کا نتیجہ دیکھے بغیر دوسری گولی ڈیوڈ پر چلا دی۔ وہ اسے پستول نکالتے اور گولی چلاتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے حواس اب پوری طرح کام کر رہے تھے۔ اس نے بچنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں اس کا ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے چاقو پر پڑا جس سے کچھ دیر پہلے سینڈی لیمو کاٹ رہی تھی۔ اس نے چاقو ہاتھ میں اٹھایا ہی تھا کہ اس نے گولی چلا دی۔ وہ گولی سے بچنے کے لیے تیزی سے پلٹ گیا۔ گولی اس کے کان کے پاس سے گزر گئی۔ اسی دوران میں ایلین اس کے برابر پہنچی لیکن اس سے پہلے کہ اینڈریو ایک بار پھر گولی چلاتا، اس نے ڈیوڈ کے

ہاتھوں سے چاقو چھینا اور اسے اینڈریو کی طرف کھینچ مارا۔ آج جو کچھ ہوا تھا، اس نے ایلین کی قوتِ برداشت ختم کر دی تھی۔ وہ اب اس قصے کو ہی ختم کرنا چاہتی تھی۔

جس وقت ایلین نے چاقو اچھالا، عین اسی وقت سینڈی نے کاؤنٹر کے پیچھے سے سر نکالا۔ فون کا ریسیور اس کے کانوں سے لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف ڈیوٹی آفیسر موجود تھا۔ "یہاں گولیاں چل رہی ہیں۔ اوہ میرے خدا... قتل ہو گیا۔ جلدی پہنچو۔" اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔ ایلین کا اچھالا ہوا تیز دھار چاقو اینڈریو کی گردن میں پیوست ہو چکا تھا۔ زخم سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

ڈیوڈ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اگلے ہی لمحے اینڈریو فرش پر پڑا ہوا درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ "بھاگو..." ایلین نے اس کا بازو پکڑا۔ اور پھر دونوں بھاگتے ہوئے باہر... نکلے۔ دوڑتے ہوئے انہوں نے سڑک پار کی۔ ڈیوڈ کا رخ اپنی کار کی طرف تھا۔ اس کے برابر ایک پرانی سیڈان کھڑی تھی۔ ایلین اس کی طرف لپکی۔

"میرے ساتھ چلو۔" اس نے چیختے ہوئے اس سے کہا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ کھول رہی تھی۔

"نہیں..." وہ اپنی کار کی طرف لپکا۔ ایلین بھی اگرچہ بدحواس لگ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ ڈیوڈ کی طرح حواس باختہ نہیں تھی۔

"میرے ساتھ چلو ورنہ یہ..." ڈیوڈ نے سنی ان سنی کر دی اور اپنی کار اسٹارٹ کرنے لگا۔ وہ تیزی سے پارکنگ سے نکلا اور... تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ وہ یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہوا، اس میں ڈیوڈ کی کوئی غلطی نہیں تھی لیکن وہ بری طرح خوف زدہ ہو چکا تھا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر یہ سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے جان چھڑائی جا سکتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایلین نے بھی گاڑی نکالی لیکن خاصے سکون سے۔ وہ تو اس طرح کے حالات کی عادی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کس شہر کا رخ کیا جائے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ ڈیوڈ تیزی سے گاڑی بھگا رہا تھا۔ اچانک اس نے پولیس کار کے سائرن سنے۔ ایسا لگا جیسے اس کے پیچھے ایک سے زائد پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتے ہوئے آ رہی ہیں۔ اس نے گھبرا کر سائڈ مرر میں دیکھا۔ تین گاڑیاں سائرن بجاتے ہوئے اس کے تعاقب میں آ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ فرار ناممکن ہے۔ اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دینے کا فوری مگر تکلیف دہ فیصلہ کر لیا۔ اس نے فوراً رفتار کم کر دی اور گاڑی کو سائڈ لین کی طرف کرنے لگا۔ اسی دوران ایک کار آگے بڑھی اور اس کے آگے آگے چلنے لگی۔ چند منٹ کے بعد اس کی مشکیں کسی جا چکی تھیں اور ایک پولیس والا اس کا سر جھکا کر اسے پولیس کار کے اندر دھکیل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ حوالات میں تھا۔

ڈیوڈ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سے یونہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تک کبھی بھی پولیس نے اس کی گاڑی کا چالان تک نہیں کیا تھا لیکن اب وہ ملزم کی حیثیت سے پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ اسے رہ رہ کر خود پر ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی نگاہوں میں گر چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس حالت میں اپنے بیوی بچوں کا سامنا کر سکے گا۔ اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے بیلٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اپنی بیوی کو فون کرنا چاہتا تھا لیکن موبائل فون وہاں نہیں تھا۔ پولیس نے تلاشی کے دوران میں اس کا موبائل فون اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر سوچوں میں گم ہو گیا۔ آج صبح جب وہ گھر سے نکلا تو اسے ملازمت کھو جانے کا ڈر تھا۔ ملازمت سے فراغت کا پروانہ ملا تو اسے نکالے جانے پر بے عزتی کا دکھ ہوا۔ جب وہ یہ غم دور کرنے کے لیے بار میں پہنچا تو پھر جو کچھ ہوا، وہ اس کی پوری زندگی پر کلنک کا ٹیکا بن گیا۔ "اوہ میرے خدا..." اس کے منہ سے نکلا اور پھر وہ زور زور سے رونے لگا۔

"مسٹر ڈیوڈ آیئے..." اچانک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ اس نے بھیگی بھیگی پلکیں اوپر اٹھائیں تو ایک پولیس والا حوالات کا دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ اپنے وکیل اور بیوی سے مل لیں۔" وہ مردہ قدموں سے اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ پولیس نے ڈیوڈ کے فون سے اس کی بیوی کا نمبر تلاش کر کے اسے اطلاع کر دی تھی۔ اب وہ تفتیشی کمرے میں وکیل کے ہمراہ بیٹھی ہوئی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" اس نے ڈیوڈ کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جواب میں ڈیوڈ نے اب تک کی ساری روداد بیان کر ڈالی۔

"آپ بیٹھیں، میں پولیس سے معلومات حاصل کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وکیل اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے تمہیں کئی بار فون ملایا لیکن تم فون نہیں اٹھا رہے تھے۔ تمہارے دفتر والے بھی تمہیں فون کر رہے تھے۔ انہوں نے ای میل بھی بھیجی لیکن تم تو اس گند کے ڈھیر میں سر ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے۔" وکیل چلا گیا تو لیزا نے کہنا شروع کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’تمہیں معلوم ہے کتنے لوگ پریشان تھے ایک صرف تمہاری وجہ سے... ملازمت تو ایک طرف رہی اب یہ نئی مصیبت۔‘‘ یہ کہہ کر وہ رو دی۔ ’’جانتے ہو تم پر قتل کا الزام ہے۔‘‘

’’میں نے قتل نہیں کیا۔ وہ تو ایلن نے کیا تھا۔ میں بے قصور ہوں۔‘‘ اس نے منمناتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ بیوی سے نظر ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

’’تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تمہاری چھوٹی سی غلطی نے کتنے بڑے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔‘‘ وہ فیصلے لہجے میں بولی۔ ’’تم ذرا سا صبر کر لیتے اور فون اٹینڈ کر لیتے تو یہ آفت نہیں آتی۔‘‘

’’کیوں کیا ہوا؟‘‘ یہ سن کر اس نے پہلی بار سر اٹھا کر پوچھا۔

’’تمہیں ملازمت سے نہیں نکالا گیا تھا... سمجھے۔‘‘ وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

’’کیا؟‘‘ اس نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

’’تمہارے فون کے بعد دفتر سے فون آیا تھا میرے نمبر پر۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم فون اٹینڈ نہیں کر رہے ہو۔ انہوں نے ہی بتایا کہ ٹائپنگ کی غلطی کی وجہ سے تمہیں برطرفی کا لیٹر دیا گیا ورنہ انتظامیہ نے تمہیں نہیں، تمہارے ڈپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ ڈیوڈ نکولسن کو برطرف کیا تھا۔ بس ناموں کی مشابہت کی وجہ سے یہ غلطی ہو گئی۔‘‘

’’کیا...‘‘ یہ سنتے ہی اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔ ’’افسوس... اب تو سب کچھ ختم ہو چکا۔‘‘ اس نے ایک بار پھر سر جھکا دیا۔ وہ دونوں خاموش تھے۔

’’خوش خبری ہے مسٹر ڈیوڈ...‘‘ اچانک وکیل کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ سارجنٹ بھی موجود تھا۔

’’کیا بات ہے؟‘‘ ایلن نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’آپ بے قصور ہیں۔‘‘ وکیل کے بجائے سارجنٹ نے کہنا شروع کیا۔ ’’ہم نے سینڈی کا بیان لے لیا ہے۔ وہ عینی شاہد ہے۔ اس کے مطابق اینڈریو آپ پر حملہ آور ہوا تھا اور اس پر چاقو اس کی گرل فرینڈ ایلن نے اچھالا تھا جو اس کی گردن پر لگا اور شہ رگ کٹنے سے اس کی موت واقع ہوئی۔ ویسے ایلن کو بھی پکڑ لیا گیا ہے۔ اس نے اعتراف جرم کر لیا ہے۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو غلط فہمی کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔ یہ لیجیے آپ کی کار کی چابی، فون اور پرس۔‘‘ سارجنٹ نے اس کی طرف تھیلا بڑھایا۔ ’’آپ لوگ اب جا سکتے ہیں۔‘‘

’’بہت شکریہ...‘‘ ڈیوڈ نے اس طرح کہا جیسے اسے اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا ہو۔ لینا وکیل کے ساتھ پہنچی تھی لیکن اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ گھر لوٹ رہی تھی۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ ڈیوڈ گاڑی اسٹارٹ کرنے والا تھا کہ اس کے فون میں تھرتھراہٹ ہوئی۔ اس نے فون اٹھا کر نمبر دیکھا۔ یہ اس کی کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر کا تھا۔

’’ہیلو سر!‘‘

’’تم میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟‘‘ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

’’وہ بات یہ ہے سر کہ...‘‘

’’جانتا ہوں۔‘‘ اس نے قطع کلامی کی۔ ’’آج جو کچھ ہوا، وہ بس ایک غلطی تھی لیکن میں جانتا ہوں کہ اس سے تمہیں شدید صدمہ پہنچا ہوگا۔ مجھے اندازہ ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کی وجہ سے تم جیسا کوئی بھی غیر معمولی قابل آدمی واپس اپنی ملازمت پر آنا گوارا نہیں کرے گا لیکن مجھے امید ہے کہ تم اس بات کو درگزر کر دو گے۔‘‘

’’دیکھیے بات...‘‘

’’ڈیوڈ! ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔‘‘ مینجنگ ڈائریکٹر نے قطع کلامی کی۔ ’’جو کچھ ہوا ہے، اس کے باعث کمپنی نے ہرجانے کے طور پر تمہیں دو ماہ کی تنخواہ اور تمہاری تنخواہ میں فوری طور پر دو ہزار ڈالرز ماہانہ اضافے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم تم جیسا ذہین اور قابل آدمی کھونا نہیں چاہتے۔ اس بحران سے نکلنے کے لیے ہمیں تمہاری اشد ضرورت ہوگی۔ امید ہے کہ کل صبح تم حسب معمول اپنی ڈیوٹی پر ہو گے۔‘‘ اس نے اپنی بات مکمل کی۔

’’ٹھیک ہے سر!‘‘ اس نے پرجوش لہجے میں جواب دیا۔

’’ٹھیک ہے۔ کل صبح ملتے ہیں۔ اب ایک بار پھر تمہاری قابلیتوں کی آزمائش کا وقت آ گیا ہے... بائے۔‘‘ یہ کہہ کر مینجنگ ڈائریکٹر نے فون بند کر دیا۔

فون کا اسپیکر آن تھا...... لینا بھی ساری بات سن رہی تھی۔ ڈیوڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ’’میں کہتی تھی نا کہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ انسان کے بھلے کے لیے ہی ہوتا ہے۔‘‘

’’ہاں... آج مجھے یقین آ گیا۔‘‘ ڈیوڈ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

••
••

لمحہ بھر میں سرزد ہو جانے والی غلطی...... جس کا مداوا ممکن نہیں تھا

زود پشیمان

بابر نعیم

حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت ہو... یا نفرت... الفت ہو کہ عداوت... انسان کو ان جذباتی کیفیات سے دوچار کر دیتی ہے... کہ وہ فیصلے کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے... ایسے ہی رومان پرور جوڑے کا دل گداز قصہ...

’’جو، ابھی میرے دفتر میں آ جاؤ۔‘‘

جو نیونارڈ نے اپنا بریف کیس فرش پر رکھ دیا اور اپنے کیوبیکل کی دیوار کی اوٹ میں دبک گیا۔ پھر جھک کر اپنے پارٹنر کے نزدیک پہنچا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ’’یہ کس بات پر اتنا پاگل ہو رہا ہے؟‘‘

سراغ رساں رچرڈ نے شانے اچکائے اور بولا۔ ’’وہ غصے میں بھرا ہوا ہی اندر آیا تھا۔‘‘

جو ٹہلتا ہوا ایڈی واٹسن کے دفتر کی جانب بڑھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایڈی اپنی زنگ آلود میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اخبارات کے تراشے اور پولیس سرٹیفکیٹ اس کے عقب میں دیوار پر بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار پر جابجا دھوئیں کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔

جو نے کمرے میں قدم رکھتے ہی اپنے لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے بلایا ہے، چیف؟''

چیف والٹن نے اپنی گھنی پلکوں کی اوٹ سے جو کو گھور کر دیکھا اور بولا۔ ''دروازہ بند کر دو۔''

جو نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

جب چیف والٹن دوبارہ گویا ہوا تو اس کا لہجہ نہایت سرد تھا۔ ''میں آج تمہاری میز کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس پر ہر طرف ثبوت بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔''

''میں انہیں سمیٹ لوں گا، چیف۔ میں حال ہی میں واقعی بے حد مصروف رہا ہوں۔ اور پھر گزشتہ ہفتے روور کی خودکشی کے کیس پر بھی کام کر رہا تھا۔ اس لیے...''

''بہتر ہوگا کہ وہ ثبوت روور کی خودکشی کے کیس سے متعلق نہ ہوں۔'' چیف نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''وہ قطعی طور پر اس کے کیس سے متعلق نہیں ہیں۔'' جو نے یقین دلانے والے انداز میں جواب دیا۔

''ویل، انہیں اٹھا کر حفاظت سے رکھ دو۔ تم ہماری پالیسی سے بخوبی واقف ہو۔ ثبوت جس روز بھی اکٹھا کیے جائیں، ان کا باضابطہ اندراج بھی اسی دن ہو جانا چاہیے۔'' چیف نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر دوبارہ ایسی کوتاہی ہوئی تو تم معطل کر دیے جاؤ گے۔''

جو نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے چیف کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کا پارٹنر رچرڈ کوئی رپورٹ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے سر اٹھا کر جو کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''وہ تم سے کیا چاہ رہا تھا؟''

''کیا تم مجھ پر ایک عنایت کر سکتے ہو؟''

''میں حاضر ہوں۔''

جو نے کیوبیکل کی دیوار کے پار ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ چیف والٹن کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ساتھ ہی فون کان پر لگائے کسی سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر ان تمام ثبوت کو جو میری میز پر بکھرے ہوئے ہیں، سمیٹ کر اپنے لاکر میں رکھ دو۔''

رچرڈ یہ سن کر اپنا سر کھجانے لگا۔ ''تم ان تمام ثبوت کا اندراج ثبوت کے رجسٹر میں کیوں نہیں کر لیتے؟ اس کام میں لگ بھگ ایک گھنٹا ہی لگے گا۔''

''میرے پاس ایک گھنٹے کا وقت نہیں ہے۔'' جو نے اپنی کرسی پر جھکتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔

اس بات پر رچرڈ نے استفہامیہ نگاہوں سے جو کی طرف دیکھا۔

''اس رات کی میں گزشتہ تین ہفتوں سے پلاننگ کر رہا تھا۔'' جو نے بتایا۔

''آج کی شب ایسی کیا خاص شب ہے؟ شیری کی سالگرہ ہے یا کچھ اور...''

''کچھ اور...''

رچرڈ آگے کی طرف جھک گیا اور بولا۔ ''وہ کیا؟''

جو نے چہرہ گھما لیا۔ ''کچھ نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کم آن!'' رچرڈ نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم پارٹنر ہیں۔ کیا آج شب تمہاری شادی کی سالگرہ ہے؟ کم آن، تم مجھے اپنی ہر بات بلا جھجک بتا سکتے ہو۔''

جو نے ایک آہ بھری اور بولا۔ ''آج ہمارے پہلے بوسے کی سالگرہ ہے۔''

''کیا؟'' رچرڈ نے اپنا سر اونچا اٹھاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک قہقہہ لگایا۔ پھر بولا۔ ''کیا تم مذاق کر رہے ہو؟''

جو نے اپنی آنکھیں سکیڑ لیں۔ ''میرا خیال ہے تم نے ابھی کہا کہ ہم پارٹنر ہیں۔ پارٹنر ایک دوسرے کا مذاق نہیں اڑایا کرتے۔'' جو نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

رچرڈ نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں معافی چاہتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' جو نے چیف کے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے قہقہوں پر دھیان رکھو۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں اپنے پہلے بوسے کی تاریخ کیوں کر یاد ہے؟ خاص طور پر شادی کے دس سال بعد اس کی یاد کیوں آئی ہے؟'' رچرڈ نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے یاد نہیں تھی۔'' جو نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آج کیسے یاد آ گئی؟''

''گزشتہ ماہ میں اپنی دوچھتی کی صفائی کر رہا تھا تو وہاں شیری کی چند ڈائریوں کے ساتھ میری کیلنڈر بک بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں شیری کی ڈائریاں سرسری طور پر پڑھنے لگا تو اس کی ایک ڈائری میں ہمارے پہلے بوسے کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ تاریخ دیکھ لی اور اس کی تصدیق اپنی کیلنڈر بک سے بھی کرالی۔'' یہ کہتے ہوئے جو نے اپنا سینہ ٹھونکا اور بولا۔ ''اب دیکھنا، وہ مجھ سے کتنی زیادہ متاثر ہو جائے گی۔''

''تو تم اسے یہ یقین دلاؤ گے کہ تم نے وہ دن آج تک یاد رکھا ہوا ہے؟ یہ غلط بات ہے۔''

اس بات پر جو نے رچرڈ کو گھور کر دیکھا اور بولا۔ ''اس بارے میں اپنا منہ بند رکھنا، رکا سمجھے؟ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ دن مجھے کیوں اور کس طرح یاد آیا ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ میں اس دن کا احترام کر رہا ہوں اور اس کی سالگرہ منانے جا رہا ہوں۔''

''میرا خیال ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' رچرڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ویل، چونکہ ہم پارٹنر اور ساتھی ہیں اس لیے میں تمہارے ثبوت اپنے لاکر میں محفوظ رکھ لوں گا تاکہ چیف کی نگاہ دوبارہ ان پر نہ پڑنے پائے بلکہ میں کل لاگ بک میں ان کے اندراج کرنے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔''

جو نے رچرڈ کا شکریہ ادا کیا اور دفتر سے کھسک لیا۔

جب وہ اپنی بے نام پولیس پیٹرول کار میں سوار ہوا تو اس نے اپنی بیوی شیری کو فون کیا۔ ''پندرہ منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے کے لیے آ رہا ہوں۔''

''لیکن...''

''بس تیار ہو جاؤ۔'' جو نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور مسکرانے لگا۔ یہ من وعن وہی الفاظ تھے جو اس نے گیارہ برس پہلے اس وقت ادا کیے تھے جب وہ اپنی چوتھی ڈیٹ پر شیری کو لینے کے لیے جا رہا تھا اور اسی طرح ڈرائیو کرتے وقت اس سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ان کی اس شب کی ملاقات کا اختتام ان کے درمیان پہلے بوسے پر ہوا تھا اور اس طرح اس کے یک طرفہ خیالات کا سلسلہ بھی اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ اس لمحے کے بعد سے اس نے خود کو قائل کر لیا تھا کہ شیری ہی وہ عورت ہے جس کے ہمراہ وہ اپنی بقیہ زندگی گزارے گا۔

گھر پہنچ کر جو نے اپنی بے نام پولیس کار اپنے ڈرائیو وے میں پارک کر دی اور ہارن بجا دیا۔

اس کی بیوی کچھ دیر بعد گھر سے باہر نکلی۔ اس وقت قدرے گرم ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اس کی لانبی سنہری زلفیں اس کے سنولائے ہوئے چہرے پر اٹھکیلیاں کرنے لگتی تھیں۔ وہ سایہ دار کار پورٹ سے گزرتے ہوئے کار کے نزدیک آ گئی اور بولی۔ ''یہ اچانک تمہیں کہاں کی سوجھی ہے؟''

''اندر آ جاؤ۔ ہم کھانے کے لیے ''چیلیز'' جا رہے ہیں۔'' جو نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

شیری نے آنکھیں سکیڑ لیں اور بولی۔ ''تم سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے؟''

''اس بات کا کیا مطلب ہے؟'' جو نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

''ہر مرتبہ جب بھی تم کوئی غلط کام کرتے ہو تو اس کی تلافی کرنے کی کوشش میں مجھے باہر لے جاتے ہو۔'' شیری نے وضاحت کی۔

جو کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کی بیوی اس بات کی حقیقت کو کیوں نہیں سمجھ رہی ہے کہ وہ آج کی رات ان کے پہلے بوسے کی یاد تازہ کرنے جا رہا ہے؟ ''میں اپنے پہلے پیار کی یاد کو روشن کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرا نہیں خیال کہ اسے روشن کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔'' اس کی بیوی نے کہا۔

''بے بی، میں تو بس تم پر اپنا پیار نچھاور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

شیری نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔ ''آئی ایم سوری۔ ٹھہرو، میں اپنا پرس لے کر آتی ہوں۔''

شیری واپس آنے کے بعد اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تو جو نے کار اسٹارٹ کرنے کے بعد معمول کے انداز میں سی ڈی پلیئر کے پلے بٹن کو دبا دیا۔ کار کے اسپیکرز سے ''لیڈی ان ریڈ'' کے گیت کے مدھر سر بکھرنے لگے۔ شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ہمارا پسندیدہ گیت!'' وہ خوشی سے بولی۔

جو نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دونوں ایک ساتھ یہ گیت گنگنانے لگے۔

ان کی کار ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔

دس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جو نے کار مقامی ون ڈسکی کے پارکنگ لاٹ میں موڑ دی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' شیری نے پوچھا۔ بظاہر وہ اس بات سے بے خبر لگ رہی تھی کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔

''تم یہاں انتظار کرو، میں بل تم لے کر آتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو نے کار روکنے کے بعد دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
پھر وہ بے نشان پولیس ...... کار سے اتر کر اسٹور کی جانب چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا شیری اس کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہی ہے یا اسے واقعی پتا نہیں کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے؟ یہ بیزار کن خیالات اس کے ذہن میں کلبلانے لگے تو اس نے سر کو ایک جنبش دیتے ہوئے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کوئی بات نہیں، اسے جلد ہی حقیقت کا احساس ہو جائے گا۔

اسٹور میں اس نے اپنی پسندیدہ شے کا انتخاب کیا اور کیشیئر کو ادائی کرنے کے بعد اپنی کار ... کی جانب پلٹ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولنے کے بعد اس نے اپنی نشست سنبھال لی اور درجن بھر تازہ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ شیری کی جانب بڑھا دیا۔

شیری اپنی سیٹ پر آگے کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ جب جو نے کار کا دروازہ بند کیا تو تب شیری نے سر اوپر اٹھایا۔ اس کے سرخ رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔

”کیا ہوا؟“ جو نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ کیا ہوا ہے؟“ شیری نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی ایک کاغذ جو کی گود میں اچھال دیا۔ ”تمہاری گرل فرینڈ نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔ اس لیے اب تم ہمارے پہلے پیار کی یاد کو تازہ کرنے جا رہے ہو؟“

جو نے ایک اچٹتی نگاہ کاغذ کے اس پرزے پر ڈالی تو فوراً سمجھ گیا کہ اس پر کیا لکھا ہوا ہے۔ وہ تحریر یہ تھی:

ڈیئر جو!

میں یہ تمہیں بتانے کے لیے لکھ رہی ہوں کہ ہمارے تمہارے تعلقات ختم سمجھو۔ میں حقیقت میں ان تمام لمحات سے بے حد لطف اندوز ہوئی جو ہم نے ایک ساتھ گزارے لیکن اب میری ملاقات کسی اور سے ہو گئی ہے۔ مجھے یہ بات تمہیں بتاتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ تم سے یہ برداشت نہیں ہوگا اور تم پاگل ہو جاؤ گے۔ مجھے اس بات سے بے حد خوف آ رہا ہے۔ اس لیے میں تمہیں یہ پیغام لکھ رہی ہوں۔

ڈیبی

جو نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔
پھر اس نے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ دوبارہ شیری کی جانب بڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں۔

اشارے تین پانچ سات ریوالور کی نال اس کے چہرے کی جانب اٹھی ہوئی تھی...

اور یہ وہی ریوالور تھا جو رودر کی خودکشی کی جائے واردات پر پایا گیا تھا...

وہی ریوالور جو اس نے اس کیس کی تحقیقات کے لیے دیگر ثبوت کے ہمراہ اپنی پولیس کار کے دستانوں کے کمپارٹمنٹ میں ایک ہفتے سے رکھا ہوا تھا...

وہی ریوالور جسے ان لوڈ کرنے کے بعد اسے ایک ہفتے قبل دفتر کے ثبوت رکھنے والے لاکرز میں محفوظ کر دینا چاہیے تھا...

”واؤ شیری۔“ جو نے گلدستہ لہراتے ہوئے کہا۔
”اس شے کا رخ ہٹا دو...“
لیکن شیری نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹریگر دبا دیا۔

کار کے اندر ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔
ریوالور کی نال شعلے اگل رہی تھی... ایک... دو... تین...
جو کا جسم ہر فائر کے ساتھ اپنی سیٹ پر جھٹکے کھا رہا تھا۔
اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں، آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ پھر اس کا جسم ڈرائیور سائڈ کے دروازے کی جانب جھک گیا۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کے حلق سے خون ابل پڑا اور کوئی آواز نہ نکل سکی۔

جو نے اپنی تمام طاقت کو مجتمع کرتے ہوئے اپنے کمزور ہاتھ سے اس کاغذ کے پرزے کو بہ مشکل تمام اپنی انگلیوں کی گرفت میں لیا اور اسے پلٹ دیا تاکہ شیری ڈیبی رودر کے قطع تعلق کے پیغام کی پشت کو غور سے دیکھ لے۔

اس پیغام کے کاغذ کے پیچھے اوپری داہنے کونے پر پولیس کے ثبوت کا اسٹیکر چسپاں تھا۔ اسی اسٹیکر کے نیچے جو رودر کے ہاتھ کی خودکشی کی وہ تحریر تھی جو اس نے اپنی کنپٹی پر گولی مارنے سے پہلے بطور اعتراف لکھی تھی۔

جب شیری نے ... کاغذ کی پشت پر چسپاں پولیس کی شہادتی اسٹیکر اور ... رودر کے اعتراف خودکشی کی تحریر پڑھی تو وہ حواس باختہ ہو گئی۔

”لیکن... یہ کاغذ تمہاری کار میں کیوں ہے؟... اس میں جو کو مخاطب کیا گیا ہے... میں بھی... او مائی گاڈ!!“

ادھر جو نیو مارڈ کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور دل کی دھڑکن بھی تھمنے لگی۔ اس کے کانوں میں اپنی بیوی کی چیخوں کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

پھر ان چیخوں کو ریوالور کے ایک فائر کی آواز نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

● ● ●

ایک عام آدمی کے لیے کیمیا گری کے گورکھ دھندے کو سمجھنا آسان نہیں... ایک کیمیا گر ہی اس کی باریکیوں کو سمجھ سکتا ہے... ایک مشاق سائنس داں کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی روداد... ایک ناسمجھ کو اپنی ماہرانہ کارکردگی کا زعم تھا...

تکمیل کے آخر کٹھن لمحات جس میں کسی بھی پل بازی پلٹ سکتی ہے

کیمیاگر

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

پروفیسر رندھیر کشیپال کی عمر ساٹھ سال تھی۔ وہ ایک با آدمی تھا اور دیکھنے میں بالکل بے ضرر نظر آتا تھا۔ اس وقت وہ کمرائے عدالت میں تھا اور اپنے بھتیجے سری چند کو مجرموں کے کٹہرے میں بیٹھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر سوچ رہا تھا کہ سری چند کسی طرح بھی سزائے موت سے نہیں بچ سکے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکے گی۔

رندھیر کشیپال کیمیا کا پروفیسر تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ سری چند مجرم ہے۔ مقدمے کا ہر پہلو اس کے خلاف تھا۔ استغاثہ نے ملزم کے خلاف چند باتیں پوری طرح ثابت کر دی تھیں۔

پہلی تو یہ کہ پروفیسر کی بہن کی وصیت کے مطابق اس کی خاصی معقول جائداد اور دولت دو حصوں میں تقسیم ہوتا تھی۔ آدھا حصہ پروفیسر کو ملنا تھا اور آدھا سری چند کو۔ پروفیسر کا نصف حصہ ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں جاتا تھا۔ اس کی صرف آمدنی پروفیسر کو ملتی تھی... پروفیسر کے انتقال کی صورت میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باقی آدھا حصہ بھی سری چند کو مل جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ سری چند کو وصیت کا علم تھا۔ تیسری بات یہ کہ سری چند ریس کا رسیا تھا۔ پروفیسر کی بہن کے قتل سے کچھ عرصے پہلے سری چند کو قرض خواہوں نے رقم کی واپسی کے لیے آخری الٹی میٹم دے دیا تھا اور قرض کی کل رقم ساڑھے چار لاکھ بنتی تھی۔ سری چند کو کسی نہ کسی صورت میں ساڑھے چار لاکھ کا انتظام کرنا تھا۔

سری چند کے خلاف چوتھی بات یہ تھی کہ وہ ملازمت نہیں کرتا تھا۔ اس کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ اسے پروفیسر کی بہن کی طرف سے ہر مہینے معمولی جیب خرچ ملتا تھا۔ لہٰذا قرض خواہوں کو ساڑھے چار لاکھ روپے ادا کرنے کے لیے اس کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنی پھوپی کو ہلاک کردے اور ورثے میں جو معقول رقم ملے، اس سے وہ اپنا قرض ادا کرے۔

یکم اکتوبر کی رات کو سری چند نے اپنی پھوپی کو قتل کردیا اور اس نے پولیس کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ اس کی پھوپی آ تنا جس شاٹ گن سے ہلاک ہوئی تھیں، وہ اس کے ہاتھوں میں تھی اور اس قصّہ میں اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ شاٹ گن کی صفائی کررہا تھا کہ اچانک شاٹ گن چل گئی اور بدقسمتی سے پھوپی گولی لگنے سے ہلاک ہوگئیں۔ سری چند کے بقول یہ محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔

استغاثہ کو سری چند کے بیان پر یقین نہیں تھا۔ خود پروفیسر نے بھی سری چند کے بیان پر یقین نہیں کیا تھا کیونکہ وہ اپنے بھتیجے سری چند سے اچھی طرح واقف تھا۔ سری چند کی عمر ستائیس سال تھی اور پروفیسر رندھیر کھنپال نے اسے پوری عمر میں ایک مرتبہ بھی سچ بولتے نہیں سنا تھا۔

پروفیسر آج تک یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ آخر اس کی بہن نے سری چند جیسے نابکار کو اپنے ورثے کا حق دار کیوں سمجھا؟ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی بہن بے اولاد تھی اور سری چند نہ صرف خوب صورت تھا بلکہ کھلنڈرا اور ہنس مکھ بھی تھا۔ عورتیں عام طور پر ایسے لڑکوں کو پسند کرتی ہیں، خواہ وہ انہیں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچا گیں۔

جج اور دیگر عدالتی ارکان فیصلہ مرتب کرنے کے لیے کمرائے عدالت سے چلے گئے۔ انہیں گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت بیت چکا تھا۔ حاضرین میں سے بہت سے لوگ انتظار سے اکتا کر واپس چلے گئے تھے۔

اب کمرائے عدالت میں چند اہلکار، چند سپاہی اور ... سے لوگوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پروفیسر کو اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ وہ مجرم کی سزا کا فیصلہ اپنے کانوں سے سننا چاہتا تھا۔ دو گھنٹے بعد جج اور دیگر عدالتی عملہ چیمبر سے باہر آیا اور عدالت کا کمرا ایک مرتبہ پھر بھر گیا۔

جج نے سری چند کو بے گناہ قرار دے دیا۔ عدالت نے ملزم کو فوری طور پر رہا کرنے کا حکم سنا دیا۔ اس کے فیصلے سے پروفیسر کے ساتھ سب کو مایوسی ہوئی۔ اخباری نمائندے بھی عجلت کے عالم میں عدالت سے باہر چلے گئے۔ حاضرین میں سے کسی نے بھی آگے بڑھ کر سری چند کو باعزت بری ہونے پر مبارک باد نہیں دی تھی، کوئی شور غل بھی نہیں ہوا۔ کمرائے عدالت آہستہ آہستہ خالی ہوگیا۔

پروفیسر رندھیر، سری چند کی طرف بڑھا۔ سری چند اپنے وکیل کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ اس نے پروفیسر کو دیکھ کر ہنستے ہوئے فضا میں ہاتھ لہرایا۔

''ہیلو انکل!''

پروفیسر نے کوئی جواب نہ دیا، بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''انکل کو اس فیصلے سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔'' سری چند نے اپنے وکیل سے کہا۔ ''ان کی خواہش تھی کہ مجھے موت کی سزا سنا دی جائے تاکہ جائداد کا میرا حصہ بھی انہیں مل جائے۔''

پروفیسر نے مقدمے کے دوران میں اس پہلو پر غور کیا تھا کہ دولت اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس کے اخراجات بہت معمولی تھے۔ تین سال بعد وہ ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس نے برسوں پہلے گوا کی پُرفضا پہاڑیوں میں ایک بہت بڑا مکان خرید لیا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی باقی عمر اسی پُرسکون مکان میں گزار دے گا اور تحقیق کا کام کرتا رہے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اس مکان میں آہستہ آہستہ ایک عمدہ قسم کی تجربہ گاہ بھی قائم کرلی تھی۔ اس تجربہ گاہ میں جدید طرز کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسے جو پنشن ملنے والی تھی، وہ اس کے اخراجات کے لیے بہت کافی تھی۔ اسے اپنے ریٹائر ہونے کی بے چینی سے انتظار تھا۔ اسے اس آمدنی کی کوئی پروا نہیں تھی جو اسے بہن کی موت کے بعد ٹرسٹ سے ہونے والی تھی۔

''میری مایوسی کی وجہ یہ نہیں ہے سری چند!'' پروفیسر نے خشک لہجے میں کہا۔ ''مجھے عدالت سے انصاف کی توقع تھی۔''

☆☆☆

دو سال تک پروفیسر رندھیر کھنپال... کو اپنے بھتیجے کی صورت نظر نہیں آئی، پچپن سال کی عمر میں وہ ریٹائر ہو کر اپنے پہاڑی والے مکان میں چلا گیا۔ وہ مکان آبادی سے چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہاں پروفیسر اپنے تحقیقی کام میں اتنا مصروف ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ اپنے بھتیجے سری چند کو سخت ناپسند کرتا تھا لیکن اس کی طبیعت انتقام پسند نہیں تھی۔ اسے اپنی بہن کی موت کا بہت افسوس تھا لیکن اس نے کبھی سری چند سے اس کا انتقام لینے کے بارے میں نہیں سوچا۔ عدالت نے سری چند کو باعزت طور پر بری کردیا تھا مگر پروفیسر کو سری چند کی بے گناہی پر قطعاً یقین نہیں تھا۔

☆☆☆

موسم سرما کی ایک شام اچانک سری چند پروفیسر کے پہاڑی مکان میں پہنچ گیا۔ پروفیسر نے دروازہ کھولا تو سری چند نے مسکراتے ہوئے اسے نمستے کہا۔ پروفیسر خاموشی سے کچھ دیر تک اس کا جائزہ لیتا رہا۔

سری چند کی عمر انتیس سال ہوچکی تھی پھر بھی خدوخال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' پروفیسر نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''انکل! میں اس بھری دنیا میں آپ کا واحد رشتے دار ہوں، ہماری ملاقات کئی سال بعد ہورہی ہے۔ کیا آپ مجھے اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہیں گے؟ باہر بہت سردی ہے، کہیں مجھے نمونیا نہ ہوجائے۔''

باہر واقعی سرد ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، پروفیسر نے مجبوراً ایک طرف ہٹ کر سری چند کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سری چند نے زمین پر رکھا ہوا سفری بیگ اٹھایا اور اندر داخل ہوگیا۔

''اگر تم یہ ملاقات طویل کرنا چاہتے ہو سری چند.... تو میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ تمہیں اس گھر میں خوش آمدید نہیں کہا جائے گا۔'' پروفیسر رندھیر نے خشک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے کم از کم ایک رات ٹھہرنے کی اجازت تو دے دیں گے، انکل؟''

''نہیں۔''

''کیا آپ ان سرد ہواؤں میں اپنے بھتیجے کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیں گے؟ آپ کو معلوم ہے آبادی یہاں سے چار میل دور ہے۔'' سری چند نے لجاجت سے کہا۔

''تم یہاں کس طرح پہنچے ہو؟''

''ٹیکسی کے ذریعے لیکن وہ واپس جا چکی ہے۔''

مرد بے چارہ

☆ میں دہری مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ بیوی میک اپ کرے تو خرچہ ناقابلِ برداشت نہ کرے تو بیوی ناقابلِ برداشت۔

☆ بابا جی! میں ہنسنا چاہوں تو بھی ہنس نہیں پاتا، کیونکہ؟ بچہ تم شادی شدہ ہو۔

☆ مرد کو محبت بھرے خطوط لکھنے کا یہ صلہ ملا کہ وہ ڈاکیے کے ساتھ بھاگ گئی۔

☆ بیوٹی پارلر میں مردوں سے میک اپ کروانے والیاں، بس میں کسی مرد کا کندھا بھی برداشت نہیں کرتیں۔

☆ وہ مرد ہی ہے جو عورت کے لیے اپنی جان لڑا دیتا ہے اور صلہ پاتا ہے زن مرید کا۔

☆ یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے والا، بیگم کی مکاری کے آگے ہار گیا۔

☆ مرد چاہے آسمان سے تارے بھی توڑ کر لے آئے۔ عورت منہ بنا کر کہے گی ''یہ کلر مجھے پسند نہیں۔''

[illegible]

''تو میں فون کرکے تمہاری واپسی کے لیے دوسری ٹیکسی منگوا دیتا ہوں۔''

''مگر میرے پاس تو ٹیکسی کا کرایہ تک نہیں ہے انکل! میں بالکل قلاش ہوچکا ہوں۔'' سری چند نے بے بسی سے کہا۔

پروفیسر نے حیرت سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ترکے میں ملنے والی دولت چند سالوں میں اڑا دی؟ اب تمہارے پاس ٹیکسی کا کرایہ تک نہیں ہے؟''

''مجھے کاروبار میں نقصان ہوگیا تھا انکل۔'' سری چند کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی رقم غلط گھوڑوں پر لگا دی۔'' پروفیسر کے لہجے میں طنز تھا۔

''ساری رقم نہیں، کچھ رقم۔'' سری چند نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''...شاید آپ کو یاد ہو مقدمے کے دوران میں یہ بات سامنے آچکی تھی کہ میں ساڑھے چار لاکھ کا مقروض تھا۔ میں نے وہ قرض ادا کیا پھر مجھے اپنے وکیل کو بھی کافی پیسے دینے پڑے۔ جو کچھ تھا دو سالوں میں ختم ہوگیا، باقی بچا ہی کیا تھا میرے پاس... مگر اب مجھے سبق مل گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ انکل! اب میں پہلے جیسا نہیں رہا ہوں اور آج کل ملازمت تلاش کر رہا ہوں۔"

ملازمت کے نام پر پروفیسر رندھیر نے بے یقینی سے اپنے بھتیجے کو دیکھا۔

"میں آپ کو بے وقوف نہیں بنا رہا ہوں انکل! آپ یقین کیجیے، ٹھوکر کھانے کے بعد ہی آدمی کو عقل آتی ہے۔ باقی کے تین چار لاکھ گنوانے کے بعد مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا ہے۔ اب میرے پاس ایک روپیا بھی نہیں ہے۔ میں آپ کے پاس مدد کے لیے آیا ہوں۔"

"اگر تم مجھ سے پیسے مانگنا چاہتے ہو تو کان کھول کر سن لو کہ میں تمہیں ایک روپیا بھی دینے کا روادار نہیں ہوں۔"

"میں آپ سے پیسے نہیں مانگوں گا انکل! آپ پہلے میری بات تو سن لیں۔ میں اس دنیا میں آپ کا واحد رشتے دار ہوں۔ کیا آپ تھوڑی دیر بیٹھ کر مجھ سے گفتگو نہیں کر سکتے؟"

پروفیسر رندھیر کھٹیال نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ موسم بہت خراب تھا، بڑی کاٹ دار سرد ہوا چل رہی تھی۔

"اچھا، بیٹھ جاؤ۔ اب میں اس موسم میں تمہیں باہر نکالنے سے تو رہا۔ تم آتش دان کے قریب بیٹھ کر اپنا جسم گرم کرو، میں تمہیں صرف دس منٹ دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد میں نیلی فون کر کے ٹیکسی منگوالوں گا، چاہے اس کا کرایہ مجھے ہی دینا پڑے۔" بالآخر پروفیسر نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو سری چند نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے چچا کو دیکھا اور کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آتش دان کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ "تم کچھ پینا پسند کرو گے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"خون رگوں میں جم رہا ہے انکل! کافی بہتر رہے گی۔"

پروفیسر کافی بنانے کے لیے باورچی خانے میں چلا گیا۔ دو تین منٹ بعد وہ باہر آیا تو سری چند ایک بند دروازے پر زور آزمائی کر رہا تھا۔

"انکل! میں غسل خانہ تلاش کر رہا ہوں، غسل خانہ کہاں ہے؟" سری چند نے پروفیسر کو دیکھتے ہی کہا۔

"یہ میری تجربہ گاہ کا دروازہ ہے۔ میں اسے ہمیشہ مقفل رکھتا ہوں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔ "غسل خانہ اوپری منزل پر ہے، وہیں چلے جاؤ۔"

سری چند جب غسل خانے سے واپس آیا تو پروفیسر نے انگلی کے اشارے سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ کافی تیار ہو چکی تھی۔ سری چند نے کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تم مجھے کچھ بتانا چاہتے تھے؟" پروفیسر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں انکل!" سری چند بولا۔ "میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس وقت میری حالت..."

"...اس حالت کے تم خود ذمے دار ہو، آگے بولو۔" پروفیسر اس کی بات کاٹ کر خشک اور قدرے بیزار لہجے میں بولا۔

"ہاں انکل! اس وقت میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میری کل کائنات میرے بیگ میں بند ہے، اس کے علاوہ میرے جسم پر یہ لباس ہے۔ میرے پاس تو سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ اس حالت کو پہنچ کر ہر شخص کو ہوش آ جاتا ہے۔ تنگ دستی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور اب میں نے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ میں اب ملازمت کر کے گھر بسانے کا خواہش مند ہوں۔ آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ آپ مجھے اپنے ہاں اس وقت تک قیام کی اجازت دے دیں جب تک مجھے کوئی ملازمت نہیں مل جاتی۔ آپ کی مہربانی سے میری زندگی بن جائے گی۔"

"پہاڑ پر رہ کر ملازمت تلاش کرنا چاہتے ہو؟" پروفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "قریب ترین بستی میں بھی یہاں کوئی کارخانہ وغیرہ نہیں ہے۔ نہ ہی یہاں بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں ہیں۔ یہاں تمہیں کس قسم کی ملازمت ملنے کی توقع ہے؟"

"آپ غلط سمجھے انکل! یہاں آنے سے پہلے میں نے ممبئی اور نیو دہلی میں ملازمت کی درخواستیں روانہ کر دی تھیں۔ مجھے اس ہفتے ان کا جواب مل جانے کی پوری امید ہے۔ میں نے آپ سے پوچھے بغیر اپنی درخواستوں پر یہاں کا پتا لکھ دیا تھا، درخواستوں کے جوابات یہیں آئیں گے۔"

"خوب! میری اجازت کے بغیر تم نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟"

"چھوڑیے انکل! اب ایسی بھی کیا غیریت؟ ایسا سلوک تو اجنبیوں سے بھی نہیں کیا جاتا، میں تو پھر آپ کا بھتیجا ہوں۔" سری چند نے لہجہ بدل لیا۔ "گستاخی معاف، ویسے آپ بڑے عیش سے زندگی گزار رہے ہیں اور یہ سب کچھ میرے ہی پیسوں کی بدولت ہے۔ ٹرسٹ میں جو تین لاکھ رہ گئے ہیں، وہ میرے ہی ہیں۔"

پروفیسر نے غور سے اپنے بھتیجے کی طرف دیکھا۔

"میرے مرنے کے بعد..." پروفیسر نے کہا۔ "شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں ٹرسٹ کی آمدنی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ وہ تمام آمدنی بینک میں جمع ہو جاتی ہے۔ اس کے بارے میں میرا ارادہ ہے کہ میں وہ ساری رقم عطیے کے طور پر یونیورسٹی کو دے دوں گا۔"

"لیکن ٹرسٹ کے تین لاکھ میرے ہیں انکل۔"

"میں تمہیں پھر یاد دلائے دیتا ہوں کہ وہ رقم میری موت کے بعد تمہیں ملے گی۔ میری زندگی میں نہیں مل سکتی۔" پروفیسر کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ "یہاں آنے سے تمہارا مقصد کہیں یہ تو نہیں ہے کہ تم مجھے مار کر..." اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو سری چند فوراً بولا۔

"مجھے آپ کی زبان سے یہ بدگمانی کی بات سن کر بہت صدمہ ہوا۔ آپ کو شاید یاد نہیں ہے کہ عدالت نے مجھے پھوپی آشا کے قتل کے الزام سے باعزت طور پر بری کر دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ مجھے پھوپی کی موت کا بہت صدمہ ہوا تھا۔"

"شاید اس لیے کہ اس نے اپنی وصیت میں مجھے بھی آدھے کا شریک کر لیا تھا؟"

"یہ غلط ہے انکل! مجھے پھوپی آشا سے بہت محبت تھی مگر آپ کو قائل کرنا مشکل ہے کیونکہ آپ کے ذہن میں ایک بار جو خیال جم جاتا ہے، اس کا نکلنا ناممکن ہوتا ہے۔ خیر چھوڑیے، میں آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ مجھے یہاں ایک ہفتے قیام کرنے کی اجازت دے دیں گے؟ امید ہے اس عرصے میں مجھے ملازمت مل جائے گی۔ میں یہاں اپنے قیام کا کرایہ تو نہیں دے سکتا، البتہ میں گھر کے کام وغیرہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"گھر کے کام کے لیے ایک ملازمہ موجود ہے۔ وہ صبح آتی ہے اور شام کو چلی جاتی ہے۔"

"تو میں آتش دان کے لیے لکڑیاں کاٹ لایا کروں گا۔"

پروفیسر کچھ سوچتا رہا۔ "میرا خیال ہے کہ ایک حادثے کے بعد تم مجھے مارنے کے لیے دوسرے حادثے کا خطرہ مول نہیں لو گے... اور اگر تم نے ایسی حماقت کی تو اس بار تمہارا بچنا محال ہوگا۔ دنیا کی کوئی عدالت اسے اتفاق تسلیم نہیں کرے گی۔ بہرحال، تم آج رات سو جاؤ، ہم اس موضوع پر کل گفتگو کریں گے۔"

"بہت بہت شکریہ انکل!" سری چند نے کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے اس موسم میں گھر سے نہیں نکالیں گے۔"

رات کو پروفیسر بہت دیر تک سری چند کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ سونے سے پیشتر اس نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ مقفل کر دیا اور دروازے کے آگے ایک بھاری بھرکم کرسی لگا دی۔

دوسرے روز خلافِ توقع مطلع بالکل صاف تھا۔ پروفیسر کی آنکھ حسبِ معمول ٹھیک آٹھ بجے کھل گئی۔ نیچے سے ملازمہ کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ پروفیسر نے سری چند کو بیدار کر کے اس سے ناشتے کے بارے میں دریافت کیا پھر ملازمہ کو ایک مہمان کے آنے کی بھی اطلاع دی تاکہ وہ ناشتا اور کھانا اسی حساب سے تیار کرے۔

پروفیسر کی ملازمہ آرکھی پچاس سال کی ایک موٹی سی عورت تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے آتی تھی اور شام کو پانچ بجے چلی جاتی تھی اور ہفتے میں دو دن چھٹی کرتی تھی... ہفتہ اور اتوار۔ پروفیسر دن بھر اپنی تجربہ گاہ میں مصروف رہتا تھا۔ اس دوران میں ملازمہ سارے گھر کی صفائی کرتی، کپڑے دھوتی، کھانا تیار کرتی اور برتن صاف کرتی۔ وہ پروفیسر کی تجربہ گاہ میں قدم نہیں رکھتی تھی کیونکہ اسے پروفیسر کے عجیب و غریب کیمیاوی محلولوں اور ان کی خوشبوؤں سے ڈر لگتا تھا۔ کھانے کے وقت وہ باہر سے پروفیسر کو آواز دے کر کھانا لگنے کی اطلاع دے دیتی تھی۔

ناشتا کرتے وقت پروفیسر نے فیصلہ کیا کہ وہ شام ہوتے ہی سری چند کو ملازمہ کے ساتھ روانہ کر دے گا اور اسے کرائے اور خرچ کی رقم دے کر جان چھڑا لے گا۔ بہرطور... اس نے سوچا کہ وہ سری چند کو دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے اس فیصلے سے مطلع کر دے گا۔ ناشتے کے بعد حسبِ معمول پروفیسر اپنی تجربہ گاہ میں چلا گیا۔ سری چند بھی اس کے پیچھے تجربہ گاہ میں گھس آیا اور بڑی دلچسپی سے ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ تجربہ گاہ جدید ترین سہولتوں سے آراستہ تھی۔ ایک طرف پوری دیوار پر فرش سے لے کر چھت تک لمبے لمبے خانے بنے ہوئے تھے۔ ان میں قطار سے بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ سری چند بہت دیر تک تعریفی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔

"کیا آج کل آپ کوئی نیا تجربہ کر رہے ہیں انکل؟"

"ہاں، میں کان کنی کے اخراجات میں پچاس فیصد کمی کا طریقہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

سری چند ٹہلتا ہوا اس دیوار کے پاس گیا جس پر بوتلیں اوپر سے نیچے تک قطار در قطار رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بوتلوں کے لیبل دیکھتا رہا۔
''انکل! آپ کو یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ کس بوتل میں کون سی چیز رکھی ہوئی ہے؟ کسی بھی بوتل پر کوئی نام نہیں ہے۔'' سری چند نے حیرت سے دریافت کیا۔
''ہر خانہ حروف تہجی کے مطابق ہے۔'' پروفیسر نے اپنے بھتیجے کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''مثال کے طور پر تم جو خانہ دیکھ رہے ہو وہ ''پ'' کا خانہ ہے۔ پہلی بوتل پوٹاشیم آرسنائڈ کی ہے۔ دوسری بوتل پوٹاشیم برومائڈ کی ہے۔ اسی طرح سائنائڈ، کلوریٹ اور ہائڈرو آکسائڈ وغیرہ ہیں۔ مجھے صرف اتنا یاد رکھنا ہوتا ہے کہ کون سا خانہ کس حرف کا ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے مطلوبہ بوتل اٹھا سکتا ہوں۔''
سری چند نے ہاتھ بڑھا کر ایک شیشی اٹھالی۔ ''یہ پوٹاشیم سائنائڈ ہے انکل! سنا ہے دنیا میں اس سے زیادہ خطرناک زہر نہیں ہوتا؟''
''ہاں، یہ اتنا زود اثر ہے کہ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں آدمی کو ہلاک کر دیتا ہے۔''
''آپ اسے کہاں استعمال کرتے ہیں؟''
''یہ دراصل چاندی کی کانوں سے چاندی نکالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے عام طور پر سوڈیم سائنائڈ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ گاہ میں پوٹاشیم سائنائڈ آسانی کے ساتھ کارآمد ہوتا ہے۔ ہر قسم کے سائنائڈ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ میں آج کل ایک ایسا طریقہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سائنائڈ کی جگہ کوئی سستی چیز استعمال کی جا سکے۔''
سری چند نے پوٹاشیم سائنائڈ کی بوتل وہیں رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔ ''آپ بڑی خطرناک چیزوں کے درمیان رہتے ہیں انکل۔''
''سانپ سب کے لیے خطرناک ہوتا ہے لیکن سپیرے کے ہاتھ میں بے ضرر ہو جاتا ہے۔'' پروفیسر کے لہجے میں تفاخر تھا۔ ''اب میں معذرت چاہوں گا سری چند! مجھے اپنا کام شروع کرنا ہے۔''
سری چند خاموشی کے ساتھ تجربہ گاہ سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے وقت اس نے پلٹ کر ایک مرتبہ غور سے پوٹاشیم سائنائڈ کی بوتل اس طرح دیکھی جیسے وہ اس کی جگہ ذہن نشین کر رہا ہو۔
پروفیسر نے تجربہ گاہ کا دروازہ بند کر لیا۔ وہ اپنے بھتیجے کی نظریں بھانپ گیا تھا۔ ''کیا سری چند کسی نئے حادثے کے بارے میں غور کر رہا ہے؟'' پروفیسر نے سوچا۔ وہ شاید یہ سوچ رہا ہے کہ اس کے انکل سائنائڈ سے کام کرتے ہیں۔ اگر سائنائڈ کے ذریعے ان کی موت واقع ہو جائے تو سب اسے ایک حادثہ تصور کریں گے۔ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ کام کے دوران میں پروفیسر غلطی سے سائنائڈ کا شکار ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر سری چند کو موقع فراہم کیا جائے اور وہ مجھے زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کرے تو اس سے یہ بات ضرور ثابت ہو جائے گی کہ اس نے اپنی پھوپی کو بھی ارادتاً قتل کیا تھا۔ شاٹ گن کا ایک دم چل جانا محض حادثہ نہیں تھا۔ لیکن پروفیسر اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔
اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے پوٹاشیم سائنائڈ کی بوتل اٹھائی اور اسے ایک بے حد حساس ترازو پر تولا۔ بوتل کا وزن تین رتی کم ساڑھے آٹھ اونس تھا۔ اس نے وزن ایک علیحدہ کاغذ پر نوٹ کر کے بوتل اسی جگہ رکھ دی اور تجربہ گاہ کا دروازہ مقفل کیے بغیر باہر آ گیا۔
سری چند ایک آرام کرسی پر نیم دراز کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔
''میں ذرا غسل کرنے جا رہا ہوں۔'' پروفیسر سیڑھیاں چڑھ کے اوپری منزل پر چلا گیا۔ جب تیس منٹ بعد پروفیسر واپس آیا تو سری چند اسی انداز سے کرسی پر نیم دراز رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ملازمہ آ کر صفائی وغیرہ کر رہی تھی۔ پروفیسر نے تجربہ گاہ میں داخل ہو کر دروازہ مقفل کر لیا اور سائنائڈ کی بوتل کا وزن دوبارہ کیا۔ اس مرتبہ بوتل کا وزن ساڑھے سات اونس اور پانچ رتی تھا۔ گویا سری چند نے بوتل میں سے تقریباً ایک اونس سائنائڈ نکال لیا تھا جو کئی ہزار لوگوں کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے، پروفیسر نے سوچا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ فوراً باہر جا کر اپنے احمق بھتیجے سے کہہ دے کہ اسے اس کے قاتلانہ منصوبے کا علم ہو گیا ہے اور اسے فوراً دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دے۔ اس نے اس ارادے کے تحت دروازہ چھوا ہی تھا کہ ایک نئے خیال نے اس کے قدم روک دیے کہ پہلے مجھے سری چند کے منصوبے کی تفصیلات معلوم کر لینی چاہئیں۔ اس طرح اسے شرمندہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ ذہن پر ذرا سا زور ڈالنے سے پروفیسر پر یہ بات واضح ہو گئی کہ سری چند وہ مہلک زہر وسکی کی بوتل میں ملانے کی کوشش کرے گا کیونکہ گھر میں وسکی صرف وہ پیتا ہے۔
تجربہ گاہ سے نکل کر اس نے سری چند کو ادھر اُدھر تلاش کیا۔ ملازمہ بدستور گھر کی صفائی میں مصروف تھی۔ ''سری چند کہاں گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''صاحب جی! وہ... اوپر گئے تھے۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔
''ہوں۔'' پروفیسر رندھیر نے ہنکارا بھرا۔ پھر باورچی خانے میں جا کر ریفریجریٹر کا دروازہ کھولا اور وسکی کی بوتل کھول کر اسے اچھی طرح سونگھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر سری چند نے وسکی میں سائنائڈ شامل کر دیا ہوگا تو اس میں سے کڑوے بادام جیسی بو آئے گی لیکن وسکی میں اس قسم کی بو نہیں تھی۔ اس نے احتیاطاً تھوڑی سی وسکی ایک پیالی میں نکال کر تجربہ گاہ میں اس کا معائنہ کیا۔ وسکی ملاوٹ سے پاک تھی۔
وہ تجربہ گاہ مقفل کر کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ملازمہ صفائی مکمل کر کے گھر سے جا چکی تھی۔ پروفیسر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر اپنے ذہن میں وہ مکالمے دُہرانے لگا جو اسے اپنے بھتیجے کے سامنے ادا کرنے تھے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اگر اس نے سری چند کو ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا تو یہ اس کے مسئلے کا حل نہیں ہوگا بلکہ اس طرح سارا معاملہ التوا میں پڑ جائے گا اور اسے ہمیشہ سری چند کی طرف سے جان کا خطرہ رہے گا۔ اب تو اسے سری چند کے منصوبے کا پتا چل گیا ہے لیکن آئندہ نہ جانے وہ کیا طریقہ اختیار کرے؟ ممکن ہے چھپ کر حملہ کرے۔ اس صورت میں وہ اپنا دفاع مؤثر طریقے سے نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے وہ آئندہ خود حملہ کرنے کے بجائے اسے ہلاک کرنے کے لیے کسی پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کرے۔ دولت کی ہوس آدمی کو اندھا کر دیتی ہے، خاص طور پر ایسے آدمی کو جو عیش و عشرت کی زندگی گزارتے گزارتے اچانک پائی پائی کا محتاج ہو گیا ہو۔
اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ وہ پولیس کو فون کر کے سری چند کو گرفتار کرا دے لیکن وہ آخر یہ کس طرح ثابت کرے گا کہ سری چند کا ارادہ اسے قتل کرنے کا تھا؟ سری چند پر زیادہ سے زیادہ زہر چرانے کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ زہر چرانے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ چور اسے کسی انسان کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سری چند خطرہ بھانپ کر چرایا ہوا زہر ضائع کر دے۔ ایک اونس سائنائڈ ضائع کرنے میں آدھا منٹ بھی نہیں لگتا۔
پولیس کو سیڑھیاں طے کرنے میں اس سے زیادہ وقت لگ جاتا اور اگر سری چند... زہر ضائع کر دیتا تو پروفیسر کو خواہ مخواہ پولیس کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا۔ سری چند صاف بچ جاتا اور آئندہ بہت احتیاط سے کام لیتا۔
اس مسئلے کے مختلف زاویوں پر غور کرتے کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک اس کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک منصوبہ کوندا۔ پروفیسر کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد سری چند اوپر سے آ گیا۔

"سری چند!" پروفیسر نے کہا۔ "آج جمعہ ہے۔ میں تمہیں پیر تک یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ پیر کی شام کو تمہیں ہر صورت میں یہاں سے جانا پڑے گا۔"

"بہت بہت شکریہ انکل۔" سری چند نے قدرے حیرت سے کہا۔

"آؤ بیٹھو، کیا تمہیں تاش کھیلنا آتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔" سری چند نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ کو اپنے کام کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔"

"آج کام کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ ٹھہرو، میں تاش کی گڈی لاتا ہوں۔"

وہ دونوں دوپہر کے کھانے تک تاش کھیلتے رہے، اس دوران میں سری چند پانی پینے کے لیے دو مرتبہ باورچی خانے میں گیا۔ پروفیسر کو بھی ٹھیک اسی وقت دو مرتبہ پیاس لگی۔ وہ بھی سری چند کے پیچھے باورچی خانے میں گیا۔ دراصل وہ اپنے بھتیجے کو ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سری چند نے اعلان کیا کہ اب وہ تاش سے اکتا چکا ہے اور رسالے وغیرہ پڑھنا پسند کرے گا۔ پروفیسر بھی اس کے سامنے علم کیمیا کی ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ سری چند جب بھی باورچی خانے میں گیا، پروفیسر رندھیر سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا رہا۔ ایک مرتبہ پروفیسر نے ریفریجریٹر کھول کر وہسکی کی بوتل بھی نکالی تا کہ اس کا بھتیجا وہ جگہ دیکھ لے جہاں بوتل رکھی رہتی ہے۔

شام پانچ بجے ملازمہ آرتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"رات کا کھانا تیار کر دیا ہے صاحب جی! کل ہفتہ ہے اور پرسوں اتوار۔ میں دو روز تک نہیں آؤں گی۔"

"مجھے یاد ہے آرتی!" پروفیسر نے کہا۔ "اب تم جا سکتی ہو۔"

رات کا کھانا کھانے کے بعد پروفیسر نے برتن دھوئے اور سری چند نے انہیں تولیے سے خشک کیا پھر وہ دونوں کچھ دیر وہسکی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ دس بجے سری چند سونے کے لیے اوپر خواب گاہ میں چلا گیا۔

پروفیسر نے ایک بار پھر اپنے منصوبے کا جائزہ لیا۔

اس نے سری چند کو پیر تک ٹھہرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سری چند اگر اسے زہر دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس کام کے لیے اس کے پاس صرف تین راتیں ہیں۔ آج کی رات، ہفتے کی رات اور اتوار کی رات۔ سری چند کی مجرمانہ ذہنیت کے پیش نظر پروفیسر کو یقین تھا کہ وہ وہسکی میں سائنائڈ ملانے کا کام رات ہی کے وقت انجام دے گا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ سری چند خواب گاہ میں داخل ہو گیا ہے تو وہ دبے پاؤں کرسی سے اٹھا۔ اس نے ریفریجریٹر سے وہسکی کی بوتل نکالی اور اسے تجربہ گاہ میں لے گیا۔ چند منٹ بعد وہ تجربہ گاہ سے باہر نکلا۔ اس نے دروازہ مقفل کیا اور وہسکی کی بوتل دوبارہ ریفریجریٹر میں رکھ دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے باورچی خانے کی تمام کھڑکیاں بند کیں اور بغلی دروازہ مقفل کر کے اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

آج بھی اس نے خواب گاہ کا دروازہ مقفل کر کے اس کے آگے بھاری کرسی لگا دی اور روشنی گل کر کے بستر پر دراز ہو گیا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ غور سے کان لگائے ہر آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

دو بجے کے قریب اسے اپنی خواب گاہ کے سامنے سے کسی کے دبے قدموں گزرنے کی آہٹ سنائی دی۔ اگر اسے اس آہٹ کی پہلے سے توقع نہ ہوتی تو شاید وہ اسے نہ سن پاتا۔ آہٹ سن کر اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

صبح آٹھ بجے عادت کے مطابق پروفیسر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دروازے کے سامنے سے کرسی ہٹائی اور خواب گاہ سے نکل کر سیدھا اپنے بھتیجے کے کمرے میں پہنچا۔ بستر پر شکنیں پڑی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی وہاں سویا ضرور تھا لیکن اس وقت بستر خالی تھا۔

پروفیسر نے اطمینان سے دانت صاف کیے۔ منہ دھویا، لباس تبدیل کیا اور نیچے آ گیا۔ اس نے ہال میں لٹکا ہوا اوورکوٹ پہن لیا، سر پر گرم اونی ٹوپی جمائی اور مکان سے باہر نکل آیا۔ موسم آج بھی خوش گوار تھا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا مکان کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا اور اس نے جیب سے چابی نکال کر باورچی خانے کا بغلی دروازہ باہر سے کھولا۔ دروازہ چند انچ کھلا چھوڑ کر وہ واپس مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے ٹوپی اتاری اور کوٹ کو اس کی مخصوص جگہ پر لٹکا دیا اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے بعد پروفیسر نے سوچا کہ اب باورچی

خانے کی مسموم فضا صاف ہو گئی ہوگی۔ وہ اٹھا اور ہال عبور کرتا ہوا باورچی خانے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ چند لمحوں تک اس نے باورچی خانے کی فضا سونگھی پھر مطمئن ہو کر اس نے باورچی خانے کا بغلی دروازہ بند کر کے اسے اندر کی جانب سے مقفل کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اطمینان سے باورچی خانے میں پڑی ہوئی میز اور کرسی کی طرف دیکھا۔

میز پر وہسکی کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا، کرسی پر اس کا بھتیجا سری چند بیٹھا تھا۔ اس کا سر میز سے ٹکا ہوا تھا اور ایک ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ میز پر تھا۔ اس میں ایک چمچہ دبا ہوا تھا۔ لٹکے ہوئے ہاتھ کے نیچے کاغذ کی ایک پڑیا کھلی پڑی تھی، جس میں رکھا ہوا سفوف زمین پر بکھر گیا تھا۔

سری چند مر چکا تھا۔

پروفیسر رندھیر کھٹپال... کچھ دیر تک باورچی خانے کا جائزہ لیتا رہا پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا اور پولیس کا نمبر گھمانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس پروفیسر کے گھر پہنچ گئی۔ پولیس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ سری چند کی موت اندازاً رات ڈیڑھ اور ڈھائی بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔

"آپ کے خیال میں یہ حادثہ کس طرح پیش آیا پروفیسر؟" پولیس انسپکٹر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ سری چند مجھے زہر دے کر ہلاک کرنا چاہتا تھا۔" پروفیسر نے کہا۔ "آج کل وہ پائی پائی کو محتاج تھا۔ میری موت سے اسے خاصا مالی فائدہ پہنچتا۔ صبح جب میں نے اسے مردہ حالت میں دیکھا تو مجھے شک ہوا۔ میں نے آپ لوگوں کو فون کر کے فوراً اپنی تجربہ گاہ میں رکھا ہوا سامان چیک کیا۔ میرا شبہ صحیح ثابت ہوا۔ تجربہ گاہ سے پوٹاشیم سائنائڈ کی بوتل میں سے ایک اونس سائنائڈ غائب تھا۔"

ایک اونس سائنائڈ کا نام سن کر ڈاکٹر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"کیا وہ غلطی سے سائنائڈ کھا گیا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ اس کے پوچھتے ہوئے لہجے میں اب حیرت سے زیادہ تذبذب کی آمیزش تھی۔

"نہیں... نہیں۔" پروفیسر رندھیر ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "آپ کو شاید معلوم ہو کہ مغربی ممالک میں مجرموں کو گیس چیمبر میں سزائے موت کس طرح دی جاتی ہے؟"

"ہاں! میں نے فارنسک میڈیسن میں اسپیشلائزیشن اسٹیٹ یونیورسٹی سے ہی کیا ہے، اس لیے مجھے معلوم ہے کہ مجرم کو گیس چیمبر میں ہائیڈروسائنک گیس سونگھائی جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن کیا آپ کو اس کے صحیح طریقے کا علم ہے؟" پروفیسر نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر گمبھیر متانت سے پوچھا۔

"نہیں۔" ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔

"خیر، میں بتائے دیتا ہوں۔" پروفیسر بولا۔

"مجرم کو کرسی سے جکڑ کر باندھ دیا جاتا ہے۔ کرسی کے نیچے برتن میں ہائیڈروکلورک ایسڈ رکھا ہوتا ہے۔ باہر سے ایک بٹن دبایا جاتا ہے۔ ہائیڈروکلورک ایسڈ میں پوٹاشیم سائنائڈ کی خاصی مقدار شامل ہو جاتی ہے۔ اس سے فوراً زبردست قسم کا کیمیاوی ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں برتن کی تہ میں پوٹاشیم کلورائڈ بیٹھ جاتا ہے اور ہائیڈروجن سائنائڈ گیس کی شکل میں اوپر اٹھتا ہے اور ہوا میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ گیس اس قدر خطرناک ہوتی ہے کہ مجرم جیسے ہی اس زہر آلود ہوا میں سانس لیتا ہے، اس کی موت فوری طور پر واقع ہو جاتی ہے۔"

"لیکن اس بات کا موجودہ صورت حال سے کیا تعلق ہے؟" پولیس افسر نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے بھتیجے نے جب ریفریجریٹر میں وہسکی کی بوتل رکھی دیکھی تو وہ یہی سمجھا کہ بوتل میں وہسکی بھری ہوئی ہے۔ وہ وہسکی میں پوٹاشیم سائنائڈ شامل کرنا چاہتا تھا تاکہ جب میں وہسکی کا ایک گھونٹ بھروں تو ہلاک ہو جاؤں۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہسکی کی بوتل میں وہسکی نہیں ہے بلکہ ہائیڈروکلورک ایسڈ ہے۔ دراصل مجھے ایک تجربے کے لیے اس تیزاب کی ضرورت تھی۔ اس تجربے کے لیے ضروری تھا کہ تیزاب سرد ہو، اس لیے میں نے وہسکی کی خالی بوتل میں ہائیڈروکلورک ایسڈ بھر کر ریفریجریٹر میں رکھ دیا تھا۔ میرا بھتیجا سائنائڈ پہلے ہی چوری کر چکا تھا۔ اس نے جیسے ہی بوتل میں سائنائڈ ڈالا... چونکہ اس میں وہسکی کی جگہ تیزاب تھا، اس لیے کیمیاوی ردعمل کی وجہ سے اس میں فوراً ہائیڈروجن سائنائڈ گیس پیدا ہونے لگی۔ باورچی خانے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ اس لیے اس فضا میں سانس لیتے ہی وہ ہلاک ہو گیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سویں قسط

للکار

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبار خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے سرپھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ایک للکار ہے

طاہر جاوید مغل

ان عاشق پروانوں کا ماجرا جو اپنے خاص جو للکارتے اور للکارنے کے رسیا تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

[illegible]

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مکافات عمل جارج گورا کو آواز دے چکی تھی مگر ابھی اس نے یہ آواز سنی نہیں تھی۔ وہ اپنی امکانی فتح کے نشے میں چور تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ٹوٹی ہوئی پسلی کی وجہ سے میرے لیے حرکت کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ گردن کے پیچھے سے اور کندھے سے بہنے والے خون نے میرے تقریباً پورے جسم کو رنگین کر دیا تھا۔ میری گردن بدستور جارج کی آہنی گرفت میں تھی۔ یقیناً جارج کو بھی حیرت تھی کہ میں ابھی تک دم گھٹنے کے سبب ہوش و حواس سے بیگانہ کیوں نہیں ہوا۔ اس کا جواب بڑا مختصر تھا۔ میری غیر معمولی برداشت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ورنہ مجھ سے زیادہ تن و توش اور طاقت رکھنے والا جارج کب کا فتح کا جھنڈا لہرا چکا ہوتا۔

میں نے وہی کیا جو میں نے سوچا تھا۔ میں نے جارج کو دھوکا دیا۔ جس کا وہ کافی دیر سے متلاشی تھا۔ اس نے جب میری ٹانگوں تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کی تو میں نے اسے ایسا کرنے دیا۔ جارج اس سنہری موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ وہ مجھے سر سے بلند کر کے اکھاڑے میں پٹخ دیتا تو اس کی عظیم فتح اور بھی چمکدار ہو جاتی۔ جونہی میری ایک ٹانگ پر اس کی گرفت قائم ہوئی اس نے میری گردن کے گرد سے اپنے بازو کی پوزیشن تبدیل کی... پھر ایک زوردار نعرہ... چنگھاڑ کے ساتھ اس نے میرے ستر کلو جسم کو ہوا میں اٹھا لیا۔ تماشائی بنچوں کے بل کھڑے ہو گئے۔

زبردست شور بلند ہوا۔۔۔ میں نے اپنی دھندلائی نگاہوں کے ساتھ سائبان کی چھت کو دیکھا۔ رام پوری چاقو مجھ سے فقط دو، تین فٹ کی دوری پر تھا۔ میں اپنے زخم زخم جسم کے ساتھ جس ہتھیار تک پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہاں تک خود میرے حریف نے مجھے پہنچا دیا تھا۔

یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ اس سے پہلے کہ جارج دوسری مرتبہ چنگھاڑتا اور مجھے اکھاڑے میں پٹختا، اس سے پہلے کہ اس کی فتح کا نقارہ بجتا اور شور قیامت بلند ہوتا، میں سائبان میں اڑے ہوئے چاقو کو اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ اس کے لیے مجھے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا تھا۔ بس ایک ہلکے سے جھٹکے نے مجھے چاقو کا قبضہ سونپ دیا۔ یہ سب کچھ ساعتوں میں ہوا۔

میں نے پہلا وار اوپر سے نیچے کی طرف جارج کی گردن کی جڑ میں کیا۔ آٹھ انچ کا چاقو دستے تک جارج کی چربی دار گردن میں گھسا۔ وہ جیسے ایک لمحے کے لیے سکتے میں رہ گیا۔ اس کی کربناک کراہ میرے کانوں سے ٹکرائی اور مجھے "سیراب" کر گئی۔ جارج اپنے قدموں پر لڑکھڑایا اور پیچھے کی طرف گرا۔ میں بھی اس کے ساتھ گرا۔ جارج کی نیلی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ناقابل یقین نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھٹکے سے چاقو کھینچا اور دوسرا وار اس کے سینے پر کیا۔ "یہ جنگی کے لیے جسے تم نے اپاہج کر کے مارا۔" میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تکلیف کی شدت سے جارج کا منہ وا ہو گیا۔

میں نے چاقو کھینچ کر دوسرا وار اس کے عین دل کے مقام پر کیا۔ ''... اور یہ سلطانہ کی عزت کے بدلے میں...'' میں نے جارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

لو انچ لمبا پھل ایک بار پھر دستے تک اس کے سینے میں گھس چکا تھا۔ اس مرتبہ وہ بے پناہ تکلیف کے سبب بلند آواز میں ڈکرایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں اکڑاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ہزاروں تماشائی یکسر خاموش تھے۔ وہ بھی جیسے اس اچانک تبدیلی کے سبب سکتے کی سی کیفیت میں چلے گئے تھے۔

اس مرتبہ مجھے چاقو جارج کے جسم سے نکالنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے زور لگانا پڑا۔ اس کے زخموں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ آخری وار میں نے اس کے پیٹ پر کیا... اور وار کرنے کے بعد چاقو کو نیچے کی طرف کھینچا... جارج کا پیٹ ناف تک کھل گیا اور انتڑیاں نکل آئیں۔ ''... اور یہ اسحاق کو تڑپا تڑپا کر مارنے کے لیے۔'' میں نے دم توڑتے جارج کے سامنے سرسراتی ہوئی وضاحت کی۔

اس نے سنا لیکن وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اپنی آخری منزل کی طرف اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس کی نظر پتھراتی چلی جا رہی تھی۔ شاہی بالکونی کی طرف سے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان میں ماریا کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ اپنے بھائی کا یہ اچانک انجام دیکھ کر یقیناً اسے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ حیرت کے پہلے شدید جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب تماشائی بھی اپنا ردعمل ظاہر کرنے لگے۔ یہ دو طرح کا ردعمل تھا۔ کچھ لوگ تو شاک کی کیفیت میں تھے اور کچھ غیظ و غضب دکھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ملا جلا شور بھی تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ان میں سے ایک ہاتھ کے اندر خون آلود چاقو بھی تھا۔ میں جیت چکا تھا... اس ہجوم میں میرے سیکڑوں حمایتی بھی تھے لیکن انہوں نے میری فتح کی خوشی میں اچھل کود کی اور نہ نعرہ ہائے تحسین بلند کیے۔ وہ سب سہمے ہوئے تھے۔ جو ہوا تھا، وہ بالکل غیر متوقع تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے ہر کسی کو چپ لگا دی تھی۔ شاہی ردعمل کیا ہوگا؟ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

سائبان کے نیچے جارج گورا کی تازہ لاش پڑی تھی اور شاہی بالکونی کی طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تب میں نے دیکھا کہ بالکونی کے نیچے سے تماشائیوں کا ایک ریلا سا اکھاڑے کی طرف بڑھا۔ بے شک یہ جارج کے مشتعل حمایتی ہی تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ میدان میں داخل ہو کر میری تکا بوٹی کر دینا چاہتے ہوں۔ انہیں روکنے کے لیے کئی درجن گارڈز سامنے آگئے اور انہوں نے اکھاڑے میں کھلنے والا راستہ بلاک کر دیا۔ اسی دوران میں ایک اور اچھی پیش رفت ہوئی۔ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ اکھاڑے میں آ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔ میں نے ایک نظر شاہی بالکونی پر ڈالی... ماریا نوحہ کناں تھی۔ کچھ لوگ اسے سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ حکم جی، ورتنا دیوی اور سرجن اسٹیل وغیرہ کے چہرے بھی دھواں دھواں نظر آرہے تھے۔ شکتی دیوتا، خاک اور خون میں لتھڑا ہوا میرے پاؤں میں پڑا تھا۔ مجھے لگا کہ بارود نما جیلی کہیں، میرے آس پاس ہے اور مسکرا رہا ہے...

☆☆☆

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے غیر یقینی اور پُرخطر تھے۔ میں زرگاں کے سرکاری اسپتال میں تھا۔ میری گردن کے ٹوٹے ہوئے ٹانکے دوبارہ لگے تھے اور میری مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ سب سے پریشان کن صورت حال میرے دائیں پہلو کی تھی۔ نیچے سے چوتھی پسلی ٹوٹ گئی تھی... یہاں جارج کی ایک تباہ کن ٹھوکر لگی تھی۔ اس نے وزنی جوگرز پہن رکھے تھے۔ پسلی میں ایک بڑا فریکچر ہوا تھا۔ تاہم خوش قسمتی سے اندھا دھند لڑائی کے باوجود پسلی ''ڈس لوکیٹ'' نہیں ہوئی تھی یا شاید ''ڈس لوکیٹ'' ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے مقام پر آ گئی تھی۔ ڈاکٹر سے مشورے کے بعد عمران نے مجھے بتایا۔ ''تمہیں کم از کم تین ہفتے آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی تم یہاں سے جانے کے قابل ہو سکو گے۔''

''اور ان تین ہفتوں میں یقیناً جارج کے حمایتی اپنا کام کر گزریں گے۔ کسی رات وہ اسپتال میں گھسیں گے اور میری باقی پسلیاں توڑ کر مجھے اللہ کو پیارا کر دیں گے۔''

عمران میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔ ''اب یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جگر! تم نے جارج گورے کو شکست دی ہے، کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو نہیں پچھاڑا۔ شکتی دیوتا کو ہرانے کے بعد اب تم شکتی دیوتا ہو۔ لوگ نہ بھی مانیں، پھر بھی ان کا دل دماغ تو یہی کہتا ہوگا کہ اب تم ''شکتی دیوتا صاحب'' کی جگہ پر ہو۔ اور شکتی دیوتا صاحب کی چاہے ایک پسلی ٹوٹی ہوئی ہو، اس پر شب خون مارنا آسان نہیں ہوتا...''

''مجھے ہنسی پہ ہنسی آرہی ہے ہونا'' میں نے کراہ کر

ہوئے کہا۔

''نہیں جگر!'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''تم نے وہ کر دکھایا ہے جو یہاں کے لوگ مدتوں یاد رکھیں گے... اور کچھ تو آخری دم تک بھول نہیں سکیں گے۔ بے شک تمہاری فتح پر کسی نے جشن نہیں منایا، کہیں ڈھول نہیں بجے ہیں اور نہ چراغاں ہوا ہے لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ زرگاں کے بے شمار لوگوں کے دلوں کے اندر ضرور جشن کا سماں ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں اور نچلی نسلی ذاتوں والے ہندو بھی۔ اور وہ سب لوگ بھی جن کو کسی نہ کسی طور جارج کی من مانیوں اور زیادتیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ تمہیں پتا ہے کل رات جارج کی جیل میں کیا ہوا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔

وہ دائیں بائیں نظر دوڑا کر سرگوشی میں بولا۔ ''کسی نے راتوں رات جیل کی دیواروں پر چاکنگ کر دی ہے۔ قیدیوں کو جارج گورے کی موت کی مبارک باد دی گئی ہے اور اس کے بارے میں اور بھی کئی سخت باتیں لکھی گئی ہیں۔ اس حرکت کے شبے میں دو تین قیدی گرفتار ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں آج دوپہر جارج کی آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد جیل میں اور گرفتاریاں بھی ہوں گی۔ پانڈے اس سلسلے میں بڑا سرگرم ہے۔''

''لیکن پانڈے تو کل رات تک یہیں اسپتال کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔''

''وہ ان گارڈز کا انچارج تھا جو یہاں اسپتال میں تمہاری حفاظت پر مامور ہیں۔ رات گئے میں نے اور میڈم صفورا نے مشورہ کیا۔ اس مشورے کے بعد میڈم صفورا نے پنڈت مہاراج سے رابطہ کیا اور ان سے کہا کہ رنجیت پانڈے جیسے افسر کو تمہاری سکیورٹی کا ذمے دار بنانا ٹھیک نہیں۔ پنڈت مہاراج نے انتظامیہ سے بات کی اور پانڈے کو اس کے ماتحتوں سمیت یہاں سے ہٹوا دیا۔ اب میڈم صفورا والا پرائیویٹ اسٹاف ہی یہاں ڈیوٹی دے رہا ہے اور میں خیر سے اس اسٹاف میں اسسٹنٹ انچارج ہوں۔'' عمران نے اپنے یونیفارم کے بازو پر لگے سرخ نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ جھٹ بولا۔ ''نیوز چینل کا چیلا... میرا مطلب ہے نمائندہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہمیشہ بُری خبریں ہی دوں گا۔ ابھی پچھلے سے پچھلے مہینے میں نے ''یہ ذبان خود'' قوم کو بڑی اچھی خبر سنائی تھی۔''

''وہ کیا؟'' میں نے درد سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے کہا۔

''میں نے کہا تھا، ناظرین آج کوئی خبر نہیں ہے۔''

''تو یہ اچھی خبر تھی؟''

''بالکل، اس دور میں تو ایسی خبروں کو بھی اچھا ہی سمجھنا چاہیے۔ اتنی تیزی سے خبریں آرہی ہیں اور اتنی بُری کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ پچھلے ہفتے ہمارے ایک ساتھی کی سالی لاپتا ہو گئی۔ ہمارے ساتھی کو اس ''گمشدگی'' سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ کہیں کوئی دوسرا چینل یہ خبر پہلے نشر نہ کر دے۔ لہٰذا اس نے پہلے سالی کے اغوا کی خبر چلائی۔ پھر تصدیق کرنے کے لیے گھر ٹیلی فون کیا تو سالی صاحبہ کہیں سے اپنی لوڈ کرا کے واپس بھی آ چکی تھیں... اس کے بعد موصوف کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ واقعی ''بریکنگ نیوز'' کے زمرے میں آتا تھا... بیوی سے مار کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے، اب یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک... یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک لیکن بیوی نے بھی اس وقت تک بریک نہیں لیا جب تک موصوف کی پسلی کی ہڈی بریک نہیں ہو گئی اور... اور زبان میں فریکچر نہیں ہو گیا۔''

''زبان میں فریکچر؟ تمہارا مطلب ہے زبان میں ہڈی ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تو تم کیا سمجھتے ہو، ہم ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے یوں ہی بول لیتے ہیں؟''

''تم میڈیا پر طنز کرتے ہو مگر میڈیا کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ مجھے اس وقت درد ہو رہا ہے ورنہ میں اس موضوع پر لمبی بحث کر سکتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تمہارے اچھے ہونے کا انتظار کر لیتے ہیں۔'' اس نے فراخ دلی سے کہا۔ کل صبح والے خونی مقابلے اور اس کے انجام کے بعد سے زرگاں میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کے سارے جذبات یعنی غصہ، خوف، حیرت، خوشی... سب کچھ اس خاموشی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ جارج کے حمایتیوں میں زیادہ تر اعلیٰ طبقے اور کھاتے پیتے لوگ شامل تھے... انہیں جارج کی شکست اور موت بڑی مشکل سے برداشت ہوئی تھی۔ ایک طرح سے یہ ایک نہایت کڑوی گولی تھی جو انہیں کسی نہ کسی طور نگلنا پڑی تھی۔ دھرم کے حوالے سے یہاں انصاف کا ترازو پنڈت مہاراج کے ہاتھ میں تھا اور اسے وہی کچھ کرنا تھا جو کتابوں میں درج تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت، موقع دیکھ کر عمران پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے پاس چلا آیا۔ اس نے گلاب کی ایک کلی میرے سرہانے رکھ دی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! تمہارا کیا خیال ہے... جارج کی شکست اور موت کی خبر سلطانہ اور اقبال وغیرہ تک پہنچ گئی ہوگی؟''

''ہاں، میں بھی کل سے یہی سوچ رہا ہوں۔ ویسے جگر! اتنی بڑی خبر ہے کہ پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں اس کی گونج سنائی دی ہوگی۔ مجھے نہیں لگتا کہ کنج پور والے بے خبر ہوں گے۔''

''لیکن سلطانہ وغیرہ تو مندر کے تہ خانوں میں ہیں اور تم نے آفتاب خاں کو تہ خانوں میں جانے سے منع کر دیا تھا۔''

''مگر اشد ضرورت کے وقت وہ جا بھی سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی خوش خبری سنانے کے لیے اس نے مندر کا ایک چکر لگا ہی لیا ہو۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک زخمی چڑیا کی طرح ہر وقت پھڑپھڑاتی رہتی تھی۔ جارج کی شکست اور میری کامیابی کی خبر اس کے زخموں پر مرہم کا کام دے سکتی ہے... بلکہ ضرور دے گی۔''

شاید میں مزید بھی کچھ کہتا مگر اسی دوران میں دروازے پر گارڈز نمودار ہوئے۔ ان کے عقب میں میڈم صفورا، میجر مدن اور پنڈت مہاراج کی صورتیں نظر آئیں۔ پنڈت مہاراج کی تعظیم کے لیے میں نے تکیے سے سر اٹھایا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پنڈت مہاراج کے ساتھ ایک جواں سال، قبول صورت لڑکی بھی تھی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ باقی جسم گرم شال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حزن و ملال کی عجیب سی کیفیت تھی۔

میڈم صفورا نے ہولے سے کہا۔ ''یہ تمہارے دوست اسحاق کی بھاوج حمیدہ ہے۔ وعدے کے مطابق پنڈت مہاراج اسے تمہارے سپرد کرنے کے لیے آئے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر چونک کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے مجھے سلام کیا اور خاموش ہوگئی لیکن اس کی خاموشی بات کر رہی تھی۔ یہ خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''میرے محسن! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میں ایک درندے کی تحویل میں تھی۔ اس نے میرے دیور کو موت کے جال میں جکڑنے کے لیے مجھے چارا بنا رکھا تھا اور وہ کامیاب ہوا۔ اس نے میرے بھائی جیسے دیور کو سولی پر لٹکایا اور اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا اور اب میری باری آنے والی تھی۔ میں اس کے ''بستر ہوس'' پر پامال ہونے والی تھی۔ میرا روگ اذیت ناک موت کا دوسرا نام تھا۔ تم مسیحا بن کے آئے... تم نے میرے زہر کو تریاق دیا اور میری زنجیروں کو پگھلا کر مجھے پھر سے زندہ کیا۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟''

پنڈت مہاراج نے اپنے مخصوص اسٹائل سے اپنے لمبے بالوں کو کندھوں کے پیچھے پھینکا اور ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''اب تمہارا حال کیسا ہے؟''

''مجھے پہلے سے بہتر لگ رہا ہے مہاراج۔''

''بھگوان نے چاہا تو تم جلد ہی بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔ یہاں تمہیں ہر طرح کی سہولت ملے گی... اور پوری رکھشا بھی کی جاوے گی۔''

''مجھے آپ کے انصاف پر پورا بھروسا ہے۔'' میں نے کہا۔

پنڈت مہاراج نے حمیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ تمہاری امانت ہے۔ تم جیسے ہی ٹھیک ہو گے، اسے یہاں سے لے جا سکو گے۔ ٹھم جی نے اس سلسلے میں ضروری ہدایتیں دے دی تھیں۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر پنڈت مہاراج اور ٹھم جی کا شکریہ ادا کیا۔

پنڈت مہاراج نے مجھے بتایا کہ میرے صحت یاب ہونے تک حمیدہ لال بھون میں میڈم صفورا کے پاس رہے گی اور وہاں اس کی حفاظت کا پورا انتظام ہوگا۔

کچھ دیر بعد پنڈت مہاراج اپنے ساتھیوں اور گارڈز وغیرہ کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میڈم صفورا بھی اسحاق کی بھاوج حمیدہ کو لے کر لال بھون چلی گئی۔ میں ایک بار پھر اپنے سفید بستر پر اکیلا رہ گیا۔

سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا۔ شہر کی فضا بھی پُرسکون تھی۔ اس کے باوجود محسوس ہوتا تھا کہ سینوں کے اندر ہلچل موجود ہے۔ شہر کے باسی اپنے اپنے طور پر اس بہت بڑے واقعے کے اثرات سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ اسپتال سرجن اسٹیل کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ یہاں تین سفید فام ڈاکٹروں کے علاوہ دو تین مقامی ڈاکٹر بھی کام کرتے تھے۔ یہ مقامی ڈاکٹر وہ تھے جنہوں نے ڈاکٹر چوہان ہی کی طرح انڈین حکومت سے بھاگ کر اس دشوار گزار علاقے میں پناہ لی ہوئی تھی۔ بے شک یہاں میرا علاج ہو رہا تھا لیکن یہ اندیشے اپنی جگہ موجود تھے کہ علاج ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ میں اپنے حفاظتی انتظامات پر

پورا بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس حوالے سے عمران یہاں موجود نہ ہوتا تو شاید میں مسلسل تناؤ کا شکار ہو جاتا۔

سہ پہر کے وقت بتدریج اندھیرا چھا گیا اور پھر تیز بارش شروع ہوگئی۔ سردی میں اضافہ ہو گیا۔ ایک چھوٹی انگیٹھی میرے قریب دہکا دی گئی۔ کچھ دیر بعد عمران بھی مجھے کمپنی دینے کے لیے میرے پاس آ بیٹھا۔ گارڈز کی ہلکی نیلی یونیفارم اس کے جسم پر سج رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس پر ہر لباس ہی جچتا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! سچ پوچھو تو تمہاری کہانی ایک گہرے دکھ کی طرح میرے دل کی تہ میں بیٹھ گئی ہے۔ میں نے شبانہ کو دیکھا نہیں، پر اس کی غم زدہ صورت نگاہوں میں گھومتی رہتی ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا۔ تم دونوں لمبے عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ تمہارے رستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ راجا اور کبیر صاحب وغیرہ بار بار تم سے کہتے رہے کہ شادی کر لو... اور تم نے نہیں کی۔''

''اسی کو تقدیر کہتے ہیں جگر! کبھی بہت آسان کام بھی نہیں ہو پاتے اور کبھی ناممکن، ممکن ہو جاتا ہے۔ باقی جہاں تک شادی نہ ہونے کی بات ہے تو اس میں مجھ سے زیادہ شبانہ ہی کا قصور تھا۔ وہ اپنے فیصلے میں اپنے گھر والوں کو شامل کرنا چاہتی تھی۔ اس بے چاری کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا اور حالات اس طرح پلٹا کھا جائیں گے۔''

''یار! وہ تو لڑکی تھی۔ اس کی سمجھ محدود تھی مگر تم نے تو [illegible] سرد گرم دیکھا ہوا تھا۔ تمہیں تو پتا ہونا چاہیے تھا کہ ایسے معاملے کسی بھی وقت الٹ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم اصرار کرتے اور زور دیتے تو وہ شاد پورہ میں تم سے شادی پر رضا مند ہو جاتی۔''

عمران نے گہری سانس لی۔ ''سانپ کی لکیر پیٹنے سے بھی کوئی فائدہ ہوا ہے جو تمہیں ہوگا؟ ایسی باتیں دہرانے سے بس دکھ ہی بڑھتا ہے۔ جو بگڑنا تھا سو بگڑ گیا... جو ابھی نہیں بگڑا اسے بچانا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ حال کے بارے میں سوچنا چاہیے اور حال میں... سلطانہ بھی شامل ہے... اس نے تمہیں بہت چاہا ہے، تمہارے لیے پورے زرگاں سے ٹکر لی ہے۔ جب تم اپنے ہوش میں نہیں تھے، وہ تمہارے بچاؤ کے لیے ایک دیوار بن کر کھڑی رہی ہے۔ ایسی ہمت والی بے جگر عورتیں کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ بہت انوکھی ہے... اور تمہارے لیے اس کا پیار بھی اتنا ہی انوکھا ہے۔ لوگ شادی سے پہلے رومانس کرتے ہیں لیکن اس نے تم سے شادی کے بعد رومانس کیا اور ایسا کیا کہ حق ادا کر دیا۔ اب اسے تمہاری محبت اور سہارے کی ضرورت ہے تابی۔''

میری نگاہوں میں سلطانہ کا چہرہ گھوم گیا۔ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں، اناری جیسا رنگ، پتلی کمر لیکن مضبوط جسم جس سے جنگلی پھولوں کی باس آتی تھی... وہ میرے لیے سراپا محبت اور اطاعت تھی۔ شاید میں اسے پہاڑ سے کودنے کے لیے کہتا تو وہ بس ایک بار میری خواہش کی تصدیق کرتی اور پھر کود جاتی۔ میرا دل اس کے لیے محبت سے بھر گیا۔ جی چاہا کہ اڑ کر اس تک پہنچ جاؤں... مگر پھر اچانک دل میں یہ وسوسہ جاگا، کہیں میرے اور سلطانہ کے درمیان بھی تو کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو جائے گی؟ آنکھوں کے سامنے ہاشو کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ایک انتہا پسند شخص ثابت ہوا تھا۔ اس کے پاس سے نیلگوں زہریلے پاؤڈر کے جو پیکٹ ملے، ایسا ہی زہر سلطانہ کے پاس بھی موجود تھا۔ یہ زہر ایک پڑیا میں تھا اور یہ پڑیا اب میرے پاس تھی۔ سلطانہ کے پاس یہ زہر کیوں تھا؟ کہیں... کسی طور اس کا تعلق بھی تو ہاشو وغیرہ سے نہیں تھا؟ یہ سنگین سوال بار بار میرے ذہن میں ابھرتا اور مجھے جھنجوڑ دیتا۔ سلطانہ بھی ایک باغی تھی۔ اپنی دلیر والدہ کی طرح وہ بھی خطروں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ مرنا اور مارنا جانتی تھی... زرگاں کے باشر ہندوؤں سے اس کا ٹکراؤ دیرینہ تھا۔ کہیں وہ بھی تو زرگاں میں موجود ''خطرناک شدت پسندی'' کا حصہ تو نہیں تھی؟

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عمران نے میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''بالکل غلط۔ سائیکالوجسٹ نادرا اکبر گوندل صاحب نے کہا ہے کہ انسان کا دماغ کچھ سوچے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ہم ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں۔''

''یہ نادرا اکبر گوندل تو شاید کسی پولیس افسر کا نام تھا؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، پولیس افسر سائیکالوجسٹ نہیں ہوتے؟ گدھے! ان سے بڑا نفسیات داں اور کون ہو گا۔ عشق کا بھوت سب سے تگڑا ہوتا ہے۔ یہ اسے بھی دو چار گھنٹے میں اتار دیتے ہیں اور ''مریض'' اپنی محبوبہ کو باجی کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ یہ لوگ ''چھترول'' کے ذریعے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تحلیل نفسی کرتے ہیں اور ماضی کے ان سارے حادثوں کا پتا چلا لیتے ہیں جو کبھی وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے ہوتے۔ دیگر امراض کے علاوہ ''کنجوسی'' بھی دراصل ایک نفسیاتی روگ ہے۔ ان معالجوں کے علاج سے یہ بھی جڑ سے ختم ہو جاتا ہے۔ مریض اپنی ساری جمع پونجی بلکہ قرض اٹھائی ہوئی رقوم بھی بے دریغ خرچ کرتا اور لٹانا شروع کر دیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی اس ''فیاضی'' کا ننانوے فیصد فائدہ بھی اس کے معالجوں کو ہی ہوتا ہے...''

اچانک زور سے بجلی چمکی۔ میں اور عمران کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔ بارش زور پکڑ رہی تھی۔ دن میں ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ بعد بادل زور سے گرجے اور در و دیوار دہل گئے۔ عمران سگریٹ کا کش لے کر زخمی انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''دیکھا تم نے۔ آسمانی بجلی مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ میں باہر برآمدے میں نکلا نہیں اور جل کر کوئلہ ہوا نہیں۔''

اس کے لہجے نے مجھے آزردہ کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''یار! یہ وہم پرستیاں ہمارے دماغوں سے کس طرح نکل سکتی ہیں... کس طرح ہم ان پھپھوندی زدہ عقیدوں کے جال کو توڑ سکتے ہیں؟''

''اس کا کوئی فوری حل نہیں۔ اس کے لیے کوشش کرنا ہوگی، طویل انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے لیے انسان کے اندر کی مضبوطی درکار ہے۔ اور اندر کی مضبوطی میں سب سے اہم کردار علم کی روشنی کا ہے... نالج از پاور... اور سیانے کہتے ہیں جہاں ''پاور'' بڑھتی جاتی ہے وہاں ''ہارر'' کم ہوتا جاتا ہے۔''

''مگر یار! عقل سلیم بھی تو کوئی شے ہے۔ بڑی بڑی ہستیاں اس دنیا میں ایسی آئی ہیں جو ان پڑھ تھیں مگر انہوں نے خداداد عقل سے سچ اور جھوٹ میں پہچان کی ہے۔ بیکار عقیدوں پر لعنت بھیج کر انہیں کچرے کے ڈھیر پر پھینکا ہے۔''

عمران مسکرایا اور مقامی زبان کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک کہوت ہو بھیا۔ لیکن میں عام لوگن کی بات کرت ہوں۔ یہ جو عام لوگن ہووت ہیں نا، یہ بڑے کنفر ہووت ہیں۔ جہاں اڑ گئے بس اڑ گئے۔ پہاڑ میں سے زندہ اونٹنی نکلنے والا معجزہ دیکھ لیں پھر بھی نہ ماننے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں... اگر تمہاری بیکار سمجھ میں نا ہیں آیا تو میں تمہیں ایک اور مثال دیوت ہوں...''

وہ ایک بار شروع ہوا تو پھر بولتا چلا گیا... اس کے پاس ہر موضوع پر باتوں کا ذخیرہ رہتا تھا۔ اچانک دروازے سے باہر شور سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے گارڈز کسی شخص کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر یکایک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سانولے رنگ کا ایک شخص طوفانی رفتار سے میری طرف بڑھا۔ اس کے لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اسپتال کے عملے کا ہی آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار آلہ چمک رہا تھا۔ وہ چلاتا ہوا خطرناک انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ لیکن وہ مجھے نقصان کیسے پہنچا سکتا تھا؟ میرے اور اس کے درمیان عمران تھا۔ وہ شخص جو میری طرف بڑھنے والے ہر خطرے کے لیے ایک فلک بوس آہنی دیوار تھا۔ حملہ آور دوگنا پھرتی کا مظاہرہ بھی کرتا تو عمران کو جل نہ دے سکتا۔

عمران نے مجھ سے دس بارہ فٹ دور ہی اسے روک لیا۔ ''مار دوں گا۔'' حملہ آور گرجا اور اس نے اندھا دھند عمران پر وار کیا۔ عمران نے نیچے جھک کر تیز دھار آلے کا وار بچایا اور اسے اس طرح بازوؤں میں جکڑا کہ اس کا آلے والا ہاتھ بھی بازوؤں کے گھیرے میں آگیا۔ عمران اسے دھکیلتا ہوا دیوار کی طرف گیا۔ یہ کافی تیز رفتار عمل تھا۔ حملہ آور کا سر شدت سے پختہ دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ ڈکرانے والے انداز میں چلایا۔ تیز دھار آلے پر اس کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی۔ عمران نے پاؤں کی ٹھوکر سے یہ آلہ اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ دو تین گارڈز بھاگتے ہوئے آئے اور حملہ آور سے لپٹ گئے۔ فرش پر گرنے والا تیز دھار آلہ دراصل سرجری میں استعمال ہونے والا ایک خطرناک کٹر تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص سرجن اکشئے کے ماتحت عملے میں سے تھا اور اس کا تعلق اسی برادری سے تھا جس کے دو افراد نے چند روز پہلے لال بھون میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ دونوں افراد لال بھون کے گارڈز میں شامل تھے۔

سر پر لگنے والی سخت چوٹ کے سبب حملہ آور نڈھال ہو گیا، اس کے باوجود اس کا واویلا جاری تھا۔ ''تم مکار ہو، تم نے دھوکا کیا ہے۔ سرجارج نے تم کو بازوؤں پر اٹھا لیا تھا۔ تم ہار چکے تھے۔ تم نے ہارنے کے بعد ان پر وار کیا۔ تم نے ناتیں پائی، تم نے... ہتھیا کی ہے۔ تم ہتھیارے ہو۔ تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ اس جنم میں بھی اور بعد کے ہر جنم میں بھی...''

وہ دہاڑتا رہا۔ گارڈز اسے کھینچ کر باہر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر اچھل اچھل کر بول رہا تھا۔ ''تم نے ایک مہان ہے۔ ایک ایسے بندے کو مارا ہے جس کی

گھروں کے چولہے جلتے تھے۔ ہزاروں کنیاؤں کی ڈولیاں اٹھی تھیں۔ بھگوان تمہیں کبھی شما نا ہیں کرے گا... اور نہ ہم کریں گے۔'' وہ اتنے زور سے بول رہا تھا کہ اس کی آواز بیٹھ گئی اور الفاظ گڈمڈ ہو گئے...

گارڈز اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ تیز دھار آلہ عمران کے ہاتھ میں تھا۔ عمران نے مزید احتیاط کے طور پر میرے کمرے کی طرف آنے والے تمام دروازے بند کرا دیے اور نگرانی پر مامور گارڈز کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔

''ایک بار پھر جان بچانے کا شکریہ۔'' میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایسی احمقانہ حرکتیں کرتے ہو۔''

''تم دیکھ ہی رہے ہو، میں نے کچھ نہیں کیا بلکہ ابھی تو میں کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔''

''ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا پھر میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھا! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسی بارے میں بات کر رہے تھے۔ توہم پرستی کا روگ آسانی سے جان نہیں چھوڑتا۔ ایسے روگیوں کے پاس ہر بڑی سے بڑی دلیل کا جواب موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنے پھپھوندی زدہ عقیدوں کو اپنے سامنے پاش پاش ہوتے دیکھتے ہیں لیکن انہیں پھر سے جوڑ لیتے ہیں۔ اب دیکھو... یہ وہی لوگ ہیں جو کہہ رہے تھے کہ تمہاری پتنی کے پاپ کی وجہ سے تمہاری شکست لازم ہے۔ اب وہ اس لڑائی کے نتیجے کو ہی تسلیم نہیں کر رہے۔ لیکن ایسا کرنے والے بہت کم لوگ ہی ہوں گے۔ جو کچھ ہوا ہے وہ ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کے پاس فیصلہ کرنے کی اتھارٹی تھی، انہوں نے بھی متفقہ طور پر تمہیں فاتح قرار دیا ہے۔''

''یہ بندہ کیا کہتا جا رہا تھا؟''

''یہ بڑا کنفیوژ ہو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ جارج تمہیں بازوؤں پر اٹھا کر سر سے بلند کر چکا تھا... اور لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ یہ بات کوئی نہیں مانے گا۔ ساہمر کے اصولوں کے مطابق لڑائی تب ختم ہوتی جب وہ تمہیں اکھاڑے میں پٹخ دیتا۔ خیر چھوڑو، یہ لاحاصل بحث ہے۔ اب نئی صورت حال نوٹ کرو۔ تم پر پھر قاتلانہ حملے کی کوشش ہوئی ہے... یہ خبر بھی دو تین گھنٹے کے اندر پورے رنگاں میں پھیل جائے گی۔ لوگوں میں پھر ہلچل پیدا ہوگی۔ شہر کی آبادی پہلے ہی دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔''

''یہ سب دیکھتے سمجھتے ہوئے تو یہی لگتا ہے عمران کہ جتنی جلدی ہو ہم یہاں سے نکل جائیں۔''

''تمہارے زخموں کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم کوشش کرتے۔''

''اب بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی ذمے داری پر جانا چاہیں تو انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

''اعتراض کی بات تو ہے یار! ابھی تم چلنے کے قابل بھی نہیں ہو۔ دشوار راستوں کا طویل سفر تو دور کی بات ہے۔''

☆☆☆

میرے اگلے چار پانچ روز کافی تکلیف میں گزرے لیکن پھر بتدریج طبیعت بہتر ہونے لگی۔ میری سیکیورٹی پہلے سے زیادہ سخت کر دی گئی تھی۔ عمران بھی زیادہ وقت میرے آس پاس ہی گزارتا تھا۔ تاہم کسی وقت وہ اوجھل بھی ہو جاتا... ساتویں کے جشن کے روز جو گاڑی اس نے انعام میں جیتی تھی، وہ اسے مل گئی تھی۔ وہ کسی وقت اس پر سیر کے لیے بھی نکل جاتا۔ ایک دو بار وہ اپنے ساتھ گیتا کو بھی لے گیا۔ اس کی یہ مصروفیت میرے لیے پریشان کن تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ تو یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ میرا قریبی ساتھی ہے اور مجھے بھانڈیل اسٹیٹ سے نکالنے کے لیے یہاں آیا ہوا ہے مگر یہ تو سب جانتے تھے کہ وہ بھی پاکستانی ہے اور میری ٹریننگ وغیرہ میں میرا ساتھ دیتا رہا ہے۔

میں نے ایک دو بار اسے آزادانہ گھومنے سے منع بھی کیا لیکن وہ مستانہ تھا... دوستیاں بنانا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور وہ مشکل ترین لوگوں میں بھی اپنے پرستار پیدا کر لیتا تھا۔ یہاں بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر پھر ایک روز ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی ہم دونوں میں سے شاید کسی کو توقع نہیں تھی۔

منجھر مدن میرے پاس آیا اور بولا۔ ''تمہیں پتا چلا ہے، عمران کو چوٹیں لگی ہیں۔''

''کیسے؟'' میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے پوری جانکاری تو نا ہیں... لیکن معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اس سے اس کی گاڑی چھینی ہے۔''

میں نے ماتھا پکڑ لیا۔ مدن نے کہا۔ ''ویسے پر ایمرجنسی والے کمرے میں اس کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ ویسے وہ بالکل خیریت سے ہے۔''

یہ پریشان کن خبر تھی۔ کچھ ہی دیر بعد عمران سر اور ہاتھ پر پٹی باندھے مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ ''شاباش! یہ کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکھایا ہے تم نے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "ضرورت مند ڈاکو تھے۔ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بھائی صاحب! یہ ہماری پہلی پہلی واردات ہے۔ اگر کوئی غلطی ہو گئی تو معاف کر دیں۔ میں سمجھ گیا کہ انہوں نے کیا غلطی کرنی ہے۔ انہوں نے ڈر کر خواہ مخواہ ہی گولی چلا دینی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ مفت میں گولی کھانے کے بجائے، ان کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی کر دی جائے۔ کیریئر کے شروع میں تو جوانوں کو واقعی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔"

میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر جھانکنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ کبھی کبھی حیران کن فیاضی کا مظاہرہ بھی کر جاتا ہے۔ میں نے کہا۔ "کہیں سچ سچ کسی کو تحفے میں تو نہیں دے آئے گاڑی؟"

"تابش صاحب! اگر دے بھی آیا ہوں تو کسی دوسرے کی دُم پر تو پاؤں نہیں آنا چاہیے۔ میری اپنی گاڑی تھی۔"

شاید وہ پھر اپنی ہانکنا شروع کر دیتا مگر مجھے سنجیدہ دیکھ کر اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔ ویسے بھی نیجر کی موجودگی میں وہ میرے ساتھ زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ زرگاں کی نہر کے ساتھ ساتھ کچھ آگے تک چلا گیا۔ واپسی پر جیپ کا پہیا پنکچر ہو گیا۔ وہ پہیا بدل کر اٹھ ہی رہا تھا کہ چار بندوں نے اس پر اسلحہ تان لیا۔ اس کے پاس میڈم صفورا کا فراہم کردہ پستول تو موجود تھا مگر وہ جیپ کے ڈیش بورڈ میں رکھا تھا۔ ایک شخص نے اچانک اس پر پیچھے سے رائفل کے دستے کا وار کیا، وہ گر گیا۔ انہوں نے اس پر دو رائفلیں تانے رکھیں اور جیپ لے کر نکل گئے۔

عمران جیسے بندے سے یوں گاڑی چھین کر لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ کئی دفعہ جب بندہ خطرے کی طرف سے بالکل غافل ہوتا ہے تو بے دست و پا ہو بھی سکتا ہے۔ پھر عمران کو جو چوٹیں لگی تھیں، ان سے بھی تصدیق ہوتی تھی کہ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔

عمران نے میری تفتیشی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تابش صاحب، ابھی تمہاری پوری تسلی نہیں ہوئی... یہ حقیقت وہی ہے جو میں نے بتا دی ہے۔ میں لڑائی بھڑائی کر سکتا تھا لیکن اس میں کافی "رسک" تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو دن میں ہی حکم جی کے ہرکارے کہیں نہ کہیں سے گاڑی برآمد کر لیں گے۔ یہاں کوئی ایسا قبائلی علاقہ تو ہے نہیں جہاں لے جا کر گاڑی کا مدعا غائب کر دیا جائے۔"

میجر مدن لال بولا۔ "خیر، اس لحاظ سے تو تم نے واقعی عقل مندی کی ہے کہ گاڑی کے لیے کوئی بڑا خطرہ مول نہیں لیا۔ وہاں اس علاقے میں اس طرح کی کچھ وارداتیں پہلے بھی ہوئی ہیں۔ راہزنوں کی دو تین ٹولیاں ہیں جو ایسے کام کرتی رہتی ہیں۔ لیکن عام طور پر ان کی واردات پکڑی جاتی ہے۔"

اسی دوران میں شاہی محافظوں کا ایک لمبا تڑنگا انچارج اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے عمران کی خیر خیریت دریافت کی پھر اس سے واقعے کی تفصیل جاننے میں مصروف ہو گیا۔

اسی روز شام کو اطلاع ملی کہ زرگاں کی جیل میں زبردست بلوا ہوا ہے۔ قیدیوں نے جیل توڑنے کی کوشش کی ہے۔ جیل کی انتظامیہ نے پہلے ہوائی اور پھر سیدھی فائرنگ کی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں کم و بیش آٹھ قیدی ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے ہیں۔ طاقت کے بے رحمانہ استعمال کے بعد انتظامیہ قیدیوں کو واپس بیرکوں میں بند کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے مگر کشیدگی برقرار ہے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد عمران اس سلسلے میں پوری تفصیل لے کر آ گیا۔ اس نے بتایا۔ "اس واقعے کی وجہ وہی وال چاکنگ ہی ہے جس میں قیدیوں کو جارج کی شکست اور موت کی مبارک باد دی گئی تھی۔ جیل حکام نے اس سلسلے میں پانچ چھ افراد کو گرفتار کیا تھا۔ پتا چلا ہے کہ بعد میں ان میں سے چار قیدیوں کو ٹیکا لگا کر مار دیا گیا ہے۔"

"کیسا ٹیکا؟" میں حیران رہ گیا۔

"وہی جو ایک دفعہ ہماری میڈم صفورا ہمیں لگانے لگی تھی۔ اس نے ساری تفصیل تو بتائی تھی تمہیں۔ وہ درد کا ٹیکا ہے لیکن درد روکنے والا نہیں، درد شروع کرنے والا۔"

مجھے ساری تفصیل یاد آ گئی۔ وہ ہیزی مائل مہلک دوا جس کے بارے میں میڈم نے بتایا تھا کہ یہ بندے کو مچھلی کی طرح تڑپاتی ہے اور اس کی دوسری ڈوز اسے زندگی کی سرحد پار کرا دیتی ہے۔ میڈم کے مطابق زرگاں میں سولی کی سزا کے بعد یہ دوسری بڑی سزا تھی اور یہ سزا چار افراد کو صرف اس بنا پر دی گئی تھی کہ انہوں نے اپنے بے رحم صیاد کی موت پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

عمران نے بتایا۔ "ٹیکے کی سزا والی خبر پھیلی تو قیدی مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے گارڈز کی وردیاں پھاڑیں، انہیں مارا پیٹا... اور کوٹھریوں میں بند کر دیا۔ وہ شاید جیل توڑنے میں ہی کامیاب ہو جاتے مگر زبردست فائرنگ نے انہیں بے بس کر دیا۔ اب جیل حکام نے سو کے قریب قیدیوں کو پکڑ لیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان میں سے تیس چالیس قیدیوں کو مثالی سزا دی جائے گی تاکہ باقیوں کو عبرت ہو۔"

"مثالی سزا سے کیا مطلب؟"

"اسحاق والی سزا۔ سرعام سولی پر ٹانگ کر ہڈیوں کا چورا اور پھر موت۔" عمران نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کوئی قانون بھی لاگو ہوتا ہے یہاں؟ یا جو کچھ حکم جی کے دماغ میں آئے وہی قانون ہے۔" میں نے کہا۔

"حکم جی کا تو نام ہی حکم ہے، وہ حکم صادر نہیں کرے گا تو کیا گنگو تیلی کرے گا... لیکن یہ بات سچ ہے کہ اس طرح کی حاکمیت بغاوت کو جنم دیتی ہے اور یہی کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ پکڑے جانے والے زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ دن میں گل پانی سے بھی کوئی گرما گرم خبر آ جائے گی۔ اس سے پہلے بھی زرگاں اور گل پانی میں اسی وجہ سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جارج گورا کی جیل میں انور خان کا ساتھ دینے والے کئی قیدیوں کو سرعام سولی چڑھایا گیا تھا۔"

"لگتا ہے کہ حالات پھر کشیدہ ہو رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کسی گڑبڑ سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔" میں نے پوچھا۔

عمران بولا۔ "کل میڈم صفورا تمہارے ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں کم از کم دس دن اور بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔ لیکن... میرا خیال ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو بہتر بتاؤ... اور ذرا چل پھر کر دکھاؤ تو ہو سکتا ہے کہ چار پانچ دن میں ہی چھٹی مل جائے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ میں اب سفر کر سکتا ہوں۔" میں نے بستر سے اٹھ کر چند قدم کمرے کے اندر ہی چہل قدمی کی۔

"تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تمہیں درد ہو رہا ہے۔"

"درد تو اب اپنا "محبوب" ہے یار! اس کی کوئی پریشانی نہیں ہے مگر کچھ اور باتیں ضرور فکر مند کرتی ہیں۔"

"مثلاً؟" عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے دائیں بائیں دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ حکم جی اور اس کے ہزاروں بے رحم ہرکارے ہمیں حمیدہ سمیت یہاں سے نکل جانے دیں گے؟"

"یہ بات واقعی سوچنے کی ہے۔" عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ بندئہ مہاراج نے یہاں انصاف کا جھنڈا تھاما ہوا ہے۔ وہ یہاں وہی کچھ کر رہا ہے جو دھرم کی کتابوں اور پوتھیوں شاستروں وغیرہ میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن اندر سے اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ وہ بھی اسی حد تک جا سکتا ہے جس حد تک اسے اپنی خیریت نظر آئے گی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو... کیا ہمیں یہاں سے روانہ کرنے کی باتیں بس ڈھکوسلا ہیں؟"

"خیر، ایسا تو نہیں ہے۔ زرگاں کے مسلمانوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لیے حکم اور اس کے ساتھیوں کو کچھ تو کرنا ہوگا۔ وہ زبان دے چکے ہیں، اگر صاف مکریں گے تو ان کی ساکھ کا بیڑا غرق ہوگا۔ ہاں، ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ عین موقع پر تمہاری اور حمیدہ کی روانگی روکنے کے لیے کوئی زبردست عذر تراش لیں یا پھر ایک خاص فاصلے تک تمہیں محفوظ راستہ دینے کے بعد دوبارہ پکڑ لیں۔ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ..." وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیا بھی ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چلو چھوڑو یار ان باتوں کو۔ لوگ تو پہلے ہی کہتے ہیں کہ یہ نیوز چینلز والے تصویر کا سب سے بُرا رخ دکھاتے ہیں اور بعض اوقات صرف رخ ہی رخ ہوتا ہے تصویر ہوتی ہی نہیں۔" وہ ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔

"اور لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ یہ چکنے گھڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ صرف وہی بات بتاتے ہیں جو بتانا چاہتے ہیں۔"

"خدا کا خوف کرو۔ تم مجھے چکنا گھڑا کہہ رہے ہو جبکہ میرے سر پر بال ہی بال ہیں اور یہ بال یونہی میرے سر پر نہیں ہیں۔ اس کے لیے بڑی محنت ہوئی ہے۔ اپنے دماغ کو بہت بچا کر رکھتے ہیں ہم لوگ۔ بُرے سے بُرے حالات میں بھی اس پر زور نہیں پڑنے دیتے۔ یہ دانش کا دور نہیں، فیس ویلیو کا دور ہے۔ اسکرین پر اپنی آب و تاب برقرار رکھنا پڑتی ہے۔ باقی دانش کا کیا ہے؟ یہ تو انٹرنیٹ سے آ ہی جاتی ہے۔ تیس منٹ انٹرنیٹ کے سامنے بیٹھو، کسی بھی موضوع پر علامہ کا درجہ پا جاؤ گے..."

وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اصل موضوع وہیں دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بہرحال، یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہماری روانگی کے حوالے سے عمران کے ذہن میں بھی بہت سے خدشات موجود ہیں۔ آنے والا وقت ایک گہری دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس دھند میں داخل ہونے سے پہلے یہ جاننا مشکل تھا کہ اندر کیا ہے۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ہفتے بعد مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور میں لال بھون میں میڈم صفورا کے پاس آ گیا۔ لال بھون میں آج کل سناٹا تھا۔ ساتویں کا جشن گزرے ابھی پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے۔ پرپولس کے انتخاب میں حصہ لینے والی دوشیزاؤں کی تربیت کی گہما گہمی اب یہاں نہیں تھی۔ وہ گھنگروؤں کی جھنکار، وہ سریلے قہقہے... اور رنگ برنگے آنچل۔ وہ سب کچھ کہیں اور تھا۔ غالباً وہ سب کچھ ابھی تک راج بھون کی خلوت گاہوں کو چمکا رہا تھا۔ رنگ برنگے آنچلوں میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے دودھیا ہاتھ مے نوشوں کے لیے جام بنا رہے تھے... سریلی ہنسی شباب پرستوں کے کانوں میں رس گھول رہی تھی... اور لال بھون میں سناٹا تھا۔

گیتا کبھی بھی بس آرام ہی فرما رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ بنی سنوری نظر آتی تھی اور شاید اس کی ایک وجہ عمران بھی تھا۔ وہ اس کی ہلکی پھلکی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ حوصلہ افزائی صرف باتوں تک محدود ہے۔ دونوں گفتگو کے رسیا تھے۔ گیتا کبھی سوپیل فی گھنٹا کی رفتار سے بولتی تھی اور عمران کے پاس اس رفتار کا توڑ موجود تھا۔

حمیدہ بھی لال بھون میں ہی موجود تھی۔ وہ سوگوار حسن کی مثال نظر آتی تھی۔ اس کا شوہر صرف ایک سال پہلے اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یقیناً وہ ابھی اس کی موت کا غم بھول نہیں سکی تھی۔ اب اس کا دیور بھی اسے ایک نہ بھولنے والا دکھ دے گیا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں یہ خوف جما ہوا تھا کہ ابھی وہ خطرے میں ہے۔ غالباً ہماری طرح اسے بھی یقین نہیں تھا کہ وہ زرگاں سے بحفاظت نکل سکے گی۔ اس کی عجیب سی کیفیت تھی۔ ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی۔ کوئی آواز دیتا تو بدک اٹھتی۔ کہتے ہیں کہ درندے کی دہشت، درندے کے جانے کے بعد بھی تادیر اس کے شکار پر طاری رہتی ہے۔ حمیدہ بھی جارج کا شکار تھی۔ وہ اس کے قبضے میں رہی تھی۔ اب وہ عدم آباد روانہ ہو چکا تھا۔ حمیدہ آزاد تھی مگر گزرے دنوں کا ہراس جیسے اس کی روح میں جذب ہو گیا تھا۔

مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ میں نے تادیر اس سے گفتگو کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد میرے ساتھ آزاد فضاؤں میں پہنچنے والی ہے۔ وہ بس 'ہوں ہاں' میں جواب دیتی رہی۔ آخر میں اس نے لرزتی آواز میں بس اتنا کہا۔ ''میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ جھیلا۔ اتنے سارے زخم کھائے۔ میں جتنی دیر زندہ رہی، آپ کی یہ مہربانی بھول نہیں سکوں گی۔''

''تم سے کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے گردن جھکائی اور نفی میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد ہولے سے بولی۔ ''لیکن جب میرے دیور اسحاق نے میرے لیے لڑائی کی اور ہارا تو جارج صاحب نے بہت شراب پی تھی۔ لڑکیوں کا ناچ دیکھا تھا اور مجھے بھی ناچنے کے لیے کہا تھا۔ میں نہیں ناچ سکی تو انہوں نے مجھے سخت بُرا بھلا کہا اور بولے... تم اب بہت جلد میری جورو بننے والی ہو۔ میرے طریقے کے مطابق چلنا سیکھو۔''

''اب پریشانی کی کوئی بات نہیں حمیدہ۔'' میں نے کہا۔ ''اب وہ ڈیگل 'اپنے طریقے' کے مطابق چلتا ہوا قبر میں اتر چکا ہے اور ہم اپنے طریقے پر چل کر انشا اللہ تل پانی پہنچیں گے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر ہولے سے بولی۔ ''آپ نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہارے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہم دونوں اسحاق کے دوست ہیں۔ تم اس کی بھابی تھیں تو ہماری بھی بھابی ہو۔''

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ اپنی سفید اوڑھنی سے آنکھوں کے کنارے پونچھ کر بولی۔ ''آپ کو میرے بارے میں اسحاق نے بتایا تھا؟''

''نہیں، یہ کوئی اور تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اسی نے ہمیں تمہاری ساری کہانی سنائی اور بتایا کہ تم کس حال میں ہو۔''

''کون تھا وہ؟'' وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

''تمہارا ایک خیر خواہ... لیکن اس کے بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

اسی دوران میں میڈم صفورا کی آواز آنے لگی۔ وہ راج بھون سے واپس آ گئی تھی اور ملازموں کو ضروری ہدایات دے رہی تھی۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ عمارت کی ڈیوڑھی سے اندر آنے کے لیے میڈم کو یقیناً چھتری کی ضرورت تھی۔ عمران نے مجھے آنکھ ماری اور پھر ایک چھتری لے کر بڑے ''خادمانہ'' انداز میں جلدی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں عمران نے میڈم کے ساتھ اپنے تعلقات کافی سے زیادہ بہتر کر لیے تھے۔ اسے دلوں میں گھر کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ اپنے مخالفین پر زبردست خوش اخلاقی اور اپنائیت سے حملہ آور ہوتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نفرت کے دانت کھٹے کر دیتا تھا۔ میڈم کی ''دشمنی'' اس نے پہلا شدید حملہ تب کیا جب بند کمرے میں زہریلے سانپ نے میڈم کو ڈسا تھا۔ عمران نے بے دریغ اپنے ہونٹ میڈم کے زہر یلے زخم پر رکھ دیے تھے اور دراصل یہیں سے ان کے تعلق نے ایک نیا موڑ لینا شروع کر دیا تھا۔ میڈم کے لیے اپنی چھوٹی بہن کے قاتل کو معاف کرنا آسان نہیں تھا... مگر دھیرے دھیرے ایسا ہو رہا تھا... اور اب تو کسی وقت لگتا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میڈم اور عمران باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عمران خود بھیگ گیا تھا مگر میڈم کے اوپر چھتری موجود رہی تھی۔ میڈم کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ راج بھون سے کامیاب لوٹی ہے۔ دراصل میں نے میڈم صفورا سے کہہ رکھا تھا کہ وہ حکم سے اس بات کی اجازت لے کہ میں عمران کو اپنے ساتھ تل پانی لے جا سکوں۔ وہ اسی سلسلے میں راج بھون گئی ہوئی تھی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ میڈم نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ حکم جی نے میری یہ استدعا قبول کر لی ہے۔ میں اپنے ہم وطن کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔

عمران نے کہا۔ ''کیا بات ہے میڈم! ہماری ہر استدعا مانی جا رہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہو تو کہیں کچھ غلط بھی ہوتا ہے۔''

میڈم فوری جواب دینے کے بجائے سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر بعد بولی۔ ''اس موقع پر یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ہوں۔ پنڈت مہاراج نے واقعی راج بھون والوں کو قائل کر لیا ہو کہ ''کمنٹ منٹ'' کے مطابق تابش کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کل رات بھی پنڈت مہاراج اور حکم جی کی طویل میٹنگ ہوئی ہے۔ اس میٹنگ میں رنجیت پانڈے شریک نہیں تھا حالانکہ ایسے موقعوں پر وہ شریک ہوتا ہے۔ تمہاری بحفاظت روانگی اور سیکیورٹی کی ذمے داری ایک مسلمان فوجی افسر بشارت علی خاں کو سونپی گئی ہے۔ وہی تمہیں زرگاں کی آخری حد تک لے جائے گا۔ بہرحال ابھی اس بارے میں حتمی فیصلہ ہونا ہے...'' وہ آگے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر خاموش ہو گئی۔

عمران نے کریدا۔ ''آپ کچھ بتانے لگی تھیں؟''

اس نے طویل سانس لی اور بولی۔ ''کچھ باتیں شک ختم کرنے والی ہیں تو کچھ شک ڈالنے والی بھی ہیں۔ تمہیں وہ رضیا تو یاد ہے نا جس نے حکم جی کے دربار میں ہنگامہ مچایا تھا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میڈم بولی۔ ''گیتا سی او

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اردگرد کی بڑی خبر رہتی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ پرسوں صبح بڑھیا نے پھر بڑا غدر مچایا ہے۔ اس نے چار پانچ دن سے کھانا پینا بند کر رکھا تھا۔ پرسوں صبح وہ محافظوں کے روکنے کے باوجود بھرے دربار میں چلی آئی۔ اس نے اس بات پر سخت احتجاج کیا کہ ساعبر کی آڑ میں تم جیسے بڑے اپرادھی کو چھوڑا جا رہا ہے۔ اس نے واویلا کیا کہ دھرم کے پالن کے لیے اس نے اپنی پوری فیملی قربان کی ہے۔ اب وہ خود کو بھی قربان کر دے گی۔ اس نے خود کو باقاعدہ آگ لگانے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اسے سنبھالا گیا۔ بعد ازاں حکم جی اور رتنا دیوی وغیرہ نے اسے علیحدگی میں سمجھایا بجھایا۔ یہ بڑھیا اب بالکل مطمئن نظر آتی ہے۔ گیتا بھی بتا رہی تھی کہ وہ اب کھا پی بھی رہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ اس میں یہ تبدیلی کیوں آئی ہے۔۔۔"

کچھ دیر تک اس بارے میں بات ہوئی پھر عمران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "میڈم! تو پھر آپ نے اپنے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کب نکل رہی ہیں جل پانی؟"

"تمہیں اتنی فکر کیوں ہے میری؟"

"آپ کی فکر کیوں نہیں ہوگی۔ یقین کریں ان چند ہفتوں میں آپ کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ آپ کی کمی بے طرح محسوس ہوگی۔۔۔ اور ویسے بھی ہمارا ساتھ کوئی آج کا تو نہیں ہے میڈم۔ برسوں کی بات ہے۔"

"الو مت بناؤ۔ میں جانتی ہوں تم یہاں اسٹیٹ میں صرف تابش کے لیے آئے۔ میرے یا ابرار صدیقی کے بارے میں تم نے بھول کر بھی نہیں سوچا ہوگا۔"

"ایسا مت کہیں میڈم! آپ نہیں جانتیں کہ آپ ہمارے لیے کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ یقین کریں، میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ آپ ہمارے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوں۔"

"اور تم جانتے ہو، ایسا ممکن نہیں ہے۔" میڈم مسکرائی۔ پھر سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "ہاں، مستقبل قریب میں امید کی جا سکتی ہے۔ میں کوئی ایسا موقع تلاش کروں گی کہ یہاں سے نکل کر جل پانی پہنچ سکوں۔"

"لیکن آپ کوئی بڑا خطرہ مول مت لیں۔" میں نے خلوص دل سے کہا۔ "اگر بڑا خطرہ مول لینا پڑے تو پھر آپ انتظار کریں۔ ہمارا وعدہ ہے میڈم! ہم آپ کو اور ابرار صدیقی کو لیے بغیر اسٹیٹ سے نہیں جائیں گے۔"

"میں نے بہت پہلے وعدوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بہرحال، اچھے کی امید تم بھی رکھو، میں بھی رکھتی ہوں۔" میڈم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر ذرا توقف کر کے کہنے لگی۔ "تابش! تم اپنا بہت خیال رکھو۔ تم نے جارج جیسے شخص کو ہرا کر جہاں ایک بے مثال وکٹری حاصل کی ہے، وہاں اپنے بہت سے دشمن بھی بنا لیے ہیں۔ یہ دشمن صرف یہاں ہی نہیں، جل پانی میں بھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

میں نے میڈم صفورا کو یقین دلایا کہ میں اس کی ہدایات پر عمل کروں گا۔

۔۔۔اور پھر ہماری روانگی کی تیاری مکمل ہو گئی۔ ہم عجب گومگو کی کیفیت میں تھے۔ کبھی لگتا تھا کہ ہمیں نیک نیتی کے ساتھ یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے۔ کبھی دال میں کچھ کالا لگتا تھا۔ ایک دن پہلے پنڈت مہاراج نے لال بھون آ کر مجھے آشیرباد دی اور کہا کہ نہایت نامساعد حالات کے باوجود حکم جی اپنا وعدہ پورا کر رہے ہیں اور مجھے حمیدہ بی بی کے ساتھ زرگاں سے روانہ کیا جا رہا ہے۔

میں نے پنڈت مہاراج کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری سلامتی اور بخیریت واپسی میں ان کا کردار ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

پنڈت مہاراج ان لوگوں میں سے تھا جو میانہ رو ہوتے ہیں۔ انہیں بُرا کہا جا سکتا ہے نہ اچھا، نہ سیاہ نہ سفید۔ ان میں انسانی خوبیاں اور خامیاں ایک عجیب امتزاج کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔

روانگی سے ایک رات پہلے میں نے لال بھون کے ایک کمرے میں عجیب منظر دیکھا۔ عمران اور میں ساتھ ساتھ ہی فرش پر سوتے تھے۔ رات کے وقت میری آنکھ کھلی تو عمران موجود نہیں تھا۔۔۔ میں نے اٹھ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ دروازے کے ہینڈل کو گھمایا۔ وہ لاک نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عمران باہر نکلا ہے۔ میں نے باہر نکل کر راہداری میں جھانکا۔ آخری سرے پر جہاں لڑکیوں کی ٹیچر گیتا بھی کا کمرا تھا، روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے تک پہنچا۔ کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر نائٹ بلب کی روشنی تھی۔ شروع میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر کمرے کے اندر حرکت ہوئی اور خوش قسمتی سے میں عمران اور گیتا بھی کو دیکھنے میں کامیاب رہا۔ گیتا بھی کی جوانی ڈھل رہی تھی اور ساتھ ہی اس کا لوچ دار جسم بھی۔ وہ زیادہ خوش شکل بھی نہیں تھی۔ بس اس کا فن اور رقص میں اس کی مہارت تھی جس کی وجہ سے اس

کی قدر تھی۔ لڑکیوں کی استاد کی حیثیت سے وہ اچھی خاصی تنخواہ پاتی تھی۔ زرگاں کے خواص سے اس کے تعلقات تھے۔ عمران اس سے دل لگی کرتا رہتا تھا لیکن یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں عمران جیسے وجیہہ اسمارٹ شخص کو گیتا جیسی ڈھلی ہوئی عورت کے اتنا قریب پاؤں گا۔ میں نے اسے عمران کے بالکل پاس کھڑے ہو کر باتیں کرتے دیکھا۔ پھر وہ عجیب جذباتی انداز میں عمران کے گلے لگ گئی اور عمران کے رخسار کا بوسہ لیا۔ یہ کافی طویل بوسہ ثابت ہوا۔ اسی دوران میں اس نے عمران کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ عمران نے بھی اپنی بانہیں اس کے گرد حمائل کر دیں۔ عمران کے رخسار کے بعد اس کے ہونٹوں کی باری آئی۔۔۔ وہ اس کے ساتھ پیوست سی ہو گئی۔ وہ قریباً نصف منٹ تک اسی طرح کھڑے رہے پھر وہ لال بھبوکا چہرے کے ساتھ عمران سے علیحدہ ہو گئی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران باہر آنا چاہ رہا ہے۔ میں جلدی سے ہٹ گیا اور واپس کمرے میں پہنچ کر فرشی بستر پر دراز ہو گیا۔ ایک دو منٹ بعد عمران بھی واپس آ گیا۔ اس نے کھوجی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں جاگ تو نہیں رہا۔ پتا نہیں کہ اس کا شک رفع ہوا یا نہیں، بہرحال وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ میں نے بھی خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا بندہ تھا۔ اس کی کسی بھی بات کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔

اگلے روز علی الصباح ہم لال بھون سے روانہ ہو گئے۔ سردی کا زور کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ زرگاں کے مندروں اور گرجوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ راج بھون کی عظیم الشان عمارت کی بلندیاں بھی لشکارے مار رہی تھیں۔ اس عظیم الشان عمارت میں چند ہفتے پہلے ہم دونوں نے "نزول" کیا تھا اور مار دھاڑ کے موسم کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں پر بھرے دربار میں حکم جی اور عمران کے درمیان یادگار مکالمہ ہوا تھا جس میں عمران نے فتح پائی تھی۔ یہیں پر ساتویں کا جشن برپا ہوا تھا اور رنگ و بو کا سیلاب آیا تھا۔ یہیں پر میرے اور جارج گورا کے درمیان یادگار مقابلہ ہوا اور جارج گورا ایک سنگین غلطی کے سبب رام پوری چاقو کا شکار ہوا۔

زرگاں حد نگاہ تک ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا اور اس کی ساری خوبیوں اور خامیوں سمیت ہم اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اس کی ساری خوب صورتیاں اور بدصورتیاں، ساری محبتیں اور نفرتیں ہم سے جدا ہو رہی تھیں۔ لیکن کیا ہم واقعی جا رہے تھے؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں، حمیدہ اور عمران ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار تھے۔ نیجر مدن بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس گھوڑا گاڑی کو چاروں طرف سے مسلح گارڈز نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک اور گھوڑا گاڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ نیجر مدن نے بتایا کہ اس میں پنڈت مہاراج کا ایک نمائندہ ہے اور دربار کے ایک دو عہدے دار ہیں۔

میڈم صفورا نے بتایا تھا کہ ہماری روانگی کو راز رکھا جا رہا ہے، اس کے باوجود ہمیں اندازہ ہوا کہ مسلح گارڈز کے حصار سے آگے بہت سے عام لوگ بھی موجود ہیں۔۔۔ ان میں ہمارے حمایتی تھے اور مخالف بھی۔ بہرحال حمایتیوں کی تعداد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ان کے نعرے ہم تک پہنچ رہے تھے۔ دوسری طرف مخالفانہ نعروں کی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔ مخالفانہ نعروں کا مفہوم یہ تھا کہ میں اپرادھی ہوں، میری جگہ جل پانی نہیں، زرگاں کی جیل ہے وغیرہ وغیرہ۔

میری حمایت کے نعرے کچھ بے ہنگم سے تھے مگر نعرہ زن افراد کی تعداد زیادہ تھی۔۔۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ ان نعرہ زن افراد میں وہ لڑکی بھی شامل ہو جس نے شروع شروع میں ہمیں زرگاں میں پناہ دی تھی۔ اس کا نام وجنتی تھا۔ ہم اتفاقاً اس کے گھر میں گھسے تھے۔ وہ حمیدہ کی سہیلی نکلی تھی اور اسی نے ہمیں حمیدہ کی مصیبت سے سب سے پہلے آگاہ کیا تھا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ ریٹائرڈ فوجی اہلکار کی وہ خوش باطن لڑکی بھی ہمیں الوداع کہنے والوں میں شامل ہے اور اپنی سہیلی کی رہائی کی خوشی اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چمک رہی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "وجنتی! اگر تو ہمیں دیکھ رہی ہے تو جان لے کہ ہم نے یہاں تک اپنا وعدہ پورا کیا۔ اسحاق کے بے رحم قاتل کو جہنم واصل کیا اور تیری سہیلی کو رہائی دلائی۔ اب آگے کیا ہوتا ہے، یہ ہم نہیں جانتے۔ انسان کا کام کوشش ہے اور وہ ہم کر رہے ہیں۔"

ہمارے سیکیورٹی گارڈز کا انچارج وہی بشارت علی خاں نامی افسر تھا۔ وہ اپنے چتکبرے گھوڑے پر سوار ہماری گھوڑا گاڑی کے بالکل ساتھ جڑا کھڑا تھا۔ اس کی شخصیت متاثر کن تھی۔ مسلح گارڈز کے عقب میں میری نگاہ ایک اور شخص پر پڑی۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ ہمارے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ شاید وہ ہماری روانگی کا نظارہ کرنے کے لیے یہاں موجود تھا۔ اس کا سانولا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نفرت کی سرخی تھی۔ جارج کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکست نے جہاں ہمارے اور بہت سے بدخواہوں کو گہری مایوسی میں دھکیلا تھا، وہاں رنجیت پانڈے کے غیظ و غضب کی کمر بھی توڑ کر رکھ دی تھی۔ سامبر مقابلے کے بعد سے رنجیت پانڈے ایک بار بھی میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ اب بھی وہ تھوڑا گاڑی سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا۔

ہمیں ''الوداع'' کرنے والوں میں گیتا کبھی بھی شامل تھی۔ وہ میڈم صفورا کے عقب میں کھڑی تھی۔ میں جب سے یہاں آیا تھا، گیتا کبھی کو باتیں کرتے ہی دیکھا تھا۔ آج وہ پہلی بار گم صم نظر آئی۔ گھوڑا گاڑی حرکت میں آئی تو اس نے بھی الوداعی انداز میں ہماری طرف ہاتھ ہلایا مگر مجھے لگا کہ اس نے یہ ہاتھ صرف عمران کے لیے ہلایا ہے۔

جھیل پانی کی طرف ہمارا سفر شروع ہوا۔ منیجر مدن نے ہمیں بتایا۔ ''یہاں سے قریباً ساٹھ کلومیٹر کی دوری پر وہ جگہ ہے جسے ''جوڑا ٹیلے'' کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل دو ٹیلے ہیں جہاں پر زرگاں کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ ان ٹیلوں کے پاس سے گزرنے والے ایک برساتی نالے کو ہم زرگاں کی سرحد بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ لوگن کے ساتھ جو گارڈز جا رہے ہیں، وہ آپ کو اس سرحد تک پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ اس سے آگے آپ خود سفر کریں گے۔''

''اسی گھوڑا گاڑی پر؟'' میں نے پوچھا۔

''نا ہیں جی۔ آگے کچھ دشوار راستے بھی ہیں جہاں گھوڑا گاڑی کے لیے چلنا مشکل ہو وے گا۔ آپ کو گھوڑے دیے جاویں گے۔ دو دن کا راشن دیا جاوے گا۔ اپنی رکھشا کے لیے آپ کو دو رائفلیں بھی مہیا کی جاویں گی۔''

''اس کے بعد ہم جائیں اور ہمارا کام؟'' عمران نے لقمہ دیا۔

''ہاں، پنڈت مہاراج کے فیصلے کے مطابق اس کے بعد آپ کو خود ہی سفر کرنا ہووے گا۔''

سنہری دھوپ حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی کے اندر بھی خوش گوار حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ سفر میں گھنے والے دھچکوں کی وجہ سے میری متاثرہ پسلی میں بار بار درد کی لہر اٹھتی تھی مگر یہ قابلِ برداشت درد تھا۔ حمیدہ بدستور سہمی بیٹھی تھی۔ کسی ایسی چڑیا کی طرح جس پر خوں خوار عقاب کی دہشت نے سکتہ طاری کر رکھا ہو۔ شاید اسے ابھی تک بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اسے جارج گورا جیسے شخص سے چھڑا لیا گیا ہے اور اب وہ آزاد فضاؤں میں پہنچنے والی ہے۔

ایک جگہ درختوں کے درمیان ایک قدرتی چشمے کے قریب رک کر ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور ہمارا سفر پھر سے شروع ہوا۔ عمران اپنی پُرمزاح باتوں سے اس تناؤ کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا جو سفر کے آغاز سے ہمارے اندر موجود تھا۔

سہ پہر کے وقت ہم اس خاص مقام تک پہنچ گئے جسے ''جوڑا ٹیلے'' کہا جاتا تھا۔ چند گھنٹے پہلے جب میں اور عمران سبزیوں سے لدی ہوئی گھوڑا گاڑی کے ساتھ دیہاتیوں کے روپ میں زرگاں پہنچے تھے تو تب بھی یہ جڑواں ٹیلے ہماری نگاہوں سے گزرے تھے۔ تاہم اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے زرگاں کی حد شروع ہوتی ہے۔

جس برساتی نالے کا مدن نے ذکر کیا تھا، وہ بالکل خشک تھا۔ اس کی گہرائی بھی معمولی سی تھی۔ اس کے کنارے ہمیں جنگلی جانوروں کے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ جھاڑیوں کی حالت اور درختوں کی خستہ و ریخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ پالتو ہاتھی بھی یہاں سے گزرتے رہتے ہیں۔ ایک مقام پر ہمارا قافلہ رک گیا۔ پنڈت مہاراج کی نمائندگی ایک چھوٹے قد کا سیاہی مائل پنڈت کر رہا تھا۔ اس کے سر پر لمبی بودی اور گلے میں نصف درجن مالائیں تھیں۔

ہم گھوڑا گاڑی سے اترے۔ پنڈت نے ہمیں آشیرباد دی۔ سیکیورٹی کے انچارج فوجی افسر بشارت علی خاں نے ہمیں بتایا کہ یہاں پر ان کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب آگے ہم کو خود ہی سفر کرنا ہوگا۔

اس نے دو رائفلیں اور ایمونیشن کے دو چھوٹے بیگ ہمارے حوالے کر دیے۔ چھ صحت مند گھوڑے ہمارے لیے تیار کھڑے تھے۔ یہ تازہ دم گھوڑے پہلے سے یہاں موجود تھے۔

بشارت نے نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تین گھوڑے آپ تینوں کی سواری کے لیے ہیں۔ اس سفید گھوڑے پر آپ لوگن کا سامان اور راشن وغیرہ ہے۔ باقی دو گھوڑے فالتو ہیں۔ راستے میں آپ کو ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

پنڈت نے کہا۔ ''بھگوان سے ہماری پرارتھنا ہے کہ تم لوگن کا باقی کا سفر بھی خیریت سے گزرے۔ ہمارے لائق کوئی اور سیوا ہو تو ہمیں بتا دو۔''

''ایک گرم گرم دودھ پتی مل جاتی تو کیا بات تھی۔'' عمران نے سرگوشی کی جو بس میں ہی سن سکا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' پنڈت نے عمران سے پوچھا۔

''کچھ نہیں جی۔ آپ لوگوں کا پریم دیکھ کر آپ سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہ رہا... کتنا اچھا ہوتا اگر آپ کچھ دیر اور ہمارے ساتھ رہتے۔''

''کوئی بات ناہیں۔ ہماری پرارتھنا تو آپ کے ساتھ ہے۔''

عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔ ''کدھر ہے جی؟''

''کون؟''

''پرارتھنا۔'' عمران نے کہا۔

''پرارتھنا کا مطلب ہے کہ ان کی دعا ہمارے ساتھ ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اوہ، میں سمجھا پنڈت جی اپنی سندر بیٹی کی بات کر رہے ہیں۔ اس سے مندر کی سیڑھیوں پر ملاقات ہوئی تھی۔ میں سمجھا شاید اس کا نام پرارتھنا ہے۔'' عمران نے جیسی نکال کر کہا۔

پنڈت کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے ناگواری سے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے سمجھ نہیں پایا کہ اس کی اس اوٹ پٹانگ بات کا کیا جواب دے۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ بے ہودگی برداشت کی اور اشلوک پڑھ کر ہمیں جانے کی اجازت دی۔

عمران نے حمیدہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا۔ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے۔ باقی تینوں گھوڑے بھی ایک ہی رسّی سے بندھے ہوئے ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے زرگاں کی خیالی سرحد پار کی اور مشرق کی سمت بڑھنے لگے۔ یہ ویران راستہ تھا۔ کہیں کہیں جھاڑیاں یا اونچی جنگلی گھاس تھی۔ زمین نیم پختہ تھی۔ گھوڑے دلکی چال چلتے ''جوڑا ٹیلے'' سے دور ہونے لگے۔

ہم تقریباً نصف کلومیٹر دور آ گئے تو عمران نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ہمیں رخصت کرنے والے اب ایک سیاہ لکیر کی طرح نظر آ رہے تھے۔ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے تابی... یہ لوگ ہمیں بڑی گرم دودھ پتی پلانے والے تھے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار دودھ پتی کا مطلب دودھ پتی ہوتا ہے۔ اور یہ اتنی زیادہ گرم ہوگی کہ اگر ہم نے پینے میں بے احتیاطی کی تو ہمارے تالو جل جائیں گے اور روزِ حشر تک یہ زبان کم نہیں ہو گی۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''یار! سیدھی بات کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''ان لوگوں نے ہمیں آزاد نہیں کیا... بس چھوڑا ہے... وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔''

''تمہارا مطلب ہے...'' آواز میرے گلے میں اٹک گئی۔

''ہاں، میرا خیال ہے۔ ان سامنے والے درختوں تک پہنچتے پہنچتے سب کچھ سامنے آ جائے گا لیکن ابھی تم مڑ کر نہ دیکھنا... بس اسی طرح چلتے رہو۔'' عمران نے سنسناتی آواز میں کہا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ہم نے یہ گفتگو دھیمے لہجے میں کی تھی پھر بھی ہمارے آگے جاتی ہوئی حمیدہ کچھ چونک سی گئی۔ اس نے سرسری آواز میں پوچھا۔ ''کیا کوئی خطرہ ہے بھائی؟''

''نہیں... ابھی تو نہیں۔ لیکن تمہیں چوکس رہنا ہے۔'' میرے بجائے عمران نے جواب دیا۔

''ایک رائفل مجھے دے دو۔'' میں نے عمران سے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کام نہیں کریں گی۔'' عمران نے پورے یقین سے کہا۔

میری بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ جونہی ہم کنڈ منڈ درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچے، عمران نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دور ہمارے عقب میں ''جوڑا ٹیلے'' کے پاس سیاہ لکیر حرکت میں آ چکی تھی۔ یہ دراصل وہ درجنوں مسلح گھڑ سوار تھے جو ہمارے محافظ بن کر ہمیں یہاں تک چھوڑنے آئے تھے۔ اب وہ آندھی کی رفتار سے پھر ہماری طرف آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا بدترین اندیشہ حقیقت کا روپ دھار گیا ہے۔ یہ لوگ پھر سے ہمیں پکڑنے کے لیے آ رہے تھے۔ یہ منافقت اور ریاکاری کی انتہا تھی۔ یہ ان پنڈتوں، پجاریوں کی بے مثال دھوکا دہی تھی۔ پہلے ہمیں چھوڑ کر اپنے دھرم اور عقیدوں کا منہ بند کیا گیا پھر ہمیں دوبارہ پکڑنے کا جواز ڈھونڈ لیا گیا۔

عمران نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے حمیدہ والے گھوڑے کی لگام بھی تھام لی اور چلایا۔ ''بھاگو تابش۔''

ہم نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور انہیں بھگا دیا۔ ہمارے عقب میں رسد والا گھوڑا اور اس کے عقب میں دونوں اضافی گھوڑے بھی بھاگ اٹھے۔ یہ کافی رفتار تھی پھر بھی اس رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی جو ہمارے پیچھے آنے والوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پکڑ رکھی تھی۔ صاف اندازہ ہوا کہ وہ تیزی سے ہمارے قریب آرہے ہیں۔ سامنے چٹیل میدان تھا۔ اس میں بس کہیں کہیں جھاڑیاں اور خودرو درختوں کے جھنڈ تھے۔ کہیں کوئی قابل ذکر جائے پناہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''تیز دوڑاؤ تابی!'' عمران نے پھر پکار کر کہا۔

میں نے گھوڑے کی رفتار کو حتی الامکان حد تک بڑھا دیا۔ پسلیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ عمران کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ ہم زیادہ دور تک اس طرح نہیں جا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہم دو تین کلومیٹر تک اس طرح جاتے اور پھر دھر لیے جاتے۔ غالباً ہم نہتے بھی تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے عمران نے خود کہا تھا کہ ہمیں دی گئی رائفلیں کام نہیں کریں گی اور لگتا تھا کہ اس نے درست کہا ہے...

''عمران! وہ پاس آرہے ہیں۔'' میں نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔

''آنے دو۔ تم بس آگے دھیان رکھو۔'' اس نے حمیدہ والے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے عقب میں دھول تھی اور اس دھول کے عقب میں کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر زرگاں کے ہرکارے طوفانی رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اب ایک قوس کی سی شکل بنالی تھی۔ یہ قوس لمحہ بہ لمحہ ہم سے اپنا فاصلہ کم کرتی جارہی تھی۔ اچانک عمران نے اپنے مشکی گھوڑے کا رخ ترچھا کیا۔ ہم ہانپتے کانپتے اور تھوہر کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ یہاں درختوں کے درمیان گھنی شاخوں کا سایہ تھا اور بارش کے پانی کا ایک چھوٹا سا جوہڑ نظر آرہا تھا۔ اس جوہڑ کے کنارے درختوں میں وہی جرمن جیپ کھڑی تھی جو عمران کے مطابق چند دن پہلے اس سے چھین لی گئی تھی۔

عمران نے بڑی تیزی سے راشن کا سامان گھوڑے سے اتارا اور اسے جیپ میں پھینک دیا۔ اس دوران میں، میں اس کے کہنے پر حمیدہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سے اتار چکا تھا۔

''چلو جلدی کرو... جیپ میں بیٹھو۔'' عمران چلایا۔

ہم دو تین سیکنڈ کے اندر جیپ میں تھے۔ جیپ ایسے رخ سے کھڑی کی گئی تھی کہ اسے بس اسٹارٹ کرنے کی دیر تھی، وہ سیدھی آگے نکل سکتی تھی۔ عمران نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی لگائی۔ میں عمران کے پہلو میں تھا۔ حمیدہ پچھلی نشست پر تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہورہا تھا۔ جیپ پہلے ''سیلف'' پر اسٹارٹ ہوئی۔ عمران نے ایک جھٹکے سے اسے آگے بڑھا دیا۔ ہم درختوں کے اس جھنڈ سے یوں نکلے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ ہم نے اپنے عقب میں زرگاں کے تیز رفتار ہرکاروں کو دیکھا... ان سے اب ہمارا فاصلہ مزید کم ہو چکا تھا۔ ان کی مدھم آوازیں بھی اب ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ غیظ و غضب سے لتھڑی ہوئی یہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتی جارہی تھیں... لیکن اب ہمیں فکر نہیں تھی۔ ہمارے نیچے ہانپتے ہوئے گھوڑے نہیں، اسپیشل ماڈل کی شاندار جرمن گاڑی تھی۔ عمران اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ایک انگلش ساخت کی طاقتور ''گن'' رکھی تھی۔ اس پر ٹیلی اسکوپ بھی چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے گن اٹھا کر عقب میں دیکھا۔ ٹیلی اسکوپ میں موت کے ہرکاروں کی شکلیں نظر آئیں۔ ان کی آنکھوں میں چنگاریاں تھیں مگر ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ درختوں کے جھنڈ سے یوں اچانک جرمن جیپ نکلے گی اور ان کی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کردے گی۔ پھر یکایک مجھے تعاقب کرنے والے گھڑسواروں میں ایک چہرہ نظر آیا اور میرا خون کھول اٹھا۔ یہ زرگاں کا خطرناک ترین کمانڈو اور سفاک پولیس افسر رنجیت پانڈے تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے چند قدم آگے گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی پشت سے چپکا ہوا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے بار بار گھوڑے کو کوئی چابک وغیرہ رسید کرتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ چلانے والے انداز میں اپنے ساتھیوں کو احکامات وغیرہ بھی جاری کررہا تھا۔

میرے سینے میں ایک لہر سی اٹھی۔ وقت کا پھیر زرگاں کے اس خطرناک ترین شخص کو میرے نشانے پر لے آیا تھا۔ لیکن میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ ہاں، میں کوشش کرسکتا تھا۔ میں نے گن کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور عمران سے پوچھا۔

''لوڈ ہے نا؟''

''لوڈ ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمیں پکڑ نہیں سکیں گے۔''

''ضرورت ہے عمران!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ کتا میرے نشانے پر آرہا ہے۔''

''کون؟''

''رنجیت پانڈے۔''

یہ اطلاع عمران کے لیے بھی دلچسپ تھی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر بولا۔ ''لیکن تم چلتی جیپ میں اتنی دور سے نشانہ نہیں لے سکو گے۔''

''کوشش تو کرسکتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ٹیلی اسکوپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے آنکھ لگا دی۔

ناہموار راستے پر جیپ ہچکولے کھا رہی تھی۔ دوسری طرف ٹارگٹ بھی متحرک تھا۔ پھر بھی میں نے پوری یکسوئی کے ساتھ ٹیلی اسکوپ میں دیکھتے ہوئے پہلی گولی چلائی۔ زوردار دھماکا ہوا۔ رنجیت پانڈے کے پہلو میں گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک گارڈ الٹ کر گرا اور گھوڑے اسے روندتے ہوئے گزر گئے۔

طاقتور گن کی دوسری گولی رنجیت پانڈے سے آٹھ دس فٹ دائیں جانب ایک دوسرے گھڑسوار کو لگی۔ یہ شخص دوڑتے گھوڑے پر سے رائفل کا فائر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یقیناً اس کا نشانہ ہماری جیپ ہی تھی۔ گولی کھا کر یہ شخص بھی اپنی رائفل سمیت گھوڑے کی پشت پر سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے کل چار گولیاں چلائیں۔ ان میں سے تین نے حکم کے گارڈز کو ہٹ کیا اور وہ اس دوڑ میں سے خارج ہو کر زمین بوس ہوئے۔ رنجیت پانڈے گن کے ہلاکت خیز ہونے سے بچا رہا۔ شاید میری یہ "شوٹنگ" ان تین افراد کی موت کا بہانہ تھی جنہیں میں مارنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ قدرت اسی طرح انسانی ارادوں کو خام کرتی ہے اور مستقبل کے وہ نقشے ترتیب دیتی ہے جو تقدیر کہلاتے ہیں۔ رنجیت کو ابھی زندہ رہنا تھا اور مرنے سے پہلے ایک سنگین واقعے کا سبب بننا تھا۔

...جرمن جیپ اپنی فور وہیل پاور سے اڑی جا رہی تھی۔ ہمارا تعاقب کرنے والے دیکھتے ہی دیکھتے بہت پیچھے رہ گئے۔ یقیناً انہوں نے ہمت ہار دی تھی۔ وہ جیپ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ رہی سہی کسر گن کی مہلک فائرنگ نے پوری کر دی تھی۔

عمران بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب سکون کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور گہری سانس لے کر کہا۔ "تو یہ تھا ہمارا گیم؟"

"گیم... کون سا گیم؟"

"تم بڑی کھوچل شے ہو عمران! مجھے شروع سے شک تھا کہ تم نے بیش قیمت انعام چھوڑ کر یہ جیپ لی ہے تو اس کی کوئی وجہ ہے۔"

"نہیں نہیں... تم خواہ مخواہ شک کر رہے ہو۔ اس وقت میرے دماغ میں کوئی بات نہیں تھی۔"

"اور میرا خیال ہے کہ اپنے پیدا ہونے سے پہلے بھی تمہارے دماغ میں باتیں موجود تھیں اور تم پوری پلاننگ کے ساتھ ہی پیدا ہوئے ہو گے۔"

"دیکھو تم مجھ پر جو گنگ کا الزام لگاتے ہو اور اب خود جگتیں لگا رہے ہو۔"

"پتا نہیں کیوں، مجھے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ واقعی تم سے کوئی جیپ چھین کر لے گیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس میں کوئی ہیر پھیر ہے..."

"دیکھو اب تم مجھ پر ہیرا پھیری کا الزام بھی لگا رہے ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم گھوڑوں پر ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے اور برساتی نالے کے آس پاس کہیں فوت ہو جاتے۔ کم از کم مجھے ایسی خوب صورت خاتون کے سامنے یوں ذلیل تو نہ ہونا پڑتا۔"

سنگین صورت حال کے باوجود میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا۔ "گویا تم یہ بات مان رہے ہو کہ یہ ساری تمہاری پلاننگ تھی؟"

"میں کہاں مان رہا ہوں... میں تو برساتی نالے کے کنارے فوت ہونے کی بات کر رہا ہوں... ویسے... یار تابش! برساتی نالے کے کنارے فوت ہونے کا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔ تمہیں تو سب یاد ہی ہو گا، اس سے پہلے ایک دفعہ میں لاہور جی ٹی روڈ کے قریب ایسی وفات کا مزہ چکھ چکا ہوں۔ واہ واہ... کیسا دل بہار سین تھا جب اکٹھی چار گولیاں میرے سینے پر لگی تھیں۔ جان یوں جسم میں سے نکلی تھی جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔"

"اور اتنا کچھ ہونے کے باوجود تم زندہ ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ جینا بھی کوئی جینا ہے یار! چڑیلے کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ زندوں میں نہ مردوں میں۔ اور پھر اگر اس چڑیلے کو نیوز چینل کا پیٹ بھی بھرنا ہو تو اور بڑا عذاب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ قیامت تک میری روح یونہی بھٹکتی رہے گی۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"لیکن اتنا خوش ہونے کی ضرورت بھی نہیں تمہیں... میرے لیے "یوں قیامت تک بھٹکنے" میں ایک پہلو اطمینان کا بھی ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے چینل پر قیامت کی خبر دے سکوں گا۔ ذرا سوچو، کتنا مزہ آئے گا جب میں ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو کر اپنا دو فٹ لمبا سنگین پریشان چہرہ ناظرین کو دکھاؤں گا اور کہوں گا... خواتین و حضرات! قیامت آ گئی ہے۔ بالآخر ہم قیامت لانے میں کامیاب رہے ہیں... اب کہیں جائیے گا مت۔ ہم اب حوالے سے طویل دورانیے کی خصوصی ٹرانسمیشن شروع کر رہے ہیں۔

ہمارے اور آپ کے تھرڈ اجل بننے تک یہ ٹرانسمیشن جاری رہے گی..."

حمیدہ ہم دونوں کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر حیران ہو رہی تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی تھی۔ پیچھے اب دور دور تک تعاقب کرنے والوں کا نشان نہیں تھا مگر وہ پھر بھی خوف زدہ تھی۔ جیپ تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں کو نگلتی چلی جا رہی تھی۔

ہم نے بغیر رکے اپنا سفر جاری رکھا۔ جیپ کے اندر وافر مقدار میں فیول تھا۔ اس کے علاوہ فیول سے بھرا ہوا ایک فالتو ٹینک بھی تھا۔ گن کے اضافی راؤنڈز، ٹارچ، شکاری چاقو اور اس طرح کی کئی اشیا پہلے سے جیپ میں موجود تھیں۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ عمران نے پوری تیاری کے ساتھ جیپ کو وہاں چھپایا تھا۔ گھوڑے سے اترنے والا راشن بھی جیپ کے اندر موجود تھا اور یہ ہم تینوں کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ عمران نے بالکل درست کہا تھا۔ وقت رخصت بشارت علی خاں وغیرہ کی طرف سے جو دو رائفلیں ہمیں دی گئی تھیں، وہ بیکار تھیں۔ ان میں گڑبڑ کی گئی تھی۔ انہیں بس لاٹھی کے طور پر ہی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ہم نے کھانا بھی چلتی جیپ میں کھایا۔ ہمارے اصرار کے باوجود حمیدہ نے ایک دو لقموں سے زیادہ نہیں لیے۔ رات کے وقت ہم اسی پُرخطر علاقے سے گزرے جس کے بارے میں عمران نے کہا تھا کہ یہ "سانپوں کا علاقہ" کہلاتا ہے۔ اس وقت کے سارے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ تب میں اور عمران گھوڑا گاڑی پر سوار تھے۔ ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ زرگاں کی طرف سفر کر رہے تھے اور ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے زندہ پلٹ سکیں گے یا نہیں... اور پھر ہماری گھوڑا گاڑی میں ایک زہریلا سانپ رینگ آیا تھا۔ بعدازاں لال بھون میں اس سانپ نے میڈم اور عمران کو ایک دوجے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس گھنے جنگل میں یہ سفر ہمارے لیے دشوار ثابت ہوا۔ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کر رہے تھے۔ بس پارکنگ لائٹس کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کئی جگہ عمران کو یا مجھے نیچے اتر کر جیپ کے لیے راستہ بنانا پڑا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں ہمارے لیے اضافی تناؤ کا باعث تھیں۔ خاص طور سے حمیدہ کا برا حال تھا۔ وہ مسلسل منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ وہ ہم دونوں کو بھائی جی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ گاہے بگاہے کہتی۔ "بھائی جی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

عمران کہتا۔ "اس کا ایک ہی حل ہے بھائی جی... بس ڈرتی رہو۔ عشق کی طرح ڈر پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ یہ وہ آگ ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔"

ایک بار پھر جب حمیدہ نے کہا "بھائی جی، مجھے ڈر لگ رہا ہے" تو عمران بولا۔ "دیکھو بھائی جی! تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو تم ڈر کو لگ جاؤ۔ ڈر کو ٹھگنے کا طریقہ یہ ہے کہ اچھی اچھی باتیں یاد کرو۔ جیسے میں اور تابش کر رہے ہیں۔ تابش اس وقت اپنی طرح دار بیوی کو یاد کر رہا ہے اور رضائی کے اندر گھس کر... اس کے ہاتھ کے گرم گرم پکوڑے کھانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر فقرے میں "لمبا وقفہ" دیا تھا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اسی طرح میں اس کھوسٹ بڑھیا کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس نے اپنی ضد سے اپنا پورا پریوار تباہ کر دیا اور اب شاید خود بھی تباہ ہونے والی ہے۔"

"کون بڑھیا جی؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"وہی جس نے حکم کے دربار میں میرے ساتھ "ٹاک شو" کیا تھا۔ ذرا تصور کرو تابی! اس وقت کیا حالت ہو گی اس کی۔ اس نے تو پانچ چھ دن پہلے ہی خود کو آگ لگا کر بھرون بن جانا تھا۔ غالباً پنڈت مہاراج وغیرہ نے اسے تسلی دی ہو گی کہ ہمیں آزاد نہیں کیا جا رہا۔ چھوڑنے کے بعد ہمیں پھر پکڑ لیا جائے گا... لیکن اب، جب اس "ہائی اسپیڈ بڑھیا" کو پتا چلا ہو گا کہ ہم نکل گئے تو اس نے یقیناً قیامت مچا دی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ اب تک وہ اپنے تئیں "شہید" بھی ہو چکی ہو۔"

اڑیل بڑھیا کے ذکر نے مجھے بھی محظوظ کیا لیکن میں نے عمران کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا۔ "یار! ایسے لوگ خود شہید نہیں ہوتے، دوسروں کو شہید کرانا زیادہ باعث ثواب سمجھتے ہیں۔ خاص طور سے نوجوانوں کو۔ یہ بڑھیا اپنے خاندان کو برباد کر چکی ہے لیکن اب بھی اس کے پاس اپنے حق میں بڑی ٹھوس دلیلیں موجود ہوں گی۔"

عمران نے میری بات سے اتفاق کیا۔

ہم نے اگلے روز بھی وقفے وقفے سے سفر جاری رکھا۔ ہم بتدریج سرسبز علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ اس علاقے میں کسی سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ ایک طرح سے یہ سارا علاقہ زرگاں اور تل پانی کے درمیان "نو مین لینڈ" تھا۔ ہوشیار سنگھ اور آفتاب خاں وغیرہ نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں زرگاں اور تل پانی دونوں کے گارڈز اور جاسوس حرکت کرتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ قیام کر لیا جائے۔ اگر ہم چلتے رہتے تو ہمیں بغیر روشنی کے سفر کرنا پڑتا اور یہ بہت دشوار تھا۔ اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علاوہ پچھلے قریباً چھتیس گھنٹے میں تھکاوٹ بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ خاص طور سے حمیدہ کا تو بُرا حال تھا۔

ہم نے ایک نسبتاً اونچی جگہ پر درختوں کے درمیان جیپ روک دی۔ سردی کافی تھی مگر ہم جیپ کا ہیٹر آن نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ فیول اب گزارے لائق ہی رہ گیا تھا...

تھوڑا سا کھانا کھا کر حمیدہ پچھلی نشست پر لیٹ گئی۔

میں نے عمران سے کہا۔ ”تم بھی اپنی سیٹ اسٹریچ کر کے تھوڑی دیر آرام کرلو۔“

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، حمیدہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”بھائی جی! آپ نے بتایا تھا ناں کہ زرگاں میں میری مصیبت کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا تھا؟ آپ کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی عورت تھی؟“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”عورت نہیں لڑکی۔ تمہاری سہیلی وجنتی... ہم اتفاقاً اس کے گھر میں جا گھسے تھے۔ اسی سے ہمیں ساری باتیں پتا چلیں۔“

”وجنتی؟“ حمیدہ ششدر رہ گئی۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں سب کچھ بتایا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ بولی۔ ”جب جارج صاحب کے سپاہی مجھے پکڑنے کے لیے میرے گھر آئے تو وجنتی بھی وہیں تھی... اس نے انہیں روکنے کی بڑی کوشش کی۔ وہ ان سے لڑ پڑی تھی۔ سپاہیوں نے اسے گالیاں اور دھکے دیے تھے۔ میں اس کے بارے میں بڑی فکرمند تھی۔ آپ نے یہ بتا کر میری تسلی کی ہے کہ وہ خیریت سے ہے لیکن...“

”لیکن کیا؟“

”...جب میں نے آپ سے زرگاں میں اس بارے میں پوچھا تھا تو آپ نے تب کیوں نہیں بتایا؟“

”اس کا جواب سیدھا سادہ ہے حمیدہ۔“ میرے بجائے عمران نے جواب دیا۔ ”تب تک ہم دشمنوں میں تھے، خطرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ تمہیں وجنتی کے بارے میں بتانا کوئی مسئلہ پیدا کرسکتا تھا۔“

بات حمیدہ کی سمجھ میں آ گئی اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگی مگر وہ پھر بھی نشست پر لیٹی نہیں۔ ہچکچاہٹ کے عالم میں بیٹھی رہی۔ عمران اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ وہ ہماری موجودگی میں بے آرامی محسوس کررہی ہے... عمران اور میں جیپ سے باہر نکل آئے۔ طاقتور گن عمران کے ہاتھ میں تھی۔ ”آ... آپ کہاں جارہے ہیں؟“ وہ بوکھلائی۔

”کہیں نہیں۔ ہم ذرا سگریٹ وغیرہ پئیں گے۔ یہیں جیپ کے پاس بیٹھ رہے ہیں۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔“ عمران نے کہا۔

جیپ کے پاس ہی صاف ستھری پتھریلی جگہ تھی۔ ہم نے وہاں ایک چٹائی بچھائی اور تناور درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے ہم اپنے اردگرد زیادہ اچھی طرح نگاہ رکھ سکتے تھے۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ مدھم روشنی درختوں سے چھن چھن کر خشک پتوں سے اٹی زمین پر پڑ رہی تھی۔ ہلکی سرد ہوا درختوں کے درمیان سے یوں گزر رہی تھی جیسے کوئی دوشیزہ اپنا لمبا آنچل لہراتی بے شمار ستونوں والے محل سرا میں بھاگ رہی ہو... اس کی پائل مدھر آواز پیدا کرتی ہو اور اس کی خوشبو قرب و جوار کو بھاتی ہو... یوں لگتا تھا کہ اس سنسان جنگل میں میلوں تک ہم تینوں کے سوا اور کوئی ذی نفس نہیں۔ یہاں جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔

عمران نے سگریٹ سلگا کر اسے اپنے ہاتھ کی قوس سے ڈھانپ لیا اور اپنا دوسرا ہاتھ میری زخمی پسلی پر چلاتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ درد تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”مجھے لگتا ہے کہ تمہیں درد کے حوالے سے نہیں کہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ کچھ بھی ہو جائے تم ’نہیں‘ ہی کہو گے۔“

”کیا یہ بُری عادت ہے؟“

”بالکل نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اسی ’نہیں‘ کی وجہ سے تم جارج گورا جیسے شخص کو مات دینے میں کامیاب ہوئے ہو۔ وہ جس طرح تمہیں زخمی کرچکا تھا اور تمہاری گردن جکڑ چکا تھا، لگتا نہیں تھا کہ تم کھڑے رہ پاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ اس ’نہیں‘ کے سلسلے میں تو تمہاری شاگردی اختیار کرنی چاہیے۔“

”خیر، ایسی بھی بات نہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے ہم دونوں ایک دوسرے کی شاگردی اختیار کرسکتے ہیں۔ کچھ گُن تمہارے اندر ایسے ہیں جو مجھ میں نہیں۔“

”مثلاً؟“

میں ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مثلاً بات کو چھپانے اور گول کرنے کا فن۔“

”میں نے کیا چھپایا ہے؟“

”تم نے بتایا کیا ہے، ہر معاملے میں گھپلا کیا ہے۔ تمہیں پتا تھا کہ حکم کی نیت میں فتور ہے، وہ تمہیں صرف

دکھاوے کے لیے چھوڑ رہا ہے۔ اس کی پلاننگ کو ناکام بنانے کے لیے تم نے بھی لمبی چوڑی پلاننگ کی۔ رتنا دیوی والی جیپ حاصل کی پھر اس کے چھینے جانے کا ڈراما کیا پھر اسے پوری تیاری کے ساتھ مناسب جگہ پر چھپایا اور مجھے خبر تک نہیں ہونے دی۔“

اس نے کش لے کر تنے سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے کسی چیز کے بارے میں بھی یقین نہیں تھا۔ یہ سب اندازے تھے جو غلط بھی ہوسکتے تھے اور صحیح بھی۔ شکر ہے کہ یہ صحیح ہوئے۔ دوسری بات یہ کہ میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں کہ میں جیپ کے چھینے جانے والا ڈراما کرنے والا ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کے بعد تمہیں مسلسل اداکاری کرنا پڑے گی۔ اور ہوسکتا ہے کہ کہیں کہیں تمہاری اداکاری زیادہ اچھی نہ ہو اور حکم کے ہرکاروں کو شک گزرے۔“

”شک تو خیر مجھے شروع سے ہی تھا۔“ میں نے کہا۔ ”حکم اور پنڈت مہاراج وغیرہ جس طرح ہماری ہر بات مانتے چلے جارہے تھے... خاص طور سے جس طرح انہوں نے تمہیں بھی میرے ساتھ آنے کی اجازت فراخ دلی سے دے دی تھی، لگتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن کچھ باتیں اب بھی الجھن میں ڈالتی ہیں۔ مثلاً تمہارا جیپ کو بالکل صحیح جگہ پر چھپانا... تمہیں اس بات کا پہلے سے علم ہونا کہ جو رائفلیں ہمیں دی گئی ہیں، وہ ناکارہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔“

وہ مسکرایا۔ ”ابھی تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ کچھ معاملوں میں تم بھی میری شاگردی اختیار کرسکتے ہو۔ درست اندازے لگانا بھی تو ایک فن ہے جگر... اور اس حوالے سے میں تم سے تھوڑا سا آگے ہوں۔“

”تم بہت سے معاملوں میں آگے ہو۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”چھپے رستم ہو... بہت پہنچی ہوئی شے ہو بلکہ سچ میں ضرورت سے زیادہ ہی ’پہنچ‘ جاتے ہو۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ چاندنی اس کی ٹھوڑی کے دلکش گڑھے کو نمایاں کررہی تھی۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کوئی نئی بات نہیں کررہا۔ وہی پرانی دُہرا رہا ہوں۔ اگر باتوں کو چھپانے اور گول کرنے کا کوئی عالمی مقابلہ ہو تو تم ضرور گولڈ میڈل لے جاؤ۔“ میں مسکرایا۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ اس کی تیز عقابی نگاہیں میری آنکھوں کے راستے جیسے میرے دماغ کے اندر گھسنے لگیں۔ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”تم نے میری مستی کی بات کیوں کی ہے؟ کیا تم نے کچھ دیکھا ہے؟“

میں نے بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں، دیکھا ہے اور سخت حیران بھی ہوا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ گیتا ممی ایسی زوردار لڑکی ہے۔“

اس نے نتھنوں سے دھوئیں کی طویل لکیریں خارج کیں اور قدرے پُرسکون نظر آنے لگا... اب اس کے چہرے پر الجھن کے بجائے ایک طرح کی چمک سی آ گئی۔ چند لمحے بعد وہ مسکرایا اور بولا۔ ”انڈیا کا ایک مشہور فلمی گانا ہے، میرا تو جو بھی قدم ہے وہ تیری راہ میں ہے... تو کہیں بھی رہے میری نگاہ میں ہے۔ اسی طرح بھئی ہم بھی جو کچھ کرتے ہیں تمہارے لیے ہی کرتے ہیں۔ تمہارے سکون کے لیے... تمہاری خوشی کے لیے۔“

”یعنی تم نے میرے سکون اور خوشی کے لیے گیتا سے زبردست قسم کے رومانی سین کیے۔ بھئی واہ... زبردست... کل تم کہو گے کہ میرا غم غلط کرنے کے لیے تم نے شراب کی بوتل پی لی یا پھر میری پسلی کا درد کم کرنے کے لیے اسپرین کی چار گولیاں پھانک لیں۔“

”میں نے کہا ہے ناں، اب تمہیں باتیں کرنا آ گئی ہیں۔ وہ وقت بھول گئے جب منہ میں زبان ہی نہیں تھی۔“

”خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔“

”لیکن خربوزے کو دیکھ کر ناشپاتی تو رنگ نہیں پکڑتی۔ تم میں اور مجھ میں فرق ہے... اور اگر تم رنگ پکڑ بھی رہے ہو تو غلط پکڑ رہے ہو۔ تم شک زیادہ کرنے لگے ہو۔“

”میں شک نہیں کررہا۔ میں نے سب کچھ اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”تو کیوں دیکھا ہے بھئی؟ تمہیں کس نے دیا دیکھنے کا لائسنس؟“

”ہاں، یہ ایک ٹھیک سوال ہے۔ اس پر بعد میں بحث ہوسکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر تک مجھے مصنوعی غصے سے گھورتا رہا۔ پھر اس نے مجھے مکا مارنا چاہا۔ میں ایک دم نیچے جھک گیا لیکن اس نے مکا مارا نہیں۔ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”ڈرتے بھی ہو اور باز بھی نہیں آتے لیکن زخمی ہو اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔“

”اس رحم دلی کا بڑا شکریہ... مگر میرا سوال اپنی جگہ ہے۔“

اب اس کی آنکھوں میں مخصوص شوخ چمک نظر آرہی تھی۔ سگریٹ کا ایک اور کش لے کر اس نے باقی ماندہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سگریٹ کو جوتے کے تلوے سے رگڑ کر بجھایا اور بولا۔ ''میں ابھی تمھیں بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اب پیچھے پڑ گئے ہو تو بتانا پڑے گا۔ فلم ''بھابی دیاں چوڑیاں'' دیکھی تھی تم نے؟''

''یہ فلم کی بات کیسے آگئی درمیان میں؟''

''اس بات کو چھوڑو۔ کوئی بھی بات، کسی بھی بات کے درمیان میں کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ اب یہ دیکھو، یہ میری اپنی زندگی کی تھی لیکن تم اس کے درمیان میں کود پڑے نا... اس طرح کی اور بھی کئی اوٹ پٹانگ نامعقول مثالیں موجود ہیں۔ تم میرے سوال کا جواب دو، فلم دیکھی تھی تم نے؟'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ ''اس فلم میں لڑکے کی بھابی کی چوڑیاں شاید ولن صاحب کے قبضے میں چلی جاتی ہیں۔ وہ ان چوڑیوں کو واپس لینا اپنا نصب العین بنالیتا ہے اور آخر یہ کام کر کے دکھا دیتا ہے۔ میرے دل میں بھی یہ شدید خواہش تھی کہ میں ایسا ہی کچھ کروں لیکن اس کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری تھا۔ ایک بھابی اور دوسرے چوڑیاں۔ چوڑیوں کا انتظام تو شاید میں کسی طور کر لیتا لیکن بھابی کہاں سے لے کر آتا۔ میرا تو کوئی بھائی شائی ہی نہیں تھا۔ مگر پچھلے دنوں میری یہ مشکل آسان ہو گئی جب تم نے مجھے یہ بتایا کہ تم سلطانہ سے شادی کر چکے ہو۔ اس لحاظ سے وہ میری بھابی بن گئی۔ کچھ روز بعد ایک اور بڑا خوش گوار اتفاق ہوا، جب نادر افضل کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ ایک موقع پر تمھیں طویل بخار سے صحت یاب کرنے کے لیے سلطانہ نے اپنا سارا زیور اور جمع پونجی ایک وید صاحب کی جھولی میں ڈال دی تھی اور تمہاری جان بچائی تھی۔ بس اس دن سے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ''بھابی دیاں چوڑیاں'' والا سارا سین پارٹ اصل زندگی میں دُہراؤں گا۔ سلطانہ کا کھویا ہوا زیور اسے واپس لوٹاؤں گا۔''

''مجھے تمہاری کسی بات کی سمجھ نہیں آرہی۔'' میں نے کہا۔

''اس فلم میں بھی نکھے شوہر کو کسی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔'' اس نے کہا۔ وہ کچھ دیر مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی جیکٹ کی زپ کھولی۔ اس کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک وزنی موٹی لفافہ نکال لیا۔ ''ٹارچ جلاؤ۔'' اس نے کہا۔

میں نے ٹارچ روشن کی اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ موٹی لفافے میں خوب صورت طلائی زیورات جگمگا رہے تھے۔ ''یہ... یہ کس کے ہیں؟'' میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''سلطانہ کے۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''یہ وہی ہیں جو ڈھائی تین سال پہلے اس نے تم پر وار دیے تھے۔ یہ زرگاں کے اسی وید کے پاس تھے جس نے تمہارا علاج کیا تھا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ میں اس تک کیسے پہنچا۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ایک ہوشیار مقامی نے میری مدد کی اور یہ مشکل کام آسان ہو گیا۔''

''مجھے... یقین... نہیں آرہا۔''

''اس فلم میں بھی اس احمق شوہر کو کسی بات کا یقین نہیں آتا تھا۔''

میری نگاہیں زیورات پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ ساتھ ستر تولے سونا تو رہا ہوگا... میں زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ایک بار پھر ذہن پر چھائی ہوئی دھند میں سے فراموش کردہ ماضی کے کچھ مناظر ابھرنے لگے۔ مجھے لگا کہ سلطانہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔ اس کے اردگرد مسہری پر چمکیلی سرخ پتیوں کی جھالریں ہیں۔ یہ جھالریں لالٹین کی روشنی میں دمک رہی ہیں اور خود سلطانہ بھی لشکارے مار رہی ہے۔ اس کے گلے میں ایسا ہی گلوبند تھا۔ اس کی ناک میں ایسی ہی نتھ تھی... میرا دل گواہی دینے لگا، شاید عمران ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ سلطانہ کے ہی گہنے ہیں۔

''کس سوچ میں کھو گئے شہزادے؟'' عمران نے مجھے ٹہوکا دیا تو میں چونک گیا۔

میری کھوجی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ میں نے پوچھا۔ ''کب لے تمھیں یہ زیور؟''

''جن دنوں تم نے اپنی پسلی کی ''ویلڈنگ'' کرائی تھی اور اسپتال میں تھے۔'' وہ مسکرایا۔

مجھے یاد آیا کہ ان دنوں عمران کافی گھومتا پھرتا رہا تھا۔ جیپ کی ڈرائیونگ کا بہانہ کر کے وہ تین چار بار اسپتال سے نکلا تھا اور دیر تک باہر رہا تھا۔

ایک دم میں نے چونک کر پوچھا۔ ''لیکن... ہم بات تو کچھ اور کر رہے تھے۔ میں نے تم سے تمہارے اور گیتا کھی کے بارے میں پوچھا تھا۔''

''تو وہی تو بتا رہا ہوں یار۔ ان زیوروں کی دستیابی اور گیتا کھی میں گہرا تعلق ہے۔ تمھیں کچھ عجیب تو لگے گا لیکن میں وہی بتا رہا ہوں جو سچ ہے۔ ایک دن میں اور گیتا کھی بڑے اچھے موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ طوفانی رفتار سے بول رہی تھی اور اپنے ماضی کے قصے سنا رہی تھی۔ میں نے اس سے سلطانہ کے زیورات کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی اور بتایا کہ وہ زیور کیسے اور کن حالات میں زرگاں کے ایک تجربہ کار وید کے پاس چلے گئے تھے۔ میں نے گیتا کھی سے کہا کہ وہ ایک چلتا پرزہ ہے۔ زرگاں کے چپے چپے کی خبر اسے رہتی ہے۔ کیا وہ کسی طرح اس وید کا اور زیوروں کا پتا نہیں چلا سکتی؟ وہ موڈ میں تھی۔ الائچی سپاری پان چبا کر بولی کہ وہ یہ کام کر دے گی لیکن اس کے بدلے مجھ سے ایک من پسند تحفہ لے گی۔ میں نے کہا کہ تحفہ تو دینے والے کی مرضی کا ہوتا ہے۔ وہ بولی لیکن میں اپنی مرضی کا لوں گی۔ میں ذرا چونک گیا۔ میں نے کہا، اگر کوئی ایسی چیز ہوئی جو میں نہ دے سکا تو؟ وہ بولی۔ میں تمھیں بڑی اچھی طرح جان گئی ہوں عمران صاحب! کوئی ایسی چیز نہیں مانگوں گی جو تم نہ دے سکو۔ بس اس طرح ہمارے درمیان ایک ''ڈیل ٹائپ'' کی چیز ہو گئی... گیتا کھی نے میری توقع سے زیادہ صلاحیت دکھائی۔ ایک دو جگہ میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ آٹھ دس دن کے اندر ہم اس وید صاحب تک اور ان زیوروں تک جا پہنچے۔ وید صاحب ان زیوروں کے منہ مانگے پیسے مانگ رہا تھا لیکن لالچی شخص اکثر ڈرپوک بھی ہوتا ہے۔ میں نے اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ معقول رقم پر زیور واپس کرنے پر رضامند ہو گیا... وید کو قائل کرنے کے سلسلے میں گیتا کھی نے بھی کردار ادا کیا۔''

''اور زیورات کے لیے رقم کہاں سے لی تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''جگر! تمھیں بتایا ہے نا کہ پیسوں کے سلسلے میں تمہارے یار کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔''

''پھر بھی پتا تو چلے؟''

''میڈم صفورا سے ادھار لیے تھے۔ اگر اللہ نے اسے زندگی دی تو جلدی ہی لوٹا دوں گا۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ میڈم صفورا جیسی عورت تمھیں ادھار دے سکتی ہے۔''

''وہ بہت کچھ دے گی اور لے گی، اگر اس کی زندگی رہی تو۔ تم آگے آگے دیکھنا۔''

''اس کی زندگی کی بڑی فکر ہے تمھیں۔ خود تو جیسے آبِ حیات پی رکھا ہے تم نے۔''

''چڑ لے کو موت نہیں آتی یار... وہ مر کر ہی تو چڑیلا بنتا ہے۔''

چاندنی درختوں میں اپنا زاویہ بدل چکی تھی۔ ہلکی اوس گرنا شروع ہو گئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر پچھڑ میں اتھری ہوئی جرمن جیپ کے اندر حمیدہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ کسی چکور کی آواز بلند ہوئی اور سناٹے میں دور تک پھیل گئی۔ میں نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تو پرسوں رات میں نے لال بھون کے کمرے میں جو کچھ دیکھا وہ گیتا کھی کا من پسند تحفہ تھا؟''

''تم کہہ سکتے ہو۔ ان عورتوں کی خواہشیں بھی انہی کی طرح عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ وہ کہتی تھی، میں تمھیں اپنے ہونٹوں سے الوداع کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا کر لو بھی۔ اس نے میرے ساتھ اس کمرے میں اپنی مرضی کے ایک دو منٹ گزارے اور اسی میں خوش ہو گئی۔ کوئی اس طرح خوش ہو جائے تو اسے کر دینا چاہیے یار۔ ہمارے حقوق کون سے بحقِ زوجہ محفوظ ہیں۔''

میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا شخص تھا۔ پوٹلی میں لپٹے ہوئے زیورات چاندنی میں دمک رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''عورت کی زندگی میں گہنوں کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے اور عروسی گہنے تو اس کی روح کے اندر رکھے ہیں۔ انہیں کھو کر وہ اندر سے تاریک ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کل یا پرسوں رات جب تم سلطانہ سے تنہائی میں ملو تو اپنے ہاتھ سے اسے یہ گہنے پہناؤ۔ مجھے یقین ہے تمہارے ہاتھوں سے یہ سونا پہن کر وہ اندر سے روشن ہو جائے گی۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ ''لیکن ایک بات کا تمھیں مجھ سے ابھی اور اسی وقت وعدہ کرنا ہوگا اور اگر تم نے وہ وعدہ توڑا تو سمجھو ہمارے درمیان جنگِ عظیم ہو جائے گی۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ بہت نقصان ہوگا ہماری دوستی کا۔''

''کیسا وعدہ؟'' میں نے پوچھا۔

''سلطانہ بھابی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ گہنے برآمد کرنے میں میرا عمل دخل ہے۔ میں یہ کریڈٹ تمہارے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے میری یہ خواہش پوری نہ کی تو... سچ کہتا ہوں، ہماری لڑائی ہو جائے گی۔'' وہ واقعی سنجیدہ تھا۔

میں نے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کہیں پاس کے درختوں میں ایک بار پھر چاندنی میں نہائی ہوئی... چکور کی رومان انگیز آواز سنائی دی۔ عمران کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ''سلطانہ بڑی اسپیشل لڑکی ہے تابش۔ وہ باہر سے شاید بہت خوب صورت نظر نہ آتی ہو مگر اندر سے حسین و جمیل ہے۔ وہ تمہارے پیار کی اتنی زیادہ حق دار ہے جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ تم نے اسے ٹوٹ کر بکھرنے سے بچایا ہے، اب اس کی زندگی کو زندگی بنانا بھی تمہارا ہی کام ہے...''

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ اگلی شب دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ہم ایک بار پھر اس مچھیرا بستی فتح پور کے نواح میں تھے۔ فتح پور کا قدیم مندر دو کلومیٹر دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ ہلکی چاندنی میں ہم دونوں اپنی کیچڑ زدہ جرمن جیپ کے پاس کھڑے تھے۔ جیپ کا انجن خاموش تھا۔ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔

حمیدہ کو اس کی شدید خواہش کے مطابق ہم نے شام کے وقت یہاں سے چالیس پچاس کلومیٹر دور ایک بستی ''شاہی پور'' میں اتار دیا تھا۔ شاہی پور میں حمیدہ کے دو شادی شدہ تایا زاد بھائی رہتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ان کے ذریعے بحفاظت تل پانی میں اپنے دیگر رشتے داروں کے پاس پہنچ سکتی ہے۔ وقت رخصت وہ بے حد ممنون اور احسان مند نظر آئی تھی۔ خاص طور سے میری طرف دیکھ کر اس کی آنکھیں بار بار ڈبڈبا جاتی تھیں۔

اور اب ہم فتح پور میں داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔ فتح پور میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں ایک نہایت ناپسندیدہ کام کرنا تھا۔ اور وہ یہ کہ اپنی اسپیشل جرمن جیپ کو، جس نے کٹھن راستوں پر ہمارا بے مثال ساتھ دیا تھا... پانی میں غرق کرنا تھا۔ اس کام کے لیے ہم ایک بڑا بارشی جوہڑ پہلے ہی منتخب کر چکے تھے۔ عمران چونکہ کئی ماہ سے یہاں فتح پور میں رہ رہا تھا، اس لیے وہ اور اقبال یہاں کے نشیب و فراز کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ جوہڑ کافی گہرا تھا۔ دوسرے جوہڑوں کی طرح اس میں بھی چھوٹے سائز کی مچھلیاں موجود ہوتی تھیں لیکن انہیں پکڑنے کے لیے کوئی اس جوہڑ کی طرف نہیں آتا تھا۔ یہاں بھی وہی توہم پرستی کارفرما تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں اوپر تلے تین لڑکے بالے اس جگہ ڈوب کر ہلاک ہو چکے تھے اور حسب رواج یہ جوہڑ آسیب زدہ قرار پا گیا تھا۔

ہم نے جیپ میں سے تمام ضروری اشیا نکال لی تھیں... جیپ بالکل جوہڑ کے کنارے پر کھڑی تھی۔ اس کے دروازے بند کرنے کے بعد ہم نے اسے آہستہ آہستہ دھکیلنا شروع کیا اور وہ جوہڑ کے مٹیالے پانیوں میں اترتی چلی گئی۔ ایک منٹ کے اندر اس کا نام و نشان مٹ گیا... ہم نے جوہڑ کے قریب سے اس کے چوڑے ٹائروں کے نشان ختم کر دیے۔ امید تھی کہ دو چار دن میں جب بارش ہو جائے گی تو باقی ماندہ نشانات بھی ختم ہو جائیں گے۔

اب مسئلہ آفتاب خاں کو ڈھونڈنے اور اسے بتانے کا تھا کہ ہم واپس پہنچ گئے ہیں۔ پروگرام کے مطابق اس کام کے لیے عمران کو آگے جانا تھا۔ ہمارے رسد کے سامان میں دو بڑے سائز کی گرم چادریں بھی موجود تھیں۔ عمران نے ایک چادر مقامی انداز میں اس طرح جسم کے گرد لپیٹی کہ اس میں منہ سر بھی چھپ گیا۔ ایک لاٹھی کے ساتھ اس نے کپڑوں والی گٹھڑی باندھ کر کندھے سے لٹکا لی۔ اس حلیے میں وہ ایک مقامی مسافر ہی نظر آنے لگا۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر اس نے دور مار رائفل بھی اپنی چادر کے نیچے ہی چھپائی تھی۔ میرے پاس ہتھیار کے نام پر بس ایک چاقو تھا۔ یہ بڑا خاص چاقو تھا اور میرے لیے اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

ہم پیدل ہی فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مندر کے تہ خانوں میں صورت حال کیا ہوگی؟ وہ سب لوگ خیر خیریت سے ہوں گے جنہیں ہم یہاں چھوڑ کر گئے تھے؟

فتح پور کے بالکل پاس آ کر میں درختوں کے ایک جھنڈ میں ٹھہر گیا اور عمران آگے چلا گیا۔ میں ایک ایک پل گن کر گزارنے لگا۔ قریباً ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا، ہمارا اپنے ساتھیوں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ جہاں ان سے ملنے کی خوشی تھی، وہاں ان گنت اندیشے بھی ذہن میں سر ابھار رہے تھے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا میں آج رات سلطانہ کو اپنے روبرو دیکھ سکوں گا؟

مجھے عمران پر پورا بھروسا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ فتح پور میں داخل ہو کر وہی کچھ کرے گا جو موجودہ صورت حال میں بہترین ہوگا۔

انتظار کے پل، برسوں کی طرح گزرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ آخر مجھے ایک شخص کا سایہ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ عمران تو ہرگز نہیں تھا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے چاقو پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ آنے والا دراز قد تھا۔ پھر میں نے پہچان لیا۔ وہ آفتاب خاں تھا۔ میں درختوں کی اوٹ سے باہر نکلا، ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

آفتاب خاں نے جوش کے عالم میں میرا کندھا چوما اور بولا۔ ''مرحبا... مرحبا تابش بھائی! آپ نے... آپ نے ام سب کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔ آپ نے وہ کر دکھایا جس کا ام سب لوگ بس سپنا ہی دیکھ سکتا تھا۔ امارے بس میں ہوتا تو ام آپ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتا اور آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر گاؤں میں لے جاتا۔''

اس نے ایک بار پھر جوش سے میرا کندھا چوما۔

میں نے کہا۔ ''سب خیریت سے ہیں نا آفتاب خاں... میرا مطلب ہے، اقبال، تاؤ افضل، ہوشیار سنگھ اور سلطانہ؟''

''سب ایک دم خیریت سے ہے جی۔ بس ایک بندہ خیریت سے نہیں ہے، اس کے بارے میں ام آپ کو بعد میں بتا دے گا۔''

''سلطانہ اور اقبال تو خیریت سے ہیں نا؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''بالکل جی، ایک دم ٹھیک ٹھاک۔ ام لوگوں کو ورگاں میں ہونے والے زبردست دنگل کا خبر دس پندرہ دن پہلے ہی مل گیا تھا۔ ام کو یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ایک بہت بڑے مقابلے میں ایک جوان نے جارج گورا کو جان سے مار ڈالا ہے۔ لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ مارنے والا کون ہے۔ کچھ لوگ اسے تل پانی کے انور خاں کا کارنامہ بتاتا تھا، کچھ چھوٹے سرکار کے ایک فوجی افسر کا نام لیتا تھا لیکن ام کو یقین تھا کہ یہ آپ دونوں میں سے ہی کوئی ہوگا۔ ایک دو روز بعد سارا تفصیل معلوم ہو گیا اور اس بات کا پکا پکا تصدیق ہو گیا کہ یہ کارنامہ آپ نے ہی کیا ہے۔'' آفتاب خاں اتنا پُرجوش تھا کہ اس کی آواز بار بار بھرا رہی تھی۔

''عمران کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ام انہیں مندر میں چھوڑ آیا ہے۔ وہ خود بھی میرے ساتھ یہاں آنا چاہتا تھا لیکن ام نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں۔''

آفتاب مجھے اپنے ساتھ لے کر مندر کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھٹھری ہوئی چاندنی میں فتح پور کے سنسان گلی کوچے سو رہے تھے۔ بس کہیں کہیں کسی بکری کی ممیاہٹ یا آوارہ کتے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ حسب معمول آفتاب خاں کے ہاتھ میں لاٹھی اور لالٹین تھی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اس بکل میں یقیناً چھوٹا موٹا اسلحہ بھی موجود تھا... مندر کا جلا ہوا مسمار شدہ حصہ دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ تعمیر کا سامان یہاں وہاں بکھرا ہوا تھا۔ اردگرد احتیاط سے دیکھنے کے بعد آفتاب خاں مندر کی شکستہ سیڑھیاں چڑھ کر چوبی دروازے تک پہنچا اور اس کا قفل کھول دیا۔ تب اس نے اشارے سے مجھے بھی اوپر بلا لیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر کے نیم گرم ماحول میں چلے گئے۔ بالائی تہ خانے میں ہمارے سارے ساتھی موجود تھے۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہونے والا اقبال ہی تھا۔ اس نے جوش کے عالم میں مجھے اٹھایا اور کئی چکر دیے۔ اس کے بعد طلال، تاؤ افضل اور دیگر لوگوں نے میرا استقبال کیا۔ مجھے سلطانہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری نگاہ اس کی تلاش میں بھٹکنے لگی۔ وہ سب سر اٹھانے لگے۔ ''سلطانہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

عمران چہکا۔ ''ہم ڈھونڈتے ہیں ان کو جو ل کے نہیں ملتے... روٹھے ہیں نہ جانے کیوں مہماں وہ مرے دل کے۔'' پھر اس نے نیچے والے تہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔

تاؤ افضل بولا۔ ''چلو جاؤ۔ وہ وہاں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جب سے پتا چلا ہے کہ تم آ گئے ہو، مسلسل رو رہی ہے۔''

میں سیڑھیاں اتر کر زیریں تہ خانے میں پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ دروازہ بند تھا... میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پہلے اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی پھر بے بس ہو گئی اور بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ دل فگار انداز میں بولی۔ ''وہ مر گیا ہے نا... وہ مر گیا ہے نا مہرو ج؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں سلطانہ! میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے میں نے نہیں تم نے مارا ہے۔ تمہاری دبی ہوئی طاقت نے مارا ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔''

''سچ کہو مہرو ج... سچ کہو۔''

''ہاں سلطانہ... وہ تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔ اس کی انتڑیاں اس کے پیٹ سے باہر تھیں۔ وہ اپنے خون میں لت پت تھا۔''

''وہ رویا چلایا بھی تھا؟''

''ہاں سلطانہ! میں نے اسے کئی زخم لگائے۔ وہ ہر زخم پر ڈکراتا تھا اور اس کی آواز پورے میدان میں گونجتی تھی۔''

وہ اور جوش کے عالم میں مجھ سے لپٹ گئی اور شدت سے رونے لگی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ میری جیکٹ کو بھگوتی رہی۔ پھر میں نے اسے خود سے جدا کیا۔ میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ دام پوری چاقو نکالا جس سے میں نے جارج گورا کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے خم دار پھل پر ابھی تک اس کے خون کا نشان موجود تھا۔

''یہ دیکھو سلطانہ! یہ ہے وہ ہتھیار، جس سے میں نے اس شیطان کو ڈھیر کیا۔'' اس نے چاقو میرے ہاتھ سے لیا اور بے ساختہ اس کے دستے کو چوم لیا۔ پھر وہ میرے سینے سے لگ گئی اور ایک بار پھر تشکر کے آنسو بہانے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مندر کے تہ خانوں میں وہ رات جشن جیسی تھی۔ سب میرے اور عمران کے گرد جمع تھے... وہ آتش دانوں میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن لیے تھے۔ تاؤ افضل کی بیٹیوں نے نوری اور سلطانہ کے ساتھ مل کر بڑی تیزی سے گوشت بھونا تھا اور چاول پکائے تھے۔ سب نظر آ رہے تھے مگر گاڑی بان ہوشیار سنگھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ قتل ہو جانے والے گرو کی جواں سال پتنی رادھا بھی نظر نہیں آئی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ درمیانی تہ خانے میں سو رہی ہے۔

''ہوشیار سنگھ کہاں ہے؟'' میں نے آفتاب خاں سے پوچھا۔

وہ ذرا ٹھٹکا پھر اقبال کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تابش بھائی! ابھی باہر ام نے آپ کو بتایا تھا نا کہ امارے ساتھیوں میں سے بس ایک بندہ خیریت سے نہیں ہے... وہ بھی خانہ خراب ہوشیار سنگھ ہے۔ وہ ہوشیاری دکھا کر یہاں سے نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ گرو کی پتنی رادھا کو بھی لے گیا۔''

''او گاڈ... یہ کیسے ہوا؟'' میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ عمران بھی حیران پریشان نظر آنے لگا۔

اقبال نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔ ''رادھا ہر وقت اپنے گرو پتی کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ ایک دن میں نے اسے بتا دیا کہ وہ مر گیا ہے۔ اس خبر پر اس نے بڑا واویلا مچایا۔ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کلائیوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں، سیندور مٹا دیا اور پتا نہیں کیا کچھ کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے گرو کی موت کا غم بھی ہو مگر اس سے زیادہ خوف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے ''مہان'' شخص کی ہتھیا کی وجہ سے کوئی بڑی سخت مصیبت آئے گی۔ لال آندھی چلے گی، باڑ تباہی مچا دے گی یا بیماری پھوٹ پڑے گی۔ وہ رونے چلانے لگی اور اس نے کہا کہ وہ اپنے گرو پتی کے ساتھ ہی ستی ہونا چاہتی ہے۔ وہ خود کو آگ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے اسے روکا۔ دو تین دن یہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہ ستی ہونے کی کوشش کرتی اور ہم اسے پکڑ دھکڑ کر روکتے۔ پھر ایک دن میری برداشت ختم ہو گئی۔ میں نے مٹی کے تیل کی بوتل لی، ماچس پکڑی اور یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ میں نے کہا، اگر تم نہیں رہ سکتیں تو پھر ہو جاؤ ستی۔ اگلے دن سے وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اس نے سفید کپڑے پہن لیے، زمین پر سونا شروع کیا اور روکھی سوکھی روٹی بس دو وقت کھانے لگی۔

اس نے کہا کہ وہ گرو کے غم میں بیوگی زندگی گزارے گی... میں نے ہوشیار سنگھ کو رادھا کی دیکھ بھال پر لگایا ہوا تھا اور یہ میری غلطی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار سنگھ نکلا۔ اسے پتا تھا کہ اگر رادھا ستی ہونے کے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی تو ''بیوگی'' کے فیصلے پر بھی نہیں رہ سکے گی۔ وہ بھرپور جوان تھی اور ابھی ایک موٹے بوڑھے شوہر کے سوا اس نے دیکھا ہی کچھ نہیں تھا۔ ہوشیار سنگھ نے پتا نہیں کیا کرامات دکھائی کہ تھوڑے ہی دنوں میں جوان رادھا کو پوری طرح شیشے میں اتار لیا۔ ہمیں ہوشیار سنگھ کے اس ''سنہری کارنامے'' کا پتا تب چلا جب نوری نے ہوشیار سنگھ اور رادھا کا پول کھولا۔ دراصل نوری کو ان دونوں پر شک ہو چکا تھا۔ ایک شام اس نے چالاکی دکھائی اور رادھا کے کمرے کی چٹخنی کو ہتھوڑی سے چوٹ لگا کر خراب کر دیا۔ رات کسی وقت ہوشیار سنگھ اپنی جگہ سے اٹھا اور رادھا کے پاس چلا گیا۔ نوری نے ایک ٹارچ کا انتظام پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور ہم رادھا کے کمرے میں جا گھسے۔ ہم نے جو کچھ وہاں دیکھا، وہ ان خواتین کے سامنے دہرانا مناسب نہیں... مختصر یہ کہ وہ دونوں سخت نازیبا حالت میں تھے۔ ہم نے دونوں پر بہت لعن طعن کی۔ ہوشیار سنگھ دو تین دن اپنے کمرے میں ہی گھسا رہا۔ اس دن کے بعد سے نوری اور کلثوم نے رادھا کے کمرے میں سونا شروع کر دیا۔

''اگلے آٹھ دس روز میں معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور ہمیں لگنے لگا کہ دونوں سدھر گئے ہیں مگر ہوشیار سنگھ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ اسے اپنی بے عزتی کا رنج بھی تھا۔ دوسری طرف رادھا کی جوانی کا نشہ اسے لگ گیا تھا۔ اس نے چپکے سے ایک منصوبہ بنایا اور ایک رات رادھا کو لے کر مندر سے نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ آفتاب خاں تالا کھول کر مندر میں آیا تو ہوشیار سنگھ اور رادھا دونوں سب سے اوپر والے کمرے میں کاٹھ کباڑ کے اندر موجود تھے۔ ہوشیار سنگھ نے آفتاب کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر نیچے گرایا اور رادھا کے ساتھ نکل گیا۔ آفتاب جس بری طرح گرا تھا اس کی موت بھی ہو سکتی تھی مگر ایک خوش گوار اتفاق یہ ہوا کہ جہاں وہ گرا تھا وہاں دو تین لحاف پڑے تھے۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بس سر پر ایک زخم لگا۔ زوردار آوازیں سن کر میں بھی اوپر آ گیا۔ میں اور آفتاب مندر سے نکل کر ہوشیار سنگھ اور رادھا کے پیچھے لپکے۔ وہ شاید گاؤں کی طرف بھاگتے تو ان کے لیے اچھا ہوتا۔ لیکن رات کے بارہ بجے تھے اور شاید ہوشیار سنگھ کے بھی بجے ہوئے تھے، وہ جنگل کی طرف گیا۔

کچھ آگے جا کر انہوں نے برساتی نالا پار کرنے کی کوشش کی۔ صرف ایک گھنٹا پہلے تک تیز بارش ہوتی رہی تھی۔ نالے میں بہاؤ بڑا تیز تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ ٹھیک اندازہ نہ لگا سکے۔ ہم نے ان کے چلانے کی آوازیں سنیں لیکن ہم بھی کچھ نہ کر سکے۔ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ پانی کے ساتھ بڑی تیزی سے آگے نکل گئے۔''

''یعنی ان کا کچھ پتا ہی نہیں چلا؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں جی، دو تین دن تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔'' اقبال کی جگہ آفتاب خاں نے جواب دیا۔ ''ام سب سخت پریشان تھا۔ اگر وہ زندہ بچ گئے تھے تو پھر ام سب اس مندر میں بالکل بھی خیریت سے نہیں تھے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ تھا تو بھی خطرہ موجود تھا۔ کبھی کبھی کسی کی موت کا دعا بھی مانگنا پڑتا ہے۔ ام نے بھی مانگا اور یہ قبول ہوا۔ تیسرے دن ام کو پتا چلا کہ نیچے کی طرف کھوڑی نام کی جگہ پر نالے سے دو لاشیں ملا ہے۔ ایک کسی جوان سکھ کا اور دوسرا ہندو ناری کا ہے...''

یہ روداد میرے اور عمران کے لیے بڑی سنسنی خیز رہی۔ رادھا کے ساتھ جو کچھ ہوا، شاید یہ بھی انتہا پسندی کا ایک شاخسانہ تھا۔ وہ جوان خوب صورت لڑکی صرف دھرم کی خاطر ایک ادھیڑ عمر بدوضع پتی کی ''خواہشوں'' کا شکار رہی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس جال سے نکل نہیں سکی تھی۔ اس کے آدرش کہتے تھے کہ وہ خودکشی کر لے یا پھر ایک ہندو بیوہ بن کر زندہ درگور ہو جائے لیکن اس کے اندر کی عورت ان غیر فطری سوچوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ٹوٹی تو ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اقبال اور نوری نے اسے موقع پرست ہوشیار سنگھ کی آغوش میں دیکھا۔

اس روداد کے المناک پہلو نے ہمیں جہاں افسردہ کیا، وہاں اس بات کا احساس بھی دلایا کہ چند دنوں کے ساتھ میں کسی بھی شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے ہوشیار سنگھ اور رادھا دونوں کے بارے میں جو علیحدہ علیحدہ اندازے لگائے تھے، وہ دونوں اس سے بہت مختلف نکلے تھے۔

☆☆☆

...اور یہ رات میرے اور سلطانہ کے ملن کی رات تھی۔ ہمیں تہ خانوں میں واپس آئے ہوئے اب تقریباً اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ سفر کی تھکان اور تکلیف ختم ہونے کے بعد میری جسمانی حالت اب کافی بہتر ہو چکی تھی۔ ہمارے کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ میرے کہنے پر آفتاب خاں باہر سے سلطانہ کے پسندیدہ پھول لایا تھا۔ گیندے اور موتیے کے یہ پھول میں نے سلطانہ کے تکیے کے قریب رکھ دیے۔ اس نے ہلکے گلابی پھولوں والا سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کے نہایت گھنے بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے آج پھر میرے لیے اپنے ہاتھ سے حلوہ بنایا تھا۔ اب وہ اس حلوے کی تعریف سننے کی منتظر تھی۔ میں نے حلوے کے بجائے حلوہ بنانے والی کی تعریف شروع کر دی تو اس کے چہرے پر حیا کا رنگ لہرانے لگا...

آج بھی وہ سلطانہ نہیں تھی جو میرے چھونے سے کپکپانے لگتی تھی اور جس کا چہرہ دھواں ہو جاتا تھا۔ میری تعریف کے جواب میں وہ سادگی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں، میں جیادہ خوب صورت نائیں ہوں۔ یہ آپ اچ ایں جنہیں میری تعریفوں کے پل باندھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔''

''کبھی خود کو میری آنکھوں سے دیکھو تو تمہیں اپنی اہمیت کا پتا چلے۔'' میں نے کہا۔

''میں تو آپ کے خدموں کی خاک بھی نائیں ہوں میرو ج! آپ نے میرے اندر پھر سے جندگی ڈالی ہے۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''اپنوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا سلطانہ۔ اگر کیا جاتا ہوتا تو میں تمہارے سامنے شکریے کے انبار کھڑے کر دیتا۔''

''نائیں میرو ج۔'' اس کی جھیل آنکھوں میں پانی چمکنے لگا۔ ''میں جانتی ہوں آپ نے وہاں زرگاں میں میرے لیے بہت مصیبت اٹھائی ہوئے گی، بہت جیادہ خطرے مول لیے ہوئیں گے۔ میرا بس چلے تو آپ کے ان زخموں کے لیے مرہم بن جاؤں۔''

''تم مرہم ہو سلطانہ! تم سے بڑا مرہم اور کیا ہو سکتا ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو... تم نے ابھی تک مجھ سے بیویوں والی کوئی بات نہیں کی۔''

''کیا جی؟'' وہ چونک کر بولی۔

میں مسکرایا۔ ''شوہر جب سفر سے گھر واپس آتے ہیں تو بیویاں پوچھتی ہیں کہ وہ ان کے لیے کیا لائے ہیں۔''

''آپ خود آ گئے ہیں، میرے لیے اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہوئیں گا۔'' وہ بولی۔ وہ اب بڑے تواتر سے مجھے ''تم'' کے بجائے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ یہ تبدیلی بھی ان تبدیلیوں میں سے ایک تھی جو اس میں رونما ہوئی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے علاوہ بھی تو کچھ پوچھا جاسکتا ہے۔''

''آپ جو بھی لائے ہوں گے، وہ میرے لیے سب سے اچھا ہوئیں گا۔''

''اچھا، مجھے ایک بات بتاؤ سلطانہ! آخر تم زیور کیوں نہیں پہنتی ہو؟ میں نے کسی غریب سے غریب مقامی عورت کو بھی چھوٹے موٹے زیور کے بغیر نہیں دیکھا؟''

''میں نے بتایا تھا نا مہروج! مجھے عادت اچ نا ہیں ہے۔''

''عادت ہی نہیں ہے یا پھر زیور ہی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب مہروج؟'' وہ چونک سی گئی۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! بات وہی ہے جس کا تمہیں پتا ہے اور مجھے بھی۔ کچھ عرصہ پہلے تم اپنے سارے زیور اور جمع پونجی، میری زندگی بچانے پر خرچ کر چکی ہو۔ تمہاری شادی کے گہنے جن میں تمہاری ماں کے گہنے بھی شامل تھے، اب تمہارے پاس نہیں ہیں۔''

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ میں نے اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈالا اور موی کاغذ میں لپٹے ہوئے سلطانہ کے گہنے اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی چلی گئی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے ان طلائی زیورات کو ٹٹولا اور اس کی حیرت بڑھتی گئی۔ ''یہ... یہ آپ کو کہاں سے ملے مہروج؟''

''ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی ملتا ہے، یہ تو پھر گہنے تھے سلطانہ۔ یہ ابھی تک زرگاں کے اسی وید کے پاس تھے جس نے میرا علاج کیا۔ بے شک وہ ایک بہت قابل اور بہت لالچی وید ہے۔ میں نے ان زیورات کے لیے اسے باقاعدہ قیمت دی ہے اور موجودہ بھاؤ کے مطابق دی ہے۔''

سلطانہ کے سادہ چہرے پر ایک عجیب معصوم سی چمک نمودار ہوگئی۔ اس چمک میں اندرونی خوشی کا عکس تھا۔ اس نے ایک بار پھر زیورات کو اپنی کپکپاتی انگلیوں سے ٹٹولا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ میرے گلے سے لگ گئی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹا کر اس کے ماتھے پر جھومر سجایا، اس کے گلے میں گلوبند پہنایا، اس کے کانوں میں جھمکے آویزاں کیے اور اسے ایک بار پھر گلے سے لگا لیا۔ آج کی شب وہ سر تا پیر سے جگمگا گئی تھی۔

''مہروج! میں سوچ بھی نا ہیں سکتی تھی کہ آپ میرے لیے اتنا کچھ کریں گے۔'' وہ نیازمندی سے میرے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کا سر اٹھایا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام کر دیا... ہاں، آج اس کا مرمریں جسم اس کپکپی سے محفوظ تھا جو میرے چھوتے ہی اس پر طاری ہو جاتی تھی۔ اس نے بڑی ''عاجزانہ خود سپردگی'' کے ساتھ خود کو میرے اندر جذب کر دیا۔ میں نے لالٹین بجھا دی۔ ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہو گئے۔ اس کے جسم میں پہاڑی بارشوں کا ترنم تھا... جنگلی پھولوں کی مہک تھی اور خودرو درختوں کا بانکپن تھا۔ وہ بڑی محبت سے میرا نام پکارتی رہی۔ اس کی یہ حسین سرگوشی ریشمی اندھیرے میں جذب ہوتی رہی...

اگلے آٹھ دس روز بڑے حسین تھے۔ میری گردن کا زخم غیر متوقع تیزی سے ٹھیک ہوا تھا۔ پسلی کا درد بھی اب نہ ہونے کے برابر تھا۔ کلثوم، تاؤ افضل کی بیٹیوں اور نوری وغیرہ سے بہت گھل مل چکی تھی۔ یہ کلثوم وہی لڑکی تھی جسے میں نے گنج پور کے چودھری اور سیٹھ وغیرہ سے نجات دلائی تھی۔ کلثوم، نوری اور تاؤ افضل کی بیٹیاں ان تہ خانوں کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھیں۔ وہ دیگر امور خانہ داری کے علاوہ مزے دار کھانے بھی پکا رہی تھیں۔ کئی ہفتوں کی جان توڑ مشقت اور خطرات کی یلغار کے بعد مجھے اور عمران کو راحت کی گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں۔ سلطانہ بھی بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کے کانوں میں اب جھمکے چمکتے تھے اور کلائیوں پر چوڑیاں گنگناتی تھیں۔ وہ سرِ شام صاف ستھرا لباس پہنتی، خود کو تھوڑا سا سنوارتی اور اس کی آنکھوں میں شرمیں سائے لہراتے... ان خوب صورت شب و روز میں اگر اس کے ذہن میں کوئی کسک تھی تو وہ بالو کے حوالے سے تھی۔ ہمارا بچہ ہم سے دور تھا۔ بے شک وہ محفوظ ہاتھوں میں تھا اور خیریت سے تھا لیکن دوری تو تھی۔

ایک شب کے ریشمی اندھیرے میں جب میں چت لیٹا تھا اور سلطانہ کا سر میرے سینے پر تھا، میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات پوچھوں سلطانہ؟''

''جی۔'' اس نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

''تمہیں پتا ہے کہ تمہارا پرانا ملازم باشو ل پانی میں نہیں ہے؟''

اس نے چونک کر میرے سینے سے سر اٹھایا اور بولی۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''زرگاں میں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب دیا۔ ''اور وہ وہاں اچھی حالت میں بھی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب مہروج؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے لالٹین کی لو اونچی کی تو کمرے میں مدھم روشنی پھیل گئی۔ سلطانہ نے اپنے دودھیا شانوں کے گرد گرم شال لپیٹ لی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! مجھے ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ باشو کو لنگا نہیں ہے؟''

اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر بولی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہروج! با... باشو بول نہیں سکتا۔ یہ سب جانتے ہیں...''

''لیکن... وہ بول سکتا ہے سلطانہ! میں نے اسے خود بولتے سنا ہے۔''

''کب... کہاں؟''

''حکم کے دربار میں... جہاں اسے زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسے مل پانی سے پکڑا ہے جہاں وہ ایک بڑی سنگین واردات کرنے جا رہا تھا۔''

سلطانہ کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا مہروج! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کہیں... کہیں وہ کوئی اور شخص تو نہیں جسے آپ نے زرگاں میں دیکھا ہے؟''

''مجھے اتنا ہی یقین ہے کہ وہ باشو ہے، جتنا اس بات کا یقین ہے کہ تم سلطانہ ہو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے... کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

اس کے کہنے پر میں نے اسے تفصیل سے سارے واقعات بتائے۔ میرا اور عمران کا حکم کے بھرے دربار میں پہنچنا، وہاں سخت مزاج بڑھیا سے ہمارا مکالمہ، باشو کا پابہ زنجیر نمودار ہونا۔ پانڈے کے باشو کے بارے میں انکشافات... زہر سے بھرے ہوئے پیکٹ کی رونمائی... میں نے سب کچھ سلطانہ کے گوش گزار کیا۔ آخر میں، میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہاشم عرف باشو نے کس طرح ہٹا کٹا دل خود پر لگائے جانے والے الزامات قبول کیے اور بچ جانے کی صورت میں اپنے اقدام کو دہرانے کا اعلان کیا۔

سلطانہ سخت حیرت کے عالم میں سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ ''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' وہ آخر میں لرزاں آواز میں بولی اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

میں اس سے زہر والی پڑیا کی بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کی کیفیت دیکھ کر خاموش رہا۔ وہ اگلے روز بھی بالکل گم صم رہی۔ تیسرے روز اس نے خود ہی اس پڑیا کی بات چھیڑ کر مجھے حیران کر دیا۔ نوری نے بڑا زبردست پلاؤ بنایا تھا۔ ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک سلطانہ نے کہا۔ ''مہروج! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔''

''کہو سلطانہ۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''جن دنوں میں بہت جیادہ دکھی تھی اور جارج کی جان لینے کے لیے طلال کے ساتھ زرگاں چلی گئی تھی، میں نے خود کو مارنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''کیا مطلب سلطانہ؟''

''میں نے فیصلہ کیا تھا مہروج کہ اگر میں زرگاں میں پکڑی گئی تو بے عزت ہونے کے بجائے موت کو گلے لگاؤں گی۔ میں نے جہر کی ایک پڑیا اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ یہ جہر بس تھوڑے سے میں بندے کو مار سکتا ہے۔ یہ جہر مجھے باشو نے دیا تھا۔ پرسوں آپ نے جہر والے لفافے کی بات کی ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ جہر بھی اسی لفافے کا ہو۔''

''تم بڑے ڈرا دینے والے انکشاف کر رہی ہو سلطانہ! مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اس حد تک جا چکی ہو۔ کیا ان دنوں تمہیں میرا اور بالو کا خیال بھی نہیں آتا تھا؟''

وہ کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ ''اگر سچ پوچھتے ہیں... مہروج... تو نہیں آتا تھا۔ میں اس وقت خود کو جندہ سمجھتی اچ نہیں تھی، ہاں... سمجھتی اچ نہیں تھی۔ مرنا میرے لیے اتنا اچ آسان تھا جتنا آنکھیں بند کرنا...'' وہ عجیب لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''اب وہ پڑیا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اب وہ نہیں نہیں ہے۔ اگر ہوتی بھی تو سمجھیں کہ نہیں تھی۔ اب میں ان باتوں کے بارے میں سوچنا اچ نہیں چاہتی۔''

''کہیں پھینک دی ہے؟''

''نہیں... کھو گئی ہے۔''

''تمہاری بہت سی کھوئی ہوئی چیزیں میرے پاس سے ملتی ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ٹیلکوں پاؤڈر والی چھوٹی سی پڑیا سلطانہ کے سامنے کر دی۔

ایک بار پھر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ''یہ... یہ آپ کو کہاں سے ملی؟''

''جہاں تم نے چھپائی تھی۔'' میں نے کہا... اور پڑیا اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

اس نے لرزاں ہاتھوں سے اس پڑیا کو کھولا۔ کچھ دیر تک اشک بار آنکھوں سے اس ٹیلکوں پاؤڈر کو دیکھتی رہی جو کسی بھی شخص کو دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی سرحد پار کرا سکتا تھا۔ پھر اس نے اس پڑیا کو انگیٹھی کے دہکتے انگاروں پر الٹ دیا اور میرا بازو تھام کر میرے کندھے سے سر لگا دیا۔

باشو کے بارے میں، میں نے جو انکشافات پرسوں سلطانہ کے سامنے کیے تھے، انہوں نے بظاہر سلطانہ کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک شخص اتنا عرصہ ان کے گھر میں ان کے ساتھ گونگا بن کے رہا اور وہ اس کے بارے میں جان نہ سکے۔ اس کے علاوہ وہ صرف باشو نہیں تھا بلکہ ہاشم رازی تھا اور اس کی اہمیت اور حیثیت ان کی سوچوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ ''میں آپ کو اور عمران بھائی کو جھٹلا نہیں سکتی مہروج! کوئی اور یہ بات کہتا تو میں کبھی بھی نہیں مانتی۔''

اس رات بھی ہم دیر تک باشو اور اس کے جنونی رویے کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اس کے علاوہ زرگاں کے وہ حالات بھی ہماری گفتگو کا موضوع بنے جو تاجی حکمرانوں کی من مانیوں سے پیدا ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے فرقہ پرستی اور شدت پسندی کو ہوا مل رہی تھی... اور وہ عروج پر پہنچ رہی تھی۔

سلطانہ نے باشو کے حوالے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا تھا۔ پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ اس معاملے میں تھوڑا بہت پیچ ضرور ہے۔

عمران اپنی باتوں سے ان تہ خانوں کی گھٹن اور سنجیدگی دور کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ وہ اکثر اپنی باتوں سے ماحول کو کشت زعفران بنا دیتا تھا۔ اور تو اور تاؤ شکل جیسا بے رنگ شخص اور طلال جیسا نہایت سنجیدہ لڑکا بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ طلال سلطانہ کا لگا بھانجا تھا اور ہر سرگرمی میں اس کے ساتھ شریک رہا تھا۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ بھی اپنی خالہ پر جان چھڑکتا تھا۔ درحقیقت یہ طلال ہی تھا جس نے مجھ پر انکشاف کیا تھا کہ اس کی خالہ، جارج گورا سے بدلہ لینے کے لیے تڑپ رہی ہے اور وہ کسی بھی وقت خاموشی کے ساتھ ان تہ خانوں سے نکل کر دوبارہ زرگاں کا رخ کر لے گی۔ یہ سب کچھ مجھے بتاتے ہوئے وہ زار و قطار رو تا بھی رہا تھا۔ اس کی باتوں نے میرے دل پر ایسا اثر کیا تھا کہ منٹوں میں ہونے والا کام دنوں میں ہوا اور میں عمران کے ساتھ جارج گورا کی طرف نکل کھڑا ہوا۔

طلال اب بھی ہر وقت سلطانہ کے آس پاس ہی رہتا تھا۔ اپنی خالہ سے اس کا ایک قلبی تعلق بن چکا تھا۔ جارج کے ساتھ اپنی لڑائی کی روداد میں پوری تفصیل سے سب کو سنا چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ سب مزید سننا چاہتے تھے۔ یہ تذکرہ تہ خانے کے سارے مکینوں کے لیے زبردست دلچسپی کا باعث تھا۔ خاص طور سے طلال کے لیے۔ وہ اس سارے واقعے کی مکمل جزئیات جاننے کا خواہش مند تھا۔ آج بھی وہ موقع دیکھ کر میرے پاس آن بیٹھا تھا اور سامیر کے اس مقابلے کی باتیں کرنے لگا۔

میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہیں سمجھی اور اس کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ اس کے سوالوں میں سادگی بھرا تجسس ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''خالو تابش! جب آپ کی گردن جارج کے بازو میں پھنس گئی اور آپ اسے نکال نہیں سکے تو آپ کیا سوچ رہے تھے؟ کیا آپ کو امید تھی کہ آپ نکل سکیں گے؟''

''امید پر ہی تو دنیا قائم ہے۔ سیانے یہی کہتے ہیں کہ امید اور کوشش کا دامن آخر تک نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

''میرا مطلب ہے جی کہ سورج ڈوب جانے کی وجہ سے پنڈتوں نے لڑائی رکوا دی۔ فرج (فرض) کیا اگر وہ یہ لڑائی نہیں رکواتے تو کیا آپ نکل جاتے؟''

''میں اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ میری برداشت ساتھ دیتی رہی اور میں لڑائی کو لمبا کھینچتا رہا، یہاں تک کہ لڑائی کا وقت ختم ہو گیا۔ اسی لیے کہتے ہیں نا کہ قدرت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے جو کوشش کرتے ہیں۔''

طلال کی نگاہوں میں میرے لیے ستائش ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ مجھ سے مختلف سوال پوچھتا رہا۔ میں اتنی سردی گرمی کیسے برداشت کر لیتا ہوں؟ میں بھوک کیسے جھیل لیتا ہوں؟ میں کھردرے فرش پر کیسے سو جاتا ہوں؟ کیا واقعی مجھے درد محسوس نہیں ہوتا؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس دوران میں آفتاب خان بھی وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپر تھا اور اس میں میٹھے چاول تھے۔

''یہ کیا ہے آفتاب؟'' میں نے پوچھا۔

وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ''تابش صاحب! ام نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منت مان رکھا تھا کہ اگر آپ زرگاں سے کامیاب ہو کر خیریت کے ساتھ واپس آ گیا تو ام لوگوں کا منہ میٹھا کرائے گا۔ ام نے آج زردے کا یہ دیگ پکوایا تھا اور بچوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ کچھ چاول ام یہاں لے آیا۔ ام چاہتا ہے کہ آپ امارے سامنے اپنا منہ میٹھا کرے۔"

میں نے اور طلال نے ایک ایک لقمہ لیا۔ "تمہیں جارج کے مرنے کی خوشی ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اتنا زیادہ کہ آپ سوچ نہیں سکتا۔ لوگ کہتا ہے کہ دشمن کے مرنے پر بھی خوشی نہیں منانا چاہیے لیکن یہ ایسا گندہ دشمن تھا کہ ام خوشی منائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا... اور یہ صرف امارا بات ہی نہیں ہے۔ اس راجواڑے کا زیادہ تر لوگ خوش ہے۔ پتا ہے، جب زرگاں سے یہ خبر یہاں پہنچا تو لوگوں کا چہرہ چمک اٹھا۔ آپ جاتے جاتے ام کو منع کر گیا تھا کہ ام تہ خانے کے اندر نہیں جائے گا۔ پر ام سے برداشت ہی نہیں ہو سکا۔ رات تک کا وقت ام نے پتا نہیں کس طرح کاٹا اور پھر تہ خانے میں آ گیا۔ اس وقت آپ کا بی بی سلطانہ مصلے پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔ خوشی کے مارے امارے منہ سے بات ہی نہیں نکلا۔ ام بس اتنا ہی کہہ سکا... وہ خبیث مر گیا، ختم ہو گیا..."

آفتاب خاں نے اس دن کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچا جب فتح پور میں جارج گورا کے مرنے کی اطلاع پہنچی تھی۔

ہمارے یہاں تہ خانوں میں آنے کے بعد آفتاب خاں تقریباً روزانہ ہی اندر آ رہا تھا۔ وہ رات کو فتح پور کی گلیوں میں پہرا دیتا تھا۔ اس پہرے کے دوران میں ہی نصف شب کے وقت وہ چپکے سے مندر کا پرانا دروازہ کھولتا تھا اور اپنی لاٹھی اور لالٹین سمیت تہ خانوں میں اتر آتا تھا۔ مجھے اس حوالے سے تھوڑی سی تشویش تھی۔ اسی تشویش کی وجہ سے میں نے اور عمران نے زرگاں جاتے وقت آفتاب سے کہا تھا کہ وہ تہ خانوں میں آنے سے گریز کرے۔

میں نے ایک بار پھر اس سے یہی بات کی۔ میں نے کہا۔ "آفتاب! اول تو یہ چاہتا ہے کہ تم ہر وقت ہمارے پاس رہو مگر مسئلہ وہی ہے کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اگر کسی رات کسی نے تمہاری آمد و رفت دیکھ لی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"آپ کہتے ہیں تو ام آنا کم کر دیتا ہے۔ لیکن ام آپ کو ایک بات کا پورا یقین دلاتا ہے، امارے وجہ سے بھی کسی کو آپ کے یہاں ہونے کا پتا نہیں چلے گا..."

پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ وہ مندر کی سیڑھیاں چڑھنے اور دروازہ کھول کر اندر آنے میں کیا کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرتا ہے۔

اگلے روز آفتاب خاں نے تہ خانوں میں آ کر جو خبر سنائی، وہ واقعی سنسنی خیز تھی۔ یہ خبر اسی کھوسٹ بڑھیا کے بارے میں تھی جسے ہم اس کی ساری ٹوٹ سمیت زرگاں میں چھوڑ آئے تھے۔ آفتاب خاں نے بتایا کہ پچھلے چار پانچ روز سے بڑھیا نے مرن بھرت رکھا ہوا تھا۔ وہ زرگاں کے بڑے مندر کی سیڑھیوں پر دھرنا دیے بیٹھی تھی۔ کمزور عقیدہ لوگوں کا ایک جم غفیر اس کے گرد اکٹھا رہتا تھا۔ بڑی عمر کے کچھ اور مرد و زن بھی اس کے ساتھ اس بھوک ہڑتال میں شریک ہوتے گئے اور اچھا خاصا تماشا بن گیا تھا۔ پرسوں رات کو بڑھیا بیٹھے بیٹھے لڑھک گئی۔ پتا چلا کہ وہ مر گئی ہے۔ اس کے دیہانت کی خبر نے زرگاں میں ہلچل مچا دی۔ انتہا پسند ہندو بھڑک اٹھے۔ انہوں نے مندر کے قریب ہی مسلمانوں کے ایک محلے پر حملہ کیا۔ مسلمانوں کے مکانوں کو چاروں طرف سے گھیرا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ اس نہایت سنگین واقعے میں کم و بیش ساٹھ لوگوں کے ہلاک ہونے کی اطلاع تھی۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ بہت سے لوگ زخمی بھی ہوئے تھے...

یہ دل خراش اطلاع تھی۔ زرگاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتعال بڑھ رہا تھا۔ خاص طور سے اونچی ذات کے ہندو بہت مشتعل تھے۔ مسلمانوں نے جس طرح میری اور جارج کی لڑائی میں میری حمایت کی تھی اور جس طرح چپکے چپکے میری جیت کی خوشی منائی تھی، اونچی ذات کے ہندوؤں کو یقیناً بہت تاؤ چڑھا تھا۔ اب اس کا بدلہ مسلمانوں کے پورے ایک محلے کو جلا کر لیا گیا تھا۔

یہ بہت افسردہ کر دینے والی خبر تھی اور اس میں افسردہ کر دینے والا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کم بخت بڑھیا اس سارے فساد کے باوجود ابھی زندہ تھی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا جہاں چند گھنٹوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اب پتا نہیں کہ وہ واقعی بے ہوش ہوئی تھی یا یہ اس کا کوئی مکر تھا۔ زرگاں کے ضعیف العقیدہ لوگ اسے بھی بھگوان کا چمتکار قرار دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسا واقعہ بس کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

اگلے روز سب بجھے بجھے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی کسی نے نہیں کھایا۔ سلطانہ بھی افسردہ تھی۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ "لگتا ہے کہ زرگاں اور گل پانی میں حالات پھر سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید اس بار لڑائی تک نوبت آ جائے۔"

"ہاں، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ساٹھ لوگوں کے مرنے کی خبر ہے۔ بہت سے زخمی بھی ہیں۔"

"اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔" عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ وہ وجہ زیادہ اہم ہے۔ جب ہم زرگاں سے آ رہے تھے تو وہاں جیل میں ہنگامہ ہوا تھا بلکہ اسے بغاوت ہی کہنا چاہیے۔ سو کے قریب قیدیوں کو پکڑ لیا گیا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ ان میں سے تیس چالیس کو سولی کی سزا ہو جائے گی... اگر واقعی ایسا ہو گیا تو مجھے نہیں لگتا کہ یہاں امن رہ سکے گا۔"

"آئندہ کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں، تاؤ افضل کی کسی دختر سے شادی کر کے اسے جلدی سے دو تین بچوں کا نانا بنا دوں۔ اگر یہاں ہونے والی لڑائی میں مر بھی گیا تو کوئی میرا نام لینے والا تو ہو گا..." وہ پھر پٹڑی سے اتر گیا۔

"بس اب اپنی بکواس شروع کر دو۔" مجھے بھی تاؤ آ گیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر بمشکل بٹھایا اور خلافِ توقع سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "تابی! ہم زیادہ دیر یہاں رہ نہیں سکتے۔ تمہیں پتا ہی ہے، حکم کے سامنے مجھے بتانا پڑا تھا کہ میں فتح پور کے مندر میں ہونے والے خونی ہنگامے کا چشم دید گواہ ہوں۔ اب ہمارے فرار کے بعد ہماری تلاش شروع ہو چکی ہے۔ دیکھنا ایک دو دن میں حکم کے سپاہی یہاں فتح پور تک بھی پہنچیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آفتاب خاں سے بھی پوچھ گچھ کریں۔ کسی بھی وقت ہماری یہاں موجودگی کا پول کھل سکتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"ہمیں جلد از جلد گل پانی پہنچ جانا چاہیے۔ وہیں سے ہماری واپسی کا کوئی راستہ نکل سکے گا۔"

"لیکن اگر گل پانی پہنچنے کی کوشش میں دھر لیے گئے تو پھر؟"

"اس کا ایک حل ہے۔ لیکن وہ حل یہاں سے سات آٹھ میل کی دوری پر ہے۔ مجھے پہلے اس حل تک پہنچنا ہو گا۔"

"کھل کر بات کرو یار۔"

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "جب تمہاری گردن سے "ایکٹر اکٹ چپ" نکلوانے کے لیے میں ڈاکٹر لی وان کو یہاں لے کر آیا تھا تو راستے میں ہنومان نامی ایک بستی میں رکا تھا۔ یہاں ایک ٹیلے پر ایک بڑا گھوڑا ہے۔ اس بستی میں نتھا کمار نامی ایک شودر سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ شخص خاندانی شکاری ہے۔ اس علاقے کی ہر اونچ نیچ کو جس طرح جانتا ہے، شاید ہی کوئی دوسرا جانتا ہو۔ مجھے یقین ہے اگر ہم اس بندے کو کچھ رقم دیں تو یہ ہمیں نہایت محفوظ راستوں سے گل پانی کے نواح تک پہنچا سکتا ہے۔ اور یہی نہیں، ہمارے لیے مناسب سواری کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔"

اس حوالے سے میرے اور عمران کے درمیان آدھ پون گھنٹا گفتگو ہوئی۔ حسبِ معمول عمران یہ کام بھی اکیلے ہی کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں اڑ گیا کہ اگر جانا ہے تو پھر ہم اکٹھے جائیں گے۔ ورنہ نہیں جائیں گے... کافی بحث و تمحیص کے بعد عمران رضامند نظر آیا۔ ہم نے اس بارے میں دیگر تفصیلات طے کرنا شروع کر دیں۔ بے شک اس میں خطرہ موجود تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ عمران کی طرح مجھے بھی خطرات کو گلے لگانا اچھا لگنے لگا ہے۔

اس رات میں نے سلطانہ کو بھی بتا دیا کہ میں اور عمران ایک دو روز کے لیے مندر سے باہر جائیں گے تاکہ گل پانی پہنچنے کا معاملہ آسان ہو سکے۔ سلطانہ نے اس پر کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ وہ گریہ کرے گی اور مجھے باہر جانے سے روکے گی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ میں اسے زرگاں سے آنے والی دل خراش خبر کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔ دوسرے تیسرے دن مجھے پتا چلا کہ ایسا نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ میرے لیے بالکل ناقابلِ یقین ثابت ہوا۔ آفتاب خاں کا ایک اور روپ میرے سامنے آیا جس نے مجھے بھونچکا کر کے رکھ دیا... بلکہ بنیادوں تک ہلا ڈالا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ پسلی کے درد کی وجہ سے میں نے کروٹ بدلی تو مجھے لگا کہ سلطانہ میرے پہلو میں موجود نہیں ہے۔ میں نے لحاف ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لالٹین روشن کر کے میں نے دیکھا، کمرا خالی تھا۔ سلطانہ کی چپل بھی موجود نہیں تھی۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے غسل خانے میں دیکھا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی تہ خانے میں گیا۔ نوری، کلثوم، تاؤ افضل کی بیٹیاں اور طلال وغیرہ سب سو رہے تھے۔ یہاں تک کہ تاؤ افضل بھی جو رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارتا تھا، سویا ہوا تھا۔ اچانک مجھے سب سے اوپر والے تہ خانے کی طرف سے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک کمرے میں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ میں لکڑی کے قدمچوں پر ننگے پاؤں چلتا ہوا اوپر گیا۔ ایک دم مجھے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازے کی اوٹ میں ہوتا پڑا۔ میں نے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں سے سلطانہ کو نکلتے دیکھا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ اگلے ہی لمحے مجھے ادھ کھلے دروازے میں آفتاب خاں نظر آیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سلطانہ سے کچھ کہا پھر ایک چھوٹا سا مستطیل ڈبا سلطانہ کو تھمایا جسے سلطانہ نے لے کر اپنی چادر میں چھپالیا۔

وہ اب واپس پلٹنے والی تھی۔ میں تیزی سے نیچے اترا۔ کمرے میں واپس جا کر لالٹین بجھائی اور بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ رہا ہے۔ یہ میں کیا دیکھ آیا تھا؟ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد سلطانہ کا ہیولا کمرے میں داخل ہوا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کیے بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے آفتاب سے حاصل ہونے والا گتے کا ڈبا پلنگ کے نیچے کہیں چھپایا۔ جو ہلکی ہلکی آوازیں پیدا ہوئیں، ان سے مجھے شک ہوا کہ ڈبے میں چوڑیاں یا اس قسم کی کوئی شے ہے۔

باقی کی رات میں نے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سلطانہ ایسی ہرگز نہیں تھی۔ یقیناً یہ کوئی اور معاملہ تھا۔ لیکن کیا تھا؟ اور اگر تھا تو وہ مجھ سے کیوں چھپا رہی تھی؟

میں نے سلطانہ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن میرے دل و دماغ میں زبردست ہلچل تھی۔ اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے مجھے وہ ڈبا دیکھنے کا موقع ملا جسے سلطانہ نے پلنگ کے نیچے چھپایا تھا۔ میرا خدشہ درست نکلا۔ اس میں پیلی اور سرخ چوڑیاں تھیں۔ یہ خوب صورت چوڑیاں وہ آفتاب سے لے کر آئی تھی... اور آفتاب وہ شخص تھا جسے میں نے اپنی غیر موجودگی میں تہ خانے میں آنے سے منع کیا تھا اور وہ پھر بھی آ رہا تھا۔ میرے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچ گیا۔ عمران سارا دن مجھ سے پوچھتا رہا کہ میں کھویا کھویا کیوں ہوں؟ میں مختلف حیلوں سے اسے ٹالتا رہا۔ اس کی متلاشی نگاہیں جان چکی تھیں کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ ”ہماری پیاری سی بھابی سے پھر تو کوئی جھگڑا نہیں ہو گیا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، ایسا کچھ نہیں۔“

”اگر ہے تو بتاؤ یار! میں ایک اچھے دیور کا کردار بڑی خوبی سے ادا کر سکتا ہوں بلکہ ضرورت ہو تو بارعب جیٹھ بن کر بھی دکھا سکتا ہوں۔ بھابی کے پاس اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہو گا کہ میاؤں میاؤں... میرا مطلب ہے، میں آؤں، میں آؤں کرنے لگے۔“

اس روز آفتاب خاں رات دس بجے کے قریب تہ خانے میں آیا۔ حسبِ معمول اس کے پاس باہر کی خبریں موجود تھیں۔ آج کی اہم ترین خبر وہی تھی جس کا اندیشہ دو دن پہلے عمران نے ظاہر کیا تھا۔ آفتاب نے بتایا کہ سہ پہر کے وقت دو جیپوں پر سوار آٹھ دس مسلح افراد بستی میں آئے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔

”کس طرح کی پوچھ گچھ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ پوچھتا تھا کہ دو ڈھائی ماہ پہلے مندر میں جو ہنگامہ ہوا، وہ کس طرح کا تھا۔ اس میں کتنا لوگ مرا تھا وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ یہ پوچھنے لگا کہ باہر کا جو مسلمان لوگ یہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ دوبارہ یہاں آیا ہے یا نہیں۔ خود انہوں نے ہر گھر میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں تفصیل مفصل پوچھا اور کہا کہ اگر کسی نے کچھ چھپانے کا کوشش کیا تو اس کا حشر خراب ہو جائے گا۔ وہ دوبارہ آنے کا کہہ کر شام کے وقت واپس گیا ہے۔“

آفتاب خاں بالکل معمول کے مطابق باتیں کر رہا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا کہ وہ کل کیوں نہیں آیا؟

”بس جی... کل مندر کے پاس ہی ایک گھر میں فوتیدگی ہوا۔ لوگ جاگ رہا تھا۔ ام نے ٹھیک نہیں سمجھا۔“

اس کے سفید جھوٹ نے میرے تن بدن کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔ اس گفتگو کے دوران میں سلطانہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ اس نے چائے کی پیالی آفتاب خاں کی طرف بڑھائی... دونوں کی نظریں چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے میں گڑی رہیں۔ مجھے لگا کوئی میرے منہ پر طمانچے رسید کر رہا ہے۔

یہ کیا ہوا تھا میرے ساتھ؟ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ سلطانہ جو ایک بیوی سے زیادہ ایک زر خرید باندی کی طرح میری اطاعت گزاری میں مصروف رہتی تھی، اپنے کردار کا ایسا رخ پیش کرے گی، یہ بعید از گمان تھا۔

اگلی رات صورتِ حال کچھ اور بھی واضح ہو گئی۔ نصف شب کا وقت تھا۔ میں بستر پر جاگ رہا تھا لیکن آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ سینے میں بے چین دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ سلطانہ میرے پہلو میں ساکت لیٹی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ سو رہی ہے یا نہیں۔ پروگرام کے مطابق آج آفتاب خاں کو نہیں آنا تھا۔ رات کوئی ڈیڑھ بجے کا وقت ہو گا جب سلطانہ بستر سے اتری اور چپل پہن کر دبے پاؤں کمرے سے نکل گئی۔ میری بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ میں ...

پندرہ بیس منٹ انتظار کیا پھر خود بھی اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں نے احتیاطاً اپنا ریوالور شلوار کے نیفے میں اڑس لیا تھا۔ درمیانی تہ خانے سے نادر افضل کی غنودگی بھری کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ یہ کھانسی تھی تو میں درمیانی تہ خانے سے گزر کر بالائی تہ خانے میں آیا۔ آج پھر کاٹھ کباڑ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر ہلکی روشنی تھی جو یقیناً آفتاب خاں کی لالٹین ہی کی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے کے بالکل قریب چلا گیا۔ مجھے کسی جھری یا درز کی تلاش تھی تاکہ اندر جھانک سکوں۔ کافی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بس میں اندر، مدھم آواز میں بولے جانے والے دو تین جملے ہی سن سکا... سلطانہ کی دبی دبی آواز آئی... ”نا ہیں آفتاب! اب یہ ممکن نا ہیں۔ میں اسے اور دھوکے میں نا ہیں رکھ سکتی۔ اسے کسی بھی وخت (وقت) پتا چل جائے گا۔ اب بھی بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ مجھے فکر تھی کہ تم انتظار کرتے رہو گے۔ اب میں چلتی ہوں۔“

”ابھی تو ام نے کوئی بات ہی نہیں کیا۔“ آفتاب کی آواز ابھری۔

”نا ہیں، کافی باتیں ہو گئیں۔“

”چلو ٹھیک ہے لیکن پرسوں تو تم ٹائم پر آ جائے گا نا؟“

”اس شرط پر کہ مہروج اپنے کام سے چلا گیا... اور دوسری بات یہ آفتاب کہ یہ... آخری بار ہو گیں گا۔ بالکل آخری بار۔“ سلطانہ کا لہجہ حتمی تھا۔

آفتاب نے شاید ٹھنڈی سانس بھری اور کچھ منمنایا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس کے بعد بس ایک ہی مختصر سا جملہ میری سمجھ میں آ سکا۔ آفتاب خاں نے کہا تھا۔ ”گرم چادر ضرور لے کر آنا۔“

زندگی میں پہلی بار اس طرح کی صورتِ حال سے پالا پڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ دل چاہا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور دونوں کے سینوں میں گولیاں ٹھونک دوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوچ بھی تھی کہ کہیں یہ سب کچھ واہمہ ہی نہ ہو۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ جو کچھ دیکھا یا سنا جائے، وہ بعینہٖ ویسا ہی ہو جیسا سمجھ میں آ رہا ہو۔ یہ آدھی رات کی ملاقاتیں اور باتیں کسی اور حوالے سے بھی تو ہو سکتی تھیں۔ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت میرے سامنے نہیں آیا تھا جسے حتمی کہا جا سکے۔

میں سیڑھیاں اتر کر واپس کمرے میں آ گیا اور بستر پر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد سلطانہ بھی آ گئی۔ پرسوں کی طرح بغیر کوئی آواز پیدا کیے اس نے پھر پلنگ کے نیچے کچھ چھپایا اور میرے پہلو میں لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے پر سلطانہ نے خود ہی میرے جانے کا ذکر چھیڑ دیا... ”عام سے لہجے میں بولی۔ ”مہروج! کل پھر جا رہے ہیں آپ؟“

”جانا تو چاہیے۔“ میں نے بے دلی سے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

”عمران بھائی بھی ساتھ جائے گا؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی۔ ”کتنے بجے نکلیں گے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے، کتنے بجے نکلوں تو تمہیں آسانی رہے گی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

بیوی کا مشورہ

کاشف کا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ وہ اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے انگوٹھے کو دیکھ کر کہا۔

”گھر جاؤ اور انگوٹھے کو دو تین گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں ڈبوئے رکھو۔“

گھر جا کر کاشف نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسی اثنا میں اس کی بیوی آ گئی اور پوچھا۔ ”کیا کر رہے ہو؟“ شوہر نے کہا۔

”میرے انگوٹھے میں تھوڑی سی چوٹ آ گئی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے اگر میں دو تین گھنٹے تک اسے ٹھنڈے پانی میں رکھوں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیسا بے وقوف ڈاکٹر ہے۔“ بیوی نے کہا۔ ”زخمی انگوٹھے کو ٹھیک کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے گرم پانی میں ڈبویا جائے۔“

بیوی کے کہنے پر کاشف نے دو تین گھنٹے تک انگوٹھے کو گرم پانی میں رکھا اور انگوٹھا واقعی ٹھیک ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد اس کی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا۔

”میں نے تمہارے کہنے پر عمل نہیں کیا تھا بلکہ بیوی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے انگوٹھے کو گرم پانی میں ڈبویا تھا جس کی وجہ سے انگوٹھا ٹھیک ہو گیا۔“

”عجیب بات ہے۔“ ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ ”میری بیوی تو ایسی حالت میں ہمیشہ انگوٹھا ٹھنڈے پانی میں ڈبونے کو کہتی ہے۔“

جمیلہ خاتون، راولپنڈی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ چونکا۔ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر خود بھی ''کشتی'' ایک طرف رکھ کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس مشکوک جوہڑ کی طرف کوئی آئے گا نہیں... دیگر خطرات سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس ہتھیار موجود تھے۔ عمران کی بھاری چادر کے نیچے وہی دور مار رائفل تھی۔ میرے تہ بند کی ڈب میں ریوالور تھا اور جیب میں وہی تاریخی چاقو جس نے جارج گورا کے عروج کو زوال دیا تھا۔

عمران نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے یار! دو تین دن سے تمہاری تی گم ہے۔ تم کچھ چھپا رہے ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گہرے اندھیرے میں اپنے سامنے دیکھتا رہا... اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ''کچھ بولو یار! ہم بھی ایک دوسرے کو نہ بتائیں گے تو اور کون بتائے گا... اچھا... چلو یہی بتا دو کہ یہاں کیوں رکے ہو؟''

''اس لیے کہ ہم نے آگے نہیں جانا۔ آج رات یہیں رکنا ہے۔''

''یہیں رکنا ہے؟ وہ کیوں؟''

''میں ایک بندے کی اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔''

''کون بندہ؟''

''آفتاب خاں...'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ دکھ کے بوجھ سے میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''آفتاب خاں؟ اس نے کیا کیا ہے؟''

''وہ جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا... اور شاید تمہاری سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔'' مجھے اپنی آنکھیں نم محسوس ہوئیں۔

عمران ایک ایسا دوست تھا جس کو میں اپنی ہر غمی خوشی میں شریک کر سکتا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ ہمارے درمیان کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ لیکن آج عمران سے سلطانہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ میں نے حوصلہ جمع کیا اور دل فگار لہجے میں وہ سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا جو اب تک صرف میں جانتا تھا۔

گہری تاریکی میں، میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کا چہرہ بھی حیرت کی آماج گاہ بن گیا ہے۔ اس نے مجھ سے کئی سوال جواب کیے... اور آخر میں وہ بھی اسی گومگو کی کیفیت میں چلا گیا جس میں، میں تھا۔ سلطانہ کے سابقہ کردار کی طرف دیکھتے تھے تو سب جھوٹ لگنے لگتا تھا، نگاہ کا فریب محسوس ہوتا تھا... مگر واقعات کی گواہی کچھ اور کہانی سنا رہی تھی۔

عمران نے درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''... تو تمہارا خیال ہے کہ آج رات سلطانہ، مندر سے آفتاب خاں کے ساتھ نکلے گی اور کسی قریبی گھر میں جائے گی۔''

''یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر لگتا یہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دس بجے کے بعد سے مندر کے آس پاس موجود رہیں تاکہ ہمیں آفتاب کے آنے اور جانے کا پتا چلے۔''

عمران نے ماتھا ہاتھ میں پکڑ لیا اور کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنے چمکیلے ڈائل والی گھڑی دیکھی۔ اب نو بجنے والے تھے۔ وہ بولا۔ ''اگر ہمیں مندر کی طرف ہی جانا ہے تو پھر اٹھ جائیں۔ دس پندرہ منٹ پہلے گیا اور بعد میں گیا۔ جاتے جاتے بھی آدھ گھنٹا تو لگ ہی جاتا ہے۔''

میں نے کشتی اٹھائی۔ پگڑی درست کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ عمران بھی اٹھ گیا۔ وہ ایک دم پژمردہ نظر آنے لگا تھا۔ تاہم مجھے حوصلہ دینا بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''گھبراؤ نہ تابی! جو ہوگا ہمارے لیے اچھا ہی ہوگا اور پتا نہیں کیوں اب بھی میرا دل اس ساری صورت حال کو مان نہیں رہا ہے۔''

ہم گھنے درختوں میں چلتے ہوئے جوہڑ سے واپس روانہ ہوئے۔ آدھ گھنٹے میں ہم واپس مندر کے آس پاس پہنچ گئے۔ آسمان پر ہلکا سا ابر تھا جس کے سبب تاریکی پچھلی رات سے زیادہ ہی گہری ہو گئی تھی۔ گاؤں کی زیادہ تر روشنیاں اب بجھ چکی تھیں۔ گلیوں میں ہلکی دھند تھی اور آوارہ کتوں کا شور تھا۔

ہم نے درختوں کے درمیان ایک مناسب جگہ دیکھی اور گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے جب ہمیں ایک روشنی مندر کی طرف آتی دکھائی دی۔ دھیرے دھیرے وہ روشنی مندر کی سیڑھیوں تک آ گئی۔ یہ یقیناً آفتاب خاں ہی تھا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے لالٹین بجھا دی۔ چند لمحے بعد غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ آفتاب کا ہیولا سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد ہیولا اوجھل ہو گیا۔ وہ مندر میں جا چکا تھا۔

اب انتظار پہلے سے زیادہ کٹھن ہو گیا۔ نصف شب کے سناٹے کا فائدہ اٹھا کر آفتاب مندر کے اندر تھا اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں طول پکڑتی گئیں۔ ایک ہی جگہ سردی میں بیٹھے بیٹھے جسم اکڑنے شروع ہو گیا تھا۔ میں تو ایسی سختی کا کچھ عادی ہو گیا تھا لیکن عمران اس موسم کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ انتظار ختم ہوا۔ مندر کا دروازہ کھلا اور سیڑھیوں پر حرکت نظر آئی۔ اس مرتبہ آفتاب کے ہیولے کے ساتھ دو اور ہیولے بھی تھے۔ ایک ہیولا واضح طور پر عورت کا تھا اور یہ یقیناً سلطانہ ہی تھی۔ اس نے خود کو سرتاپا چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ تینوں ہیولے سیڑھیوں سے اترے اور انہی درختوں کی سمت بڑھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم نے خود کو لمبی گھاس اور گھنی شاخوں میں کچھ اور بھی ''کیموفلاج'' کر لیا۔ ہم سے قریباً پندرہ بیس میٹر کی دوری پر آ کر تینوں ہیولے جھاڑیوں میں ٹھہر گئے۔ میرے اندازے کے مطابق تیسرا ہیولا ہمارے دوست اقبال کا تھا۔ اس نے سلطانہ کو کندھوں سے تھاما ہوا تھا اور وہ تھوڑا سا جھکی ہوئی تھی جیسے تکلیف میں ہو۔ آفتاب کی مدھم آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ بس دو منٹ یہاں رکیں۔ ام اس سامنے والے احاطے سے بائیسکل لے کر آتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

چند سیکنڈ بعد اقبال کی جانی پہچانی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ سلطانہ کو تسلی دے رہا تھا۔ ''کچھ نہیں بھابی! پیٹ کا معمولی درد ہے۔ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ آفتاب بتا رہا ہے، بڑا سیانا حکیم ہے۔ پورا علاقہ مانتا ہے اسے۔''

سلطانہ شاید ہولے سے کراہی تھی۔ پھر اس نے ایک بوتل میں سے دو گھونٹ پانی پیا۔ اسی دوران میں آفتاب خاں بھی سائیکل لے کر آ گیا۔ اقبال نے سلطانہ کو سہارا دے کر سائیکل کے چوڑے کیریئر پر بٹھایا۔ اس کی مدھم ہائے ہائے سنائی دی۔ اقبال نے پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''یہ اجوائن اور سونف کا پانی ہے۔ دو دو گھونٹ پیتی جائیں اس سے فائدہ ہوگا۔''

آفتاب خاں سائیکل پر سوار نہیں ہوا بلکہ اسے یونہی چلاتا ہوا آگے بڑھ گیا... اقبال تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا پھر واپس مندر کی طرف چلا گیا۔ اب ہمارے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہیں کھڑے رہتے۔ ہم درختوں میں سے نکلے اور ایک محفوظ فاصلے سے بائیسکل کا پیچھا کرنے لگے۔ سلطانہ بدستور کیریئر پر تھی اور آفتاب اسے پیدل دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یقین کرنا تو مشکل تھا کہ سلطانہ واقعی بیمار ہو گئی ہے۔ یہ سب کچھ اسی ڈرامے کا حصہ لگتا تھا جس کے کچھ سین میں پچھلے تین چار روز سے دیکھ رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ سلطانہ اور آفتاب خاں نے مندر سے باہر آنے کے لیے بیماری والا کھیل کھیلا ہے۔ اقبال کو تو خواتین کی حفاظت کے لیے مندر میں ہی رہنا تھا۔ آج کے آفتاب خاں ہی تھا جو ناگہانی تکلیف کی صورت میں سلطانہ کو کسی معالج کے پاس لے جا سکتا تھا۔ اب یہ ''تکلیف'' کیا تھی، اس کا ''علاج'' کیا تھا اور معالج کون تھا، اس کا پتا تو آنے والی گھڑیوں میں ہی چل سکتا تھا۔ کچھ آگے جا کر آفتاب خاں نے اپنی لالٹین روشن کی اور سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا لی۔ حفاظت کے لیے اس کے پاس اپنی رائفل بھی موجود تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ گھنے درختوں میں سفر نہیں کر رہا تھا۔ لالٹین روشن ہونے سے ہمیں تعاقب میں مزید آسانی ہو گئی اور ہم نے احتیاطاً اپنا اور آفتاب خاں کا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا۔

یہ سفر بغیر کسی وقفے کے جاری رہا اور میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا کہ آفتاب اور سلطانہ کی منزل کہیں آس پاس ہی ہے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم اپنے مقام آغاز سے تقریباً پانچ میل آگے آ چکے تھے... یہاں ان دونوں نے آدھ گھنٹے کا وقفہ کیا اور ایک بار پھر چل پڑے۔ سفر کی شکل اب بھی وہی تھی۔ سلطانہ سائیکل کے کیریئر پر تھی اور آفتاب پیدل چل رہا تھا۔ جس قسم کے راستے تھے، وہ سوار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سفر کا یہ دوسرا دورانیہ اندازاً ایک گھنٹے کا رہا۔ نہایت ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ صبح صادق کا وقت قریب آ گیا ہے۔

سلطانہ اور آفتاب کا یہ دوسرا قیام گھنی خودرو جھاڑیوں میں ہوا۔ ہم ابھی تک بڑی کامیابی سے تعاقب کر رہے تھے۔ ہم اب بھی ان دونوں کے زیادہ قریب نہیں گئے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے کی وجہ سے تاریکی ذرا کم محسوس ہونے لگی تھی۔ عمران نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ آفتاب سائیکل کے پاس اکیلا کھڑا ہے۔''

''سلطانہ کہاں ہے؟''

''شاید اپنی کسی ضرورت کے لیے درختوں میں گئی ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سلطانہ کے ہیولے کو خودرو جھاڑیوں اور درختوں میں سے نمودار ہوتے دیکھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ اپنے کپڑے بدلنے کے لیے جھاڑیوں میں گئی تھی۔ اب اس کے جسم پر ہندو لڑکیوں کی طرح لہریے دار ساڑی تھی۔

آفتاب اور سلطانہ کا سفر ایک بار پھر شروع ہوا۔ اب وہ دونوں ہی سائیکل کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اجالا ہونے کی وجہ سے تعاقب ہمارے لیے دشوار ہو گیا تھا لیکن یہ دشواری تادیر برقرار نہیں رہی۔ اچانک ہی ہمیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندازہ ہوا کہ ہم کسی بستی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ایک بڑے مندر کا کلس دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور بھجن کی آواز بھی کانوں میں پڑنے لگی۔ درختوں کے درمیان گھری ہوئی اس بستی میں کافی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مختلف رنگوں کے جھنڈے لہراتے نظر آئے... اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی مذہبی تہوار ہے۔ یہ ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ مسلمان نہ ہونے کے برابر نظر آ رہے تھے۔ غالباً اردگرد کی چھوٹی موٹی بستیوں سے بھی لوگ یہاں پہنچ رہے تھے۔ ہم سلطانہ کو دور سے دیکھ سکتے تھے۔ اس نے اپنا نصف سے زیادہ چہرہ ساڑی کے پلو سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ اپنے حلیے سے ایک ہندو لڑکی نظر آتی تھی۔ ہمیں دور سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا مگر لگتا ایسے ہی تھا کہ اس نے ماتھے پر تلک بھی لگا رکھا ہے۔ اچانک میرے ذہن میں وہ نتھ اور جھمکے وغیرہ آ گئے جو تہ خانوں میں آفتاب نے اسے دیے تھے۔ کیا وہ چیزیں بھی سلطانہ کو صرف روپ بدلنے کے لیے دی گئی تھیں؟ یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی، پھر بھی میرے سینے میں خوش گوار دھڑکنیں جاگنے لگیں۔ کچھ بھی تھا مگر سلطانہ کے حوالے سے میرا بدترین اندیشہ ماند پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

عمران کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ''سلطانہ اور آفتاب نے ہمارا یہ حلیہ دیکھا ہوا ہے... ان کی نظر ایک بار بھی ہم پر پڑ گئی تو وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔''

ہم ایک شامیانے کی اوٹ میں چلے گئے اور ان دونوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگے۔ سلطانہ اب ہرگز بیمار نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے ایک عارضی دکان سے پوجا کی کچھ چیزیں خریدیں اور اس طرف چلی گئی جدھر عورتوں کا ہجوم تھا۔ آفتاب خان اب اس سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ مندر کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ مندر میں داخل ہونے کے لیے عورتوں اور مردوں کے علیحدہ علیحدہ راستے تھے۔ کم عمر بچے بھی عورتوں کے ساتھ تھے۔ اندر داخل ہونے کے لیے قطاریں بنائی گئی تھیں۔ سیکیورٹی سخت تھی۔ عورتوں کی تلاشی لینے کے لیے عورتیں موجود تھیں۔ سلطانہ بھی ایک قطار میں لگ چکی تھی۔ ہمارے قریب سے گزرتی ایک ہندو عورت کی کلائیوں پر لال اور پیلی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔ ہندو عورت کے کندھے سے لگا ہوا ایک شیرخوار بچہ مجھے دیکھ کر بے وجہ مسکرایا۔ پھر ماں بیٹا بھیڑ میں اوجھل ہو گئے۔

ہم نے دیکھا کہ آفتاب خان ایک سائیکل مرمت والے کے پاس بیٹھ گیا ہے۔ ہم بھی ایک قریبی چائے خانے میں گھس گئے۔ یہاں سے ہم آفتاب پر نگاہ بھی رکھ سکتے تھے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ساری سائیکل کھلوا کر اسے ''اوورآل'' کرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یقیناً یہ بھی وقت گزاری کا ایک بہانہ تھا۔

''یہ تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے پیارے۔'' عمران نے چائے خانے کی خستہ میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں چکر تو کوئی اور ہی ہے۔'' میں نے تائید کی۔ میرے اندر خوشی اور دکھ کی عجیب ملی جلی سی کیفیت تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ سلطانہ کے کردار کے حوالے سے جو جان لیوا شکوک میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے، وہ اب باطل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نسبت سے میرے سینے میں پیدا ہونے والا گاڑھا سیاہ دھواں اب چھٹتا چلا جا رہا تھا۔ اب اس کی جگہ ایک دوسری طرح کے فکروغم نے لے لی تھی۔ کچھ عرصے پہلے سلطانہ کے پاس سے ایک زہریلی پڑیا ملی تھی۔ اس پڑیا میں ویسا ہی نیلگوں زہر تھا جیسا زرگاں میں ہاشم رازی عرف ہاشو کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ تب میرے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں سلطانہ کا تعلق بھی تو کسی طور پر ہاشو کی سرگرمیوں سے نہیں؟ آج کی صورتِ حال چلا چلا کر اعلان کر رہی تھی کہ میرا وہ اندیشہ درست تھا۔

''مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے۔'' میں نے چائے کی پیالی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''وہ تو مجھے بھی آ رہی ہے۔ سلطانہ کسی بہت خاص مقصد سے اندر گئی ہے۔''

''کہیں یہ وہی زہر والا معاملہ تو نہیں؟'' میری آواز میں لرزش آ گئی۔

''ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ اس بارے میں ہمیں آفتاب خان ہی بتا سکتا ہے۔''

''تو پہنچیں اس کے پاس؟''

''نہیں تابی! یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگتا۔ آفتاب خان بھی وہ نہیں جو ہمیں نظر آ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے کوئی اور ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک اس کے پاس جائے۔ دوسرا دور رہ کر اردگرد کا جائزہ لے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ دیکھو، ان شامیانوں کے پیچھے گنے کے کھیت نظر آ رہے ہیں۔ تم کسی طرح آفتاب کو ان کھیتوں میں لے آؤ۔ میں بھی تمہارے آس پاس ہی رہوں گا۔''

تھوڑی سی تفصیل طے کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سیدھا سائیکلوں کی اس دکان پر پہنچا جہاں آفتاب بیٹھا

سائیکل سروس کرا رہا تھا اور ساتھ ساتھ جلیبی کھا رہا تھا... مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ چند لمحوں کے لیے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''او ہو، تابش بھائی! آپ یہاں؟ یہ ام... کیا ادھر ہو رہا ہے؟''

''مجھے بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا... تم یہاں کیسے؟'' میں نے کہا۔

''ام نے یہاں ایک بندے کو ادھار پیسا دیا ہوا ہے۔ اس سے لینے آیا تھا۔ یہاں اس میلے میں یہ سائیکل کا دکان دیکھا تو سوچا کہ سائیکل کو بھی ٹھیک ٹھاک کرا لے۔ لیکن... لیکن آپ تو ہنومان گاؤں گیا تھا نا۔ خو، اس کا راستہ تو نالے کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔''

میں نے آواز دبا کر کہا۔ ''نالے کے ساتھ ساتھ ہی جا رہے تھے مگر راستے میں گڑبڑ ہو گئی۔ کچھ لوگ پیچھے لگ گئے۔ شاید زرگاں کے ہی تھے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر اس طرف کو نکلے ہیں۔''

''عمران بھائی کہاں ہے؟''

''وہ سامنے کھیتوں میں۔ اسے تھوڑی سی چوٹ بھی لگ گئی ہے۔''

آفتاب خان بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یقیناً اس کے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور آفتاب خان گنے کے کھیتوں میں پہنچ گئے۔ یہ آٹھ دس فٹ اونچے کھیت تھے۔ ''کہاں ہے عمران بھائی؟'' آفتاب نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا۔

میں نے اپنے تہبند کی ڈب میں سے ریوالور نکال لیا۔ آفتاب کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ''خبردار آفتاب! اپنے ہاتھ اپنی جیبوں سے دور رکھو... اور نیچے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں اردگرد کے پودوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور عمران بھی وہاں آ گیا۔ اپنی گرم چادر کے نیچے اس نے رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت رکھی ہوئی تھی۔ آفتاب سمجھ گیا کہ معاملہ سنگین ہے۔ ''نیچے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے پھر پھنکار کر کہا۔

اب آفتاب کا رنگ سرخ ہونا شروع ہو گیا۔ بہرحال، وہ نیچے بیٹھ گیا۔ عمران نے بھی دور مار رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ میرا ریوالور پہلے سے ہی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے آفتاب کی پھولی ہوئی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک بٹن چاقو، نسوار کی ڈبیا، تھوڑی سی کرنسی اور چند کاغذ تھے۔ رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ یہ چھوٹی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نال والی رائفل میں نے اتار لی اور دور پھینک دی۔
''امارے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' وہ سنبھل کر بولا۔
''پہلے تم بتاؤ کہ تم ہمارے ساتھ یہ سب کیا کر رہے ہو؟'' عمران نے کہا۔
''ام نے کیا کیا ہے؟''
''سلطانہ، اندر کیا کرنے گئی ہے؟'' عمران نے رائفل آفتاب کے سر سے لگا کر پوچھا۔
آفتاب ایک بار پھر بھونچکا رہ گیا۔ وہ ہم دونوں کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا... عمران نے کہا۔ ''دیکھو آفتاب! چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ تہ خانوں کے اندر اور تہ خانوں سے باہر جو کچھ ہوا ہے، وہ ہم دیکھتے رہے ہیں۔ جب تم ''بیمار'' سلطانہ کو سائیکل پر بٹھا کر فتح پور سے روانہ ہوئے تھے، تب بھی ہم تمہارے پیچھے تھے۔ اب کوئی سوال نہ کرنا۔ بس جواب دینا... سلطانہ کو تم نے کس کام سے اندر بھیجا ہے؟''
''ام نے نہیں بھیجا۔ وہ خود گیا ہے۔ وہ خود جانا چاہتا تھا۔'' آفتاب خود سری کے انداز میں بولا۔
''کیوں جانا چاہتی تھی وہ؟''
''ام نہیں جانتا... اور اگر جانتا بھی ہوتا تو تم کو نہ بتاتا۔'' آفتاب کا لہجہ اب واشگاف ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کے چہرے پر جو ہراس نظر آیا تھا، اب ناپید ہو چکا تھا۔
''تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے تو ہم دوسری طرح پوچھیں گے۔'' میں نے ریوالور اس کی طرف سیدھا کیا۔
''آپ کا جس طرح مرضی پوچھو۔ ام اپنے باپ کا اولاد ہی نہیں اگر تم کو ایک لفظ بھی بتائے۔'' آفتاب کا انداز مزید آتشیں ہو گیا۔ اب وہ سرتاپا ایک خود دماغ پٹھان نظر آتا تھا۔ ''اور ام تم کو ایک اور بات بتا دے۔ جو ہوتا ہے، وہ تو ہوتا ہی ہے۔ اگر تم زیادہ واویلا کرے گا تو پھر سلطانہ بی بی کا جان بھی چلا جائے گا۔ یہ لوگ اس کا بوٹیاں نوچ لے گا۔ بہتر ہے کہ جو ہو رہا ہے وہ ہونے دو۔ اور یہ سب کچھ ہمارے فائدے میں بھی ہے۔''
''کس فائدے کی بات کر رہے ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔
وہ چند سیکنڈ چپ رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ زبان کھولے یا نہیں۔ پھر پھنکارتی آواز میں بولا۔ ''کیا تم مسلمان نہیں ہے؟ کیا تمہارا دل اس ظلم پر خون نہیں ہوتا جو یہ لوگ ام پر کر رہا ہے؟ کیا تم نے زرگاں میں جل کر مرنے والے بچوں کی آخری پکاروں کو بھلا دیا ہے؟ ان کا بدلہ لینا ام سب کا فرض ہے اور ام لیں گے۔''
عمران نے ایک دم اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔ اس نے گن کی نال جھکا دی اور بولا۔ ''ہماری سوچیں تم سے علیحدہ نہیں ہیں آفتاب! جو آگ تمہارے دل میں بھڑک رہی ہے، وہی ہمارے دل میں بھی ہے۔ لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ تم ہمارے ساتھی ہوتے ہوئے بھی ہم سے سب کچھ چھپا رہے ہو۔''
''اور یہی کچھ سلطانہ نے بھی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ مجھے اعتماد میں لے لیتی تو مجھے یہ دکھ نہ ہوتا۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ شاید تم نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔''
''نہیں... ام نے کسی کو مجبور نہیں کیا... اور یہ سارا کام مجبوری کا ہے بھی نہیں۔ یہ تو اندر کی غیرت اور جوش کا کام ہے۔ یہ نہ زبردستی کروایا جا سکتا ہے، نہ زبردستی رکوایا جا سکتا ہے۔''
عمران نے کہا۔ ''اگر ہمیں دوست سمجھتے ہو آفتاب خان تو سب کچھ کھول کر بتا دو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جائیں۔''
''ام کیا بتائے؟''
''تم اور سلطانہ کس کے کہنے پر یہ سب کچھ کر رہے ہو؟''
''ام نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یہ بس اندر کا جذبہ ہوتا ہے۔''
''اندر کا جذبہ تو ہمارے اندر بھی ہے... لیکن ہم کچھ کر نہیں پا رہے۔ تم نے کچھ کیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی تمہیں راہ دکھا رہا ہے۔ ہمیں صاف بتاؤ آفتاب خان! ہمیں لگ رہا ہے کہ تمہارے، سلطانہ اور ہاشو وغیرہ کے درمیان تعلق ہے۔''
آفتاب کے چہرے پر رنگ سا گزرا لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں۔ سنبھل کر بولا۔ ''ام ہاشو وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ام کو صرف اتنا پتا ہے کہ وہ سلطانہ بی بی کے گھر میں کام کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سوچ بھی امارے جیسا ہو مگر امارے اور اس کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' آفتاب کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ ہاشو، سلطانہ، طلال، آفتاب شاید کسی ایک ہی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔
میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا

''کیا مطلب؟'' وہ ذرا چونکی۔
''میرا مطلب ہے، بہت سویرے نکلوں گا تو تمہیں جلدی اٹھنا پڑے گا۔ کھانا وغیرہ بنانا ہو گا۔ صبح پانچ چھ بجے کے قریب نکلیں گے، یا پھر شام کو۔''
''اور واپسی؟''
''دو راتیں تو تمہیں اکیلے گزارنا پڑیں گی۔''
''مہروج! اس کام میں جیادہ خطرہ تو نہیں ہے؟'' اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''خطرہ ہے تو اچھی بات ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''خطروں سے ہی تو راستے نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
اسی دوران میں طلال اندر آ گیا۔ اس نے سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''خالہ! نوری کو بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے، وہ تمہیں بلا رہی ہے۔''
سلطانہ، طلال کے ساتھ بالائی تہ خانے کی طرف چلی گئی۔ کھانا زہر لگ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف رکھ دیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے پلنگ کے نیچے ہاتھ چلایا۔ ایک تھیلا تھا۔ اس میں چوڑیوں والے ڈبے کے ساتھ ایک بالکل چھوٹی سی پوٹلی بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے باہر نکال لی۔ یہ ایک ریشمی رومال تھا جس میں کچھ باندھا گیا تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ یہ چاندی کے جھمکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی خوب صورت طلائی نتھ تھی۔ ایسی نتھ میں نے یہاں اکثر ہندو عورتوں کو پہنے ہوئے دیکھی تھی۔ عطر کی ایک چھوٹی سی شیشی بھی ان چیزوں کے ساتھ موجود تھی۔ سلطانہ کے واپس لوٹنے سے پہلے میں نے یہ اشیا پھر اسی جگہ پر رکھ دیں۔ دروازہ کھولا اور بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ رگوں میں آگ دوڑ رہی تھی۔ جو ٹوٹے پھوٹے فقرے سنے تھے، وہ زہر بجھے تیروں کی طرح سوچوں میں سنسنا رہے تھے۔ ایک فقرہ بار بار ذہن میں آ رہا تھا۔ آفتاب نے سلطانہ سے کہا تھا، اگر تم چاہو تو کر آنا... اس سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے مندر سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا وہ سلطانہ کو کسی قریبی گھر میں لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو کیوں تھا؟ اس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا تھا۔ وہ کاٹھ کباڑ والے سرد کمرے کے بجائے کسی آرام دہ ماحول میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ بہرحال جو کچھ تھا، فی الحال اندازوں اور قیافوں کے مرحلے میں آتا تھا، یقین سے کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا تھا۔
اس روز میں نے عمران کے ساتھ مل کر مندر سے باہر نکلنے اور ''ہنومان گاؤں'' میں نتھا کمار نامی اس ہندو شکاری سے ملنے کا پروگرام بنالیا۔ ہمیں اگلے روز شام کا اندھیرا ہوتے ہی مندر سے نکل جانا تھا۔ دیہاتیوں کے بھیس میں ہمیں پیدل سفر کرنا تھا اور ہنومان گاؤں پہنچنا تھا۔ ہمارے دیہاتیوں والے بھیس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے آفتاب نے ہمیں دو کسیاں بھی فراہم کر دی تھیں جنہیں ہم نے کاشت کاروں کے انداز میں کندھے پر رکھنا تھا۔ مقامی دیہاتیوں والے لباس ہمارے پاس پہلے سے موجود تھے۔ میں نے عمران کو اپنی اندرونی ہلچل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔
اگلے روز شام ہونے تک ہم جانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہماری غیر موجودگی میں یہاں کا کرتا دھرتا اقبال ہوتا تھا۔ اب بھی وہی تھا۔ میں سلطانہ کو چور نظروں سے دیکھتا تھا اور اس کے اندرونی اضطراب کو محسوس کر کے دل خون ہونے لگتا تھا۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن ہماری روانگی کے حوالے سے بڑی فکرمند تھی۔ اسے یہ ڈر تھا کہ کوئی اڑچن پیدا ہونے سے ہمارا پروگرام بدل نہ جائے۔
کیا یہ وہی سلطانہ تھی جسے میں جانتا تھا اور شوہر سے جس کی وفاداری کے قصے مشہور تھے؟ میں اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا تو ذہن میں دھند سی بھرنے لگی تھی۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی آفتاب خان مندر میں پہنچ گیا اور ہم اس کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ فتح پور میں ابھی چراغ جل رہے تھے تاہم گلیاں گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مندر کی تعمیر کے لیے اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے تھے۔ ہم ان ڈھیروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے گھنے درختوں میں داخل ہو گئے۔ کچھ آگے جا کر ہم نے آفتاب خان کو ''الوداع'' کہا اور اپنے منتخب راستے پر چل دیے۔
قریباً ایک فرلانگ آگے آ کر میں ٹھٹکا اور تھوہر کے گنجان درختوں میں رک گیا۔ یہیں پر وہ آسیب زدہ جوہڑ بھی تھا جس میں چند دن پہلے ہم نے شان دار جرمن جیپ کو غرقاب کیا تھا۔ عمران بولا۔ ''یہاں کیوں رک گئے ہو؟ ابھی کوئی جن بھوت آ کر کہے گا، السلام علیکم۔ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں اور یہاں گھاس پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو چکھنا چاہتا ہوں۔''
میں نے کاشت کاروں والی ''کسی'' کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھی اور بیٹھ گیا۔ عمران نے آنکھیں نکالیں۔ ''اوئے، تم تو سچ مچ بیٹھ گئے ہو۔ کیا واقعی مرنے کا ارادہ ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ بتاؤ، سلطانہ کتنے پیکٹ لے کر گئی ہے اندر؟"
"ک... کون سے پیکٹ؟"
"زہر کے پیکٹ۔ جو پرشاد میں ملائے جاتے ہیں۔" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔
"آ... آپ پتا نہیں کیا بات کر رہے ہیں... وہ کسی اور کام سے گیا ہے۔ تو، ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔"
مجھے لگا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ آفتاب کا کھوکھلا لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اندر سے ہل گیا ہے۔
عمران نے کہا۔ "دیکھو، اگر تم ہمیں دوست نہیں سمجھو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ تمہیں بعد میں پچھتاوا ہوگا۔"
"آپ ہمارا دوست ہے لیکن اس بارے میں ابھی ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ ابھی یہ کام ہو لینے دو۔" وہ اٹل آواز میں بولا۔ اس کے اندر وہی سختی موجود تھی جو انتہا پسند گروہوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی خاموشی برقرار رکھنے کے لیے ہر خطرہ مول لینے اور ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔
آفتاب کی تلاشی سے برآمد ہونے والی چیزیں ابھی عمران کے ہاتھ میں تھیں۔ ان میں دو تہہ شدہ کاغذ بھی تھے۔ ایک رقعہ نما کاغذ پر عمران کی توجہ مبذول ہو گئی۔ اچانک مجھے لگا کہ آفتاب، عمران پر جھپٹے گا اور رقعہ نما کاغذ اس سے چھین لے گا۔ میں نے .... ریوالور کا رخ ایک بار پھر اس کے سر کی طرف کر دیا۔ "آفتاب! اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ حرکت کرو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔"
عمران نے دو قدم پیچھے ہٹ کر تحریر پڑھنا شروع کی۔ وہ کچھ اس طرح تھی۔ "...ش تمہارے پاس آرہا ہے۔ اس کے پاس دو تھیلی ہے۔ ایک اپنے پاس رکھو، دوسری کام میں لاؤ۔ چڑھاوے کا میلا تین چار اور پانچ تاریخ کو ہوگا۔ ان میں سے کوئی تاریخ چن لو۔ عورتوں والے حصے میں جانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ س حلیہ بدل کر جا سکے گی۔ س کا کام بس یہ ہوگا کہ وہ تھیلی گلزار تک پہنچا دے۔ گلزار "مٹھا" بانٹنے والی عورتوں کی کرتا دھرتا ہے۔ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہے۔ مندر کے اندر ہی رہتی ہے۔ باقی کام وہ کرے گی۔"
یہ تحریر رونگٹے کھڑے کرنے والی تھی۔ تحریر میں موجود اشارے واضح تھے۔ تھیلی کا مطلب زہریلے پاؤڈر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ س کا اشارہ سلطانہ کی طرف تھا۔ مٹھے سے مراد پرشاد تھا۔
یہ وہی بے رحم انتہا پسندی تھی جو ہم نے ہاشم عرف ہاشو میں دیکھی تھی۔ یہ اندھا جوش کہیں بھی ہو، کسی بھی مذہب، فرقے یا گروہ میں ہو، یہ قابلِ قبول نہیں تھا۔ میرے ذہن میں وہ چھوٹا سا بچہ آیا جو اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا میری طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور بے وجہ شرمایا تھا۔ وہ بچہ صرف ایک بچہ تھا۔ ایک بے گناہ... یہی بچہ چند روز پہلے زرگاں میں جل کر مرا تھا... اب یہی بچہ پھر یہاں، زہر کھا کر مرنے والا تھا۔ اس بچے کو نہیں مرنا چاہیے تھا۔ یہ کوئی بھی تھا، یہ اس دنیا کا "کل" تھا۔ یہ امید کی کرن تھا۔ یہ آس کی ڈور تھا۔ میں یا آفتاب خاں یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے تھے کہ کل یہ بچہ، خدا کا نام لیوا نہیں ہوگا، یہ سچائیوں کا علم نہیں اٹھائے گا، کہنہ عقیدوں کو نہیں توڑے گا اور زخموں کا مرہم نہیں بنے گا۔ ہم اسے مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان لمحوں میں مجھے آفتاب خاں، ہاشو، کھوسٹ بڑھیا اور سنتش میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔
عمران نے میری اور میں نے عمران کی طرف دیکھا۔
ہم ایک نازک ترین موڑ پر کھڑے تھے۔ سلطانہ جو میری دیکھی ہوئی تھی، جو میرے سانسوں میں بستی تھی، مندر کے اندر پہنچ چکی تھی۔ اس کے لباس میں زہر چھپا ہوا تھا۔ یہ زہر پرشاد میں ملایا جانے والا تھا یا ملایا جا چکا تھا۔ ہم حرکت میں آتے تو سلطانہ کی زندگی کو خطرہ تھا۔ نہ آتے تو بے شمار عورتیں اور بچے موت کے منہ میں چلے جاتے۔ حرکت میں آنا ضروری تھا۔
اچانک بندوق کا زوردار فائر سنائی دیا۔ یہ فائر مندر کے عین سامنے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ چلائے۔ ایک سیکنڈ کے لیے... صرف ایک سیکنڈ کے لیے میری اور عمران کی توجہ اس دھماکے کی طرف گئی۔ آفتاب نے فائدہ اٹھایا اور اٹھ کر تیزی سے فصیل میں گھس گیا۔ "رک جاؤ!" عمران دہاڑا۔
اس نے رائفل سیدھی کی مگر فائر کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ چند قدم اس کے پیچھے دوڑا مگر آفتاب اونچے ستونوں کے اندر کافی آگے پہنچ چکا تھا۔ اس کا پیچھا کرنا بے سود تھا۔ ہم واپس پلٹے اور اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہوئے جس نے مندر کے سامنے تہلکہ مچا دیا تھا۔ لوگ چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک گھوڑا گاڑی کے گھوڑے بدک گئے تھے اور وہ خالی ہی ایک طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے کسی کو لپک کر اس گھوڑا گاڑی میں گھستے دیکھا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ مجھے سبز اوڑھنی کی جھلک نظر آئی تھی۔ سلطانہ کی اوڑھنی بھی سبز تھی۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ایک پولیس آفیسر کا امتحان جس نے اپنی محنت اور مشاہدے سے ہر طور گم کیا تھا...

اس کارخانۂ قدرت سے ایک سادہ و آسان مگر خیال انگیز و پُر فریب کتھا... جو سب کچھ ٹھیک ہے... کی عملی تصویر پیش کر رہی تھی... ناممکن اور ممکن کے درمیان الجھا دینے والی ایک کشمکش...

فریبِ نظر

سلیم انور

وہ شخص سفید چادر میں لپٹی ہوئی لاش کے سرہانے کھڑا تھا جسے ایمرجنسی میڈیکل سروس کے لوگ اٹھا کر اسٹریچر پر رکھ رہے تھے۔ اس شخص کا قد لمبا اور شانے چوڑے تھے۔ اس کی توند تھوڑی سی نکلی ہوئی تھی۔ پیشانی پر سیاہ بالوں کا ایک گچھا سا پڑا ہوا تھا۔
[illegible] وہاں [illegible] لوگوں کی نظریں بار بار اس دراز قامت شخص اور سفید چادر میں لپٹی ہوئی لاش کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ [illegible] سال سے [illegible] سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ ابھی تک لاشوں کا عادی کیوں نہیں ہوا تھا...
اسی لمحے میں دوسری جانب کی پٹری سے ایک ریل تیزی سے [illegible] گزر رہی تھی۔ [illegible] اسٹیشن میں [illegible] کی آواز گونج رہی تھی۔ اسٹیشن کی سیڑھیوں [illegible] پیچھے

ہوئے تھے۔ ''پولیس لائن۔ کراس مت کیجیے۔''

ریل کے گزرنے کے بعد اسٹیشن پر ایک بار پھر خاموشی سی چھا گئی۔ تب وہ دراز قامت شخص پلٹا اور ایڈی لوگن اور اس کی پارٹنر ایرون ایوانز کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''آل رائٹ، آل رائٹ۔ تم دونوں یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟''

سراغ رساں ایڈی نے استفہامیہ نظروں سے اسٹریچر پر رکھی ہوئی لاش کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

وہ دراز قامت شخص ایڈی کی نظروں کا مطلب سمجھ گیا اور بولا۔ ''وہ میری بیوی ہے۔ ویسے تم کون ہو؟''

ایڈی نے اپنی نگاہوں کا رخ دوبارہ اس شخص کی جانب گھما دیا اور بولا۔ ''میں سراغ رساں ایڈی لوگن ہوں۔ یہ میرا پارٹنر سراغ رساں ایرون ایوانز ہے۔''

''بہت خوب!'' دراز قامت شخص نے ترش اور طنز سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''جبکہ تم لوگ یہاں موجود ہو، اس کے باوجود وہ شخص جس نے میری بیوی کو پلیٹ فارم پر سے نیچے دھکا دیا تھا، بچ کے نکل گیا ہے۔''

''کیا آپ بتانا چاہیں گے کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے، مسٹر...؟'' ایرون نے پوچھا۔

''آرتھر... آرتھر میٹز۔'' دراز قامت شخص نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔

''او کے، مسٹر آرتھر۔''

آرتھر نے نظر اٹھا کر ایرون کی جانب دیکھا اور اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ''جب ٹرین آرہی تھی تو میں اور میری بیوی اس پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک شخص جو حلیے سے خانہ بدوش لگ رہا تھا، تیزی سے ہماری طرف آیا۔ اس نے میری بیوی کی پاکٹ بک پر جھپٹا مارا اور اسے پٹری پر دھکیل دیا۔''

ایرون توجہ سے اس شخص کی بات سن رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی ہتھیلی سے اپنی گیلی پیشانی پر سے پسینا پونچھا اور بولا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ شخص خانہ بدوش تھا؟''

سراغ رساں ایرون بھی دراز قامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس کی رنگت کالی کی رنگت سے ملتی جلتی تھی۔

''ویل۔'' آرتھر نے کہا۔ ''اس شخص نے پرانی گرین آرمی وردی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے جسم سے بہت بو آرہی تھی اور وہ خود کلامی کر رہا تھا۔''

''جب آپ یہاں آئے تھے تو کیا وہ پلیٹ فارم پر پہلے سے موجود تھا؟'' ایڈی نے سوال کیا۔

آرتھر نے شانے اچکا دیے اور اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے اپنی شادی کی انگوٹھی کو بل دیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ میں نے ادھر اُدھر توجہ نہیں دی تھی۔ میں اپنی بیوی سے باتیں کر رہا تھا۔''

ایرون نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''تو آپ یہاں کھڑے ہوئے تھے اور وہ شخص نہ جانے کہاں سے آگیا اور آپ کی بیوی کو پٹری پر دھکا دے دیا؟''

''ہاں۔'' آرتھر نے جواب دیا۔

''آپ اس کے پیچھے نہیں بھاگے؟''

''میں اس کے پیچھے بھاگتا؟'' آرتھر نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''میری بیوی پٹری پر گری ہوئی تھی۔ ٹرین سر پر آن پہنچی تھی۔ پھر ٹرین نے میری بیوی کو کچل دیا۔ سب کچھ آناً فاناً ہوگیا۔''

سراغ رساں ایرون نے پلیٹ فارم اور پٹری کے درمیان فاصلے کا جائزہ لیا اور ماتھے پر شکنیں لاتے ہوئے اپنے پارٹنر سراغ رساں ایڈی سے بولا۔ ''آؤ چل کر کنڈکٹر صاحب سے بات کرتے ہیں۔''

''کنڈکٹر کو بھول جاؤ۔'' آرتھر نے قدرے غصے سے کہا۔ ''خدا کے لیے اس شخص کو تلاش کرو جس نے میری بیوی کو دھکا دیا ہے۔''

''دیکھو...'' ایڈی نے کہنا چاہا۔

''نہیں، تم دیکھو۔ تم لوگ اپنا کام کرو اور اس قاتل کو تلاش کرو۔''

''ہم تلاش کرلیں گے۔'' ایڈی نے بھی غصے سے جواب دیا۔

آرتھر نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور ان دونوں کو گھورنے لگا۔ ''تم لوگ ایسے دیوانے خانہ بدوشوں کو یوں سڑکوں پر گھومنے پھرنے کے لیے کیوں کھلا چھوڑ دیتے ہو؟ ہمارے نیویارک میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے تاکہ کسی شہری کو کسی قسم کی گزند نہ پہنچے۔''

''یہاں کے حفاظتی اقدامات بھی نیویارک سے مختلف نہیں ہیں۔'' ایڈی نے اپنے غصے کو پیتے ہوئے جواب دیا۔

''ویل، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ ہم یہاں تعطیلات منانے کے لیے آئے تھے اور اب میری بیوی کا قتل ہوگیا ہے اور تم بجائے اس شخص کو ڈھونڈنے کے جس نے میری بیوی کو پٹری پر دھکا دیا ہے، یہاں کھڑے مجھ سے سوالات

کیے جارہے ہو۔''

اتنے میں ایک سفید رنگ کی وین جس کے سائڈ پر جلی حروف میں ''چینل سیون نیوز'' پینٹ تھا، پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی۔ اس کے دروازے کھلے اور ایک شخص کیمرا لیے باہر آگیا۔ اس کے پیچھے مائکروفون لیے ایک عورت بھی نیچے اُتر آئی۔

لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروپ ان کے گرد اکٹھا ہوگیا۔

آرتھر نے وین کی طرف دیکھا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

'ہاں، اس شخص کے اَپ سیٹ ہونے کا سبب ہے۔' ایڈی نے سوچا۔ 'آخر کار اس کی بیوی کو ابھی ابھی ہلاک کردیا گیا ہے لیکن اس شخص نے اس خانہ بدوش کا پیچھا کیوں نہیں کیا جس نے اس کی بیوی کو پلیٹ فارم سے نیچے آتی ٹرین کے سامنے دھکا دیا تھا؟'

''نہایت عجیب سی بات ہے۔'' ایرون نے کہا۔

ایڈی نے حیرانی سے ایرون کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔

''کیا بات عجیب سی ہے؟'' ایڈی نے پوچھا۔

''مسٹر آرتھر کا فوری طور پر اس نتیجے پر پہنچنا کہ وہ شخص خانہ بدوش تھا۔'' ایرون نے جواب دیا۔

''ویل، تم جانتے ہو کہ لوگ کس قسم کے ہوتے ہیں۔ مسٹر آرتھر نے جس طرح اس شخص کا حلیہ بیان کیا ہے، بیشتر لوگ اسی انداز سے سوچتے اور یہی نتیجہ اخذ کرتے۔''

ایرون نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ بات دلچسپ لگی ہے کہ وہ خانہ بدوش شخص اتنی لمبی سیڑھیاں اتنی تیزی سے اتر کر غائب ہوگیا۔ یقیناً جسمانی لحاظ سے وہ پھرتیلا ہوگا۔''

سراغ رساں ایڈی نے اپنی نظریں سیڑھیوں پر مرکوز کردیں اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''دلچسپ خیال ہے۔ ارے، وہ جوزف ہے۔ دیکھیں اس کے پاس کہنے کو کیا ہے۔''

ایڈی اور ایرون جوزف کی جانب متوجہ ہوگئے۔

جوزف قامت میں ایرون سے چھوٹا تھا اور اس کے بازو کی مچھلیاں اس کے یونیفارم کی آستینوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ دیکھنے میں وہ ایک پولیس مین کے بجائے ریسلر زیادہ نظر آتا تھا۔

''کتنا کراہت آمیز منظر تھا۔'' جوزف نے قریب آکر کہا۔

''ہاں، کیا تم نے پلیٹ فارم پر موجود لوگوں سے بات کی؟'' ایڈی نے پوچھا۔

جوزف نے اپنے خاکستری بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ایڈی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اس وقت پلیٹ فارم پر زیادہ لوگ موجود نہیں تھے۔ درحقیقت مسٹر آرتھر اور ان کی بیوی لوگوں سے خاصے فاصلے پر الگ تھلگ کھڑے تھے۔ اس لیے کسی اور نے یہ نہیں دیکھا کہ حقیقت میں کیا ہوا۔ جب انہیں پتا چلا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔''

ایرون نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''ایک اجنبی شہر میں سیاح... اور وہ بھی مجمع سے الگ تھلگ۔ جب وہ خانہ بدوش سیڑھیوں سے نیچے دوڑ رہا تھا تو کیا کوئی اس کے پیچھے لپکا تھا؟''

جوزف نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں، حقیقت میں کسی کی بھی توجہ اس طرف مبذول نہیں تھی اور یہ واقعہ چند سیکنڈ میں ہوگیا۔ تب تک وہ خانہ بدوش غائب ہوچکا تھا۔ لوگوں کو اس کے بعد پتا چلا کہ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔''

''تم نے کنڈکٹر سے بات کی؟'' ایڈی نے پوچھا۔

''ابھی نہیں کی۔ وہ تمہارے عین عقب میں موجود ہے۔'' جوزف نے جواب دیا۔

ایڈی گھوم گیا۔ کنڈکٹر ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ چہرے سے پریشان لگ رہا تھا۔ اس کے بدن پر ابھی تک ہلکی سی کپکپی طاری تھی۔ ایڈی اس کی جانب چل دیا۔ اسے اپنے پیچھے ایرون کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' ایڈی نے اس سے پوچھا۔

''ہاں، بہتر ہوں۔'' کنڈکٹر نے گمبھیر آواز میں جواب دیا۔ اس کا لہجہ خالص اسپینش تھا۔ ''بڑا ہولناک حادثہ تھا۔ میں ریل کو روکنا چاہتا تھا لیکن یہ سب اچانک اور بہت تیزی سے ہوگیا۔ میرا مطلب ہے کہ اگر میں کسی کو پلیٹ فارم پر جھکا ہوا دیکھتا ہوں تو ہمیشہ ہارن بجاتا ہوں۔ لیکن وہ شخص تو اچانک آیا اور اس نے عورت کو پٹری پر دھکیل دیا۔''

''کیا تم نے اسے سیڑھیوں کی سمت بھاگتے ہوئے دیکھا تھا؟'' ایرون نے پوچھا۔

کنڈکٹر نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک آہ سی بھری اور بولا۔ ''ہاں، یقیناً وہ ایک ساتھ دو سیڑھیاں پھلانگ رہا تھا۔ وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔''

ایڈی نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے شانے پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھلی دیتے ہوئے بولا۔ ''خود پر قابو پانے کی کوشش کرو۔''

کنڈکٹر نے اپنی جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی، اسے کھولا اور ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبالی۔ پھر لائٹر سے سگریٹ سلگانے کے بعد بولا۔ ''مجھے اس کام میں دس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اس سے قبل آج تک میرے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔''

ایڈی نے جوزف کی جانب اشارہ کیا۔ ''وہاں اس باوردی شخص کو دیکھ رہے ہو۔ اسے تمہارے بیان کی ضرورت ہوگی۔ شاید ہیڈکوارٹر تک جانا پڑ جائے۔''

کنڈکٹر نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور نتھنوں سے دھواں خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''او کے!''

پھر وہ بینچ سے اٹھ کر جوزف کی جانب چل دیا۔

ایڈی نے آرتھر کو تلاش کرنا چاہا تو وہ نیوز چینل کی وین کے پاس کھڑا دکھائی دیا۔ رپورٹر نے اپنا مائک اس کے منہ کے سامنے کیا ہوا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' ایرون نے ایڈی سے پوچھا۔

''آؤ باہر چلتے ہیں اور جگہ کا جائزہ لیتے ہیں۔'' ایڈی نے جواب دیا۔

''او کے۔''

ایڈی نے سیڑھیوں تک پہنچنے کے بعد ایرون کے گزرنے کے لیے پیلے ٹیپ کو اوپر اٹھایا اور پھر اس کے پیچھے خود بھی سیڑھیاں اترنے لگا۔

باہر نکلنے کے بعد ایڈی نے سڑک پار مکانوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سرخ بالوں والی ایک عورت اپنے ریٹچ اسٹائل کے مکان کے لان میں اپنی پھولوں کی کیاریوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ ایرون نے مسکراتے ہوئے ایڈی سے کہا۔

''چلو اس سے پوچھتے ہیں۔ شاید اسے کچھ معلوم ہو۔''

''ایرون! اس کی پشت ہماری طرف ہے اور پھر وہ شاید ابھی لان میں آئی ہوگی۔ وہ تو بس اپنے پھولوں کو دیکھنے میں مصروف ہے۔''

''لیکن کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ کتنے بہت سے پھول ہیں اور لگتا ہے کہ وہ ان کی خصوصی دیکھ بھال کرتی ہے۔'' یہ کہہ کر ایرون سڑک پار کرنے لگا۔

ایڈی بھی اس کے پیچھے چل دیا۔

ان کے بھاری قدموں کی آواز پر وہ عورت چونکی اور ماتھے پر شکنیں ڈالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس عورت نے درمیان سے مانگ نکالی ہوئی تھی اور اس کے سرخ بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس نے اپنی سبزی مائل بھوری آنکھیں ان دونوں پر مرکوز کر دیں اور بولی۔ ''میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

ایرون نے اپنا بیج دکھایا، پہلے اپنا اور پھر ایڈی کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ کیا آپ یہاں دیر سے موجود ہیں؟''

''مجھے یہاں لگ بھگ ایک گھنٹا ہو گیا ہے۔ کیوں؟''

''ہم ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جو اسٹیشن کی سیڑھیوں پر سے دوڑتا ہوا باہر نکلا تھا۔ اس نے بوسیدہ گرین آرمی وردی پہنی ہوئی تھی۔ کیا آپ نے اسے دیکھا تھا؟'' ایرون نے پوچھا۔

عورت نے اپنے چہرے پر آتے ہوئے سرخ بالوں کو ہٹایا اور اپنی پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، میں نے اسے دیکھا تھا۔ کیا معاملہ ہے؟''

''اس شخص نے ایک عورت کی پاکٹ بک چھینی اور اسے ریل کی پٹری پر دھکیل دیا۔'' ایڈی نے بتایا۔ ''اس عورت کو ٹرین نے ٹکر ماردی جو اسی وقت وہاں پہنچی تھی۔''

''او مائی گاڈ!'' عورت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے منہ پر چلا گیا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔ اور وہ عورت...؟''

''ہاں۔'' ایرون نے افسردگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عورت چند لمحوں کے لیے گم صم سی ہو گئی۔

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا تھا کہ وہ کس طرف گیا؟'' ایرون نے پوچھا۔

''وہ بائیں طرف گھوما تھا اور بھاگنا شروع کیا تھا کہ وہاں کوڑے میں پڑے ہوئے خالی کنٹینر میں اس کا پیر سلپ ہو گیا اور وہ گر پڑا۔ پھر وہ اٹھا اور کارنر کی طرف دوڑ گیا۔ وہاں ایک وین کھڑی تھی۔ وہ اس وین میں سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا۔''

''وہ وین میں سوار ہو کر گیا ہے؟'' ایڈی نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں، وہ نیلے رنگ کی وین تھی۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ میں اس وقت یہی سمجھی کہ اس شخص کو گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ اس کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وین کارنر پر کیوں کھڑی تھی۔''

''کیا آپ نے اس کا نمبر نوٹ کیا تھا؟'' ایڈی نے جاننا چاہا۔

''نہیں۔ وین کافی فاصلے پر تھی۔ لیکن اس شخص نے اپنے جیبے کو ٹٹولا تھا جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ کوڑے کے ڈھیر پر الجھ کر گرا تھا تو کوئی شے اس کی جیب سے نیچے گر گئی تھی۔'' عورت نے بتایا۔

''چلو وہ جگہ چیک کرتے ہیں۔'' ایرون نے بے تابی سے کہا۔ ''تھینک یو!'' اس نے عورت کا شکریہ ادا کیا۔

''یو آر ویلکم۔ امید ہے کہ تم لوگ اسے پکڑ لو گے۔''

ایرون تیز تیز قدموں سے وہاں پہنچ گیا جہاں خالی کین بکھرے پڑے تھے۔ ایڈی ٹہلتا ہوا اس کے پاس چلا گیا اور سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''اگر وہ شخص جس نے عورت کو دھکا دیا تھا، بے گھر تھا تو یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ ایک وین اس کا انتظار کر رہی تھی۔''

''حقیقت یہی ہے۔'' ایرون نے جواب دیا۔ پھر وہ جھک کر زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ اسے ایک سلور سگریٹ لائٹر پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اپنی جیب میں سے ربر کے پتلے دستانے نکال کر ہاتھوں میں پہنے۔ پھر ایک بیگ نکالا، زمین پر پڑا ہوا سگریٹ لائٹر اٹھایا اور بیگ میں ڈالنے کے بعد اسے سیل کر کے اس پر لیبل لگا دیا۔ ''شاید اس شخص کو اسی کی تلاش تھی۔ اسے فارنسک والوں کے پاس لے چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس پر سے انہیں اس شخص کی انگلیوں کے نشانات مل جائیں۔''

☆☆☆

دو گھنٹے بعد ایڈی اپنے علاقے کے تھانے میں اپنی میز پر بیٹھا ہوئی سائڈ رپورٹ لکھ رہا تھا۔ اس دوران میں اس کا دھیان اس خانہ بدوش شخص کی طرف چلا گیا۔ وہ وین اس شخص کا انتظار کیوں کر رہی تھی؟ کیا اس شخص نے اس عورت کو پٹری پر دھکیلنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا تاکہ اس کی پاکٹ بک جھپٹ کر منتظر وین میں بیٹھ کر وہاں سے فرار ہو جائے؟

ایرون، ایڈی سے چند فٹ کے فاصلے پر اپنی میز پر بیٹھا انگلیوں سے طبلہ بجا رہا تھا۔ ساتھ ہی فون پر کسی سے بات بھی کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنی کرسی پر تن کر بیٹھ گیا اور بھویں اچکانے لگا۔ چند منٹ بعد وہ بولا۔ ''شکریہ ہارون!'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا اور اپنے پارٹنر ایڈی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ کیس لحظہ بہ لحظہ دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' ایڈی نے پوچھا۔

ایرون نے کافی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے اسے واپس میز پر رکھ دیا اور بولا۔ ''وہ میرا ایک دوست تھا جس سے میں فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کا تعلق نیو یارک کے ہومی سائڈ سے ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ گزشتہ ماہ مسز آرتھر اپنے لنچ کے وقفے کے دوران میں سینٹرل پارک سے گزر رہی تھی

حماقت

ڈاکٹر: مریض سے ''تم اب میرے پاس آئے ہو، اس سے پہلے پتا نہیں کتنے ڈاکٹروں کو دکھایا ہوگا۔''

مریض: ''جی نہیں، میں تو ایک کیمسٹ کے پاس گیا تھا۔''

ڈاکٹر: ''کھلی جہالت ہے۔ کیمسٹ ڈاکٹر تو نہیں ہوتا کہ علاج کر سکے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، خیر بتاؤ اس نے تمہیں کیا احمقانہ مشورہ دیا؟''

مریض: ''جی اس احمق نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا ہے۔''

[illegible]

کہ کسی نے اسے لوٹنے کی کوشش کی اور اس کی پیٹھ میں چاقو گھونپ دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ زندہ بچ گئی۔''

ایڈی بھی یہ سن کر اپنی نشست پر تن کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''اب تم مجھے یہ مت بتانا کہ وہ ایک خانہ بدوش شخص تھا جس نے اس پر حملہ کیا تھا۔''

''یقیناً نہیں۔'' ایرون نے جواب دیا۔ ''وہ ایک عورت تھی۔''

''عورت!''

''ہاں۔''

''کیا کسی نے اس کا حلیہ نوٹ کیا تھا؟''

ایرون نے کافی کا آخری گھونٹ پینے کے بعد کپ ردی کی ٹوکری میں اچھال دیا۔ ''نہیں، وہ عورت سیاہ پینٹ، سیاہ سوئٹر اور سیاہ عینک پہنے ہوئے تھی۔''

ایڈی نے... کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تو اس کی نگاہ آرچی گریفن پر پڑی جو انہی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ فارنسک یونٹ کا سربراہ تھا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں ایک کاغذ تھاما ہوا تھا۔

وہ ایڈی کے پاس آ کر رک گیا اور بولا۔ ''ویل، میرے پاس اچھی خبر بھی ہے اور بری خبر بھی۔ تم پہلے کون سی خبر سننا چاہو گے؟''

''اچھی خبر۔'' ایڈی نے کہا۔

''ہم نے سگریٹ لائٹر پر سے انگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے تھے۔ وہ انگلیوں کے نشانات بوب ہارپر نامی مجرم کے ہیں جو کہ بارہا جیل جا چکا ہے۔ اس کا پچھلا جرم لوٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مار اور جسمانی آزار پہنچاتا تھا۔"

''ویٹ از گریٹ!'' ایرون نے کہا۔ ''اور بُری خبر کیا ہے؟''

''اس کا آخری معلوم پتا چھ ماہ پرانا ہے اور وہ کچھ عرصے سے وہاں پر بھی موجود نہیں ہے۔ وہ ایک آوارہ گرد ہے جس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔ وہ اس وقت کہیں بھی ہوسکتا ہے۔ اسے تلاش کرنا خاصا مشکل ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے آرچی نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا کاغذ ان دونوں کے درمیان میز پر رکھ دیا۔

اس کاغذ پر بوب ہارپر کی تصویر تھی۔

ایڈی نے ایک گہرا سانس لیا اور ستائشی لہجے میں بولا۔ ''گریٹ!''

''میں تمہیں اور کچھ بتاؤں؟ یہ سب خبروں میں آیا ہے۔ مسز آرتھر نیویارک میں ایک آرٹ گیلری کی مالک ہے۔ وہ دولت مند ہے اور اس کا شوہر بھی رئیس ہے۔ وہ نیوز چینل پر مطالبہ کررہا ہے کہ تم لوگ اس کی بیوی کے قاتل کو تلاش کرنے کے لیے خانہ بدوشوں کی تمام پناہ گاہوں پر چھاپے مارو۔''

''کیا اسے بوب ہارپر کے بارے میں معلوم ہے؟'' ایرون نے پوچھا۔

''ابھی تو اسے علم نہیں ہے اور نہ ہی اس نے فون کر کے اس بارے میں پیش رفت دریافت کی ہے۔ وہ بس چیخ چلا رہا ہے کہ ہمیں خانہ بدوشوں کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔''

''گریٹ۔'' ایڈی نے کہا۔ ''تو پھر ہمیں یہی کچھ کرنا ہوگا؟''

''ویل، یہ کام کرنے سے قبل میں چندان جگہوں پر جانا چاہوں گا جو کاریں کرائے پر دیتے ہیں۔'' ایرون نے کہا۔

یہ سن کر ایڈی نے بھویں اچکاتے ہوئے ایرون کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیوں؟''

''بس اچانک سوجھی ہے۔''

''ایرون! وہ شخص کوئی سیاح نہیں ہے۔'' آرچی نے کہا۔ ''وہ ایک آوارہ گرد ہے۔ اس کا تو کوئی پتا بھی نہیں ہے۔''

ایرون نے بوب ہارپر کی تصویر اٹھائی۔ وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ وہ اس کا جائزہ لینے لگا۔

''آؤ، رومیروز چلتے ہیں۔ جب ہم ریلوے اسٹیشن کی طرف آرہے تھے تو میں نے وہ کار رینٹل دیکھی تھی۔ لگ بھگ پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہے۔''

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد ایڈی رومیروز نامی کار رینٹل سروس میں داخل ہوا تو وہاں ایک عورت کمپیوٹر ٹرمینل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایرون نے اسے اپنا بیج دکھایا پھر بوب ہارپر کی تصویر اس کے سامنے کردی اور بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

کاؤنٹر پر موجود عورت نے اپنے بالوں کو درست کرتے ہوئے نظریں کمپیوٹر اسکرین پر جما دیں اور ٹائپ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، مجھے یہ یاد ہے۔ اس شخص نے اپنا نام بوب ہارپر بتایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ اسے مسلسل ہیلن کے نام سے پکار رہا تھا۔ ان کے درمیان اس بات پر بحث ہورہی تھی کہ ضمانت کے طور پر کون اپنا شناختی کارڈ ہمارے پاس جمع کرائے گا۔ پھر آخر میں وہ رضامند ہو گیا۔ اس کا قیام چیسٹر ہوٹل میں ہے۔''

ایڈی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رینٹل کار کے دفتر سے باہر آگیا۔ ایرون نے باہر آنے کے بعد اپنا ریڈیو نکالا اور بولا۔ ''مجھے چیسٹر ہوٹل کا علم ہے۔ نہایت بدوضع سی جگہ ہے۔''

ایک گھنٹے بعد سراغ رساں ایڈی اور ایرون، چیسٹر ہوٹل میں داخل ہورہے تھے۔

ایڈی نے کاؤنٹر کلرک کو اپنا بیج دکھایا۔ اس نے غور سے ایڈی کی طرف دیکھا پھر ایرون کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''بوب ہارپر تیسرے فلور پر کمرا نمبر تین سو میں ہے۔''

ایڈی اور ایرون لفٹ کی جانب بڑھ گئے اور لفٹ میں سوار ہوکر تیسری منزل پر جا پہنچے۔

بوب ہارپر انہیں ہال وے میں دکھائی دے گیا۔ ایڈی اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ آنکھ کے اوپر زخم کا نشان، لمبے بازو جن پر کہنی سے کلائی تک ٹیٹو گدے ہوئے تھے۔

ایڈی نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ ''تم بوب ہارپر ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے کھرکھراتی آواز میں کہا۔

''میں سراغ رساں ایڈی ہوں۔ یہ سراغ رساں ایرون ہے۔ ہم تم سے چند منٹ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

بوب ہارپر نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور انہیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ایڈی، بوب ہارپر کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر چلا گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ تب بوب نے ایڈی کو اندر کی طرف دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک کافی ٹیبل سے جا ٹکرایا۔

پھر بوب پلٹا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مار اور جسمانی آزار پہنچاتا تھا۔"

''ویٹ از گریٹ!'' ایرون نے کہا۔ ''اور بُری خبر کیا ہے؟''

''اس کا آخری معلوم پتا چھ ماہ پرانا ہے اور وہ کچھ عرصے سے وہاں پر بھی موجود نہیں ہے۔ وہ ایک آوارہ گرد ہے جس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔ وہ اس وقت کہیں بھی ہوسکتا ہے۔ اسے تلاش کرنا خاصا مشکل ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے آرچی نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا کاغذ ان دونوں کے درمیان میز پر رکھ دیا۔

اس کاغذ پر بوب ہارپر کی تصویر تھی۔

ایڈی نے ایک گہرا سانس لیا اور ستائشی لہجے میں بولا۔ ''گریٹ!''

''میں تمہیں اور کچھ بتاؤں؟ یہ سب خبروں میں آیا ہے۔ مسز آرتھر نیویارک میں ایک آرٹ گیلری کی مالک ہے۔ وہ دولت مند ہے اور اس کا شوہر بھی رئیس ہے۔ وہ نیوز چینل پر مطالبہ کر رہا ہے کہ تم لوگ اس کی بیوی کے قاتل کو تلاش کرنے کے لیے خانہ بدوشوں کی تمام پناہ گاہوں پر چھاپے مارو۔''

''کیا اسے بوب ہارپر کے بارے میں معلوم ہے؟'' ایرون نے پوچھا۔

''ابھی تو اسے علم نہیں ہے اور نہ ہی اس نے فون کر کے اس بارے میں پیش رفت دریافت کی ہے۔ وہ بس چیخ چلا رہا ہے کہ ہمیں خانہ بدوشوں کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔''

''گریٹ۔'' ایڈی نے کہا۔ ''تو پھر ہمیں یہی کچھ کرنا ہوگا؟''

''ویل، یہ کام کرنے سے قبل میں چند ان جگہوں پر جانا چاہوں گا جو کاریں کرائے پر دیتے ہیں۔'' ایرون نے کہا۔

یہ سن کر ایڈی نے بھویں اچکاتے ہوئے ایرون کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیوں؟''

''بس اچانک سوجھی ہے۔''

''ایرون! وہ شخص کوئی سیاح نہیں ہے۔'' آرچی نے کہا۔ ''وہ ایک آوارہ گرد ہے۔ اس کا تو کوئی پتا بھی نہیں ہے۔''

ایرون نے بوب ہارپر کی تصویر اٹھالی۔ وہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ وہ اس کا جائزہ لینے لگا۔

''آؤ، روميروز چلتے ہیں۔ جب ہم ریلوے اسٹیشن کی طرف آرہے تھے تو میں نے وہ کار رینٹل دیکھی تھی۔ لگ بھگ پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہے۔''

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد ایڈی رومیروز نامی کار رینٹل سروس میں داخل ہوا تو وہاں ایک عورت کمپیوٹر ٹرمینل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایرون نے اسے اپنا بیج دکھایا پھر بوب ہارپر کی تصویر اس کے سامنے کردی اور بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

کاؤنٹر پر موجود عورت نے اپنے بالوں کو درست کرتے ہوئے نظریں کمپیوٹر اسکرین پر جما دیں اور ٹائپ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، مجھے یہ یاد ہے۔ اس شخص نے اپنا نام بوب ہارپر بتایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ اسے مسلسل ہیلن کے نام سے پکار رہا تھا۔ ان کے درمیان اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ ضمانت کے طور پر کون اپنا شناختی کارڈ ہمارے پاس جمع کرائے گا۔ پھر آخر میں وہ رضامند ہو گیا۔ اس کا قیام چیسٹر ہوٹل میں ہے۔''

ایڈی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رینٹل کار کے دفتر سے باہر آگیا۔ ایرون نے باہر آنے کے بعد اپنا ریڈیو نکالا اور بولا۔ ''مجھے چیسٹر ہوٹل کا علم ہے۔ نہایت بد وضع سی جگہ ہے۔''

ایک گھنٹے بعد سراغ رساں ایڈی اور ایرون، چیسٹر ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے۔

ایڈی نے کاؤنٹر کلرک کو اپنا بیج دکھایا۔ اس نے غور سے ایڈی کی طرف دیکھا پھر ایرون کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''بوب ہارپر تیسرے فلور پر کمرا نمبر تین سو میں ہے۔''

ایڈی اور ایرون لفٹ کی جانب بڑھ گئے اور لفٹ میں سوار ہو کر تیسری منزل پر جا پہنچے۔

بوب ہارپر انہیں ہال وے میں دکھائی دے گیا۔ ایڈی اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ آنکھ کے اوپر زخم کا نشان، لمبے بازو جن پر کہنی سے کلائی تک ٹیٹو گدے ہوئے تھے۔

ایڈی نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ ''تم بوب ہارپر ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے کھرکھراتی آواز میں کہا۔

''میں سراغ رساں ایڈی ہوں۔ یہ سراغ رساں ایرون ہے۔ ہم تم سے چند منٹ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

بوب ہارپر نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور انہیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ایڈی، بوب ہارپر کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر چلا گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ تب بوب نے ایڈی کو اندر کی طرف دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک کافی ٹیبل سے جا ٹکرایا۔

پھر بوب پلٹا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایرون کی جانب لپکا۔ ایرون نے ایک کھڑا ہاتھ باب کی گردن پر مارا تو اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ اس سے قبل کہ وہ نیچے گرتا، ایرون نے اس کو شانوں سے پکڑ لیا اور پہلے ایک مُکا اس کے پیٹ پر اور پھر ایک اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ باب الٹے قدموں لڑکھڑاتا ہوا الماری تک چلا گیا اور پھر نیچے ڈھے گیا۔

اس دوران میں ایڈی اپنی پتلون جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''سوری، تمہیں زحمت ہوئی۔'' اس نے ایرون سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ تمہیں اس کی توقع نہیں تھی۔ مجھے اس کی اس حرکت پر حیرت ہوئی ہے۔''

اتنے میں سنہری بالوں والی ایک دراز قامت دبلی پتلی عورت دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی جو اس کے اوپری جسم کو ڈھانپنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس کی سیاہ شارٹس سے اس کی دبلی پتلی گہبی ٹانگیں نمایاں دکھائی دے رہی تھیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ چیخ کر بولی۔ ''میں پولیس کو بلاتی ہوں۔''

''تم ہیلن ہو؟'' ایڈی نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''گڈ! ہم پولیس والے ہیں۔ تم سے مارگریٹ آرتھر کے قتل کے بارے میں چند سوالات پوچھنا چاہتے ہیں۔''

یہ سن کر ہیلن کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور اس نے بھاگنا چاہا۔ ایڈی اس کے پیچھے لپکا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے اسے فرش پر پھینک دیا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر لا کر ان میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

وہ چیخ رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو۔''

ایرون دروازے میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ ایڈی سے ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم ہمیشہ کمزور لوگوں پر ہی قابو کرتے ہو؟''

''اس لیے کہ تم مجھ سے زیادہ تگڑے ہو۔''

''اوہ!'' ایرون نے باب پر نگاہیں جماتے ہوئے اپنا سر ہلایا۔

''تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' باب نے ایرون کو گھورتے ہوئے کہا۔

''شٹ اَپ باب! اب اور کچھ مت کہنا۔'' ہیلن نے تیز لہجے میں کہا۔

''اسے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' ایرون نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے سب معلوم ہے کہ یہ کیا چکر ہے۔''

''کیا مجھے بتانے کی زحمت کرو گے؟''

ایرون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد ایرون اس دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو رہا تھا جو میریٹ ہوٹل کے بار کی جانب لے جاتا تھا۔ ایڈی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

بار میں پہنچ کر ایرون نے آرتھر کو دیکھ لیا۔ وہ بار میں بیٹھا کسی مشروب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب آرتھر کی نگاہ ان پر پڑی تو وہ زبردستی مسکرا دیا۔ ''ویل، ویل، ویل! شکاگو کے بہترین سراغ رساں یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''ہم نے سوچا شاید تم جاننا چاہو گے کہ کیا ہو رہا ہے؟'' ایرون نے کہا۔

آرتھر یہ سن کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے تابی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''او کے!'' ایرون نے کہا۔ ''تم اور تمہاری گرل فرینڈ ہیلن پیئرز نے تمہاری بیوی کو قتل کرنے کے لیے باب بار پر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ تم نے ایک ماہ قبل مارگریٹ کو سینٹرل پارک میں قتل کرنے کے لیے ہیلن کو معاوضے پر کام سونپا تھا لیکن وہ ناکام رہی تھی۔ اس نے اعتراف کر لیا ہے کہ تم اس کے عاشق ہو اور تم اپنی بیوی کے مرنے پر اس کی زندگی کی بیمہ پالیسی کی رقم حاصل کر لو گے جو پانچ لاکھ ڈالرز کے لگ بھگ ہے۔ اور بلاشبہ تم اس کی دولت کے وارث بھی بن جاؤ گے۔''

ایڈی نے آگے بڑھ کر آرتھر کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ''باب کو یہ راز اگلنے میں صرف پندرہ منٹ لگے کہ تم نے اسے ایک خانہ بدوش کا بہروپ اختیار کرنے اور تمہاری بیوی کو پلیٹ فارم سے نیچے پٹری پر دھکیلنے کے لیے بیس ہزار ڈالرز دیے تھے۔ یہ تم نے بہت بری حرکت کی تھی، آرتھر!''

''تمہیں مجھ پر شک کیونکر ہوا؟'' آرتھر نے پوچھا۔

''تم سے جب میری ملاقات ہوئی تھی، اسی لمحے مجھے تم پر شک ہو گیا تھا۔'' ایرون نے جواب دیا۔ ''تمہارا رویہ اس شخص کی طرح نہیں تھا جسے اپنی بیوی سے محبت ہو۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو سب کچھ چھوڑ کر اس خانہ بدوش کے پیچھے بھاگتا جو میری بیوی کا قاتل تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ تمہیں اپنی بیوی سے کوئی محبت نہیں تھی!''

وفا پرست

رضوانہ منظر

وہ اپنے کام کو نہایت اطمینان اور ایمانداری سے سرانجام دینے کا عادی تھا ... اسے زندگی میں جو بھی ہدف ملا، اس نے بناکسی شش و پنج کے اسے ... کامیابی سے تکمیل تک پہنچادیا... لیکن اس بار ایک انوکھا کیس اس کا منتظر تھا...

ان بیتے ہوئے لمحوں کی یادیں جو فیصلہ بدلنے پر قادر تھیں

یہ قتل کے لیے نہایت اطمینان بخش رات تھی۔ میرا خیال ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس طرح کی بات دل میں لا سکتے ہیں لیکن تب ایسے لوگ بھی کم تعداد میں ہوں گے جن کا تعلق میرے پیشے سے ہو... اور میں نے اس کام کو کبھی پیشہ نہیں سمجھا... اس لیے کہ ہر جاب میرے لیے ایک دل فریب چیلنج کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

کون؟ کس طرح؟ کہاں؟ اور کب؟

اور میں اس کے نتیجے سے بے حد لطف اندوز ہوتا ہوں جو کہ رقم کی صورت... میرے ہاتھ آتا ہے... ڈھیر ساری رقم!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ منفرد جاب میرے لیے خاص طور پر دلچسپی کا باعث تھی۔ اس لیے کہ ایک چھوٹے شہر میں یہ میری پہلی جاب تھی۔ میں عام طور پر بڑے شہروں میں کام کرتا ہوں جہاں میں اپنی کارکردگی کے بعد بآسانی غائب ہوجاتا ہوں۔

کون؟ وہ کسی کی بیوی تھی۔

کس طرح؟ یہ یقیناً مجھ پر منحصر تھا۔

کہاں؟ جگہ اس عورت کے شوہر نے بتادی تھی جو اس جگہ کے علاوہ کہیں بھی موجود ہوتا۔ موقع واردات سے عدم موجودگی۔

کب؟ یہ بات بھی ہمارے معاہدے میں بیان کردی گئی تھی (جو بلاشبہ زبانی معاہدہ تھا تحریری نہیں۔ اس لیے کہ ہم اس قسم کا کوئی ثبوت پیچھے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ کیا یہ احمق پن نہیں ہوتا؟)

ہم نے ملاقات کے لیے کلف سائڈ مال کے فوڈ کورٹ کا انتخاب کیا جہاں موجود دوسرے لوگوں کی مکمل توجہ اپنی ڈنر پلیٹوں پر مرکوز تھی اور ہماری طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا۔

''اس جمعے کو۔'' اس عورت کے شوہر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان!''

اور یہ بدھ کی شب تھی۔ میرے پاس منصوبہ بندی کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''اور کیا تم اس جگہ سے خاصی دور محفوظ مقام پر ہوگے؟''

''لاس ویگاس اور شکاگو کے درمیان ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہوا میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور وہ کہاں ہوگی؟'' میرا اشارہ اس کی بیوی کی جانب تھا۔

''وہ آٹھ بجے کے قریب فٹنس سینٹر سے چل پڑے گی۔ پہاڑی سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے وہ گھر پہنچ جائے گی۔ اس کا یہ معمول کبھی تبدیل نہیں ہوتا!''

''یہ جاننے کے باوجود بھی کہ تم گھر پر نہیں ہوگے؟''

''اسے اس بات کا علم نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ میں سات بجے تک گھر لوٹ آؤں گا۔ اور یہ کہ میں کھانا اور وائن لے کر آؤں۔ اس لیے اسے ڈنر بنانے کی فکر بھی نہیں ہوگی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ میرا نصف کام پہلے ہی کرچکا تھا۔ اب مجھے صرف اس کی بیوی کا کام تمام کرنا تھا اور پھر اس چھوٹے شہر سے نکل جانا تھا۔

''کیا تمہارے پاس میرے لیے اس کی کوئی تصویر ہے تاکہ میں اسے شناخت کرنے میں دھوکا نہ کھا سکوں؟'' میں نے کہا۔ ''کہیں میں کسی اور کی بیوی کو ٹھکانے نہ لگا دوں!''

''یقیناً ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ ساتھ ہی جیب سے ایک رنگین تصویر نکال کر میری جانب بڑھا دی۔

میں نے تصویر لے لی اور تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی میرے دل کی دھڑکن رک سی گئی۔

میں اس عورت کو جانتا تھا۔ نہ صرف جانتا تھا بلکہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

وہ میری زندگی کا پہلا پیار تھی۔

ہم برسوں سے ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں تھے لیکن اس کے باوجود میں اسے کسی بھی جگہ پہچان سکتا تھا۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں، ستواں ناک، وہی بکھری ہوئی سنہری زلفیں، میرے جوش اور ولولے کا وہی انداز تھا جو ایک ٹین ایجر کا ہوسکتا ہے۔

اور اس وقت بھی مجھے وہی سنسنی سی محسوس ہوئی تھی۔

میرا حلق خشک ہورہا تھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی ہے؟'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے اپنے حلق کو تر کیا۔ ''میرا مطلب ہے یہ تمہاری بیوی ہی ہے نا؟''

میری اس بات سے اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آگئیں۔ ''کیا تمہارے خیال سے میں اپنی بیوی کو نہیں پہچانتا ہوں؟''

''لیکن... لیکن...'' میری زبان لڑکھڑا گئی۔

''بات کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں فوری طور پر جواب نہ دے سکا۔

''کیا پچاس ہزار کی رقم کافی نہیں ہے؟'' اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''رقم یہاں موجود ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' میں نے ایک بار پھر تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''رقم کافی ہے۔''

کسی اجنبی کو ٹھکانے لگانا ایک الگ بات تھی۔ لیکن وہ لڑکی جس نے برسوں پہلے اپنا تن من دھن مجھ پر لٹا دیا تھا اسے ٹھکانے لگانا دوسری بات تھی۔

پچاس ہزار ڈالرز اور دن کے کام کے عوض کیا یہ ایک اچھا معاوضہ نہیں تھا؟ آپ کیا کہتے ہیں؟ یہ اس رقم سے زیادہ تھی جو میں عام طور پر طلب کیا کرتا ہوں۔ یہ رقم اس لحاظ سے بھی اچھی خاصی تھی کہ میں کچھ عرصے کے لیے ایک نئے نام کے ساتھ کسی نئی جگہ سیٹ ہوسکتا تھا۔

اور شاید کوئی نیا کاروبار بھی شروع کیا جاسکتا ہے، میں نے سوچا۔

اس نے نوٹوں کی گڈی میرے حوالے کردی اور ہاتھ ملا کر رخصت ہونے کے لیے پلٹ گیا۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھنے لگا۔ اس کے شانے تنے ہوئے تھے۔ اس کے چلنے کا انداز ایک ایسے امیر آدمی کی طرح تھا جسے دنیا میں کسی چیز کی پروا نہ ہو۔ مجھے تو یہ تک محسوس ہوا جیسے وہ بے حد مسرور ہو اور کوئی دھن گنگنا رہا ہو۔

ادھر میرے اپنے شانے لٹک سے گئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے پوری دنیا کا بوجھ میرے کندھوں پر آگیا ہو۔ جینی کا حسین چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے ابھر رہا تھا۔

سویٹ جینی میسن! لیکن اب وہ جینی میسن نہیں ہے، میں نے سوچا۔ اب وہ جینی گلیڈن ہے۔ امیر کبیر جینی گلیڈن۔ اسے ورثے میں اپنے باپ سے ڈھیروں دولت ملی تھی۔ اس کے باپ کا کوئی ٹیکنیکل قسم کا کاروبار تھا۔

لیکن اس کے شوہر کی نہ تو جینی کے باپ کے کاروبار میں کوئی شراکت رہی تھی اور نہ ہی جینی کو ورثے میں ملنے والی دولت میں۔ البتہ اب وہ پوری کی پوری دولت خود ہتھیانا چاہتا تھا۔

اور دولت کے اس حصول کے لیے اس نے ایک بھرپور معاوضے کے بدلے میری خدمات حاصل کی تھیں۔

''کچھ ایسا کرنا کہ جیسے لوٹ مار کی واردات کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوئی ہو۔'' اس شخص نے مجھے مشورہ دیا تھا۔ ''یا پھر اس کی کار گھر واپسی پر پہاڑی سڑک پر سے نیچے گر جائے۔ کچھ اسی قسم کا کام ہونا چاہیے۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ تم یہ کام کس طریقے سے سرانجام دوگے۔ بس اسے ٹھکانے لگا دو۔'' اس کا لہجہ بے حد سرد و سفاک تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اسے یقین دلا دیا تھا۔

لیکن... جینی؟

میں اب خود کو بیمار محسوس کررہا تھا۔ واقعی حقیقت میں میری طبیعت خراب سی ہورہی تھی۔ لیکن واپس اپنے موٹل جانے سے قبل میں نے اس چھوٹے سے شہر کا ایک چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہاں اپنے مختصر قیام کے لیے ایک ایسے چھوٹے سے سستے موٹل کا انتخاب کیا تھا جہاں پر مجھے یقین تھا کہ استقبالیہ کی ڈیسک پر بیٹھا ہوا شخص لوگوں پر زیادہ توجہ دینے کا عادی نہیں لگ رہا۔

میں نے سوچا کہ شہر کے ساتھ ساتھ وہ پہاڑی سڑک بھی دیکھ لی جائے جس کا ذکر جینی کے شوہر نے کیا تھا۔ اگر میں اس طریقۂ کار یعنی جینی کی کار کے پہاڑی سڑک پر سے نیچے گر جانے پر عمل کروں تو شاید مجھے یہ اتنا برا اور تکلیف دہ محسوس نہ ہو۔

اس طریقۂ کار میں اسے درحقیقت ہاتھ لگانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی؟ اور اس طرح وہ میرا چہرہ بھی کبھی دیکھ نہیں پائے گی؟

پھر میرا ذہن ان گزشتہ کاموں کی طرف چلا گیا جو میں اب تک سرانجام دے چکا تھا۔ گزشتہ چند برسوں میں، میں ایک درجن سے زیادہ افراد کو ٹھکانے لگا چکا تھا لیکن کیا کبھی میں نے اپنے کسی بھی ہدف کے بارے میں اس طرح سوچا تھا؟ یہ کہ وہ کیا تھا، کیا تھی؟ کیسا تھا، کیسی تھی؟ یا اس نے کیا، کیا تھا یا مجھے اس کی پروا رہی ہو؟ اس طرح کی کیفیت تو کبھی مجھ پر طاری نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور ان چہروں کو، ان جگہوں کو اپنے ذہن کے پردے پر لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن کچھ بھی نمایاں نہیں ہوا۔

وہ تمام ہدف میرے لیے ایک جاب کی حیثیت رکھتے تھے جو مجھے سرانجام دینا تھے، میں نے سرانجام دے دیے اور وہ تاریخ کا ایک حصہ بن گئے۔

میرا ایک اپنا طریقۂ کار تھا۔ رقم وصول کرو، کام سرانجام دو اور آگے بڑھ جاؤ۔

لیکن اس مرتبہ معاملہ قطعی مختلف تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں یہ سب کچھ کس طرح کروں؟

میں نے بقیہ سہ پہر دیر تک مقامی لائبریری میں گزاری۔ میں گزشتہ سال کی سوشل تقریبات کی مائیکروفلمیں چیک کرتا رہا۔ جینی ہر اخبار کی زینت تھی۔ وہ ہر سوشل تقریب میں موجود تھی چاہے وہ کسی خیراتی ادارے کا فنکشن تھا یا سوپ کچن کی تقریب، ڈے کیئر کا موقع تھا یا خون کا عطیہ دینے کی مہم۔

ہر تصویر میں زندگی سے اس کے پیار کا اظہار اس کے گرد روشنی کے ہالے کے مانند دکھائی دے رہا تھا جبکہ دوسری جانب اس کا شوہر چند ایک موقعوں پر اس کا ہم رکاب نظر آیا تھا۔ پریس میں اس کے کسی کارنامے کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔ ماسوائے جینی اور اس کی شادی کے موقع کے حوالے سے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لحاظ سے وہ کوئی قابلِ ذکر شخصیت نہیں تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ جس شخص نے میری خدمات مستعار لی تھیں، وہ سونے کے ایک کان کن کی طرح تھا جو نہ صرف ایک حسین فرد بلکہ ایک قابلِ احترام اور نیک بخت شخصیت کو اس صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس تصور سے میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا اور میں کڑھتا ہوا اپنے موٹل واپس آ گیا۔

میرا خیال تھا کہ شاید کچھ دیر سونے کے دوران میں اس کا کوئی حل میرے ذہن میں آ جائے۔ میں اس بارے میں سن چکا تھا کہ تحت الشعور بھی بعض اوقات مسائل کا حل نکال دیتا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اگلے روز صبح میں اپنی کرائے کی سیڈان کار میں شہر کے مشرقی علاقے کی سمت روانہ ہو گیا۔ یہ سیڈان کار کوئی ایسا اسپیشل ماڈل نہیں تھی کہ کوئی اسے یاد رکھتا یا مجھ پر کسی کو خاص توجہ دینے کا سبب بنتی۔ وہ پہاڑی سڑک شہر کے مشرقی حصے میں تھی جو اوپر تک چلی گئی تھی۔ سڑک کے نیچے گہرائی میں ایک دریا بہہ رہا تھا۔

اگر سڑک پر سے کسی کار کو نیچے دھکیلا جاتا تو وہ چند چپٹی چٹانوں پر سے لڑھکتی، قلابازیاں کھاتی ہوئی نیچے پانی میں جا گرتی۔ دریا کے پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ وہ کار کو اس مقام سے بہا کر خاصا دور لے جاتا، جس مقام سے کار سڑک پر سے نیچے دریا میں گرتی۔

لیکن چٹان کا جائزہ لینے سے ایک پرابلم سامنے آئی۔ وہ یہ کہ جہاں چٹان سے کار کو نیچے دریا میں گرایا جا سکتا تھا وہاں ایک عمودی چٹان ابھری ہوئی تھی جسے ایک قدرتی بچاؤ کی دیوار کہا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ تقریباً تین فٹ اونچی سیمنٹ کی بنی ہوئی ایک حفاظتی دیوار بھی موجود تھی۔

کوئی بھی کار اس دیوار کو توڑ کر نیچے نہیں جا سکتی تھی۔

میں واپس شہر کی جانب چل پڑا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے امکانات جنم لے رہے تھے جنہیں باری باری سوچنے کے بعد رد کرتا جا رہا تھا۔ میں اپنے گرد و پیش سے بے خبر گاڑی چلانے میں مگن تھا۔

ایک مقام پر جب سگنل پر بتی سرخ ہونے کی بنا پر میں نے اپنی کار روکی تو میرے برابر میں ایک کار آ کر رکی اور ہارن بجانے لگی۔ میں نے سگنل کی طرف دیکھا۔ سگنل کی لائٹ ابھی بھی سرخ تھی۔ کار کے احتجاج کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے سوچا کہ اس کار کے ڈرائیور کو گھور کر اپنے غصے کا اظہار کروں۔ اتنے میں کار کی میری جانب کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کھسکا اور ایک عورت نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ لہرایا۔ میرا غصہ حیرت میں بدل گیا۔

وہ جینی گلیڈن تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، میں نے سوچا۔ پہلے میرے ذہن میں خیال آیا کہ کار کو ریس دے کر وہاں سے غائب ہو جاؤں۔ یہ بھی سوچا کہ میں ایسا بن جاؤں جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔

لیکن پھر میرے ذہن میں اس سے ملاپ اور اس کے ساتھ گزارے لمحات کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں نے بھی اپنی کار کی کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار دیا۔

"جینی!" میں نے بلند آواز سے کہا۔ "کیا سرپرائز ہے۔"

"کار آگے کنارے پر روک لینا۔" جینی نے کہا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔

بعد میں، بہت بعد میں ایک غیر معروف سے بار اینڈ گرل میں مشروبات اور ڈنر کے دوران جینی نے جس پُرتپاک رویے کا اظہار کیا وہ میرے لیے ناقابلِ فراموش تھا۔ ہم ایک عرصے سے ملاقات نہ ہونے کی پچھلی ساری کسر پوری کر رہے تھے۔ ہم پچھلی یادوں کو تازہ کر کے خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پچھلا زمانہ لوٹ آیا ہو۔

جینی سے میں نے یہ جھوٹ گھڑا کہ میں شکاگو کی ایک ایڈورٹائزنگ فرم سے وابستہ ہوں اور کلف سائڈ میں میری موجودگی کا سبب یہ ہے کہ میں شمال کی جانب جاتے ہوئے یہاں سے گزر رہا تھا جہاں مجھے چند تعطیلات منانے والی پراپرٹی کو چیک کرنا تھا۔

جینی نے اپنے بارے میں ایمانداری سے سب کچھ بتا دیا۔ ان میں سے بیشتر حقائق کا مجھے پہلے سے علم تھا۔ البتہ اپنے شوہر کے متعلق بات کرنے سے وہ ہچکچا رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔

"کیا تم شادی شدہ ہو، ٹام؟" جینی نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وجہ؟"

"وہ لڑکی کبھی نہیں ملی جو میرے دل میں تمہاری یادوں کی استعداد کی حامل ہو۔" میں نے جواب دیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ تعجب خیز احساس بھی ہوا کہ شاید سچ بھی یہی ہے۔ میں نے اپنا وائن کا گلاس بلند کر دیا۔

وہ شرما گئی۔

مجھے یاد آ گیا کہ اس کے چہرے کا رنگ کتنی آسانی سے سرخ ہو جاتا تھا۔ "شریر کہیں کے۔" اس نے کہا اور بے ساختہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "تم سے مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے، تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیا تم رک نہیں سکتے کہ کل ڈنر ہمارے ساتھ کرو؟ میرا شوہر بھی گھر لوٹ آئے گا اور میں جانتی ہوں کہ تم سے مل کر اسے خوشی ہوگی۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

"میں رک نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "ٹوماک میں میری ایک اپائنٹ منٹ ہے۔"

"اوہ!" اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ اسے یہ سن کر مایوسی ہوئی ہے۔

"لیکن شہر چھوڑنے سے پہلے میں لنچ کر سکتا ہوں۔" میں نے پیشکش کی۔ "اگر تمہارے پاس وقت ہو....."

وہ مسکرا دی۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں وہی مخصوص چمک ابھر آئی۔ "میں دل و جان سے حاضر ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

پھر ہم رخصت ہو گئے۔ میں نے اس کا الوداعی بوسہ نہیں لیا۔ لیکن میں لینا چاہتا تھا، یہ میری خواہش تھی۔

میں اگلے دن تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک بار پھر جینی کی رفاقت چاہتا تھا۔ میں خود کو ہارا ہوا اور شکست خوردہ تصور کر رہا تھا۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

مجھے نیند آ رہی تھی۔ مجھے جو کام سرانجام دینا، اس کے متعلق جب میں سوچتا تو میرے پیٹ میں مروڑ سا ہونے لگتا۔ میں اس کام کا معاوضہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا اور میں نے آج تک کبھی کسی طے شدہ معاہدے سے انحراف نہیں کیا تھا۔

اور اگر میں انحراف کر لیتا ہوں تو کیا ہوگا؟

اس سے جینی کی زندگی تو نہیں بچ سکے گی۔ اس کا احمق شوہر اسے ٹھکانے لگانے کے لیے کسی اور پیشہ ور قاتل کو تلاش کر لے گا۔ دنیا کا کاروبار تو چلتا رہے گا... لیکن جینی کی سحر انگیز شخصیت کے بغیر، اس کے عمدہ کاموں کے بغیر، اس کی دلفریب مسکراہٹ کے بغیر۔

جب مجھے نیند آئی تو اس وقت صبح کی پو پھٹ رہی تھی لیکن میں بہت دیر تک نہیں سو سکا۔ البتہ یہ درست نکلا کہ آپ کا تحت الشعور آپ کے بہت سے مسائل کو حل کر دیتا ہے۔

جب میں بیدار ہوا تو مجھے پتا تھا کہ مجھے حقیقت میں کیا کرنا ہے۔

جینی اور میں نے کلف سائڈ کی سب سے اونچی عمارت کے ٹاپ پر بنے ہوئے ریسٹورنٹ میں ایک شاندار سا لنچ کیا۔ پانچ منزل کی بلندی پر سے نیچے بہتے ہوئے دریا کا نظارہ بے حد دلکش تھا۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو ریسٹورنٹ اس وقت تقریباً خالی ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ مجھے ٹوماک میں اپنی فرضی اپائنٹ منٹ کے لیے روانہ ہونا ہے اور اس شہر سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

"تم واپس آؤ گے نا، ٹام؟" جینی نے اپنی کار میں سوار ہونے سے قبل التجائی لہجے میں کہا۔ "میں واقعی تم سے دوبارہ ملنا چاہتی ہوں۔"

"اوہ، ہاں۔ میں آؤں گا۔ ضرور آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تمہارے شوہر سے بھی ملنا ہے۔"

☆☆☆

اور میں نے اس کے شوہر سے ملاقات کر لی۔

ہماری یہ مڈبھیڑ...... ائرپورٹ کی اس راہداری میں ہوئی جہاں وہ گھر جانے کے لیے تیز قدموں سے خارجی راستے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی ممکنہ موت کے تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ البتہ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

میں اس کی مخالف سمت سے بڑھ رہا تھا۔ جب ہمارا آمنا سامنا ہوا تو میری آستین میں پوشیدہ نہایت باریک پھل کا چھوٹا خنجر یعنی اسٹیلیٹو اپنا کام دکھا گیا۔

اس کی سفید قمیص پر دل کے مقام پر خون کا ہلکا سا دھبا تک نمودار نہیں ہوا۔ جب وہ ماربل کے فرش پر کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا تو میں اس وقت تک ہجوم میں کئی گز کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔

کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا، یہ قتل کے لیے ایک نہایت اطمینان بخش رات تھی۔

اب مجھے کچھ عرصے انتظار کرنا ہوگا، پھر میں کلف سائڈ واپس جاؤں گا۔

جینی کے پاس... اپنی جینی کے پاس جس سے میں نے واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واجب القتل

تنویر ریاض

آسائشات... زندگی کی دلفریبی ورنگینی کو جِلا بخشتی ہیں... وہیں کئی چیزوں کی دستیابی زندگی کو مشکل بنادیتی ہے... انسانوں کا معاملہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہوتا ہے... کچھ احباب زندگی کے لیے نہایت ضروری اور باعثِ اطمینان وسکون ہوتے ہیں... لیکن کچھ لوگ اس کے برعکس ثابت ہوتے ہیں... اوران کا زندگی سے چلے جانا ہی بہتر ہوتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کے گرد گھومتی کہانی... جس کی موجودگی ہر ایک کے لیے باعثِ آزار تھی...

واردات قتل کا قضیہ جو ایک معمے کی صورت اختیار کر چکا تھا

کئی دنوں سے میری ڈاڑھ میں شدید تکلیف تھی لیکن مصروفیت کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس جانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ایک روز جب درد ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں نے ڈاکٹر جیری ہیرس کا نمبر ملایا اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ عموماً لنچ کے بعد آدھا گھنٹا آرام کیا کرتا تھا۔ اس نے ازراہِ مہربانی وہ وقت مجھے دے دیا اور فوراً کلینک پہنچنے کی تاکید کی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اس سے پہلے کہ کسی اور مسئلے میں الجھ جاتا، ڈاکٹر کے کلینک کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے میری ڈاڑھ کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ بائیں جانب ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جسے فوری طور پر بھرنا ہو گا۔ پھر اس نے میری مرضی جانے بغیر ہی اپنی کارروائی شروع کر دی۔ جب کیپٹن کی فون کال موصول ہوئی تو اس وقت میرا منہ مختلف قسم کی پٹیوں اور اوزاروں سے جکڑا ہوا تھا اور میں ''اوں آں'' کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیپٹن یقیناً اس صورت حال سے لطف اندوز نہیں ہوا ہو گا اسی لیے اس نے قدرے ترش لہجے میں مجھے ایک قتل کی اطلاع دی اور پتا سمجھاتے ہوئے تاکید کی کہ جتنی جلد ممکن ہو، میں جائے وقوعہ پر پہنچ جاؤں۔ میں نے فاصلے کا تعین کرتے ہوئے اندازہ لگایا کہ وہاں تک پہنچنے میں کم از کم آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔

اگلے دس منٹ تک میں بے چینی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں ڈاکٹر نے میرے منہ سے پٹیاں اور اوزار نکال دیے۔ پھر اس نے دوا لگا دی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی چلاتے ہوئے اس پارکنگ گیراج تک پہنچ گیا جو کینڈل اسکوائر کے قریب واقع تھا۔ میرا ساتھی جوئے سالومن وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جائے وقوعہ کا ماہر اور اس کے دو معاون بھی وہاں پہنچ چکے تھے اور اپنے کام میں مصروف تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس جگہ کی تصویریں لی جا رہی تھیں۔ جوئے اور دونوں معاونین ایک پرانے ماڈل کی ہنڈا اکورڈ کار کے قریب کھڑے تھے۔ جوئے لمبا چوڑا جسیم شخص ہے۔ کسی زمانے میں وہ باکسنگ کرتا تھا۔ اس نے کئی مقابلے جیتے اور اسی لیے اپنے علاقے ساؤتھ بوسٹن میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ اسے پولیس ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے ہوئے چودہ سال ہو چکے تھے جبکہ میں پچیس سال سے یہ ملازمت کر رہا تھا۔ اب میرا ارادہ تھا کہ چار سال بعد ریٹائر ہو کر کوئی بار کھول لوں گا۔

میں نے ان کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ کار کے پاس ہی مقتول کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اس شخص کی عمر تیس کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ سانولی رنگت کا کوئی ہندوستانی لگ رہا تھا۔ اس نے جینز، شرٹ اور گرد آلود ٹینس کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کی دائیں آنکھ کے اوپر سر کے سامنے والے حصے میں ایک گڑھا سا پڑ گیا تھا جس میں سے خون کے قطرے بہہ رہے تھے۔ میں جوئے سے واردات کی تفصیلات پوچھنا چاہ

تھا لیکن ڈاڑھ سُن ہونے کی وجہ سے میں ٹھیک سے نہیں بول پا رہا تھا۔ جوئے نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے آئس ہاکی کا میچ دیکھنے کا پروگرام بنا رہا تھا اور اس نے آج رات کے ٹکٹ بھی خرید رکھے تھے لیکن اس قتل کے بعد اس کا امکان بہت کم تھا کہ وہ ان ٹکٹوں کو استعمال کر پائے گا۔

''کیا تم نے آج صبح سے ہی پینا شروع کر دی؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں دندان ساز کے پاس گیا ہوا تھا اور گزشتہ دو ہفتوں سے ڈاڑھ کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ اس وقت بھی میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس کے طنز کا جواب دے سکوں لہٰذا میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

وہ میری سرد مہری کو بھانپ گیا۔ اس لیے مجھے خوش کرنے کے لیے بولا۔ ''اس شخص کو مرنے کے لیے آج کا دن ہی ملا تھا۔ خیر یہ بتاؤ، ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

''اس نے اپنا کام کر دیا ہے اور اب میں کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے بمشکل تمام یہ الفاظ ادا کیے۔ ''تمہارے پاس کیا معلومات ہیں؟''

جوئے نے لاش کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا اور بولا۔ ''مقتول کا نام سنجے پٹیل ہے اور یہ گاڑی اسی کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اس کے پاس سے جو کارڈ برآمد ہوا ہے، اس کے مطابق یہ ایک سوفٹ ویئر کمپنی میں ملازم ہے جو یہاں سے دو بلاک کے فاصلے پر ہے۔ لاش کا طبی معائنہ ہونے سے پہلے کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن بظاہر یہی لگتا ہے کہ کسی وزنی اور ٹھوس چیز سے اس کے سر پر ضرب لگائی گئی ہے۔ سر کی چوٹ کے علاوہ اس کے جسم پر کوئی دوسرا نشان یا علامت نظر نہیں آ رہی۔''

''تمہارے خیال میں ایک ہی ضرب لگائی گئی ہو گی؟''

''میرا اندازہ یہی ہے۔''

میں نے ایک بار پھر لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی کھوپڑی کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ اگر ایک ہی ضرب لگائی گئی تھی تو یہ کام کسی مضبوط جسامت رکھنے والے شخص کا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے جوئے سے پوچھا۔ ''کیا میڈیکل ایگزامنر آ رہا ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''اسے آدھ گھنٹا پہلے فون کر دیا گیا تھا۔ اب تک تو اسے یہاں آ جانا چاہیے تھا۔''

میں نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم ان ٹکٹوں کو بھول جاؤ۔ شاید آج رات ان کے استعمال کا موقع نہ ملے۔''

جوئے نے گھور کر مجھے دیکھا پھر اس نے لوہے کی ایک ... کی جانب اشارہ کیا جسے پارکنگ کی ایک دیوار کی ...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں محفوظ کرلیا گیا تھا۔ یہ سلاخ گاڑی کا ٹائر بدلنے والے جیک کی تھی۔ جوئے نے اپنے سر کے برائے نام بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"لگتا یہی ہے کہ یہ سلاخ اسی گاڑی سے نکالی گئی ہے ورنہ اسے گاڑی کی ڈکی میں اپنی جگہ پر ہونا چاہیے تھا۔ اسے ہم ڈاکا زنی کی واردات بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ مقتول کے بٹوے میں نقدی اور کریڈٹ کارڈ اب بھی موجود ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کی جیب سے کوئی چیز نکالی گئی ہے۔"

میں نے ایک بار پھر کار کو غور سے دیکھا۔ اس کے دروازے، شیشے اور ڈکی پوری طرح بند تھی۔ شاید کسی نے باریک تار سے سامنے کا دروازہ کھولا ہو اور پھر ڈیش بورڈ پر لگا ہوا بٹن دبا کر ڈکی کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے وہاں موجود ایک معاون سے پوچھا کہ کیا انہیں کار پر سے کسی کی انگلیوں کے نشان ملے ہیں تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے جوئے سے پوچھا کہ کیا وہ ڈکی کھول سکتا ہے۔ اس نے تھیلی میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ریموٹ بٹن دباتے ہوئے ڈکی کھول دی۔ میں نے اس کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ ہر چیز سلیقے اور ترتیب سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ لوہے کی سلاخ کو فالتو ٹائر کے نیچے سے نکالنے اور اس کے بعد سب چیزوں کو ترتیب سے رکھنے میں کچھ وقت تو لگا ہوگا۔ یقیناً قاتل کوئی ایسا شخص تھا جسے پنیل کے معمولات کا علم ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ پنیل کی واپسی کس وقت ہوگی۔ اگر کوئی ناتجربہ کار شخص یہ قتل کرتا تو وہ ڈکی کے سامان کو بے ترتیب حالت میں ہی چھوڑ دیتا اور مقتول کے سر پر اس وقت تک ضربیں لگاتا رہتا جب تک کہ اسے اس کی موت کا یقین نہ ہو جاتا۔ یہ کام کسی ٹھنڈے مزاج شخص کا تھا جو جانتا تھا کہ وہ کیا کررہا ہے۔

میں نے ڈکی بند کردی اور یہ سوچ کر میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے کہ جائے وقوعہ سے کوئی ایسا نشان نہیں ملا جس کے ذریعے ہم قاتل تک پہنچ سکیں۔ شہر میں قتل کی واردات ہونا کوئی اچھی بات نہیں تھی لیکن اس کا حل نہ ہونا اس سے بھی برا تھا۔ اگر قاتل کوئی پیشہ ور تھا تو شاید اسے پکڑنا اتنا آسان نہ ہوتا جب تک قسمت ساتھ نہ دیتی۔

"لاش کس نے دریافت کی تھی؟" میں نے جوئے سے پوچھا۔

"گشت کرنے والے کانسٹیبل ونسٹن نے۔" جوئے نے بیزاری سے جواب دیا۔ "وہ گزشتہ ہفتے کی ہدایات کے مطابق معمول کے گشت پر تھا۔ اسی کی نظر اس لاش پر پڑی۔"

گزشتہ چند ہفتوں سے سینٹرل اسکوائر اور اس سے ملحقہ علاقوں کے گیراج سے کار چوری کی اطلاعات ملنے کے بعد گشت کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا تاکہ ایسی وارداتوں کی روک تھام کی جائے اگر ہم ان کے بجائے علاقے میں سیکیورٹی کیمرے نصب کردیتے تو اس قتل کا معما حل ہونے کا امکان کئی گنا بڑھ جاتا۔

پیٹرول مین نشن کوئی سو فٹ کے فاصلے پر پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلا کر پوچھا کہ کیا اس نے لاش کے پاس سے کسی کو فرار ہوتے دیکھا ہے؟ اس کا جواب نفی میں تھا۔ اب تک کوئی ایسی شہادت نہیں ملی تھی جس کی میں توقع کررہا تھا۔ وہ صرف اتنا بتا سکا کہ اس نے تین بج کر اٹھارہ منٹ پر یہ لاش دیکھی تھی۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟" اس نے اپنے سر کے چھدرے بالوں پر دوبارہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم میڈیکل ایگزامنر کے آنے کا انتظار کرو گے؟"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم اس سے بعد میں بھی مل سکتے ہیں۔ پہلے چل کر پنیل کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں سے بات کرتے ہیں۔"

پنیل کے باس نے پہلے تو اس طرح کا ردعمل ظاہر کیا جیسے ہم اس کے ساتھ زبردستی کررہے ہیں لیکن جب اسے بتایا گیا کہ یہ ایک قتل کا معاملہ ہے اور اسے مذاق نہ سمجھا جائے تو اس کا چہرہ سفید ہوگیا۔ مجھے لگا کہ کہیں خوف کے مارے اس کی حرکت قلب ہی بند نہ ہو جائے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور بمشکل یہ بتا سکا کہ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ پنیل کس وقت اور کیوں دفتر سے چلا گیا تھا؟

"ویسے پنیل بہت خاموش طبیعت تھا اور کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔" اس نے بتایا۔

"اس کا کسی ساتھی سے کوئی جھگڑا تو نہیں تھا؟" جوئے نے پوچھا۔

اس نے اپنا سر ہلایا پھر رک کر کچھ سوچنے لگا پھر اس نے بتایا کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ "جو کچھ میں نے سنا ہے، اس کے مطابق اس تنازعے کو حل کرنے میں بھی ان کے درمیان کافی اختلافات تھے۔"

جوئے نے میری طرف دیکھا۔ معاملے کا ایک نیا پہلو سامنے آگیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے اس سے مزید سوالات کیے لیکن اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ اس کی کمپنی میں گزشتہ تین سال سے کام کررہا تھا۔ اس کے بعد ہم نے دفتر میں موجود تمام لوگوں سے بات کی۔ کچھ کو یہ جان کر بہت صدمہ ہوا کہ ان کا ایک ساتھی قتل کردیا گیا ہے جبکہ کچھ لوگوں نے اسے ایک خبر سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ کہ ان میں سے کسی کا بھی پنیل کے ساتھ ذاتی تعلق نہیں تھا۔ ان سب نے باس کے الفاظ کی تائید کی کہ پنیل خاموش طبیعت اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص تھا۔

اس کے قریب بیٹھنے والے کچھ لوگوں نے پنیل اور اس کے وکیل کے درمیان ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو سن رکھی تھی جس سے انہیں اندازہ ہوا تھا کہ وہ طلاق کی کارروائی کے سلسلے میں بہت مشکل اور پریشانی سے دوچار تھا۔ اس کے ایک ساتھی نے یاد کرتے ہوئے بتایا کہ ایسی ہی ایک گفتگو کے بعد اس نے پنیل کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتے دیکھا تھا اور جب پوچھا گیا تو اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو ایک پائی بھی نہیں دے گا۔ اس کے ساتھ بیٹھنے والے ایک اور شخص نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ ڈھائی بجے کے قریب دفتر سے چلا گیا تھا۔

دفتر سے روانہ ہوتے وقت ہم نے باس سے پنیل کی بیوی کا فون نمبر لے لیا۔ اس نے ہمیں کانفرنس روم میں اسپیکر فون استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ یہ نمبر اس کے سیل فون کا تھا اور وہ اس وقت بوسٹن کے مرکز میں واقع ایک اکاؤنٹنگ فرم میں اپنی ڈیوٹی پر تھی۔ وہ ہماری آواز سن کر حیران رہ گئی اور پوچھنے لگی کہ ہم نے اسے کس لیے فون کیا ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ اس سے ملنے کی یہ وجہ بتائی جاسکتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ دفتر سے جارہی ہے لیکن جوئے نے اسے وارننگ دی کہ جب تک ہم وہاں نہ پہنچیں، وہ دفتر میں ہی ٹھہرے۔ یہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔

پنیل کے پاس سے برآمد ہونے والا سیل فون ہمارے پاس تھا اور اس سے زیادہ تر کالز ایک ہی نمبر پر کی گئی تھیں۔ یہ اس کے وکیل کا نمبر تھا۔ جوئے نے اس سے رابطہ کرکے کچھ بات کی اور فون بند کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ جیسے ہی اس وکیل کو معلوم ہوا کہ اس کا مؤکل مرچکا ہے، اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ یوں لگا جیسے وہ نشے کی حالت میں ہے۔

"میرا اندازہ ہے کہ پنیل کے ذمے اس کی بھاری فیس واجب الادا تھی جس سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا ہے۔"

"کیا وہ ہم سے ملنے پر آمادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ پارک اسٹیشن کے قریب ٹریمونٹ اسٹریٹ پر کام کرتا ہے۔ ہم مقتول کی سابقہ بیوی سے بات کرنے کے بعد وکیل سے پارکر ہاؤس لاؤنج میں مل سکتے ہیں۔"

میں نے سر ہلا دیا۔ پانچ بج چکے تھے۔ مجھے اپنے نچلے ہونٹ میں کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی۔ میں نے منہ کھولا اور اپنے جبڑوں کو حرکت دینے لگا۔ درد میں کافی کمی ہوچکی تھی اور میں بولنے میں بھی بہتری محسوس کررہا تھا۔

پانچ بج کر بیس منٹ پر ہم اس عمارت کے سامنے پہنچ چکے تھے جہاں مقتول کی سابقہ بیوی کام کرتی تھی۔ وہ اپنے دفتر کی لابی میں ہمارا انتظار کررہی تھی۔ وہ چھوٹے قد کی دبلی پتلی عورت تھی جس کی گہری سیاہ آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے زخمی فاختہ کی یاد آگئی۔ وہ پرکشش کہلائی جاسکتی تھی اگر اس کے چہرے پر تناؤ اور پریشانی کے آثار نہیں ہوتے۔ اس نے پہلے جوئے اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔

"مجھے آدھ گھنٹا پہلے اپنے بیٹے کو لینے جانا تھا۔" وہ تھوڑا سا سخت لہجے میں بولی۔ "وہ ڈے کیئر سینٹر میں ہوتا ہے اور اگر اسے وقت پر نہ لوں تو مجھے اس کے عوض اضافی فیس دینا پڑتی ہے۔ خیر، یہ بتاؤ کہ میرے شوہر نے میرے بارے میں کیا جھوٹ بولا ہے؟"

"ایکسکیوزمی!" میں نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے شوہر کو قتل کردیا گیا ہے اور اس کی لاش اس کے دفتر کے قریب پارکنگ ایریا سے ملی ہے۔"

اس نے میری طرف دیکھ کر کئی بار پلکیں جھپکائیں اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔

"اوہ، میرے خدا!" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ اسے وقتی طور پر صدمہ تو ہوا تھا لیکن اس کا اثر وقتی تھا جیسے اس نے ٹی وی پر کسی کو قتل ہوتے دیکھ لیا ہو۔

"ہمیں تم سے کچھ سوالات کرنا ہیں۔" جوئے نے کسی تکلف کے بغیر کہا۔

اس نے بدحواسی کے عالم میں جوئے کی طرف دیکھا اور بولی۔ "تمہارا خیال ہے کہ میرا اس قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟"

"میڈم! میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔" جوئے نے سپاٹ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب یہی تھا۔" وہ کاٹ کھانے والے انداز میں بولی۔ "تم نے ہماری طلاق کے بارے میں سنا اور سوچ لیا کہ میں ایسی کوئی حرکت کرسکتی ہوں۔"

"مسز پنیل!" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ معمول کی کارروائی ہے۔ ہمیں تم سے کچھ سوالات کرنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں گے۔''

وہ میری طرف مڑی۔ اب اس کی آنکھوں میں چمک لوٹ آئی تھی۔ ''میں بچے سے نفرت کرتی تھی۔ وہ انتہائی ذلیل اور گھٹیا شخص تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس کی موت چاہتی تھی۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ اس نے میری ساری جمع پونجی چرا کر اپنے والدین کو بھیج دی جو بنگلور میں رہتے ہیں۔ اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ وہ مجھے اور اپنے بیٹے کو قلاش کر کے جا رہا ہے۔ میرا وکیل سارا حساب کتاب تیار کر رہا ہے تاکہ جج اسے یہ رقم واپس کرنے کی ہدایت کرے۔ اگر مجھے اسے مارنا ہوتا تو یہ کام اپنی رقم وصول کرنے کے بعد کرتی۔''

''اس کے باوجود ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہیں گے۔'' جوئے نے اصرار کیا۔

''اس وقت تو یہ ممکن نہیں۔ ابھی مجھے اپنے بیٹے کو لینے کے لیے جانا ہے۔ اگر مجھ سے بات کرنی اتنی ہی ضروری ہے تو تم بعد میں میرے اپارٹمنٹ آسکتے ہو لیکن اگر تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ بچے کو کس نے قتل کیا تو اس کے والدین سے بات کرو۔ وہ بھی اس کی طرح گھٹیا ہیں۔ وہ اس رقم کی خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔''

''تم جس رقم کی بات کر رہی ہو وہ اندازاً کتنی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً دو لاکھ ڈالرز سے بھی زیادہ۔'' اس نے کہا۔ ''اس جمع پونجی کے علاوہ، بچے ترانوے ہزار ڈالرز مالیت کے سرٹیفکیٹ بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ اب تک ہندوستان جا چکا ہوتا اگر میرا وکیل، جج کو قائل کر کے اس کا پاسپورٹ ضبط نہ کروا دیتا۔''

میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا پتا دے دے، ہم رات میں کسی وقت اس سے بات کریں گے۔ جوئے نے مجھے اس طرح گھورا جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور مسز بچیل سے وہ کاغذ لے کر جیب میں رکھ لیا جس پر اس نے اپنے گھر کا پتا لکھا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دفتر سے باہر چلی گئی۔ میں نے اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ محسوس کی۔ اس کے جانے کے بعد جوئے مجھ سے الجھ پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمیں اسے نہیں جانے دینا چاہیے تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنے بچے کی وجہ سے فکرمند تھی جو ڈے کیئر سینٹر میں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔

''تم نے اس کی کہانی پر یقین کر لیا؟'' جوئے نے ناگواری سے کہا۔

''کسی حد تک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس بات پر یقین کرنا تو مشکل ہے کہ بچیل کے والدین نے ہندوستان میں بیٹھ کر اس پر حملہ کرنے کے لیے کسی پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں بچیل کے وکیل سے مل لینا چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کی بیوی کی بیان کردہ کہانی میں کتنا سچ ہے؟''

جب ہم بچیل کے وکیل سے ملنے جا رہے تھے تو مجھے میڈیکل ایگزامنر کا فون موصول ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مقتول کے سر پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی گئی تھی جس سے اس کی فوری موت واقع ہو گئی۔

''کیا صرف ایک ہی ضرب لگائی گئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، صرف ایک۔''

''اس طرح کی ضرب کے نتیجے میں بچنے کا کتنا امکان ہوتا ہے؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''جس قوت سے یہ ضرب لگائی گئی تھی، اس میں بچنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔''

''کیا تم موت کے وقت کا تعین کر سکتے ہو؟''

اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا تو میں سوچنے لگا کہ وہ مجھے کیا نئی بات بتائے گا۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ وہ ڈھائی بجے کے قریب دفتر سے نکلا اور اس کی لاش کو پہلی بار تین بج کر اٹھارہ منٹ پر دیکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی موت اسی درمیانی عرصے میں واقع ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد ہم مزید کچھ دیر باتیں کرتے رہے لیکن اس کے پاس بتانے کے لیے اور کچھ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے لوہے کی سلاخ کو آلۂ قتل کے طور پر شناخت کر لیا تھا اور یہ کہ بچیل جیسی سالم صحت مند شخص تھا اور اسے قتل کرنے کے لیے ہی اتنی زور سے ضرب لگائی گئی تھی۔ جب ہم پارکر ہاؤس پہنچے تو میں نے اس فون کال کے لیے میڈیکل ایگزامنر کا شکریہ ادا کیا اور اس سے ملنے والی تمام معلومات جوئے کو بھی بتا دیں۔

بچیل کا وکیل وعدے کے مطابق پارکر ہاؤس کے لاؤنج میں واقع ایک بار میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے مارٹینی کا آدھا گلاس رکھا ہوا تھا۔ وہاں وکیلوں کے لباس میں اور بھی کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے لہٰذا ہم نے وکیل کو شناخت کرنے کے لیے اس کے سیل پر فون کیا اور جس شخص نے ہمارے فون کا جواب دیا، اس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے ہم پر نگاہ ڈالی اور ہمارے سستے سوٹوں کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ اسے ہمارا ہی انتظار تھا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور

ہمارے قریب آتے ہوئے بولا۔

''تم یقیناً وہی سراغ رساں ہو جنہوں نے مجھے بچیل کے سلسلے میں فون کیا تھا؟'' اس نے اپنا نام مارٹن گولڈ بتایا اور باری باری ہم دونوں سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کیوں نہ ہم کسی میز پر چل کر بیٹھیں جہاں خاموشی ہو اور آرام سے بات کی جا سکے۔''

جب ہم اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو اس نے گلاس میں پڑی ہوئی بقیہ مارٹینی اپنے حلق میں انڈیلی اور ویٹرس کو اشارہ کر کے بلایا تاکہ ہمارے لیے کچھ منگوا سکے۔

''بچے کو کسی نے قتل کر دیا۔'' وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''ہم نے سنا ہے کہ اسے طلاق کی وجہ سے کچھ مسائل کا سامنا تھا؟'' جوئے نے کہا۔

گولڈ نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ''اس کے کردار کو سمجھنے کا یہی مناسب طریقہ ہے۔''

''اس کی بیوی نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔''

''اس پر یقین کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اس قتل میں ملوث ہو سکتی ہے؟''

گولڈ کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بولا۔ ''اس کا کوئی امکان نہیں۔''

''کیوں؟''

''بچے بچیل کا رویہ اس کے ساتھ کبھی بھی اچھا نہیں رہا۔ اس نے پورے عرصے کے دوران ۔۔۔ اسے دہشت زدہ کیا اور ڈراتا دھمکاتا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اور اس کا مطالبہ تھا کہ بچیل وہ رقم واپس کر دے جو اس نے اپنے والدین کو بھیج دی تھی۔ اگر تمہاری اس سے بات ہوئی ہو تو اس نے یقیناً بتایا ہوگا کہ بچیل نے یہ رقم کس طرح اپنے والدین کو بھیجی۔ اب اس کے مر جانے کے بعد رقم ملنے کے امکانات بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ اسی طرح میرے بھی فیس کے تیس ہزار ڈالرز ڈوب گئے۔''

''بچیل کی بیوی نے بتایا ہے کہ اس نے دو لاکھ ڈالرز سے زیادہ رقم ہندوستان بھیج دی ہے؟'' جوئے نے اس سے پوچھا۔

گولڈ نے کچھ دیر سوچا اور تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا کہنا درست ہے۔ وہ گزشتہ چار سال سے باقاعدگی سے رقم بھیج رہا تھا۔ اس نے طلاق کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے سب کچھ سمیٹ لیا اور سرٹیفکیٹ بھی

لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے ساتھ لے گیا۔"

"اب وہ رقم کہاں ہے؟"

"اس کا زیادہ حصہ ہندوستان میں پٹیل کے والدین کے پاس پہنچ چکا ہے۔ مسز پٹیل کا وکیل اس کی واپسی کی کوشش کر رہا ہے۔"

"یہ رقم گزشتہ چار سال میں منتقل ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں اور اسے اس کے بارے میں بالکل بھی پتا نہیں چلا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

اس نے مارٹینی کا ایک طویل گھونٹ لیا اور بولا۔ "اس نے مالی معاملات کے حوالے سے ہمیشہ اپنی بیوی کو اندھیرے میں رکھا اور وہ آنکھ بند کر کے اس پر بھروسا کرتی رہی۔ اس نے اپنی بیوی کو اس کے خاندان سے الگ تھلگ کر دیا اور اس کے پیسے کو ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا۔ اگر اس کی بیوی کا وکیل بروقت کارروائی نہ کرتا اور عدالت اس کا پاسپورٹ ضبط نہ کرتی تو مجھے یقین ہے کہ اب تک وہ ہندوستان واپس جا چکا ہوتا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مسز پٹیل کے پاس اس سے نفرت کرنے کی معقول وجہ موجود تھی؟" میں نے کہا۔ "بعض اوقات کسی کو قتل کرنے کے لیے پیسے کے مقابلے میں نفرت زیادہ مضبوط محرک ہوتی ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ جہاں تک میں انہیں جانتا ہوں، اس کے مطابق وہ عورت بھیڑ اور بیٹا بھیڑیا تھا۔"

"مسز پٹیل کا خیال ہے کہ اس قتل میں پٹیل کے والدین کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔" جوئے نے آہستہ سے کہا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "ایسا ممکن ہے اور مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوگی اگر انہوں نے واقعی یہ حرکت کی ہو۔"

"کیا تمہاری کبھی اس کے والدین سے بات ہوئی؟"

"ایک دفعہ۔" وکیل نے کہا۔ "میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ پیسے واپس نہ کرنے کی صورت میں کیا کچھ ہو سکتا ہے لیکن وہ اپنے بیٹے کی بھلائی سے زیادہ اس رقم کو چھپانے کے لیے پریشان نظر آ رہے تھے۔"

اس نے ویٹرس کو بلا کر بل لانے کے لیے کہا اور بولا۔

"کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ایک آخری سوال۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کس شخص نے مسز پٹیل کے وکیل کو رقم ہندوستان بھیجنے کے بارے میں بتایا ہوگا؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "شاید کوئی ایسا شخص جو یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ بیٹے دو لاکھ ڈالرز چرا کر ہندوستان بھاگ جائے اور اپنی معصوم بیوی اور بچے کو کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ دے۔"

یہ کہہ کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ "اس کے علاوہ اگر کچھ پوچھنا ہو تو تم بعد میں بھی مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔"

اس کے جانے کے بعد ہم دونوں کافی دیر تک اس معاملے کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔

"یہ معاملہ تو مزید الجھتا جا رہا ہے۔" جوئے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور سوچنے لگا کہ پٹیل کے والدین سے رابطہ کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

☆☆☆

ہماری اگلی منزل مسز پٹیل کا اپارٹمنٹ تھا۔ وہ ایورٹ کے علاقے میں ایک کمرے پر مشتمل فلیٹ میں رہتی تھی۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح وہ اپنے شوہر کی وجہ سے قرض کے جال میں پھنس گئی اور بمشکل اس اپارٹمنٹ کا کرایہ ادا کر رہی ہے۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"تم اسی سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کس قسم کا شخص ہوگا جس نے اپنے بیٹے کو اس حال میں چھوڑ دیا۔"

میں فوری طور پر اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کا بیٹا بہت چھوٹا تھا لیکن اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھیں ہر ایک کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھیں۔ وہ مسلسل جوئے کو دیکھ رہا تھا۔ جوئے کی شادی نہیں ہوئی تھی اس لیے اسے بچوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے جب لڑکے کو اپنی جانب متوجہ پایا تو تھوڑا سا گڑبڑا گیا۔ مسز پٹیل بھی خاصی پریشان نظر آ رہی تھی اور اس کی نظریں میرے اور جوئے کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ تاہم وہ اس وقت پُرسکون ہو گئی جب ہم نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ ہمیں اپنے شوہر کے والدین کا پتا اور فون نمبر دے سکتی ہے؟ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ ہم اس کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ ہمیں پٹیل کے قتل کا معمّا حل کرنے کے لیے اس کے والدین سے بات کرنی چاہیے۔ ہم نے اس سے مزید کئی سوالات کیے لیکن کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ اس قتل میں ملوث ہے۔ اس نے ہمیں اپنے شوہر کا آخری پتا دیا جہاں ان دونوں میں سے کوئی نہیں رہ رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ مکان ضبط ہو چکا تھا۔

"طلاق سے پہلے اسے اس مکان کی قسطیں ادا کرنا تھیں لیکن اس نے گزشتہ چھ ماہ سے کوئی ادائیگی نہیں کی اور وہ رقم بھی اپنے والدین کو بھیجتا رہا۔ اس کے علیحدہ ہونے کے بعد مجھے مکان کی ضبطی کا نوٹس ملا۔ اس نے میری عمر بھر کی کمائی برباد کر دی۔ بڑی مشکل سے میں یہ اپارٹمنٹ لینے کے قابل ہو سکی جس کے لیے مجھے چار ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کرنا پڑا۔ کیا کوئی شخص اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے؟"

اس بار بھی میں خاموش رہا اور اپنا سر ہلانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔

"وہ انتہائی گھٹیا شخص تھا۔" یہ کہہ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

اسے روتا دیکھ کر اس کا بیٹا بھی رونے لگا۔ میں مسز پٹیل کے برابر میں بیٹھ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپانے لگا۔ وہ لڑکا جوئے کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ جوئے نے شکایتی انداز میں مجھے دیکھا لیکن میں نے اسے نظرانداز کر دیا اور مسز پٹیل کو خاموش کرانے کی کوشش میں لگا رہا۔

☆☆☆

سومرول میں واقع بیٹے پٹیل کا اپارٹمنٹ ایسا منظر پیش کر رہا تھا جیسے وہاں عرصہ دراز سے کوئی نہ رہ رہا ہو۔ کچن کے باہر ایک چھوٹی سی میز پڑی ہوئی تھی جس پر بیٹھ کر وہ کھانا کھاتا ہوگا۔ کمرے کے فرش پر ایک گدا بچھا ہوا تھا۔ اس کے سوا اپارٹمنٹ میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک لیپ ٹاپ، چند جوڑی کپڑے اور کچھ کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ہمیں اس جگہ کی تلاشی لینے میں پندرہ منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ ردی سامان کی تھیلی کے نیچے ایک میگزین پڑا ہوا تھا جس کے آخری صفحے پر ایک اشتہار کے گرد دائرہ بنایا گیا تھا۔ یہ اشتہار ایک ایسے شخص کے بارے میں تھا جو ہر قسم کے مسائل حل کر سکتا ہے۔ اس طرح کے میگزین میں ایسے ہی اشتہارات کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس لیے مجھے ان میں سے ایک کے گرد دائرہ لگا ہوا دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس اشتہار میں رابطے کے لیے صرف پوسٹ بکس نمبر دیا ہوا تھا۔ میں نے جوئے کو وہ اشتہار دکھایا تو وہ پٹیل کو گالی دیتے ہوئے بولا۔

"وہ اپنی بیوی کو مروانا چاہتا تھا۔"

"اس اشتہار سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"لیکن اس نے جو گڑھا کھودا تھا، وہ اس میں خود ہی گر گیا اور بیوی کے بجائے اس کی موت واقع ہو گئی۔"

"شاید تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

جوئے کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ بولا۔ "اس شخص کی وجہ سے میں میچ دیکھنے سے محروم ہو جاؤں گا۔"

☆☆☆

میں پوسٹ بکس کے باہر کھڑے مطلوبہ شخص کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران میں ایف بی آئی سے فون کر کے ان قاتلوں کے بارے میں معلومات حاصل کر چکا تھا جو اس علاقے میں وارداتیں کرتے تھے۔ اس شخص کا نام مائیک نیلسن تھا اور وہ جیسے ہی عمارت میں داخل ہوا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ایک مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ وہ اپنے پوسٹ بکس کی جانب بڑھا لیکن اس کی چھٹی حس نے بروقت اسے میری موجودگی کے بارے میں آگاہ کر دیا اور وہ اپنا بکس کھولے بغیر وہاں سے چلا گیا جس میں وہ خط رکھا ہوا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو میں نے اس کے اشتہار کے جواب میں لکھا تھا۔

میں نے وہیں رک کر جوئے کو فون کیا جو عمارت کے باہر کھڑا تھا اور اسے نیلسن پر نظر رکھنے کی ہدایت کی۔ اس نے پانچ منٹ بعد مجھے فون کر کے بتایا کہ ہمارا مطلوبہ شخص تین عمارتیں چھوڑ کر ایک بار میں بیٹھا ہوا ہے۔

''تم اس سے کس طرح پیش آؤ گے؟'' جوئے نے پوچھا۔

ہم اس کے تعاقب میں دوبارہ بھی یہاں آسکتے تھے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ اس پوسٹ بکس کو دوبارہ استعمال نہیں کرے گا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ بار میں بیٹھ کر کس کا انتظار کر رہا ہے۔

''میں اس سے بات کرنے جا رہا ہوں۔'' میں نے جوئے سے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ میں اس سے اکیلے میں ہی ملوں۔''

جوئے نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور بتایا کہ وہ بار کے باہر میرا انتظار کرے گا۔

میں بار میں داخل ہوا۔ وہ عقبی حصے میں ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے دیکھا تو بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا کہ میں کیا پینا چاہوں گا۔ میں نے اسکاچ کے لیے کہا تو اس نے بارٹینڈر کو اشارہ کر دیا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، کچھ زیادہ نہیں۔''

''تم نے یہ کیسے جانا کہ میں تمہارے بکس کی نگرانی کر رہا تھا؟''

وہ مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ بھی اس کی آنکھوں کی طرح پھیکی تھی۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟''

''اگر تم میرے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے تو یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کیوں کر رہے تھے؟''

''میرا خیال تھا کہ تم کسی قتل کی تحقیقات کر رہے ہو۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوا۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں مسلسل میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''تم بتا کیوں نہیں دیتے کہ کس قتل کی تحقیقات کر رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

حالانکہ وہ اس بارے میں جانتا تھا لیکن شاید وہ میری زبان سے سننے کا خواہش مند تھا۔ لہٰذا میں نے اسے بتا دیا۔

''ہاں، مجھے یاد آ گیا۔ میں نے شام کے اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی۔ تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں اس پنیل نامی شخص کو قتل کروں گا..... صرف اس لیے کہ میری شہرت اچھی نہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ میں ایف بی آئی سے تمہارے بارے میں مفصل معلومات حاصل کر چکا ہوں۔''

اس نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں اور بولا۔ ''میں کوئی اعتراف نہیں کروں گا۔ فرض کرو کہ میں ایک قاتل ہوں اور مزدنے پنیل کو قتل کیا ہے، تب بھی تم میرے خلاف کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تم یہاں بیٹھ کر اور مجھ سے باتیں کر کے محض اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں تمہیں اس قتل کا ملزم نہیں ٹھہرا سکتا؟''

اس نے ایسا منہ بنایا جیسے کوئی کڑوی گولی نگل رہا ہو پھر بولا۔ ''میں نے اخبار میں اس واقعے کی جو تفصیل پڑھی ہے، اس کے مطابق جس جگہ پنیل کو قتل کیا گیا، وہاں کوئی کیمرا نصب نہیں تھا اور نہ ہی اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ موجود ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی ثبوت ہوتا تو تم یہاں بیٹھ کر باتیں کرنے کے بجائے اب تک مجھے گرفتار کر چکے ہوتے۔''

ایک طرح سے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہمارے پاس کوئی شہادت یا ثبوت نہیں تھا اور نہ یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس نے پنیل کو قتل کرنے کے لیے کسی سے کوئی معاوضہ لیا ہے۔ سوائے ایک اشتہار کے جس کے گرد دائرہ لگا ہوا تھا لیکن وہ بھی اس وقت تک بیکار تھا جب تک ہمیں پوسٹ بکس پر نیلسن کی انگلیوں کے نشانات نہ مل جاتے جس کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

میری اسکاچ ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ تم نے ایک ایسے شخص کو کیوں مار ڈالا جو کسی کام کے سلسلے میں تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا؟ کیا اس کے ہاتھ تمہاری کوئی کمزوری لگ گئی تھی اور وہ تمہیں بلیک میل کر رہا تھا کہ تم اس کا کام بلا معاوضہ کر دو... بتاؤ، تم نے اسے کیوں مارا؟''

نیلسن کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب مفروضہ ہے اور میں نے جو کچھ اخبار میں پڑھا ہے، اسی کی بنیاد پر کڑیاں ملا رہا ہوں۔''

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا۔ شاید وہ ایسے الفاظ تلاش کر رہا تھا جن سے اعتراف کی جھلک نظر نہ آئے۔ ''میں قاتل تھا اور پنیل جیسے لوگ میری خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔ اس نے بھی مجھے ذاتی معاوضہ ادا کر دیا تھا اور کہا کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کرانا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے بیٹے کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کی۔ وہ ہندوستان جانے سے پہلے اسے کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا جسے کم عمر لڑکوں سے دلچسپی ہو کیونکہ وہ خود اپنے بیٹے کی پرورش نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ کیا میں کسی ایسے شخص کو جانتا ہوں جسے کم عمر لڑکوں سے دلچسپی ہو۔''

''یہ بات اس نے تم سے کہی کہ تم اس کے بیٹے کو فروخت کرنے میں اس کی مدد کرو؟''

''ممکن ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر ہو گیا ہو لیکن اس کا مطلب یہی تھا۔'' نیلسن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی نظریں نیچے کر لیں اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو مر جانا ہی چاہیے۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' نہ جانے یہ الفاظ کیسے میری زبان سے پھسل پڑے۔

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا..... اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ کیوں ادا کیا۔ میرے سوالوں کا جواب دینے یا پنیل کو قتل کرنے کے لیے.....! سچی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس بھی اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ بار سے باہر جاتے ہوئے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میں پنیل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی وہ اپنے بیٹے کو فروخت کرنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا؟ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ اس کے بیٹے کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ کسی بے اولاد جوڑے کے گھر میں پروان چڑھے گا یا لوگوں کے گھروں میں نوکری کر کے جوان ہوگا؟ مجھے اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی کہ نیلسن سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو سکا اور اس نے اپنا ہدف تبدیل کر لیا۔

جوئے باہر گاڑی میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''چلو۔''

جواب

اردو کے پروفیسر سے اس کی محبوبہ نے دل لگی کرنے کے لیے انھلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم جیسے کتابی کیڑے سے شادی تو دور کی بات ہے، بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نہ تمہارے دل میں کوئی امنگ ہے نہ ترنگ اس لیے میرے خطوط واپس کر دو۔''

پروفیسر نے جواباً کہا۔ ''مجھے بھی تمہارے لکھے ہوئے خط رکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری اردو کی لکھائی بہت خراب ہے، تمہارا خط پڑھنے کے لیے اگر میں صبح اٹھوں تو شام ہو جاتی ہے اور اللہ کی پناہ! تم ایک پیرے میں چھ سات غلطیاں کر لیتی ہو۔ تم بے فکر رہو، میں ابھی گھر جا کر تمہارے خطوط خانقشے لے کر آتا ہوں۔''

دریشم یونس کاتعاون کراچی سے

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم کسی بھوت سے مل کر آ رہے ہو۔ کچھ معلوم ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ آخری کوشش بھی ناکام رہی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پولیس اسٹیشن چل کر کیپٹن کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ گو کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرے گا لیکن ہم اب اس کیس پر مزید وقت ضائع نہیں کر سکتے۔''

جوئے نے بناوٹی انداز میں کہا۔ ''پھر بھی ہم کچھ نہ کچھ معلوم کرنے میں تو کامیاب ہو گئے۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کم از کم یہ تو پتا چل گیا کہ پنیل کا قاتل کون ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم اس کے خلاف کوئی ثبوت یا شہادت پیش نہیں کر سکتے۔''

جوئے کی بات سن کر میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ نیلسن نے پنیل کے بارے میں کہا تھا کہ ایسے لوگوں کو مر جانا چاہیے۔ گویا دوسرے لفظوں میں وہ اس قتل کا اعتراف کر رہا تھا۔ یہ بات تو مجھے بہت دیر میں یاد آئی کہ اس کی انگلیوں کے نشان آلۂ قتل یعنی لوہے کی سلاخ اور کار کے دروازے کے ہینڈل پر بھی ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی میری ساری تھکن دور ہو گئی اور میں سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلا رنگ

لبِ بام

منظر امام

کسی بزرگ کا قول ہے کہ سب سے برا فقیر وہ ہے جو امیر کے دروازے پر ہو... اور سب سے اچھا امیر وہ ہے... جو فقیر کے دروازے پر ہو... وہ شخص فقیر اور صوفی نہیں تھا... لیکن اس کا سابقہ مسلسل ہر طور کے لوگوں سے پڑتا تھا... اس کے دروازے پر جو بھی چھوٹا بڑا... مفلس و قلاش، کمزور و طاقتور آتا... وہ ان سب کو اپنی شفقت اور انہماک سے اپنا اسیر بنا لیتا... لوگ اس کی جستجو میں تھے... اور وہ خود کسی سائبان کی تلاش میں سرگرداں تھا...

بے قرار و بے سکون لوگوں کی دربدری، وہ اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے اکتوبر کا پہلا رنگ

''کیا نام ہے تیرا؟'' پولیس کانسٹیبل نے اپنے کھردرے اور اکھڑ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔

''ابے ماں باپ نے کوئی نام نہیں رکھا؟''

''ماں باپ نہیں ہیں میرے۔'' اس نے جواب دیا۔

اس دوران میں فضل داد اپنے ٹھیلے کے پاس سے ہٹ کر ان دونوں کے پاس آ گیا۔ کانسٹیبل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں ایک آنکھ دبائی۔

''ابے سن لیا۔ اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ گلیوں کی اولاد ہے۔ سالے کے ماں باپ اسے فٹ پاتھ پر ڈال گئے ہوں گے۔''

''ہاں بادشاہو۔'' فضل داد نے تائید کی۔ ''ایسا ہی ہوا ہے لڑکے کے ساتھ۔ ویسے ہے بہت سوہنا۔ یہیں پارکنگ میں گاڑیاں دھوتا ہے۔''

''چل تو پھر تو ہی اس کا کوئی نام رکھ دے۔'' کانسٹیبل شیر باز نے کہا۔

''میں تو اسے راجو کہہ کر بلاتا ہوں۔ ہے بھی تو راجا جیسا۔''

شیر باز نے اپنی دو انگلیوں سے راجو کے گال کو سہلایا اور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جہاں ایک تیل بیچنے والا اس کی اجازت کے بغیر تیل بیچنے لگا تھا۔

''بہت کم بخت ہے سالا۔'' فضل داد نے شیر باز کی طرف دیکھتے ہوئے راجو سے کہا۔ ''لیکن تو فکر مت کر... میں جب تک یہاں ہوں، کوئی تجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

راجو نے اپنی آنکھوں سے ہی فضل داد کا شکریہ ادا کیا۔ ٹین کا کنستر اٹھایا اور اس طرف دوڑ پڑا جہاں ابھی ابھی ایک گاڑی آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

گاڑی سے اترنے والا شخص موٹا اور گنجا تھا... راجو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صاحب! گاڑی دھو دوں؟''

''نہیں۔'' موٹے نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔ ''ضرورت نہیں ہے۔''

''صاحب! صرف بیس روپے دے دینا۔''

''میں نے کہا نا ضرورت نہیں ہے۔ بھاگ یہاں سے۔''

موٹے کی بیوی بھی اپنے شوہر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ایک دبلی پتلی سی خوب صورت عورت تھی۔ دونوں مارکیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ اسی وقت کسی نے راجو کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ بھورا تھا، اسی پارکنگ میں گاڑیاں دھونے والا۔ راجو کو اسی نے کام پر لگایا تھا۔ ''راجو! یہ ایک نمبر کا کنجوس ہے سالا۔'' بھورے نے جاتے ہوئے جوڑے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خود کتنا بدصورت ہے اور بیوی کیسی کچا ہے؟''

راجو کی سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتی تھیں۔ کوئی عورت کچا کیسے ہو سکتی تھی لیکن بھورا سب کچھ جانتا تھا کیونکہ وہ ایک نمبر کا بدمعاش تھا۔

''دیکھ، وہ تیری مہارانی آ گئی۔'' بھورے نے چھوٹی آلٹو کی طرف اشارہ کیا۔ ''تو تو اس کی جان بن گیا ہے، کسی اور کو تو گاڑی کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی۔''

راجو اپنی بالٹی اٹھا کر اس چھوٹی گاڑی کی طرف دوڑ پڑا۔

وہ لڑکی گاڑی سے اتر کر شاید راجو ہی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک خوب صورت سی اسمارٹ لڑکی تھی۔ اس پارکنگ کے نہ جانے کتنے لوگ اسے دیکھ کر آہیں بھرنے لگتے تھے۔ ''ہائے، کیا چیز ہے۔''

وہ ہمیشہ انگریزی لباس میں ہوتی۔ جینز، ٹی شرٹ یا جرسی۔ آدھی پیشانی تک خوب صورت بالوں کی لٹ، پیروں میں جاگرز۔ نہ جانے کون تھی؟ کہاں سے آتی تھی... کیا کرتی تھی؟

لیکن ہفتے میں دو تین چکر ضرور لگتے تھے اور جب بھی آتی راجو ہی سے اپنی گاڑی دھلوایا کرتی۔ کسی اور کو گاڑی کے قریب بھی نہیں آنے دیتی تھی۔

''سلام بی بی۔'' راجو نے اس کے پاس پہنچ کر سلام کیا۔

''آ گئے؟'' لڑکی مسکرا دی۔

''جی بی بی! آپ کو دیکھتے ہی دوڑتا ہوا آ گیا ہوں۔''

''شاباش... اب جلدی سے اپنا کام شروع کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں واپس آ رہی ہوں۔''

راجو نے بالٹی سے گیلا کپڑا نکال کر اپنا کام شروع کر دیا۔ لڑکی بل کھاتی ہوئی مارکیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی چال بھی بہت دل کش تھی۔

بھورے کا یہ کہنا تھا کہ وہ لڑکی فلموں میں کام کرتی ہو گی اس لیے اتنی خوب صورت ہے جبکہ راجو کا خیال تھا کہ شاید کسی بہت امیر آدمی کی بیٹی ہے اسی لیے اتنے ٹھکارے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتی ہے۔

وہ راجو کو پیسے بھی سب سے زیادہ دیتی تھی۔ عام طور پر گاڑی کی دھلائی کے بیس روپے ہوتے تھے۔ بہت سے تو بیس روپے بھی بک بک کر کے دیتے تھے جبکہ وہ لڑکی پچاس کا نوٹ دے کر جایا کرتی تھی۔

راجو گاڑی کی دھلائی میں مصروف تھا کہ ایک آدمی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ راجو اکثر اسے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی مارکیٹ میں ایک دکان تھی۔ وہ صورت ہی سے بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی کار میں آیا کرتا اور کار کو اسی پارکنگ میں کھڑی کرتا تھا۔

اس نے آج تک راجو سے اپنی گاڑی نہیں دھلوائی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے شہزادے؟" اس آدمی نے بڑی بے تکلفی سے راجو کو مخاطب کیا۔

"اپنا کام کر رہا ہوں۔" راجو نے جواب دیا۔

"تیرے تو مزے ہیں شہزادے۔" اس آدمی نے کہا۔ "ہن... میری گاڑی پہچانتا ہے؟ وہ سامنے کھڑی ہے لال رنگ والی۔" اس نے اشارہ کر کے بتایا۔

"جی صاحب! پہچانتا ہوں۔"

"ذرا اس پر بھی پیار بھرا ہاتھ پھیر دینا پیارے۔"

راجو کو اس کی یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں لیکن اسے اپنا کام تو کرنا تھا۔ لڑکی آدھ گھنٹے سے پہلے ہی واپس آگئی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق راجو کو پچاس روپے دیے اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راجو اسے سلام کر کے ایک طرف ہٹ گیا۔

اب اسے اس آدمی کی گاڑی دھونی تھی۔

وہ بالٹی لے کر اس کی گاڑی کے پاس پہنچا ہی تھا کہ وہ آدمی پھر کہیں سے نمودار ہو گیا۔ وہ شاید اپنی دکان کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔

"رہنے دے یار۔" اس نے راجو کا ہاتھ تھام لیا۔ "پھر کبھی سہی۔ اس وقت ضروری کام سے جانا ہے۔"

"دس منٹ میں گاڑی دھو دوں گا صاحب۔" راجو نے کہا۔

"چھوڑ رہنے دے۔" اس نے اپنی جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر راجو کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ رکھ لے۔"

"کس لیے صاحب؟ میں نے تو اپنا کام ہی نہیں کیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے راجو کی جیب میں نوٹ ٹھونس دیے۔ "یہ میں پیار میں دے رہا ہوں۔" اس نے راجو کا گال پکڑ کر چٹکی لے لی۔ "تجھ سے پیار بھی تو ہو گیا ہے۔"

چٹکی کی تکلیف سے راجو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

☆☆☆

"جہاں سید کا پیر... وہاں خیر ہی خیر۔" ایک ملنگ سید بادشاہ کے گرد ناچ رہا تھا۔

سید بادشاہ کی اس وقت آنکھیں بند تھیں لیکن اس کے کان کھلے ہوئے تھے۔ وہ ملنگ کے نعرے سن رہا تھا۔ ملنگ کے قدموں کی تیز آوازوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت وجد کے عالم میں رقص کر رہا ہے۔ "جہاں سید کا پیر... وہاں خیر ہی خیر۔"

کوئی نہیں جانتا تھا کہ سید بادشاہ کون تھا اور کہاں سے آکر اس آبادی کو اس نے اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ اس نے نہ جانے کب کی روایات کو زندہ کیا تھا۔

بستی سے کچھ فاصلے پر ایک میدان تھا۔ اس میدان کے ایک بڑے گھنے درخت کے نیچے اس نے ایک چبوترا اپنے ہاتھوں سے بنا کر اس پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ اس درخت کے برابر میں ایک مزار بھی تھا۔

شروع شروع میں تو لوگوں نے اس پر توجہ نہیں دی پھر آہستہ آہستہ اسے کوئی پہنچا ہوا شخص سمجھنے لگے۔ اس کا بھی یہی حال تھا کہ اس نے اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

وہ ایک بے نیاز شخص معلوم ہوتا تھا۔

کسی نے ضد کر کے کچھ کھلا دیا تو کھا لیا، ورنہ خاموش رہا۔ اس کے آنے سے پہلے اس مزار کی طرف بہت کم لوگ آتے تھے۔

ایک ریلوے لائن میدان سے کچھ فاصلے سے گزرتی تھی۔ لوگ اس مزار کو ریلوے والے بابا کا مزار کہا کرتے تھے لیکن اس طرف آتے نہیں تھے۔ سوائے دو چار ملنگوں کے جو کبھی کبھی اس مزار پر آکر دھمال کیا کرتے لیکن سید بادشاہ کے آنے کے بعد لوگوں نے مزار کی طرف توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ یہ لوگ مزار کی وجہ سے نہیں بلکہ سید بادشاہ کی وجہ سے آیا کرتے جس کی حیثیت ان کے نزدیک زندہ پیر کی تھی۔

سید بادشاہ کے بارے میں کچھ کہانیاں..... مشہور ہو گئی تھیں۔ جیسے وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے اور جس کو نظر بھر کر دیکھ لیا اس کی دنیا بدل جاتی ہے۔ فلاں کے ساتھ یہ ہوا یا فلاں کے ساتھ یہ ہوا۔

لوگ چاہے کچھ بھی کہتے ہوں لیکن سید بادشاہ ان باتوں سے بے نیاز تھا۔ اس کی شہرت اس وقت زیادہ ہوئی جب ایک عورت اس سے ملنے کے لیے آئی۔

وہ شام کا وقت تھا۔ ملنگ، سید بادشاہ سے کچھ فاصلے پر دم لگانے میں مصروف تھے۔ سید بادشاہ معمول کے مطابق اپنی آنکھیں بند کیے شاید مراقبے میں تھا کہ میدان کی طرف سے ایک گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔

یہ ایک نئی گاڑی تھی۔ جو سیدھی مزار کی طرف آرہی تھی۔ ملنگ ہوشیار ہو کر اس گاڑی کو دیکھنے لگے۔ وہ گاڑی مزار کے پاس آکر رک گئی۔ اسے چلانے والا ایک ڈرائیور تھا۔ اس نے بڑے ادب سے پچھلی طرف کا دروازہ کھولا اور ایک عورت گاڑی سے باہر آگئی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔

اس نے بہت قیمتی ساڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کا قد لمبا تھا اور اس کے خوب صورت بال اس کی کمر تک آرہے تھے۔

ڈرائیور مزار کے پاس ہی رک گیا جبکہ وہ عورت سید بادشاہ کے پاس آگئی۔ ملنگ حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

دونوں ملنگوں نے دیکھا کہ اب عورت نے سید بادشاہ کو مخاطب کیا۔ اس کے مخاطب کرنے پر سید بادشاہ نے اپنی آنکھیں کھول کر اس عورت کی طرف دیکھا پھر دونوں میں کچھ باتیں ہونے لگیں جو ملنگوں کو سنائی نہیں دے رہی تھیں پھر وہ عورت اٹھ کر اپنی گاڑی کی طرف چل دی۔ گاڑی کے پاس رک کر اس نے دونوں ملنگوں کی طرف دیکھا پھر انہیں اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

دونوں ملنگ تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔

"یہ کب سے یہاں بیٹھے ہیں؟" اس عورت نے دریافت کیا۔ اس کا اشارہ سید بادشاہ کی طرف تھا۔

"ان کو تو یہاں ایک مہینا ہو گیا ہے بیگم صاحب۔" ایک ملنگ نے بتایا۔

"ان کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

"تکلیف کیسی؟" دوسرا ملنگ جوش سے بولا۔ "یہ تو ہمارے سید بادشاہ ہیں۔"

سید بادشاہ سن کر عورت کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے پھر اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ تم دونوں ان کا خیال رکھنا۔"

اس کے اشارے پر ڈرائیور نے ایک ایک ہزار روپے دونوں ملنگوں کو دیے پھر اس عورت نے مزار سید بادشاہ کی طرف دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد دونوں ملنگوں نے اچھل اچھل کر نعرے لگانے شروع کر دیے۔ "جہاں سید بادشاہ کا پیر، وہاں خیر ہی خیر۔"

ان ملنگوں میں ایک تو ویسے ہی ہمت نہیں تھی کہ وہ سید بادشاہ سے اس کے بارے میں کوئی سوال کر سکتے، اب ہزار ہزار روپے ملنے کے بعد باقی ہمت بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ صرف اچھل کود ہی کر سکتے تھے۔ "جہاں سید بادشاہ کا پیر، وہاں خیر ہی خیر۔"

لوگوں نے سید بادشاہ سے متاثر ہو کر اس کے لیے ایک جھونپڑی سی بنا دی تھی۔ سید بادشاہ کو جب آرام کرنا ہوتا تو وہ چبوترے سے اٹھ کر اس جھونپڑی میں چلا جاتا۔

اس وقت بھی وہ جھونپڑی میں آگیا۔

وہاں ایک بستر اور کچھ برتنوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سید بادشاہ نے ایک طرف رکھی ہوئی جائے نماز بچھائی اور سجدے میں چلا گیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ آہستہ آہستہ بولے جا رہا تھا۔ "میرے مولا! مجھے معاف کر دینا... میری خطاؤں کو معاف کر دینا مولا۔"

اب جھونپڑی کے باہر مزار کے پاس پولیس والوں کی ایک جیپ آکر رک گئی۔ ملنگ اس جیپ کو دیکھ کر سہم گئے۔ یہ بھی پہلا موقع تھا کہ پولیس وہاں آئی تھی۔

دو سپاہیوں کے ساتھ ایک باوردی انسپکٹر جیپ سے اترا۔ "اوئے ادھر۔" اس نے ایک ملنگ کو اپنی طرف بلایا۔ "جلدی کر۔"

ملنگ اس کے پاس پہنچ گیا۔ "جی بادشاہو۔"

"کہاں ہے وہ بہروپیا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"کس کی بات کر رہے ہو بادشاہو؟"

"اس کی بات کر رہا ہوں جس نے یہاں تماشا مچایا ہوا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کہاں ہے وہ؟"

"جہاں سید بادشاہ کا پیر، وہاں خیر ہی خیر۔" دوسرے ملنگ نے زور سے نعرہ لگایا۔

اس دوران میں علاقے والوں کو پتا چل گیا تھا کہ سید بادشاہ کے لیے پولیس آئی ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ دوڑے ہوئے چلے آئے۔ انسپکٹر کو ان لوگوں کے تیور خطرناک معلوم ہونے لگے۔

اس نے لوگوں کی طرف دیکھ کر اپنی صفائی پیش کی۔ "بھائیو! میں سید بادشاہ کے پاس ساتھ بن کر آیا ہوں۔"

تناؤ کچھ ختم ہو گیا..... انسپکٹر لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا جھونپڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ہلکے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آواز دی۔ پھر اپنے جوتے اتار کر اندر چلا گیا۔

سید بادشاہ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اس نے انسپکٹر کو بڑی ٹھنڈی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں بھی ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ ''کیا بات ہے... کیا چاہتے ہو؟''

ایک لمحے کے لیے انسپکٹر گڑبڑا کر رہ گیا۔ سید بادشاہ کا رعب اس پر غالب آنے لگا تھا۔ پھر اس کی انسپکٹری اس پر طاری ہوگئی۔ ''سید بادشاہ! کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنے خدا کا ایک حقیر بندہ۔'' سید بادشاہ نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ کیوں آئے ہو میرے پاس؟''

''بستی والوں کو تم سے شکایتیں ہیں۔'' انسپکٹر نے بتایا۔

''مجھ سے شکایت؟'' سید بادشاہ مسکرا دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ بستی والے باہر جمع ہیں۔ میں خود ہی ان سے پوچھ لیتا ہوں کہ مجھ سے انہیں کیا تکلیف پہنچی ہے۔''

انسپکٹر گڑبڑا کر رہ گیا۔ ''کوئی بات نہیں سید صاحب! آپ آرام کریں۔ میں خود ان سے بات کرلوں گا، آپ پریشان نہ ہوں۔''

سید بادشاہ مسکراتا رہا۔ انسپکٹر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

☆☆☆

ایک سوزوکی آکر رک گئی۔

اس سوزوکی میں دیگیں رکھی ہوئی تھیں۔ بریانی... اور زردے کی۔ سوزوکی کے رکتے ہی چاروں طرف سے لوگ امنڈ پڑے۔

یہ لنگر لینے آئے تھے۔ بھکاری مرد عورتیں اور بچے۔ ان کے ساتھ گاڑیاں دھونے والے، پالش کرنے والے، دو چار خوانچے والے بھی آکر اس ہڑبونگ میں شامل ہوگئے تھے۔

راجو ایک طرف کھڑا بڑی حسرت سے سوزوکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سوزوکی پر کھڑے ہوئے دو آدمیوں نے بریانی بانٹنی شروع کردی تھی۔

بریانی کی خوشبو پارکنگ میں پھیلی ہوئی تھی۔

ایک طرف سے بھورے نے آکر راجو کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا بات ہے... تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟ آگے بڑھ۔''

''بھورے بھائی! میں نہیں لے سکتا۔'' راجو نے کہا۔ ''اتنی مار ماری جو ہو رہی ہے۔''

''اسی میں تو مزہ ہے یار۔'' بھورا ہنس پڑا۔ ''زیادہ مت بن۔ آ میرے ساتھ۔ ورنہ منہ دیکھتا رہ جائے گا۔''

بھورے کی ایک خوبی تھی کہ وہ ایسی عجیب وغریب آوازیں نکالتا تھا کہ اس کے آگے کھڑے لوگ بدک جاتے تھے۔ اس وقت بھی اس نے یہی تکنیک استعمال کی۔

لوگ دائیں بائیں ہو گئے اور وہ راجو کو کھینچتا ہوا سوزوکی کے پاس لے آیا۔ ایک بڑا تھیلا راجو کو ملا تھا اور ایک بھورے کو۔ ایک چھوٹے تھیلے میں مٹھا بھی ان کے ہاتھ آگیا۔

وہ دونوں اس بھیڑ سے کٹ کر پل کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ یہی جگہ ان کا گھر تھی۔ راجو، بھورے اور ان جیسے نہ جانے کتنے بچے اسی پل کے نیچے گتے کی چادریں بچھا کر سویا کرتے تھے۔

راجو بھاگ کر ایک بوتل میں پانی بھر کر لے آیا تھا۔ بریانی کے شاپرز پھاڑ کر دونوں نے کھانا شروع کردیا۔ بریانی بہت مزے کی تھی۔

''یار بھورے بھائی! ایک بات تو بتا۔'' راجو نے پوچھا۔ ''یہ لوگوں کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آجاتے ہیں؟''

''ابے اس شہر میں ایک سے ایک پڑے ہیں۔'' بھورے نے بتایا۔ ''اگر چاہیں تو پورے شہر کو دونوں ٹائم کا کھانا کھلا دیں۔''

''پھر ہم ایسے کیوں ہیں... ہمارے پاس پیسے کیوں نہیں ہیں؟''

''میرے راجا! ہم سب فٹ پاتھ کی اولاد ہیں... اسی لیے۔'' بھورے نے برا سا منہ بنایا۔ ''ہمارے ماں باپ ہمیں پیدا کر کے یہیں ڈال گئے تھے۔ اسی لیے ہم ایسے ہیں۔''

''ہمارے ماں باپ کہاں ہوں گے؟''

''ابے یار... یہ میرے کو کیا معلوم۔ ہوں گے کہیں نہ کہیں۔'' بھورے نے کہا۔ پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھ، وہ آگئی تیری چمک چھلو۔''

راجو خوش ہوگیا۔

وہ لڑکی جو اس سے گاڑی دھلوایا کرتی تھی، ایک موچھوں والے آدمی کے ساتھ کھڑی تھی۔ ''یار! یہ سالا کون ہے؟'' بھورے نے پوچھا۔

''بھائی ہوگا اس کا۔''

''ابے جا... بھائی ایسے نہیں ہوتے۔'' بھورا معنی خیز انداز میں بولا۔ ''مجھے تو یہ اس کا یار معلوم ہوتا ہے۔''

راجو نہیں جانتا تھا کہ یہ یار کیا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اسے بھورے کی یہ بات بری لگی تھی۔ حالانکہ اس لڑکی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، کوئی رشتہ نہیں تھا، اس کے باوجود اس کی خواہش ہوئی کہ کوئی اسے برا نہ سمجھے۔

بھورا اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ وہ آدھی بریانی چھوڑ کر اس لڑکی کے پاس آگیا جو اسے دیکھ کر پُرجوش انداز میں بول پڑی تھی۔ ''ارے کہاں رہ گئے تھے تم؟'' اس نے پوچھا۔ ''میں تو کب سے تمہیں تلاش کررہی تھی۔''

''ڈارلنگ! کیا خاص بات ہے اس لڑکے میں جو تم اسی سے گاڑی دھلوانے کی ضد کررہی ہو؟''

''یہ بہت اچھا بچہ ہے۔'' اس لڑکی نے کہا۔ ''بہت ایمان داری اور محنت سے کام کرتا ہے۔'' پھر اس نے راجو کی طرف دیکھا۔ ''چلو راجو، اپنا کام شروع کرو۔ ہم ابھی مارکیٹ سے ہو کر آتے ہیں۔''

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مارکیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ راجو کو اس آدمی پر غصہ آنے لگا۔ وہ آدمی اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ میم صاحب تو بہت اچھی تھی۔ اتنی خوب صورت، اتنی رحم دل۔

وہ گاڑی دھوتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کافی دیر بعد وہ دونوں مارکیٹ سے واپس آگئے۔ دونوں نے بہت سے شاپرز تھام رکھے تھے۔ یعنی دونوں نے خوب شاپنگ کی تھی۔

''شاباش!'' لڑکی نے اس کی طرف پچاس کا ایک نوٹ بڑھا دیا۔ ''لو، یہ رکھ لو۔''

''کیا کر رہی ہو؟'' موچھوں والے نے نوٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ ''میں روپے بہت ہیں۔ زیادہ کیوں دے رہی ہو؟''

''بس یونہی۔''

''مت دیا کرو۔ اس طرح ان سالوں کی عادتیں خراب ہوجاتی ہیں۔'' اس آدمی نے اپنی جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر راجو کی طرف بڑھا دیے۔ ''لو یہ رکھ لو اور آئندہ سے میم صاحب کو بے وقوف مت بنانا، ورنہ ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گا۔''

راجو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اپنی بالٹی اٹھائی اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ وہ لڑکی اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔

''کتا... کمینہ۔'' راجو زیرلب اس آدمی کو گالیاں دینے لگا۔ ''اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟ میم صاحب سے کہوں گا کہ اس آدمی کے ساتھ نہ رہیں۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔''

وہ دن بھر اداس رہا جیسے اس کے اندر نوٹ چھوت سی مچی ہوئی ہو۔

رات اس کے لیے بہت بھیانک بن کر آیا کرتی تھی۔

پل کے نیچے جہاں وہ سب سویا کرتے تھے، وہاں سے کچھ فاصلے پر پبلک لیٹرین بنا ہوا تھا۔ اس کے گٹر کا پانی عام طور پر بہتا ہوا اسی جگہ آجاتا جہاں پر ان کے بستر بچھے رہتے تھے۔

بستر کیا تھے، بدبودار دریاں، پھٹے ہوئے تکیے، بوریاں اور گتے کے ٹکڑے۔ رات بھر مچھر انہیں تنگ کیے رہتے لیکن یہ ہر احساس سے ماورا ہو کر سو جایا کرتے تھے۔

مچھروں سے زیادہ تکلیف دہ آوارہ قسم کے ملنگ اور بھکاری تھے جو وہیں پر آکر چرس کے سگریٹ پیا کرتے جس کی بدبو سے راجو کا دماغ پھٹتا رہتا۔

ان ملنگوں اور بھکاریوں کے علاوہ کچھ دوسرے قسم کے فنڈے بھی تھے۔ یہ بہت بے شرم اور بدمعاش قسم کے لوگ تھے۔ ان میں سے دو چار تو راجو سے عجیب باتیں کیا کرتے۔

راجو کو ان کی باتیں سن کر غصہ آجاتا لیکن وہ سوائے رونے کے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

اسے یاد نہیں آتا تھا کہ وہ ہے کون؟ اس کے ماں باپ کون ہیں؟ اور وہ اس جگہ کہاں سے آگیا؟ بس جیسے اس کی آنکھیں کھلیں، اسے شعور آیا تو اس نے خود کو اسی جگہ دیکھا۔

اگر بھورا اس کا ساتھ نہیں دیتا تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوجاتا۔ بھورے ہی نے اسے گاڑیاں دھونے کے کام پر لگا دیا تھا جس سے اس کے پاس اتنے پیسے ہوجاتے کہ وہ وقت کا کھانا خرید لیتا۔ بس اس سے زیادہ اس کی زندگی میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔

اس رات نہ جانے کیوں اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور پولیس والے کو اپنے پاس کھڑا دیکھ کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

یہ وہی پولیس والا تھا جو اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ اس وقت اس کا آنا راجو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اس کے سارے ساتھی بے خبر سو رہے تھے۔

پولیس والے نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ ''اوئے چل میرے ساتھ۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''کہاں؟'' راجو نے سہم کر پوچھا۔

''چل، نخرے مت کر۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ تھانے لے چلوں گا۔''

راجو کو اپنے پاس، اپنے پیروں کے قریب ایک بڑا سا پتھر دکھائی دے گیا۔ نہ جانے اس وقت اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے جھک کر پتھر اٹھایا اور اسی تیزی سے پولیس والے کے سر پر دے مارا۔

پولیس والا چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا۔ راجو نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ وہ اپنے عقب میں کئی آوازیں سن رہا تھا لیکن وہ دوڑتا چلا گیا۔

☆☆☆

ملنگوں نے اور سید بادشاہ کے عقیدت مندوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس عورت کے آنے کے بعد سے سید بادشاہ بہت پریشان رہنے لگا ہے۔

اس کی پریشانی اس کے چہرے سے ظاہر ہوا کرتی تھی۔ اس بستی کے ایک آدمی منیر نے سید بادشاہ کے قریب ہی اپنا ڈیرا لگا لیا تھا۔ سید بادشاہ نے اگرچہ اس سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس نے خود اپنے طور پر سید بادشاہ اور اس مزار کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لی تھی۔

وہ سید بادشاہ کے کھانے پینے کا خیال رکھتا۔ اسے یہ اندازہ تھا کہ سید بادشاہ کا موڈ اس وقت کیسا ہے۔ کیا وہ لوگوں سے ملنا چاہتا ہے یا نہیں۔

وہ اسی حساب سے لوگوں سے معاملات کیا کرتا۔ سید بادشاہ بھی اس کی خدمات سے بہت متاثر معلوم ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی منیر سے باتیں بھی کر لیا کرتا۔

منیر ہی نے سید بادشاہ کے بارے میں کئی طرح کی کہانیاں مشہور کر دی تھیں۔ جیسے سید بادشاہ رات بھر عبادت کیا کرتا ہے، ایک سے ایک جن اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن سید بادشاہ نے منیر سے پوچھا۔ ''منیر! تم نے میرے بارے میں لوگوں کو کیسی باتیں بتا رکھی ہیں؟''

''نہیں تو سرکار۔'' منیر جلدی سے بولا۔ ''میں نے تو آپ کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔''

''میرے خلاف نہیں... میرے حق میں کی ہیں۔'' سید بادشاہ نے کہا۔ ''جیسے میں رات بھر جاگ کر عبادت کیا کرتا ہوں۔''

''یہ غلط تو نہیں ہے سرکار! میں نے تو خود آپ کو ساری ساری رات جاگتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''جاگنا اور بات ہے... عبادت اور بات ہے۔'' سید بادشاہ نے کہا۔ ''میں عبادت کہاں کرتا ہوں... اور میری خدمت میں آنے والے جنوں کو تم نے کہاں سے دیکھ لیا؟''

''سرکار۔'' منیر نے اپنی گردن جھکا لی۔ ''بات یہ ہے سرکار کہ ان لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ورنہ یہ لوگ آپ کی عزت کرنا چھوڑ دیں۔''

''یہ جھوٹی عزت ہے منیر خان۔'' سید بادشاہ نے کہا۔ ''آئندہ سے احتیاط رکھنا۔''

''جی اچھا سرکار۔'' منیر جلدی سے بولا۔ پھر اس نے سید بادشاہ کی طرف دیکھا۔ ''سرکار! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

''سرکار! میں کئی دنوں سے آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں۔ خاص طور پر اس دن سے جب ایک حکیم صاحب آپ کے پاس آئی تھیں۔ آخر پریشانی کیا ہے سرکار! آپ دوسروں کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ آپ بتائیں سرکار... ہوسکتا ہے ہم گناہ گاروں کی دعائیں آپ کے کام آجائیں۔''

''منیر!'' سید بادشاہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟''

''نہیں سرکار! اور جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''جاننا چاہیے تمہیں۔'' سید بادشاہ نے کہا۔ ''ان لوگوں کو بھی جان لینا چاہیے جو میرے آگے پیچھے ہوتے ہیں، جو میری عزت کرتے ہیں۔ جان لینا چاہیے کہ میں کون ہوں... تاکہ وہ دھوکے میں نہ رہیں۔''

منیر خان کے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ سید بادشاہ اپنے حوالے سے کوئی انکشاف کرنے جا رہے تھے۔

''بتائیں سرکار کہ آپ کون ہیں؟'' منیر نے پوچھا۔

''کیا تم نے کبھی تنویر سایا کا نام سنا ہے؟'' سید بادشاہ نے پوچھا۔

''تنویر سایا!'' منیر جھرجھری لے کر رہ گیا۔ ''جی ہاں سرکار! کئی بار اس کا نام سن چکا ہوں۔ وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔ سایا اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سائے کی طرح غائب ہو

جاتا ہے۔''

''خدا تمہارا بھلا کرے۔ تنویر سایا وہ آدمی ہے جس نے صرف کسی کا خون نہیں کیا ہے، کسی کو مارا نہیں ہے۔ یعنی اس پر قتل کا کوئی الزام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ دنیا بھر کے جرائم کر چکا ہے۔''

''جی ہاں سرکار! اس کی دہشت ہی بہت ہے۔'' منیر نے کہا۔ ''لیکن تنویر سائے سے آپ کا کیا تعلق ہے؟''

''وہ تنویر سایا میں ہی ہوں۔'' سید بادشاہ نے بتایا۔

''کیا؟'' منیر نے حیرانی سے کہا۔ ''آپ ہیں سرکار؟''

''ہاں، وہ میں ہی ہوں۔ تمہیں شاید نہیں معلوم ہو کہ میری تلاش میں یہاں پولیس بھی آئی تھی لیکن انسپکٹر مجھ سے مل کر واپس چلا گیا۔ جانتے ہو کیوں؟ وہ اس لیے کہ عین وقت پر اس کو فون کر کے کسی نے کہا تھا کہ مجھے پریشان نہ کیا جائے اور فون کرنے والا ایسا شخص تھا کہ انسپکٹر اس کی بات سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ باتیں بناتا ہوا واپس چلا گیا۔''

''کس نے فون کیا ہوگا سرکار؟''

''کسی ایسے شخص نے جو شاید مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہے۔'' سید بادشاہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''کیونکہ میں ابھی بھی ہزاروں کام کر سکتا ہوں۔ وہ شخص ابھی میرے سامنے نہیں آیا ہے لیکن اس نے مجھ پر اپنے احسان کا ایک پتھر پھینک دیا ہے۔''

''لیکن سرکار! تنویر سایا جیسا آدمی اس حال کو کیوں آگیا ہے؟'' منیر نے پوچھا۔ ''آپ نے ایسی شان دار زندگی کیوں چھوڑ دی؟''

''اس لیے کہ وہ زندگی صرف نام کی شان دار تھی منیر۔'' سید بادشاہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''کچھ بھی نہیں رکھا تھا اس میں۔ مجھ پر کسی کی نظر کرم ہو گئی تھی اور اس وقت احساس ہوا کہ ارے میں تو دھوکے والی زندگی گزار رہا ہوں۔ اصل زندگی تو کچھ اور ہے۔ تم جانتے ہو، میرے بینک اکاؤنٹ میں کروڑوں روپے ہیں۔ میرا شان دار گھر ہے، کئی گاڑیاں ہیں۔ میں سب یونہی چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔''

''لیکن کیوں؟ آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

''اس لیے کہ کسی کی نگاہ نے میرے اندر کی دنیا بدل دی تھی۔'' سید بادشاہ نے بتایا۔ ''وہ ایک قلندر تھا۔ میں ایک دن اپنی گاڑی پر جا رہا تھا کہ وہ راستے میں مل گیا۔ میں اس وقت کسی سگنل پر جا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ دے کر گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر گاڑی روک دی۔ وہ میرے پاس آیا، کھڑکی کے پاس۔ اس نے اپنی نگاہیں مجھ پر جما دیں۔ کیا بتاؤں ان نگاہوں میں کیا تھا، کیسی دنیائیں آباد تھیں۔'' اس نے کہا۔ ''کیوں دنیا کا کتا بنا ہوا گھوم رہا ہے... سب کچھ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

سید بادشاہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ''پھر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ دنیا ترک کر دی۔ میں نے شادی نہیں کی ہے، اسی لیے اس قسم کا بھی کوئی جھنجٹ نہیں ہے میرے ساتھ۔ بہت دنوں تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ پھر یہاں آکر بیٹھ گیا۔ یہ ہے میری کہانی۔ وہ تنویر سایا تو مر چکا ہے جبکہ میرا کوئی نام نہیں ہے۔ تم لوگ مجھے سید بادشاہ پکارنے لگے ہو جبکہ میں نہ تو سید ہوں اور نہ بادشاہ ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہوں میں۔''

''آپ ہمارے لیے بہت کچھ ہیں سرکار۔'' منیر کے لہجے میں عقیدت تھی۔ ''آپ جو بھی ہیں، بہت بڑے آدمی ہیں آپ۔ آپ ذرا اپنی کٹیا سے نکل کر تو دیکھیں، کتنے لوگ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''منیر! تم نے اچھا یاد دلایا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو اپنے بارے میں بتا دوں کہ میں کون ہوں۔ یہ بے چارے مجھے آسمان سے اترا ہوا سمجھ رہے ہیں۔ میں ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ اچھا ہے کہ یہ میرا اصل چہرہ دیکھ لیں۔''

منیر نے منع کیا کہ سید بادشاہ ایسا نہ کریں لیکن سید بادشاہ اپنی جھونپڑی سے باہر آگیا جہاں تین چار سو کے قریب لوگ جمع تھے۔

سید بادشاہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ عقیدت سے نعرے لگانے لگے۔ ''جہاں سید بادشاہ کا ڈیرہ، وہاں خیر ہی خیر۔''

''ٹھہرو، میری بات سنو۔'' سید بادشاہ نے بلند آواز میں کہا۔ ''جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ تم لوگ کیوں میرے پیچھے اپنا وقت برباد کر رہے ہو؟ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ میں ایک مجرم ہوں۔ گناہ گار آدمی ہوں۔ تم لوگوں نے تنویر سائے کا نام سنا ہوگا۔ میں وہی تنویر سایا ہوں۔''

لوگوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سید بادشاہ اپنی دھن میں بولتا جا رہا تھا۔ ''لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں خود کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیدھا اور سچا راستہ مل چکا ہے۔ میں اس راہ پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم لوگ میرا ساتھ دو، دعا کرو میرے لیے۔"

لیکن لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ کچھ دیر بعد سید بادشاہ اور منیر کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

کتنا بڑا جرم تھا اس کا۔

راجو نے ایک پولیس والے کا سر پھاڑ دیا تھا۔ اس نے خود دیکھا تھا کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ پولیس والا تو ویسے ہی خوں خوار اور خطرناک آدمی تھا۔

اگر راجو اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو نہ جانے اس کا کیا حشر کر دیتا اس لیے وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا۔ بغیر سوچے سمجھے دوڑتا چلا گیا۔

رات کے خوف زدہ کر دینے والے سائے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ صرف وہ پولیس والا نہیں بلکہ اور بھی بہت سے لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ سب اسے مار دینا چاہتے ہیں۔

لیکن کوئی بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف رات تھی جو اس کے دامن سے لپٹ گئی تھی۔ دوڑتے دوڑتے وہ اس پارکنگ سے بہت دور آ گیا۔ اس کا سینہ سانسوں سے دھونکنی بنا ہوا تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔

دور سے ایک گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کہیں کوئی چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ گاڑی کی تیز روشنی نے اسے نہلا دیا۔

وہ جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ ٹائر چرچرائے اور وہ گاڑی اس کے پاس آ کر رک گئی۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی گاڑی سے اترا۔ کسی کے قدموں کی آہٹ قریب آنے لگی۔ پھر کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی۔ "ارے راجو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی۔ وہی مہربان لڑکی جو اتنی رات گئے نہ جانے کہاں سے آ رہی تھی۔ "ارے بتاؤ نا... یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں نے جی... پولیس والے کا سر پھاڑ دیا تھا۔" راجو نے بتایا۔

"وہ کیوں؟"

"وہ جی... وہ مجھ سے گندی گندی باتیں کرتا تھا۔"

"سمجھ گئی۔ لوگ بھی بہت کمینے ہوتے ہیں۔" لڑکی نے ایک گہری سانس لی۔ "اب بتاؤ، کہاں جاؤ گے؟ کوئی ٹھکانا ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں، مجھے نہیں معلوم کہاں جاؤں گا۔"

"چلو میرے ساتھ۔" لڑکی نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

راجو اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی کی گاڑی میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ یہ لڑکی بہت اچھی تھی۔ راجو نے کسی سے فرشتوں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ لڑکی فرشتہ ہی ہو سکتی ہے۔ کیا فرشتہ ایسا ہی ہوتا ہے؟ مہربان، محبت کرنے والا، پناہ دینے والا۔

راستے میں اس لڑکی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ایک خوب صورت سے فلیٹ میں لے آئی۔

راجو نے فلیٹ بھی پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی سجاوٹ اسے حیران کر رہی تھی۔ بقول بھورے کے ہر چیز اش اش کر رہی تھی۔

خوب صورت نازک فرنیچر، بڑا سا ٹی وی، فرش پر بچھے ہوئے قالین، دیواروں کی پینٹنگ۔ اس نے سوچا کہ یہ لڑکی کوئی بہت امیر لڑکی ہے جس کے پاس اتنے پیسے ہیں۔ ایسی چیزیں اس نے دکانوں میں سجی ہوئی دیکھی تھیں۔

"تم نے کچھ کھایا تو نہیں ہوگا؟" لڑکی نے پوچھا۔

راجو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ شرما رہا تھا۔ لڑکی اس کا ہاتھ تھام کر اسے کچن میں لے آئی۔ یہ کچن بھی بہت بڑا تھا۔

ہر طرف سلیقے سے چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بہت بڑا فریج بھی تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹی میز اور تین کرسیاں تھیں۔

لڑکی نے جلدی جلدی اس کے لیے انڈے فرائی کر دیے اور دو سلائس اس کے سامنے رکھ دیے۔

"یہ لو، اس وقت تو یہی سب ہے۔ پیٹ تو بھر جائے گا نا؟"

"ہاں جی۔" راجو نے جواب دیا۔

"چلو، پھر شروع ہو جاؤ۔" لڑکی نے کہا۔

راجو کے ساتھ ایسی مہربانی تو کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ فارغ ہونے کے بعد اس نے لڑکی سے پوچھا۔ "آپ کا نام کیا ہے جی؟"

"ارے یہ لو... تمہیں میرا نام بھی نہیں معلوم۔" لڑکی ہنس پڑی۔ "میرا نام نیلم ہے۔ اور تمہارا نام تو میں جانتی ہوں۔ راجو... ہے نا؟"

"ہاں جی۔"

"دیکھو، یہاں ایک اسٹور روم بھی ہے۔" نیلم نے بتایا۔ "بہت بڑا ہے۔ تم اس میں سو جانا۔ وہاں بستر بھی ہوگا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

"نہیں جی، کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

نیلم نے اسے اسٹور روم دکھا دیا۔ "اب جاؤ، جا کر آرام کرو۔ وہ پولیس والا یہاں نہیں آئے گا۔"

"ایک اور بات پوچھوں جی؟"

"چلو، وہ بھی پوچھ لو۔"

"کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟"

"ہاں، یہی سمجھ لو۔" نیلم نے ایک گہری سانس لی۔

"چلو سو جاؤ۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔"

راجو کو پہلی بار آرام دہ گدے والا بستر ملا تھا۔ خوب مزے کی نیند آئی تھی اس کو۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خواب میں اسی پولیس والے کو دیکھتا رہا تھا جس کا سر پھٹ چکا تھا اور جس کا چہرہ خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

دوسری صبح اس کی آنکھ نیلم اور کسی مرد کی آوازوں سے کھلی۔ وہ مرد زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی بھاری آواز اسٹور روم تک آ رہی تھی۔ "آخر کیا ضرورت تھی اتنی ہمدردی کی؟ یہ لوگ چور ہوتے ہیں۔"

"یہ لڑکا ایسا نہیں ہے۔" نیلم کی آواز آئی۔ "میں بہت دنوں سے اس کو جانتی ہوں۔"

"کیا جانتی ہو... یہی نا کہ وہ پارکنگ میں گاڑیاں دھونے کا کام کرتا ہے؟"

"کم آن راٹھور! وہ اچھا لڑکا ہے۔ ہمارے دس کام آ سکتا ہے۔"

"اچھا بھئی، تمہاری مرضی۔" مرد کی آواز آئی۔ "بلاؤ اس کو... ذرا سمجھا دوں۔"

راجو نے بستر لپیٹ کر سلیقے سے ایک طرف رکھ دیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ مونچھوں والا آدمی اسے اچھا نہیں معلوم ہوا تھا اور اب تو وہ غصے میں بھی تھا۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔

اسٹور کا دروازہ کھلا اور نیلم دکھائی دی۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ راجو کو لے کر اس کمرے میں آ گئی جہاں وہ مونچھوں والا شخص بڑے ٹھاٹ سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ راجو کو دیکھتے ہی گرجنے لگا۔ "تو اس کو بے وقوف بنا کر یہاں بھی پہنچ گیا۔" اس نے نیلم کی طرف اشارہ کیا۔

راجو چپ رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ اس آدمی نے پھر کہا۔ "دیکھ، میں پولیس کا آدمی ہوں اگر تو نے یہاں رہ کر بدمعاشی کی نا تو سیدھا اندر کر دوں گا... سمجھا۔"

"او ہو راٹھور! اب بچے کو کیا دھمکا رہے ہو۔" نیلم نے مداخلت کی۔ "یہ کچھ نہیں کرے گا۔" پھر اس نے راجو کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جاؤ۔ جا کر منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر لو۔"

ناشتا کرتے ہوئے راجو یہی سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی کتنی اچھی ہے اور یہ آدمی کتنا خراب ہے۔ نہ جانے اس لڑکی سے اس کا کیا تعلق ہے؟

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس لڑکی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت آرام دہ صوفے پر کسی شہزادی کی طرح شان سے بیٹھی ہوئی تھی۔

راجو اس کے صوفے کے پاس قالین پر ہی بیٹھ گیا۔ نیلم نے دوسرے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "جاؤ اس پر بیٹھو۔ نیچے کیوں بیٹھے ہو؟"

راجو جھجکتا ہوا دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ "بی بی جی! تم سے ایک بات پوچھوں؟"

"تم سے نہیں آپ سے۔" لڑکی نے کہا۔

"جی، آپ سے۔ آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو۔"

"یہ جو صاحب آئے تھے، یہ آپ کے کون ہیں جی؟" اس نے پوچھا۔ "آپ ان کی بیوی ہیں؟"

"نہیں، میں ان کی بیوی نہیں ہوں۔ ان کی داشتہ ہوں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "پتا نہیں، تم داشتہ سمجھتے ہو یا نہیں۔ بہرحال، میں ان کی بیوی جیسی تو ہوں لیکن ان سے میری شادی نہیں ہوئی ہے۔"

☆☆☆

اب صرف وہ دونوں رہ گئے تھے... سید بادشاہ اور منیر۔

وہ گاؤں ان کے لیے مناسب نہیں تھا۔ وہاں کے لوگوں کی عقیدت یہ جان لینے کے بعد ختم ہو گئی تھی کہ سید بادشاہ دراصل [illegible] رہا ہے۔

اس نے اگرچہ اپنے آپ کو بدل لیا تھا لیکن کیا ضروری تھا کہ وہ پھر سے اپنی راہ پر نہیں آ جاتا۔ یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے نقلی روپ دھار رکھا ہو۔ اسی لیے بستی والوں نے سید بادشاہ سے کترانا شروع کر دیا۔ صرف منیر اس کے ساتھ چپکا رہ گیا تھا۔ سید بادشاہ اس سے کہا کرتا۔ "منیر! اب تم کیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ساتھ لگے ہو بابا! میرے پاس تو تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"نہیں سرکار! میں نے جان لیا ہے کہ آپ کون ہیں۔" منیر بولا۔ "اس لیے میں تو آپ کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔"

"ٹھیک ہے بھائی تو پھر میرے ساتھ ساتھ سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا۔"

وہ اس آبادی سے نکل کر کہیں اور آ گئے۔ منیر بھی ایک تنہا انسان تھا اس لیے اسے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

یہ دوسری آبادی شہر کے دوسرے کونے میں تھی۔ یہاں انہوں نے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ "منیر! سوال یہ ہے کہ ہم یہاں کیا کریں گے؟" سید بادشاہ نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ پیٹ بھرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"آپ بتائیں سرکار۔"

"میں کپڑوں کی رنگائی کا بہت اچھا کاریگر بھی ہوں۔" سید بادشاہ نے بتایا۔ "یہاں چھوٹے چھوٹے بے شمار کارخانے ہیں، کہیں نہ کہیں ملازمت مل ہی جائے گی۔"

"نہیں سرکار! میں آپ کو کسی کی ملازمت نہیں کرنے دوں گا۔" منیر نے کہا۔ "یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔"

"شان!" سید بادشاہ مسکرا دیا۔ "یہ شان وغیرہ ہی تو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو دھوکے میں رکھتی ہیں۔ خیر، چلو ایک دوسرا کام بھی ہے۔ میں سبزیوں کا ٹھیلا لگا لیتا ہوں۔ اتنی رقم ہے میرے پاس۔"

"سرکار! یہ بھی..." منیر نے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں، اب کچھ مت کہنا بلکہ تم اس کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔" سید بادشاہ نے کہا۔ "وہ اس طرح کہ سبزی منڈی سے سبزیاں تم لے کر آیا کرو گے اور سبزیاں میں فروخت کروں گا... اور اس دوران میں تم گھر کے کام سنبھالتے رہنا۔"

"ہاں سرکار! یہ سب سے بہتر ہوگا۔"

دونوں کے بعد وہ محلے والے ایک نئے سبزی فروش کو دیکھ رہے تھے جو کسی طرح سبزی فروش نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک خوب صورت انسان تھا اور اس کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔

وہ دوسرے سبزی فروشوں کی طرح شور بھی نہیں مچایا کرتا اور نہ ہی آوازیں لگاتا بلکہ چپ چاپ کھڑا رہتا۔ اس کے باوجود جو ایک بار اس سے سبزیاں خرید لیتا، وہ کسی اور طرف نہیں جایا کرتا۔ اس نے اپنا منافع بھی کم سے کم رکھا ہوا تھا۔ اسی لیے اس کی سبزیاں سب سے سستی ہوا کرتیں۔

دوسرے ٹھیلے والوں کو یہ بات پسند نہیں آ رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ آدمی گاہک کو خراب کر رہا ہے۔ ان ٹھیلے والوں میں فضلو کی بہت دھاک تھی۔ وہ کسی زمانے میں بدمعاش رہ چکا تھا اور اب بھی بدمعاشی کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔

وہ ایک لمبا چوڑا پہلوان قسم کا انسان تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ سامنے والے انسان کو ڈھیر کرنے میں اسے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔ وہ سبزی فروشوں کا ایک طرح سے لیڈر بنا ہوا تھا۔

وہ اپنے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکاتا ہوا سید بادشاہ کے پاس آ گیا۔ "کیوں بھئی پہلوان! تم نے یہ کیا لگا رکھا ہے؟"

"کیا بات ہو گئی بھائی؟" سید بادشاہ نے نرمی سے پوچھا۔

"یہ تم سبزیاں اتنی سستی کیوں بیچتے ہو؟" فضلو نے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس حرام کی آتی ہیں؟"

"حرام کی تو نہیں آتیں لیکن میں حرام کی نہیں کھاتا۔"

"تو کیا ہم حرام کی کھاتے ہیں؟"

"دیکھو بھائی۔" سید بادشاہ نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "مجھ سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سبزیاں اگر مفت بھی دے دوں تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے؟ یہ تو میری اپنی چیز ہے نا۔"

فضلو کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سید بادشاہ کو دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ منیر کو جب معلوم ہوا تو وہ تڑپ اٹھا۔ "سرکار! اگر آپ حکم دیں تو اس کی آنتیں نکال دوں؟"

"ہرگز نہیں۔" سید بادشاہ جلدی سے بولا۔ "ہم یہاں اس لیے نہیں آئے ہیں۔"

سبزی فروش فضلو کے لیے سید بادشاہ کی موجودگی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بہت سے گاہک ٹوٹ کر سید بادشاہ کی طرف جانے لگے تھے۔

اس نے ایک دن طیش میں آ کر سید بادشاہ کو للکار ہی دیا۔ "دیکھ بھائی، تو اب اپنا بوریا بستر اٹھا کر یہاں سے نکل لے۔"

"دیکھو، میں جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔" سید بادشاہ نے کہا۔ "میری ذات سے تمہیں کیا نقصان ہو رہا ہے؟"

"ابے بھئی بات تو یہ ہے کہ میں اس محلے میں تجھے برداشت کر ہی نہیں سکتا۔" فضلو سیدھا پھلا کر بولا۔ "بہتر یہ ہے کہ یہاں سے چلا جا، ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا پھر تجھے بچانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔"

"بھائی، میرا خیال ہے کہ بچانے والا صرف ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہر ایک کو بچا لیتا ہے۔"

"زیادہ مولوی مت بن۔" فضلو نے کہا۔ "ہاں یا نہ میں جواب دے... تو جا رہا ہے یا نہیں؟"

اس جھگڑے کو دیکھنے کے لیے اور بھی بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے جو ٹھیلے والے تھے، وہ فضلو کی طرف دار تھے جبکہ دوسرے لوگ سید بادشاہ کی حمایت میں تھے لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ فضلو کو منع کر سکیں۔

سید بادشاہ کے نرم رویے کو دیکھ کر فضلو شیر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک گالی دیتے ہوئے لپک کر سید بادشاہ کا گریبان تھام لیا۔

لوگوں نے صرف اتنا ہی دیکھا تھا کہ فضلو نے سید بادشاہ کا گریبان تھام لیا ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکے کہ وہ خود کس طرح اڑتا ہوا فٹ پاتھ پر جا گرا تھا۔

فضلو کے غبارے کی ہوا نکل گئی تھی۔

وہ شرمندگی مٹانے کے لیے کچھ دیر تک یونہی پڑا رہا۔ پھر سید بادشاہ کو غصے بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

تماشا دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ سید بادشاہ تو کمال کا آدمی ثابت ہوا تھا۔

اس رات منیر نے اس سے کہا۔ "سرکار! میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ جو ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔ فضلو اور اس کے ساتھی بہت برے لوگ ہیں۔"

"نہیں منیر! وہ برے لوگ نہیں ہیں۔ بس ذرا بہکے ہوئے لوگ ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن دوسری صبح ایک اور کہانی سامنے آ گئی۔

پولیس کی ایک موبائل سید بادشاہ کے ٹھیلے کے پاس آ کر رک گئی اور اس میں سے کچھ پولیس والے اتر کر سید بادشاہ کے پاس آ گئے۔ "اوئے! اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے۔"

"کیوں بھائی، میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟" سید بادشاہ نے پوچھا۔

"فضلو کا قتل کر کے پوچھ رہا ہے کہ تو نے کیا کیا ہے؟"

"فضلو کا قتل؟" سید بادشاہ حیران رہ گیا۔

"ہاں، تو نے کل دن میں اس سے جھگڑا کیا اور رات کو اس کا خون کر دیا۔"

☆☆☆

نیلم کے فلیٹ میں راجو کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس نے راجو کے لیے بہت سے جوڑے بھی خرید لیے تھے۔ راجو اب نیلم کو آپا کہنے لگا تھا۔

ایک دن اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "بی بی! ایک بات بتائیں... آپ کیوں میرا خیال رکھتی ہیں؟"

"اس لیے کہ تم میرے بھائی کی طرح ہو۔" نیلم نے کہا۔ "وہ بھی اب تمہاری عمر کا ہو گیا ہوگا۔ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔"

"تو اب وہ کہاں ہے بی بی؟ وہ کیوں چلا گیا؟"

"وہ نہیں گیا بلکہ میں چلی گئی۔" نیلم نے بتایا۔ "میری آنکھوں پر کسی نے پٹی باندھ دی تھی۔ مجھے اچھائی برائی کی تمیز نہیں رہی تھی۔ میں شوبز کی دنیا میں آنا چاہتی تھی۔ گھر والے منع کرتے رہے لیکن میری ایک دوست نے مجھے بہکا رکھا تھا۔ میں اس کے بہکاوے میں آ کر سب کو چھوڑ کر گھر سے نکل گئی۔ میں نے اپنے پیار کرنے والوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد میرے ساتھ کیا کیا ہوتا رہا، میں یہ نہیں بتا سکتی۔ بہرحال، اب میں راشور کے ساتھ ہوں اور یہ میری ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔"

"بی بی! آپ پھر گھر نہیں گئیں؟" راجو نے پوچھا۔

"ایک بار گئی تھی لیکن انہوں نے میرے لیے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ وہ دروازہ مجھ پر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔"

راجو خاموش رہا۔ اس کے پاس بات آگے بڑھانے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد نیلم نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ "اس لیے راجو... جب میں نے تم کو دیکھا تو ایسا لگا جیسے میرا بھائی میرے سامنے آ گیا ہو۔ میں تمہارا خیال اسی لیے رکھتی ہوں۔ اور سنو، تم بھی مجھے اب بی بی نہیں کہنا، آپا کہنا۔"

راجو کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی کو آپا کہنے کا موقع ملنے والا تھا۔ کسی نے اس سے کوئی رشتہ استوار کیا تھا۔

نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے نیلم کا ہاتھ تھام لیا۔ جیسے کوئی بھائی اپنی بہن کو سہارا دے رہا ہو۔

اس وقت نیلم کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن اب اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ہونٹوں پر ایک پیار بھری مسکراہٹ آ گئی تھی۔

نیلم کے یہاں سب ٹھیک تھا، سوائے اس مونچھوں والے راٹھور کے۔ راجو کو وہ آدمی بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اسے بہت برا لگتا تھا۔

جب وہ فلیٹ میں آتا تو راجو کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ اس کے سامنے نہ آئے۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں دبکا بیٹھا رہتا۔

اس بلڈنگ میں بہت شان دار فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ کئی فلیٹس میں ملازم بھی تھے۔ ملازمین کے لیے اسی بلڈنگ کے احاطے میں سرونٹ کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔

نیلم کبھی کبھی راجو کو بازار سے کچھ سامان وغیرہ لانے کے لیے بھی بھیج دیا کرتی تھی۔ آس پاس فلیٹس کے ملازمین اس سے چھیڑ خانی کیا کرتے۔ ”اب تو جس کے ساتھ رہ رہا ہے، وہ کون ہے تیری؟“

”وہ میری آپا ہے۔“

”یار! بہت زوردار آپا ہے۔ اپنی آپا سے میری دوستی کرا دے۔“

راجو کا دل چاہتا کہ وہ ان کم بختوں کا سر پھاڑ دے جو اس کی اتنی اچھی آپا کے لیے ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔

صرف ایک لڑکی تھی جس نے کبھی راجو سے ایسی ویسی بات نہیں کی تھی۔ یہ پندرہ سولہ برس کی تھی جو دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں کام کرتی تھی۔ وہ بھی اپنے مالکان کے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ وہ سانولے رنگ کی ایک پرکشش لڑکی تھی۔ راجو سے کسی حد تک اس کی دوستی ہو گئی تھی۔

اکثر دونوں ایک ساتھ مل کر مارکیٹ جایا کرتے۔ اس نے اپنا نام زبیدہ بتایا تھا۔ راجو کی طرح وہ اس دنیا میں اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ماں باپ بھی تھے لیکن انہوں نے زبیدہ کو کام پر لگا رکھا تھا اور ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو اس کے مالکان سے پانچ ہزار روپے وصول کر لیا کرتے۔ بے چاری زبیدہ کے حصے میں کچھ نہیں آتا تھا۔

اس کے پیروں میں بہت پرانی چپلیں ہوا کرتیں جو ٹوٹ چکی تھیں۔ ایک دن راجو نے نیلم سے کہا۔ ”آپا! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟“

”کیوں نہیں، ضرور کہو۔“

”آپا! مجھے سو روپے چاہئیں۔“ راجو نے بتایا۔

”وہ کیوں؟“

”مجھے چپلیں لینی ہیں۔“

”تمہارے پاس چپلیں تو ہیں اور جوتے بھی ہیں۔“

”وہ تو ہیں آپا... لیکن مجھے کسی اور کے لیے چاہئیں۔“ راجو نے بتایا۔

”اور وہ کون ہے؟“ نیلم مسکرا دی۔

راجو نے جھجکتے ہوئے نیلم کو اس لڑکی زبیدہ کے بارے میں بتا دیا۔ نیلم بہت دیر تک ہنستی رہی۔ راجو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے آخر ایسی ہنسنے والی کون سی بات کہہ دی ہے۔

”کیوں آپا! میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ نیلم نے کہا۔ ”تم اب جوان ہوتے جا رہے ہو۔“

راجو اس کی بات سمجھ نہیں سکا۔ نیلم نے اسے سو روپے دے دیے۔ راجو نے اسی وقت بازار جا کر زبیدہ کے لیے ایک چپل خرید لی اور جب زبیدہ اسے دکھائی دی تو اس نے زبیدہ کو آواز دی۔ ”اے... بات سنو۔“

زبیدہ جلدی سے اس کے پاس آ گئی۔

راجو نے اپنی لائی ہوئی چپلیں اس کے پیروں کے پاس رکھ دیں۔ ”یہ لو... یہ تمہارے لیے ہیں۔“

”میرے لیے؟“ زبیدہ حیران اور خوش ہو رہی تھی۔

”ہاں، تمہارے لیے... پہن کر دکھاؤ۔“

اور جب زبیدہ نے اپنی پرانی چپلیں اتار کر ایک طرف پھینک دیں اور راجو کی لائی ہوئی چپلیں پہنیں تو اس کے گورے گورے پاؤں راجو کو بہت خوب صورت معلوم ہونے لگے۔ اس نے نہ جانے کس جذبے کے تحت زبیدہ کے پیروں کو ہاتھ لگا دیا۔

زبیدہ کو تو شاید کچھ نہ محسوس ہوا ہو لیکن راجو کو بہت اچھا لگا۔ زبیدہ کے پیروں کے لمس نے اس میں ایک احساس بیدار کر دیا۔

نہ جانے کیا احساس تھا؟ شاید اسی احساس کو جوان ہونا کہتے ہیں۔

زبیدہ تو چلی گئی لیکن راجو بہت دیر تک سرشار رہا۔ جب وہ فلیٹ میں واپس آیا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے نیلم کے رونے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

راجو جلدی سے فلیٹ میں داخل ہوا۔ نیلم قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے تقریباً پھٹ چکے تھے اور راٹھور اسے بیلٹ سے مار رہا تھا۔

ہر وار کے ساتھ وہ نیلم کو گندی گالیاں بھی دیتا۔ راجو کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ راٹھور سے لپٹ گیا۔

”چھوڑ دو میری آپا کو۔“

”ہٹ کتے کے بچے۔“ راٹھور نے اسے ایک طرف دھکا دیا۔

راجو ایک طرف جا گرا۔ اس کے سامنے میز پر ہاتھی دانت کا ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں نیلم کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ راٹھور اس کو پاگلوں کی طرح مارے جا رہا تھا۔

راجو نے ہاتھی دانت کا وہ مجسمہ راٹھور پر کھینچ مارا۔ راٹھور ہائے کہتا ہوا ایک طرف جا گرا۔ راجو خون دیکھ کر سکتے میں آ گیا پھر اس نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی اور دوڑتا ہی چلا گیا۔ نہ جانے وہ اس بلڈنگ اور اس علاقے سے کتنی دور نکل آیا تھا۔

☆☆☆

سید بادشاہ کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ پولیس والوں کی باتیں سن رہا تھا۔

”تیرے تو فرشتے بھی اس قتل کا اعتراف کریں گے۔“ انسپکٹر نے سید بادشاہ سے کہا۔

”دیکھو انسپکٹر۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔“

”تو ہر قاتل کہتا ہے۔“

”لیکن میں ان میں سے ہوں کہ اگر میں نے قتل کیا ہوتا تو اعلان کر دیتا۔ پھر بھی تم لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔“

”اچھا، اتنا بڑا بدمعاش ہے تو۔ ابھی تیری ساری بدمعاشی نکل جاتی ہے۔“

”ہوش کرو انسپکٹر! تم لوگوں کی اس بے وقوفی میں اصل قاتل کہیں ادھر ادھر ہو جائے گا۔“

”اچھا، اب تو ہمیں قانون سکھائے گا۔“

اسی وقت ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ کالے کوٹ میں ملبوس اس شخص کو دیکھ کر انسپکٹر بھی مؤدب ہو گیا تھا۔ ”تشریف لائیں شاہ صاحب! بہت دنوں کے بعد آنا ہوا۔“

”میں اس آدمی کے لیے آیا ہوں۔“ شاہ نے سید بادشاہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیونکہ میں اسے چھڑانے آیا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ بے گناہ ہے۔“

”لیکن میں تو تمہیں نہیں جانتا۔“ سید بادشاہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تو ایک عام سا بندہ ہوں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”جبکہ آپ کو لاکھوں لوگ جانتے ہیں۔ ابھی ان پولیس والوں کو آپ کے بارے میں معلوم ہو جائے تو ان کی ہوا نکل جائے۔“

”کیوں جناب! کیا خاص بات ہے اس بندے میں؟“

سید بادشاہ نے اسے منع کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے سید بادشاہ کے بارے میں بتا دیا۔ ”بے وقوفو! تم لوگوں نے کبھی تنویر سائے کا نام سنا ہے؟“

”کیوں نہیں سنا۔ ہم لوگ تو انہی کے بل پر یہاں بیٹھے ہیں۔“

”تو پھر غور سے دیکھ لو۔ یہی ہیں تنویر سایا۔“ اس آدمی نے سید بادشاہ کی طرف اشارہ کیا۔

پولیس والے بوکھلا کر رہ گئے۔ خاص طور پر انسپکٹر نے جب سید بادشاہ پر دھیان دیا تو سید بادشاہ کے خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔ اس نے جلدی سے سید بادشاہ کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”سر! معاف کر دیں۔ میں آپ کو پہچان نہیں سکا تھا لیکن اب پہچان گیا ہوں۔ آپ تنویر سایا ہی ہیں۔ میں نے ایک بار آپ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ سید بادشاہ کی آواز میں کرب تھا۔ ”کاش! میں اتنا بدنام نہیں ہوتا۔“

”سر جی! آپ نے بالکل سچ کہا تھا۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”اگر آپ نے فضلو کا خون کیا ہوتا تو اعلان کر دیتے اور کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔“

”چلیں سر۔“ وکیل نے سید بادشاہ سے کہا۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ تم کس کے کہنے پر میرے پاس آئے تھے؟“ سید بادشاہ نے پوچھا۔

”شوکت خان نے بھیجا ہے جناب۔“ وکیل نے بتایا۔ ”ان کا حکم ہے کہ میں آپ کو تھانے سے سیدھا ان کے پاس لے جاؤں۔“

”تمہارے شوکت خان کا یہ حکم تمہارے لیے ہے یا میرے لیے؟“ سید بادشاہ نے پوچھا۔

”ظاہر ہے سرکار، میں آپ کو کیا حکم دے سکتا ہوں۔“ وکیل نے کہا۔ ”ویسے آپ اگر نہ جانا چاہیں تو...“

”نہیں، میں چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔“ سید بادشاہ نے کہا۔ ”ورنہ شوکت خان جیسے لوگ کمزوروں پر ظلم کرنا جانتے ہیں۔ وہ تمہاری زندگی عذاب کر کے رکھ دے گا۔ آؤ چلو۔“

سید بادشاہ جب کمرے سے نکلا تو اس کا عقیدت مند منیر کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ سید بادشاہ نے اشارے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے اپنے پاس بلا لیا۔ ''منیر! یہ کمینی دنیا ایک بار پھر میرے لیے جال بچھا رہی ہے لیکن تم پریشان مت ہونا۔ میں واپس آرہا ہوں۔''

''سرکار! جب مجھے یہ پتا چلا کہ آپ کے ساتھ یہ سب ہو رہا ہے تو میں برداشت نہیں کر سکا۔''

''اب برداشت کرو۔ سب ٹھیک ہے۔'' سید بادشاہ نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''میں اس دنیا کو آخری جھٹکا دے کر آرہا ہوں۔''

شوکت خان کی بھیجی ہوئی قیمتی گاڑی پولیس اسٹیشن سے باہر ہی کھڑی تھی۔ ایک باوردی ڈرائیور بھی تھا۔ وکیل نے بڑے احترام سے آگے بڑھ کر سید بادشاہ کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور خود لپک کر ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔

راستے بھر خاموشی رہی۔ سید بادشاہ نے وکیل سے کوئی بات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وکیل بھی خاموش رہا۔

سید بادشاہ کو معلوم تھا کہ یہ بے چارہ شوکت خان کا ایک عام سا کارندہ ہوگا۔ وہ کچھ بھی نہیں بتا سکے گا۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد گاڑی ایک شان دار بنگلے کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ سید بادشاہ کو بہت احترام سے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔

یہ ڈرائنگ روم اس بنگلے ہی کی طرح خوب صورت اور شان دار تھا اور شوکت خان، سید بادشاہ کے استقبال کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کمرے میں ایک دبلی پتلی خوب صورت سی لڑکی بھی تھی۔ شوکت خان ایک دیوہیکل قسم کا انسان تھا جس کے چہرے سے اس کی خباثت کا اظہار ہو رہا تھا جبکہ وہ لڑکی بہت معصوم سی دکھائی دے رہی تھی۔

''آؤ تنویر سایا!'' شوکت خان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

سید بادشاہ نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ شوکت خان اس پر اپنی طاقت کا اظہار کرنے کے لیے اس کے ہاتھ کو بھینچ دینا چاہتا ہے۔

سید بادشاہ نے ہولے سے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ سخت کر لیا۔ شوکت خان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ سید بادشاہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

پاس کھڑی ہوئی لڑکی کو یہ احساس بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اتنی دیر میں کیا ہو چکا ہے۔ شوکت خان نے اس لڑکی کو دیکھا اور جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اب تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ اندر جاؤ۔''

''بابا! میں اپنی بات پوری کیے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' لڑکی نے کہا۔ ''آپ کو میری بات سننی ہوگی۔''

''دیکھو بیٹا! مہمان کے سامنے ضد نہیں کرتے۔'' شوکت خان نے نرمی سے سمجھایا۔

اس وقت سید بادشاہ کو پتا چلا کہ وہ لڑکی شوکت خان کی بیٹی ہے۔ وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئی۔ شوکت خان نے اس کے جانے کے بعد ہنستے ہوئے کہا۔ ''اتنی بڑی ہوگئی ہے، ابھی تک بچوں کی طرح ضد کرتی ہے۔''

''جی ہاں، ایسی ضد تو باپ ہی سے کی جاتی ہے۔'' سید بادشاہ دھیرے سے بولا۔ ''خیر، یہ بتاؤ تم نے مجھ پر اتنی مہربانی کیوں کی؟''

''اس لیے کہ میں ہر قیمت پر تمہیں اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' شوکت خان نے کہا۔

''آخر کیوں؟''

''اس لیے کہ تم بہت کام کے آدمی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ناممکن کو ممکن کر کے دکھا سکتے ہو۔''

''شوکت خان! وہ تنویر سایا مر چکا ہے۔ میں تو اس کی پرچھائی ہوں۔'' سید بادشاہ نے کہا۔

''یہ پرچھائی بھی بہت کام کی ہے۔'' شوکت خان مسکرا کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم میرے کتنے کام آسکتے ہو۔''

''شوکت خان! میں شاید اب تمہارے کسی کام نہ آسکوں۔'' سید بادشاہ نے کہا۔ ''میری منزل کچھ اور ہے۔ میرا راستہ الگ ہو چکا ہے۔ مجھے میرے راستے پر چلنے دو۔ میں نے اپنا ماضی بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میں اس دوسرے راستے پر بہت دور نکل آیا ہوں۔''

''کیوں؟'' شوکت خان نے ایک گہری سانس لی۔ ''تنویر سایا! میں جانتا ہوں کہ تم کیا ہو۔ تمہاری کتنی دہشت ہے۔ تمہارا نام سنتے ہی اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ پولیس تم سے خوف زدہ بھی ہے اور تم سے نفرت بھی کرتی ہے لیکن تم اتنے چالاک اور ہوشیار ہو کہ تم نے کہیں اپنا نشان نہیں چھوڑا۔ پولیس کے پاس تمہارے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ہیں جبکہ وہ تمہارے بارے میں سب جانتی ہے۔''

''شوکت خان! یہ باتیں دہرانے سے کیا فائدہ؟''

''میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ پولیس کے پاس تمہارے کارناموں کے ثبوت ہوں یا نہ ہوں لیکن میرے پاس ہیں۔'' شوکت خان نے انکشاف کیا۔

''اوہ۔'' سید بادشاہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''اور یہ ثبوت تمہارے پاس کہاں سے آگئے؟''

''یہ رہنے دو۔ جب تم کہو گے تو خود تمہارے سامنے پیش کر دیے جائیں گے۔'' شوکت خان نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں کوئی دھمکی نہیں دے رہا اور نہ ہی تمہاری مرضی کے خلاف کام لینا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس وقت ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں نے تو تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا ہے۔''

''تم یہ بتاؤ تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟''

''ہاں، یہ تم نے عقل مندی کا سوال کیا۔'' شوکت خان ہنس پڑا۔ ''بس اب ریلیکس ہو جاؤ۔ ایک دو دنوں کے بعد تمہیں سب بتا دیا جائے گا۔''

☆☆☆

راجو نیلم یعنی آپا کے یہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

اس نے دوسری بار کسی کا سر پھاڑا تھا۔ ایک بار اس وقت جب اس پولیس والے نے اس سے زیادتی کی کوشش کی تھی اور دوسری بار اس راٹھور کا جس نے نیلم کے ساتھ زیادتی کی تھی۔

وہ دوڑتا چلا گیا۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس کا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ اس کے ماں باپ تھے، نہ کوئی رشتے دار، نہ کوئی دوست۔ صرف ایک نیلم تھی اس کی ہمدرد جو بے چاری اب نہ جانے کس حال میں ہوگی۔

وہ دوڑتا چلا گیا۔

یہ علاقہ اس کے لیے نیا تھا۔ یہاں بہت چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے۔ غریبوں کی آبادی معلوم ہوتی تھی...... وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ بھوک نے اس پر نقاہت طاری کر دی تھی۔ وہ اب آہستہ آہستہ چل رہا تھا اس کے باوجود اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔

پھر وہ ایک قبر کے پاس آکر ڈھیر ہوگیا۔

یہ قبر نہ جانے کس کی تھی جو ایک میدان میں بنائی گئی تھی۔ اس قبر کے پاس ایک درخت تھا، ایک جھونپڑی تھی اور کچھ فاصلے پر دو چار ملنگ آنکھیں بند کیے لیٹے یا سوئے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد خود اس کی آنکھیں بھی بند ہوتی چلی گئیں۔ پھر کسی کے جھنجوڑنے پر اس کی آنکھ کھلی۔ ایک ملنگ اس کے پاس کھڑا اسے جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔ ''اوئے اٹھ جا۔ یہاں کیوں آگیا ہے مرنے کے لیے؟''

وہ ایک غلیظ قسم کا ملنگ تھا جس کے چیتھڑے نما لباس سے بو اٹھ رہی تھی۔ راجو جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس ملنگ سے کچھ فاصلے پر دو اور ملنگ بھی تھے جو بہت حیرت اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اوئے کون ہے تو؟'' ملنگ نے پوچھا۔

''را... راجو۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا نام راجو ہے۔''

''کہاں رہتا ہے... اس بستی میں؟'' ملنگ نے مکانوں کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں کہیں نہیں رہتا۔''

دوسرے ملنگ بھی اب پاس آگئے تھے۔

ایک ملنگ نے پوچھا۔ ''کچھ کھائے گا؟''

''ہاں۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''

ملنگوں نے اس کے سامنے ایک پلیٹ میں بریانی لاکر رکھ دی جو شاید بستی والوں نے بھیجی ہوگی۔ پانی کی ایک بوتل بھی تھی جبکہ وہ تینوں اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر آپس میں نہ جانے کیا باتیں کرنے لگے۔

جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو ملنگ اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ وہ شاید اس کے لیے کوئی فیصلہ کر چکے تھے۔

''یہ بتا، اب تو کہاں جائے گا؟'' ایک ملنگ نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

''یہاں رہے گا؟'' دوسرے ملنگ نے پوچھا۔

راجو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس آفر کا کیا جواب دے۔ ویسے بھی اس کے پاس کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ یہاں کم از کم کھانے کو تو مل ہی گیا تھا اور رہنے کے لیے ایک جھونپڑی بھی بنی ہوئی تھی۔

لیکن ان ملنگوں کا ساتھ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ بہت گندے قسم کے لوگ تھے۔ وہ ان کے ساتھ کیسے رہ سکتا تھا؟ پھر اسے نیلم کا فلیٹ یاد آنے لگا۔ نیلم کی یاد آنے لگی۔ کتنا آرام تھا وہاں۔ وہ لڑکی اسے کتنے پیار سے رکھتی تھی۔

''سوچ کیا رہا ہے؟ یہیں رہ جا۔'' ملنگ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''تجھے یہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ہر طرح کا آرام ملے گا لیکن تجھے وہی کرنا ہوگا جو ہم بتائیں گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’کیا کرنا ہوگا مجھے؟‘‘

’’پہلی بات تو یہی ہے کہ تیرے باپ کا نام سید بادشاہ ہے۔‘‘ پیلے والے ملنگ نے بتایا۔

’’نہیں، میں نہیں جانتا کہ میرے باپ کا کیا نام ہے۔‘‘

’’ہم بتا رہے ہیں نا... سید بادشاہ۔‘‘ ملنگ نے کہا۔ ’’تو بھی لوگوں کو یہی بتائے گا اور تیرا نام ہے سید معصوم......‘‘

’’نہیں تو... میں تو راجو ہوں۔‘‘

’’بھول جا راجو کا جو گی۔‘‘ ملنگ مسکرا کر بولا۔ ’’دیکھ، ہمارے کہنے پر چلتا رہا تو عیش ہی عیش ہوں گے۔ پوری بستی والے تیرے آگے پیچھے ہوا کریں گے۔ طرح طرح کے کھانے، کپڑے، پیسے سب ہوں گے تیرے پاس۔‘‘

’’لیکن یہ سب کہاں سے آئیں گے... کون دے گا؟‘‘

’’یہ سب ہم پر چھوڑ دے۔ تجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ہماری بات مانتا جا۔‘‘

اس کے پاس تو کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ وہ جاتا تو کہاں جاتا۔ اس نے اقرار میں اپنی گردن ہلا دی۔

☆☆☆

سید بادشاہ کو واپس بھیج دیا گیا تھا۔

بہت دنوں کے بعد اس کے اندر ایک طوفان سا برپا ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ جس راستے پر چل پڑا ہے اس راہ پر سکون ہی سکون ہوگا لیکن یہاں تو اس کے لیے بہت رکاوٹیں تھیں۔ لوگ اسے پھر سے پرانے راستے کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اب یہ شوکت خان سامنے آ گیا تھا جس نے دھمکی دی تھی کہ وہ پولیس کے سامنے اس کے سارے ثبوت رکھ دے گا۔ تنویر سایا اب تک پولیس کی گرفت میں نہیں آ سکا تھا۔ صرف اس کے نام کی دہشت ہی کافی تھی۔

لیکن اب وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو اسی راستے پر چلتا رہے جو راستہ اس نے اختیار کیا تھا اور ثابت قدم رہ کر شوکت خان کے دباؤ کا سامنا کرے۔ اگر اسے سزا ہوتی ہے تو اسے کفارہ سمجھ کر برداشت کرے۔ یا پھر وہ شوکت خان کی بات مان لے۔ اس کے ساتھ ہو جائے اور پھر سے دنیا کی طرف واپس چلا جائے۔ اس کا عقیدت مند منیر اسے واپس آتے دیکھ کر بہت جذباتی ہو گیا۔ ’’سرکار! اگر آپ کچھ دیر اور نہیں آتے تو میں تھانے پر حملہ کر دیتا۔‘‘

’’تھانے والوں نے تو مجھے چھوڑ دیا تھا منیر۔‘‘ سید بادشاہ نے بتایا۔ ’’لیکن اس کے بعد میں ایک اور چنگل میں پھنس گیا تھا اور ابھی تک اسی جنجال میں ہوں۔‘‘

’’خدا خیر کرے سرکار۔‘‘ منیر نے کہا۔ ’’مجھے بتائیں کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ؟‘‘

’’منیر! شاید تم میرے پس منظر سے واقف نہیں ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔‘‘

منیر مسکرا دیا۔ ’’سرکار! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں۔ آپ کا ماضی کیا تھا اور آپ کیسے انسان تھے۔ لیکن اتنا یاد رکھیں سرکار کہ میں نے آپ کی خدمت آپ کو تنویر سایا سمجھ کر نہیں کی بلکہ سید بادشاہ سمجھ کر کی ہے اور آپ ہمیشہ سید بادشاہ ہی رہیں گے سرکار۔‘‘

’’منیر۔‘‘ سید بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ’’میرے دوست! تم نے مجھے روشنی دکھا دی ہے۔ ورنہ میں نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا۔ اب مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نہ کہ شوکت خان میرے خلاف سارے ثبوت پولیس کو دے دے گا اور مجھے سزا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے لیکن تم نے اس وقت جو میری راہنمائی کی ہے اس کے لیے میں زندگی بھر تمہارا شکر گزار رہوں گا۔‘‘

’’نہیں سرکار! خدا کے لیے مجھے شرمندہ نہ کریں۔‘‘ منیر نے کہا۔ ’’ویسے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ آپ جس راستے پر چل پڑے ہیں، اس راستے پر آپ کی حفاظت خود خدا کرے گا کیونکہ وہی آپ کو اس راہ پر لایا ہے۔‘‘

’’منیر! آج میں تمہاری باتوں سے بہت کچھ حاصل کر رہا ہوں۔‘‘

’’ارے نہیں سرکار! میرے پاس سوائے باتوں کے اور کیا ہے۔‘‘ منیر نے انکساری سے اپنی گردن جھکالی۔

خدا نے اسی دن سے راستے کھولنے شروع کر دیے تھے۔ فضلو کا قاتل پکڑا گیا تھا۔ وہ بھی ایک سبزی فروش ہی تھا جس کی فضلو سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس نے موقع پا کر فضلو کا کام تمام کر دیا تھا۔

سید بادشاہ دوسرے دن پھر سبزیاں لے کر ٹھیلے پر کھڑا ہو گیا۔ اس دن اس کو دیکھنے والے عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی طرف آنے سے کچھ کترانے لگے تھے۔

سید بادشاہ جانتا تھا کہ یہ بھی ایک امتحان ہے اسی لیے وہ سر جھکائے اپنے ٹھیلے کے پاس کھڑا رہا۔

دوپہر کے وقت ایک کار اس کے ٹھیلے کے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں سے دو آدمی اتر کر اس کے ٹھیلے کی طرف آئے۔ ایک تو وہی وکیل تھا جس کو شوکت خان نے پہلی بار بھیجا تھا اور دوسری شوکت خان کی بیٹی تھی۔

سید بادشاہ کو اس لڑکی کے آنے پر حیرت ہوئی تھی۔

’’چلو ہمارے ساتھ۔‘‘ وکیل نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ’’تم کو خان صاحب نے بلایا ہے۔‘‘

سید بادشاہ نے چونک کر وکیل کی طرف دیکھا۔ اس دن اس کے لہجے میں انکساری نہیں تھی۔ ورنہ اس سے پہلے وہ جناب اور آپ کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔

’’دیکھو، جا کر اپنے خان صاحب سے کہہ دو کہ میں جس راہ پر چل پڑا ہوں اس سے واپسی ممکن نہیں ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔‘‘

لیکن وکیل کے بولنے سے پہلے وہ لڑکی بول پڑی۔ ’’لیکن میں جو آپ کو لینے آئی ہوں۔‘‘

’’بی بی! کیوں آئی ہو تم؟‘‘ سید بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔ ’’میرا تم سے کیا واسطہ؟ پھر تم ایک لڑکی ہو۔ تم کو ان معاملات سے الگ رہنا چاہیے۔‘‘

’’لیکن میں الگ نہیں رہ سکتی۔‘‘ لڑکی نے کہا۔ ’’یہ سمجھ لو کہ تمہاری ضرورت بابا کو نہیں بلکہ مجھے ہے۔‘‘

’’میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟ میں تو ایک ایسی چنگاری ہوں جسے راکھ ہوئے عرصہ گزر چکا ہے۔‘‘

’’اس کے باوجود میں یہ چاہتی ہوں کہ تم میری اور بابا کی باتیں سن لو۔‘‘ لڑکی نے کہا۔ ’’اس کے بعد تمہاری مرضی۔‘‘

کچھ دیر سوچنے کے بعد سید بادشاہ نے اس لڑکی کی بات مان لی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک مرتبہ پھر شوکت خان کے سامنے تھا لیکن آج شوکت خان کا رویہ کچھ بدلا ہوا تھا۔

پچھلی ملاقات میں سید بادشاہ نے اس میں اکڑ اور غرور دیکھا تھا لیکن اس بار وہ موم ہو رہا تھا۔ نہ جانے اسے سید بادشاہ سے ایسی کون سی غرض پیدا ہو گئی تھی۔

’’تنویر سایا! یہ بتاؤ کیا تم ہمارا ساتھ دو گے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’میں نہیں جانتا کہ تمہارا ساتھ دینے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟‘‘ سید بادشاہ نے کہا۔ ’’مجھے تو اس لڑکی کی ضد کھینچ لائی ہے ورنہ تم تو مجھے پولیس کے ذریعے بلوانے والے تھے۔ تم میرے خلاف سارے ثبوت پولیس کو دے دیتے اور ابھی بھی تم یہ کر سکتے ہو۔ میں نے جس راستے پر اپنا سفر شروع کیا ہے، اس کے لیے قربانی تو دینی ہوگی۔‘‘

’’ارے نہیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے تم اسے بھول جاؤ۔‘‘ شوکت خان جلدی سے بولا۔ ’’یہ سمجھ لو کہ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔‘‘

’’چلو تو پھر یہ بتا دو کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟‘‘

اس وقت کمرے میں صرف وہی تینوں تھے۔ وکیل کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

’’تنویر سایا! یہ میری اکلوتی اولاد ہے۔‘‘ شوکت خان نے کہا۔ ’’اس کے پاس خدا کا دیا بہت کچھ ہے۔ دنیا کی ہر نعمت اس کے پاس ہے۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک بدقسمت لڑکی ہے۔‘‘

’’بدقسمت... وہ کس طرح؟‘‘ سید بادشاہ چونک گیا۔

’’یہ ابھی تمہیں پتا چل جائے گا۔ سب سے پہلے تو وہ کام سن لو جس کے لیے ہم نے تمہیں بلایا ہے۔‘‘ شوکت خان نے کہا۔ ’’اور وہ کام یہ ہے کہ تم اس سے شادی کر دو گے۔‘‘

☆☆☆

اس میدان میں اس رات بہت رونق لگی ہوئی تھی۔

بہت سے لوگ جمع تھے۔ بہت بڑے حصے پر دریاں اور چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں۔ روشنی کے لیے گیس لیمپ جل رہے تھے۔ ایک طرف ایک بڑا سا تخت تھا جس پر قوال پارٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس تخت کے ساتھ ایک چھوٹا تخت بھی تھا جس پر سید معصوم... بیٹھا ہوا تھا۔

راجو کی سج دھج اس وقت دیکھنے والی تھی۔ اس کے بدن پر سبز رنگ کا جھلملاتا ہوا کرتا تھا اور سفید شلوار۔ سر پر ہرے رنگ کی پگڑی۔ آنکھوں میں شاید سرمہ لگا دیا گیا تھا۔ اس کا چہرہ بہت نورانی سا دکھائی دے رہا تھا... دمکتا ہوا۔

دور دور سے لوگ یہ سن کر آئے ہوئے تھے کہ مزار والے نے بستی والوں کی راہبری کے لیے سید معصوم... کو بھیج دیا ہے۔ ان ملنگوں نے اس کے بارے میں نہ جانے کیسے کیسے واقعات منسوب کر دیے تھے۔

چونکہ یہ معاملات بہت پھیلے ہوئے اور ٹیکنیکل تھے اسی لیے ان ملنگوں نے ایک منیجر کی خدمات حاصل کر لی تھیں کیونکہ ملنگ جانتے تھے کہ بستی والوں میں خود ان کی کوئی ساکھ نہیں ہے۔

منیجر نے بہت ہوشیاری سے معاملات سنبھال لیے تھے۔ راجو کا گیٹ اپ، اس کے کپڑے، چندے کے لیے ایک بڑا سا باکس۔ پھر راجو کی تربیت کہ اسے لوگوں سے کس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح پیش آتا ہے اور اب قوالی کا انتظام۔ یہ سب اس منیجر یعقوب کی کارستانی تھی۔

اس کے پروپیگنڈے کے مطابق اس گمنام قبر میں سید لنگر شاہ آرام فرما تھے۔ سید لنگر شاہ سید معصوم۔۔۔ یعنی راجو کے پردادا تھے اور ان کی وفات اسی تاریخ کو ہوئی تھی جس تاریخ کو قوالی کی یہ محفل سجائی گئی تھی۔

راجو کو اگرچہ اب کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ اسے کھانے کے لیے ایک سے ایک چیز مل جایا کرتی۔ رہنے کے لیے ایک کمرا تھا۔ جھونپڑی کو اب کمرے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

اس کے پاس کپڑوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ملنگوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے سہی، اس کا احترام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کا دل یہاں نہیں لگ رہا تھا۔ اسے ایک گھٹن سی محسوس ہوتی تھی۔

اس کا دل چاہتا کہ وہ یہاں سے بھاگ نکلے... لیکن کہاں؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ویسے اسے اپنی آپا بہت یاد آیا کرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے اچھے دن انہی کے یہاں گزارے تھے۔ ویسے تو یہاں بھی اچھی گزر رہی تھی لیکن آپا والی بات اور تھی۔

کسی نے اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے تخت کے پاس ایک عورت کھڑی ہوئی تھی جو شاید اپنی کوئی مراد لے کر آئی تھی۔

''معصوم شاہ! اگر تمہاری دعاؤں سے بہو کے یہاں بیٹا ہو گیا تو میں دس دیگیں چڑھاؤں گی۔''

راجو نے اپنے پاس تخت پر رکھے ہوئے لوہے کے برتن میں سے بھنے ہوئے چنوں کو مٹھی میں بھرا اور اس عورت کی طرف بڑھا دیا۔ عورت یہ تبرک پا کر بہت خوش ہو گئی۔ وہ اسے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

یہ بھی اس منیجر کی پلاننگ تھی۔ اس نے سمجھایا تھا۔ ''دیکھو، ہر کسی کو چنے مت دینا۔ اس سے بے قدری ہو گی۔ بس کسی کسی کو دے دیا کرنا۔''

''جس کو چنے نہ دوں اس کے لیے کیا کروں؟'' راجو نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس اس کی طرف سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لینا۔'' منیجر نے کہا۔

راجو کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے دیے ہوئے چنے کسی کی تقدیر کس طرح بدل سکتے ہیں؟ یہ اور بات ہے کہ چنے مانگنے والوں کے طفیل ملنگوں کے دن ضرور بدل گئے تھے۔ اب ان کے پاس کھانے پینے اور خرچ کرنے کے لیے بہت تھا۔

ہر جمعے کی رات چندہ یا نذر باکس کا تالا کھول کر پیسے گنے جاتے۔ یہ تین چار ہزار سے کم نہیں ہوتے تھے پھر وہ پیسے آپس میں بڑی ایمان داری کے ساتھ تقسیم کر لیے جاتے۔

انہوں نے اس معاملے میں کبھی بے ایمانی نہیں کی تھی۔

اس طرح اب راجو کے پاس بھی اپنے تین ہزار روپے جمع ہو چکے تھے۔ اتنے پیسے تو اس نے زندگی میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

قوالی اب ختم ہو چکی تھی۔ قوال اپنا حصہ لے کر جا چکے تھے۔ ان پر نچھاور ہونے والے پیسے بھی ایمان داری کے ساتھ جمع کر کے تقسیم ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک بار قوالوں اور مزار گروپ کے درمیان جھگڑا بھی ہوا تھا۔ قوالوں کا یہ کہنا تھا کہ نچھاور ہونے والے پیسوں پر صرف انہی کا حق ہے جبکہ مزار گروپ کا یہ کہنا تھا کہ یہ پیسے بھی تو انہی لوگوں کی وجہ سے ملا کرتے ہیں۔

غرضیکہ بہت بک بک کے بعد یہ طے پایا تھا کہ پچاس فیصد قوال لے جایا کریں گے اور پچاس فیصد مزار گروپ کا ہو گا۔

انہوں نے راجو کو بہت کچھ سکھا دیا تھا لیکن صرف ایک چیز نہیں سکھا پائے تھے اور وہ تھی چرس نوشی۔ منیجر اس سے کہا کرتا۔ ''دیکھو راجو! جب تم چرس کے سُٹے لگا لو گے تو تمہاری آنکھوں میں جلال آ جائے گا۔ کشش آ جائے گی۔ اس سے دیکھنے والوں پر اچھا اثر پڑے گا۔''

راجو کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن منیجر نے ضد کر کے اسے چرس سے بھری ہوئی سگریٹ پلا دی۔ پہلا کش لیتے ہوئے وہ بے دم سا ہو کر ایک طرف گر پڑا۔ کھانستے کھانستے اس کی حالت خراب ہونے لگی۔

پھر ملنگوں نے اور منیجر نے یہ فیصلہ کیا کہ راجو کی آنکھوں میں سرمہ لگایا جائے۔ اس سے بھی آنکھوں میں خوب صورتی آ جاتی ہے۔ راجو کو یہ سرمہ برداشت تھا۔

قوالوں کے ساتھ ساتھ عقیدت مند بھی چلے گئے تھے۔ اب وہاں صرف ملنگ رہ گئے تھے۔ منیجر ہر رات اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ وہ ایک شادی شدہ آدمی تھا جبکہ ملنگوں اور راجو کا کوئی اور ٹھکانا نہیں تھا۔

اس رات اسے جگا دیا گیا تھا۔ جگانے والا ایک ملنگ

ہی تھا۔ اس نے زور زور سے دروازہ پیٹا تھا، تب جا کر راجو کی آنکھ کھلی تھی۔ دروازے پر ملنگ کے ساتھ کوئی اور بھی کھڑا ہوا تھا۔

وہ آدمی اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے راجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جلدی سے کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''تمہارے ساتھ... کہاں؟''

''راجو! یہ صاحب تم کو لینے کے لیے آئے ہیں۔'' ایک ملنگ نے کہا۔ ''تم کو ان کے ساتھ جانا ہے۔''

''لیکن کیوں جانا ہے... میں کسی کے ساتھ کیوں جاؤں؟''

''دیکھ لیا صاحب! یہ لڑکا آپ کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہے۔'' ملنگ نے اس آدمی کی طرف دیکھا۔

''عجیب آدمی ہو۔'' وہ آدمی جھلا گیا۔ ''ہمارے درمیان سودا ہو چکا ہے۔ تم مجھ سے دو لاکھ بھی لے چکے ہو۔''

''دو لاکھ سے کیا ہوتا ہے صاحب۔'' ملنگ نے کہا۔ ''یہ تو ہمارے لیے سونے کی چڑیا ہے۔ صرف دو لاکھ میں تو یہ چڑیا تمہارے حوالے نہیں ہو گی۔''

''تم اپنی زبان سے پھر رہے ہو۔'' وہ آدمی غرایا۔

''بس کرو صاحب! میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ مجھے دوسروں کو بھی حصہ دینا ہوتا ہے۔ کم از کم پانچ کرو۔''

راجو کا ذہن اس وقت سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اس کا سودا کر رہے ہیں، اسے بیچ دیا گیا ہے۔

یہاں وہ بہت مزے میں تھا۔ بہت اچھی گزر رہی تھی۔ یہ ملنگ اور منیجر سب اس سے پیار سے پیش آتے اور اب یہ آدمی اس کا سودا کرنے چلا آیا تھا۔ خدا جانے یہ کون تھا اور اب اپنے ساتھ لے جا کر کیا سلوک کرتا۔

اس وقت راجو کے ذہن میں صرف ایک ہی بات آ رہی تھی کہ اسے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ وہ پہلے ہی دو بار بھاگ چکا تھا، اس بار بھی بھاگ سکتا تھا۔

اور وہ بھاگ لیا۔

انتہائی تیزی کے ساتھ۔ ان دونوں کو شاید اندازہ بھی نہیں ہو پایا ہو گا کہ وہ بھاگ بھی سکتا ہے اس لیے وہ صرف شور کرتے رہ گئے اور راجو دوڑتا چلا گیا۔

☆☆☆

سید بادشاہ کے لیے زندگی کا سب سے بڑا امتحان اس کے سامنے آ گیا تھا۔

اسے شادی کرنی تھی یا اسے شادی کی آفر دی گئی تھی۔

شوکت خان نے جو کہانی سنائی وہ ایسی کوئی خاص نہیں تھی۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ اس کی بیٹی نادیہ کی شادی ہو چکی تھی۔ شادی کے وقت اس کے داماد کی کوئی اتنی خاص پوزیشن نہیں تھی۔ نادیہ اور وہ لڑکا خورشید ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ شوکت خان اس رشتے کے خلاف تھا لیکن نادیہ کی ضد کے آگے وہ مجبور ہو گیا تھا۔ اسے یہ شادی کرنی پڑی تھی۔ شادی کے بعد نادیہ کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ خورشید کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نادیہ نے خورشید سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

اس مطالبے کے لیے شوکت خان نے دباؤ ڈالا تھا۔ خورشید نے نادیہ کو طلاق دے دی۔ پھر یہ ہوا کہ اچانک خورشید کی قسمت نے کروٹ لی۔ اسے ایک مضبوط سیاسی پارٹی نے الیکشن کے لیے ٹکٹ دے دیا۔ اس پارٹی کی پوزیشن بہت مضبوط تھی اور نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ خورشید الیکشن جیت جائے گا۔

شوکت خان ہاتھ مل کر رہ گیا۔

آئندہ ہونے والا وزیر داماد کے روپ میں اس کے ہاتھ آتے آتے نکل گیا تھا۔ پھر نادیہ نے بھی خورشید سے ملاقات کر لی اور محبت کی آگ ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ ایک ہونے کے لیے...... حلالہ کرنا ضروری تھا اور اس حلالہ کے لیے پیر سائیں کا انتخاب کیا گیا تھا۔

''شوکت خان! ایک بات بتاؤ، تم اس کے لیے کسی اور کو بھی پکڑ سکتے ہو۔'' سید بادشاہ نے پوری کہانی سن لینے کے بعد کہا۔ ''کیا ضروری ہے کہ میں ہی یہ کام کروں؟''

''پیر سائیں! تمہارا انتخاب کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ خاندان والوں کو ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ نادیہ اور خورشید کے درمیان طلاق ہو چکی ہے۔'' شوکت خان نے بتایا۔ ''اسی لیے ہم خاندان کے کسی فرد کی مدد نہیں لے سکتے اور دوسری بات یہ ہے کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس سے نادیہ کی شادی ہو، وہ اسے طلاق بھی دے دے۔''

''بالکل یہی بات میرے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔'' سید بادشاہ نے کہا۔ ''کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری ساکھ کیسی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی طلاق نہ دوں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ضرور طلاق دو گے۔'' شوکت خان مسکرا دیا۔ ''کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہارے بارے میں کیا کیا جانتا ہوں۔ اور اگر تم نے نادیہ کو طلاق نہیں دی تو پھر تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اب میری سمجھ میں آ گیا کہ تم نے میرا انتخاب کیوں کیا ہے۔" سید بادشاہ نے ایک گہری سانس لی۔ "یعنی تمہیں ایک ایسے مجبور آدمی کی ضرورت ہے جو تمہارے اشارے پر شادی کرے اور تمہارے اشارے پر طلاق دے دے؟"

"ہاں، ایسا ہی سمجھ لو لیکن تمہیں میری مجبوری بھی دھیان میں رکھنا چاہیے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم کتنے مجبور ہو۔ کہانی صرف اتنی ہے کہ خورشید کو اگر پارٹی کا ٹکٹ نہیں ملتا تو تم اس کے بارے میں دوبارہ بھی نہیں سوچتے۔"

"کچھ بھی سمجھ لو۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

سید بادشاہ کے لیے یہ امتحان کا وقت تھا۔ اسے شوکت خان کی ذہنیت پر افسوس ہو رہا تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے جو اپنی شان و شوکت اور ساکھ کے لیے اپنی اولاد تک کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

پھر وہ لڑکی کیسی تھی جو صرف اس لیے اپنے سابقہ شوہر سے شادی کرنا چاہتی تھی کہ اس کا کیریئر شان دار بنتے جا رہا تھا۔

یہ سب دو کوڑی کے لوگ تھے۔ ان کے نزدیک عزت اور وقار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

سید بادشاہ نے واپس آ کر یہ مسئلہ بھی منیر کے سامنے رکھ دیا۔ "منیر! میرا ذہن تو بری طرح الجھ چکا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

"سرکار! آپ کی مہربانی کہ آپ میرے مشوروں کو اہمیت دیتے ہیں۔" منیر نے کہا۔ "اور میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"بہت فائدہ ہوگا سرکار! آپ کا گھر آباد ہو جائے گا اور ویسے بھی یہ سنت رسولؐ ہے اور آپ جس راستے پر چل پڑے ہیں اس کے لیے بھی شادی ضروری ہے۔ ورنہ انسان کے بہکنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔"

"لیکن منیر! یہ مت بھولو کہ یہ شادی چند دنوں کے لیے ہوگی۔"

"یہ تو بعد کی بات ہے سرکار! ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی بعد میں آپ سے اتنی متاثر ہو جائے کہ طلاق کا خیال ہی دھیان میں نہ لائے۔ ہو سکتا ہے کہ خود وہ بھی آپ کی صحبت میں بدل جائے۔"

"منیر! اب تم مجھے امتحان میں ڈال رہے ہو۔" سید بادشاہ نے کہا۔ "جبکہ میں نے خود کو ایسی باتوں سے بہت دور کر لیا ہے۔"

"نہیں سرکار! ایسا نہ کریں۔ یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔" منیر نے کہا۔ "آپ شادی کر لیں۔ ہاں کہہ دیں شوکت خان سے... پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

سید بادشاہ دوسرے دن خود شوکت خان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے نادیہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس دن دونوں باپ بیٹی کے تیور کچھ اور ہو رہے تھے۔

"بھائی، اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں رہی۔" شوکت خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب ہم نے خورشید کے بارے میں سوچنا ختم کر دیا ہے۔"

"کیوں خیریت... اب کون سی بات ہو گئی؟"

"کم بخت کو ٹکٹ ہی نہیں ملا۔" شوکت خان نے بتایا۔ "پارٹی نے اس کی جگہ کسی اور کو منتخب کر لیا ہے۔"

"بہت خوب! یعنی یہ شادی پارٹی ٹکٹ سے ہو رہی تھی... کسی انسان سے نہیں ہو رہی تھی۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔" اس بار نادیہ بول پڑی۔

"بی بی! مجھے تمہاری ذہنیت پر افسوس ہو رہا ہے۔" سید بادشاہ نے کہا۔ "میں نے تمہیں بہت مختلف سمجھا تھا۔"

"غلط فہمی تھی تمہاری۔" نادیہ بولتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

شوکت خان سید بادشاہ کو تلملایا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ "آ گیا نا سمجھ میں؟" اس نے کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو لیکن اتنا یاد رکھنا کہ تم مجھ سے دور نہیں ہو۔"

"سب سمجھ گیا ہوں شوکت خان۔" سید بادشاہ نے کہا۔ "اور اب مجھے افسوس اس لیے نہیں ہے کہ تمہارے لیے دولت کی اہمیت ہے۔ تم اقتدار کے بھوکے ہو اور ہمیشہ رہو گے۔"

"بس اب جاؤ۔" شوکت خان نے اپنا ہاتھ ہلا دیا۔ "فی الحال تمہاری ضرورت نہیں رہی۔"

سید بادشاہ بہت ہی افسردگی سے اس مکان سے باہر نکلا تھا۔

انسان کا ایک اور روپ اس کے سامنے آیا تھا۔

وہ بہت نڈھال سا تھا۔ اس کے پیروں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ ابھی وہ شوکت خان کے مکان کے گیٹ سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ کسی نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

آواز دینے والی نادیہ تھی، شوکت خان کی بیٹی۔ وہ تیز

قدموں سے اس کے پاس آ گئی۔ "سید بادشاہ! تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔" اس نے کہا۔

"کیوں... کیا یہ کوئی نیا ڈراما ہے؟"

"نہیں، پہلے جو ہو رہا تھا شاید وہ ڈراما ہو لیکن اب جو کچھ ہے وہ سچائی ہے۔"

"پتا نہیں تم کس سچائی کی بات کر رہی ہو۔"

"سید بادشاہ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کہیں بیٹھ کر باتیں کر سکیں۔" نادیہ نے کہا۔ "یہاں تو کسی کی نظر بھی پڑ سکتی ہے اور میرے لیے مصیبت ہو سکتی ہے۔"

"آؤ میرے ساتھ۔"

کچھ دیر بعد دونوں ایک پُرسکون ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سید بادشاہ گردن جھکائے نادیہ کی باتیں سن رہا تھا۔

"سید بادشاہ! میں اپنی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔" نادیہ بتا رہی تھی۔ "میرا باپ چاہے جیسا بھی ہو لیکن میں اندر سے ایک مختلف لڑکی ہوں اور اب مجھ سے کھلونا نہیں بنا جاتا۔ کیا بیٹی اسی لیے ہوتی ہے کہ اس کو اپنے مفاد کے لیے قربان کر دیا جائے؟ میں نے اپنے باپ کے کہنے پر خورشید سے شادی کی تھی۔"

"لیکن تمہارے باپ کا تو یہ کہنا ہے کہ یہ شادی تم نے اپنی مرضی سے کی تھی؟"

"ہاں، وہ تو یہی کہے گا لیکن یہ جھوٹ ہے۔ خورشید کا باپ ایک بہت بڑا بلڈر تھا۔ تم نے شاید ہمدانی ایسوسی ایٹ کا نام سنا ہوگا؟"

"ہاں، کئی بار سنا ہے۔" سید بادشاہ نے بتایا۔ "لیکن وہ تو اب پٹے لوگ ہیں۔"

"ہیں نہیں تھے۔" نادیہ نے کہا۔ "یہ اس زمانے کی بات ہے جب ان پر زوال نہیں آیا تھا۔ سب کچھ تھا ان کے پاس۔ پھر یہ ہوا کہ اسی زمانے میں بابا نے خورشید سے میری شادی طے کروا دی کیونکہ وہ ایک شان دار مستقبل کا مالک تھا لیکن پھر اچانک سب کچھ بدل گیا۔ شادی کو چھ سات مہینے ہی ہوئے تھے کہ ہمدانی کی پوری ساکھ بگڑ گئی۔ اس کی دو عمارتیں بیٹھ گئیں۔ درجنوں مزدور ہلاک ہوئے۔ ناقص میٹریل استعمال کا الزام لگ گیا۔ سپریم کورٹ نے ایکشن لے لیا اور ہمدانی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

"یہ سب مجھے نہیں معلوم تھا۔" سید بادشاہ نے کہا۔

"ہاں، یہی سب ہوا۔ اس طرف بینک والوں نے چڑھائی کر دی۔ لہٰذا خورشید کو اپنا سب کچھ بیچنا پڑ گیا۔ بابا کے لیے یہ صورت حال ناقابلِ برداشت تھی۔ انہوں نے خورشید سے طلاق دلوا دی جبکہ وہ بے چارہ اپنی جگہ ایک اچھا آدمی ہے۔ پھر تم نے سن لیا ہوگا کہ ایک سیاسی پارٹی نے اس کو ٹکٹ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی میرے باپ کے سازشی ذہن نے ایک سازش تیار کر لی اور تم کو پکڑا گیا تاکہ حلالہ ہو سکے۔ پھر جب پارٹی نے فیصلہ بدلا تو میرا باپ بھی بدل گیا۔ یہ ہے ساری کہانی۔"

"لیکن یہ ساری کہانی تو نہیں ہے۔" سید بادشاہ مسکرا دیا۔ "اس سے آگے بھی تو بہت کچھ ہے۔"

"ہاں، کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔" نادیہ دھیرے سے بولی۔ "اس کہانی کا ایک موڑ یہ ہے کہ میں اپنے سازشی اور لالچی باپ سے بغاوت کر کے، اسے چھوڑ کر تمہارے پاس آ گئی ہوں۔"

"دیکھو بی بی! یہ سب کہانیوں کی باتیں ہیں۔ میں ایک تہی دست انسان ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔"

"لیکن تم کم از کم انسان تو ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا اتنی جلدی اور اس طرح بدل جانا میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟" سید بادشاہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم یہ بتاؤ، تم پہلے تو پیر سائیں تھے نا؟"

"ہاں، لوگ مجھے اسی نام سے جانتے ہیں۔"

"تو یہ بتاؤ کیا تمہیں خود اپنا بدل جانا سمجھ میں آیا ہے؟" نادیہ نے پوچھا۔

سید بادشاہ نے اس سوال پر اپنی گردن جھکا لی۔

☆☆☆

اس کی کہانی فٹ پاتھ سے شروع ہوئی تھی۔ اب پھر ایک فٹ پاتھ ہی نے اسے سہارا دیا تھا۔ وہ کہاں کہاں بھٹکتا ہوا پھر فٹ پاتھ پر آ گیا تھا۔

پہلے نیلم کے ساتھ اس کا کئی ہفتے گزارنا پھر وہاں سے فرار۔ اس کے بعد ایک مزار، اس کے سودے کی بات چیت اور اس کا وہاں سے بھاگ نکلنا۔ یہ سب کسی بھیانک خواب کی طرح اس سے چمٹ گیا تھا۔

وہ اب شہر کے کسی اور حصے کی فٹ پاتھ کا حصہ بن گیا تھا۔ یہاں کوئی اسے جاننے والا نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے اس پر اعتراض کیا تھا۔

وہ سب بھی راجو کی طرح کے انسان تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلی رات خیریت سے گزر گئی لیکن دوسری رات آرام سے نہیں گزری۔ دو آدمی اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ ''اے بچے! کیا نام ہے تمہارا؟'' ایک نے بڑی نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

''راجو۔'' راجو نے اپنا نام بتا دیا۔

''یہاں کیوں آئے ہو؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''میرا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔'' راجو نے کہا۔ ''اس لیے یہاں آ گیا ہوں۔''

''اور تمہارے ماں باپ وہ کہاں ہیں؟''

''میں نہیں جانتا۔ میں نے کبھی اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا۔''

''کیا شان ہے خدا کی۔'' پہلے والا اوپر کی طرف دیکھ کر بولا۔ پھر ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ''نہ جانے کیسے بے رحم لوگ ہیں جو ایسے پیارے پیارے بچوں کو زمانے کے حوالے کر کے چلے جاتے ہیں۔ انہیں افسوس بھی نہیں ہوتا۔''

راجو خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سنتا رہا۔ وہ دونوں اس کے لیے ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے راجو کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو بیٹے! ہم تمہیں اس طرح فٹ پاتھ پر نہیں چھوڑ سکتے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟ تمہارے ساتھ کہاں جاؤں؟''

''ہم تمہیں بہت اچھی جگہ لے چلیں گے جہاں تمہارے لیے آرام ہی آرام ہو گا۔'' دوسرے نے کہا۔ ''چلو، اب میں اپنا نام بتا دوں۔ میں چیتا ہوں اور یہ ٹائیگر ہے۔'' اس نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیسے نام ہیں؟'' راجو نے حیرت ظاہر کی۔

''ہم اسی قسم کے ناموں سے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔ تمہارا بھی ایک خوب صورت نام ہو جائے گا۔''

راجو ان دونوں کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ دونوں خوامخواہ اس کے گلے پڑ گئے تھے لیکن وہ اس وقت بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ ان میں سے ایک نے جس نے اپنا نام چیتا بتایا تھا، بڑی مضبوطی کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ راجو کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ دونوں کس گاڑی پر ہوں گے۔ ایک ٹیکسی پاس ہی کھڑی ہوئی تھی۔ راجو کو اس ٹیکسی میں بٹھا دیا گیا، ٹیکسی چلانے والا کوئی اور آدمی تھا۔

راجو کو یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ دونوں اسے کہاں لے جا رہے ہیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ یہ سفر طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا طویل کہ راجو کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

''یہ تم دونوں مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یہ سمجھو کہ ہم تمہیں جنت میں لے جا رہے ہیں۔'' اس نے کہا جس کا نام ٹائیگر تھا۔ ''تمہیں ہماری ذات سے کوئی نقصان نہیں ہو گا بلکہ تم فائدے میں رہو گے۔ ہم جہاں جا رہے ہیں، وہاں تمہاری طرح کے اور بھی بچے ہیں۔''

اب ان سے کچھ اور کہنا بھی بیکار ہی تھا۔

بہت دیر کے بعد ٹیکسی ایک احاطے میں داخل ہو گئی۔ اس احاطے کے بڑے گیٹ کو ٹیکسی کے اندر آتے ہی بند کر دیا گیا تھا۔

یہ بہت عجیب سی جگہ تھی۔ ایک بڑا سا میدان جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے سے بنے ہوئے تھے۔ اس نے وہاں بہت سے بچوں کو دیکھا۔ وہ بھی شلوار قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔

احاطے میں کئی مقامات پر بلب روشن تھے جن کی روشنی میں پورا احاطہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ راجو نے گیٹ کے پاس ایک چوکیدار بھی دیکھا جس پر ایک آدمی چڑھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق راجو کو صاف دکھائی دے رہی تھی۔

خدا جانے وہ کہاں آ کر پھنس گیا تھا اور یہ لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔ راجو کو ایک بڑے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک نورانی صورت شخص گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی تسبیح تھی جس کے دانے جلدی جلدی گر رہے تھے۔

وہ راجو کو بہت گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''استاد! اس کا نام راجو ہے۔'' اس کو لانے والے نے بتایا۔ ''یہ بے چارہ اس دنیا میں اکیلا ہے۔''

''اکیلا کیوں ہے، ہم اس کے ہیں۔ خدا کی ذات اس کی ہے اور جنت کی حوریں اس کی ہیں جو اس کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔''

''سبحان اللہ... سبحان اللہ۔'' ٹائیگر اور چیتا دونوں بول پڑے۔

''تمہیں کیا معلوم کہ اس کا مقام کیا ہے۔'' اس شخص نے بات آگے بڑھائی۔ ''اس کے لیے کون کون سی نعمتیں لکھ دی گئی ہیں۔''

اس کی کوئی بات راجو کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اتنا ضرور اندازہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں سے فی الحال اسے کوئی

خطرہ نہیں ہے۔

اس بارعب شخص کے اشارے پر راجو کے سامنے دسترخوان لگا دیا گیا تھا جس پر کئی طرح کے کھانے چن دیے گئے تھے۔ راجو کو یہ سب اچھا تو لگ رہا تھا لیکن خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ یہ لوگ اسے کھانا کھلانے تو نہیں لائے ہوں گے۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی۔

راجو کے کھانا کھانے کے دوران میں وہ لوگ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ان کی بہت سی باتیں راجو کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

کھانے سے فارغ ہوا تو اسے ایک کمرے میں آرام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کمرے میں ایک آرام دہ بستر تھا جس پر لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔

دوسری صبح راجو کے لیے بہت حیرت انگیز تھی۔

بہت سویرے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کسی طرح کے شور نے اسے بیدار کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلا ہی سویا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر رکھا تھا۔

شور کی آواز کمرے کے باہر سے آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ تیس چالیس بچے احاطے کے میدان میں جمع تھے اور کوئی شخص انہیں ورزش کروا رہا تھا۔ راجو کے لیے یہ منظر حیرت انگیز بھی تھا اور دلچسپی کا بھی۔ اس نے اس قسم کی ورزشیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

اور اچانک راجو کو نیلم دکھائی دے گئی۔ وہ لڑکی جس نے راجو کو سہارا دیا تھا اور جو راجو کو اپنے ساتھ اپنے فلیٹ میں لے گئی تھی۔ وہی نیلم یہاں اس آدمی کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی جس نے رات کو راجو سے باتیں کی تھیں اور جس کو چیتا اور ٹائیگر استاد کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

☆☆☆

سید بادشاہ کو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ شوکت خان جیسے شخص کی بیٹی اتنی پاکیزہ بھی ہو سکتی ہے۔

سید بادشاہ کے لیے اب آزمائشیں شروع ہوئی تھیں۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات تھے۔ وہ اب کیا کرے؟ یا تو نادیہ کو اس کے باپ کے پاس واپس بھیج دے یا اسے اپنا لے... لیکن اپنانے کی صورت میں اس کے سامنے کئی سوالات تھے۔

بہرحال وہ نادیہ کو اپنے چھوٹے سے گھر میں لے آیا تھا جہاں منیر جیسا شخص اسے راستہ دکھانے کے لیے بیٹھا تھا۔

سید بادشاہ نے جب یہ ساری کہانی اسے سنائی تو منیر نے کہا۔ ''سرکار! آپ اب خوش ہو جائیں کہ آپ کے لیے آزمائشیں شروع ہو گئی ہیں۔''

''منیر! تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں اس لڑکی کے لیے کیا کروں؟''

''سامنے کی بات ہے سرکار! اسے پناہ دیں۔'' منیر نے کہا۔ ''ایک لڑکی اپنے ضمیر کی روشنی میں ایک فیصلہ کر کے آپ کے پاس آئی ہے تو اسے دوبارہ اندھیروں کی طرف واپس نہ بھیجیں۔''

''لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ شوکت خان اس کا باپ ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ جو لوگ ایمان لاتے تھے، وہ اپنے خون سے ہمیشہ کے لیے کٹ کر رہ جاتے تھے۔ آپ یہی سمجھیں کہ یہ لڑکی ایمان لے آئی ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت اور اس کی ذمے داری آپ پر فرض ہو گئی ہے۔''

''منیر! تمہیں کیا معلوم کہ میری زندگی کن حالات میں گزری ہے۔'' سید بادشاہ کی آواز میں کرب تھا۔ ''میں اپنے دل پر کتنا بڑا بوجھ لیے گھومتا پھر رہا ہوں۔ کسی کی تلاش ہے مجھے کہ شاید وہ مل جائے۔''

''سرکار! آپ نے اپنے بارے میں جتنا بتایا تھا، بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔''

''منیر! شاید وہ وقت آ گیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے کچھ اور راز بھی ظاہر کر دوں۔'' سید بادشاہ نے کہا۔ ''اور یہ اچھی بات ہے کہ اس وقت ایک ایسی لڑکی یہاں موجود ہے جو نہ جانے کیوں مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں تم دونوں کے سامنے بتانا چاہتا ہوں۔''

کچھ دیر کے بعد سید بادشاہ اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس وقت منیر کے علاوہ نادیہ بھی اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ ''میں ایک بہت بے رحم اور خطرناک آدمی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں سوائے گناہ سمیٹنے کے اور کچھ بھی نہیں کیا۔ اب میں اپنی تاریخ کیا دہراؤں، یہ سب جانتے ہیں۔ بہرحال، اس دوران پاکیزہ میری زندگی میں آ گئی۔''

''اور یہ پاکیزہ کون ہے؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''ایک ایسی لڑکی جو ہر لحاظ سے پاکیزہ تھی۔'' سید بادشاہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ ایسی لڑکی تھی جس نے مجھ کو اتنا متاثر کیا کہ میں نے اس سے شادی کر لی تھی۔ یہ میں مختصراً بتا رہا ہوں۔ شادی کے بعد ایک سال ہم نے بہت پیار اور سکون سے گزارا۔ ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ اس کے بعد ہمارے اختلافات شروع ہو گئے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ کیوں؟'' منیر نے پوچھا۔

''میری بے راہ روی کی وجہ سے۔'' سید بادشاہ نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔ ''وہ چاہتی تھی کہ میں جرائم کی زندگی چھوڑ دوں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بیٹے کی پرورش میری کمائی سے نہیں کرے گی۔''

''سبحان اللہ سرکار! پھر تو وہ واقعی پاکیزہ تھی۔'' منیر نے کہا۔

''ہاں، وہ ایسی ہی تھی منیر! اس نے ایک اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے بچے کی پرورش اپنی تنخواہ سے کی۔ اس کا کھانا پینا، کپڑے اور دیگر چیزیں' یہ سب وہ اپنی تنخواہ سے پورا کرتی تھی۔ اس طرح تین سال اور گزر گئے۔ اس دوران وہ مجھے سمجھاتی رہی لیکن میری آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں کہاں ہاتھ آنے والا تھا۔ میں اپنی روش پر چلتا رہا پھر ایک دن اچانک پاکیزہ بچے کو لے کر گھر سے چلی گئی۔''

''کہاں چلی گئی؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''کاش! مجھے یہ معلوم ہوتا لیکن میری بے حسی یہ تھی کہ میں نے اس کی بھی پروا نہیں کی اور اپنے دھندوں میں الجھا رہا۔ اس طرح اور کئی سال اسی اندھیرے میں گزر گئے۔ اس کے بعد اچانک مجھے ایک روشنی مل گئی۔ سچائی کی روشنی، ایمان کی روشنی۔ میں نے دنیا کے معاملات چھوڑ دیے۔ اس وقت پھر پاکیزہ بھی یاد آ گئی اور اپنا بچہ بھی۔ میں نے تلاش شروع کر دی۔ پاکیزہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کئی برس پہلے مر چکی ہے اور بچہ غائب تھا۔''

''اس وقت بچہ کتنا بڑا ہوگا سرکار؟''

''میرے اندازے کے مطابق پانچ یا چھ سال کا۔'' سید بادشاہ نے بتایا۔ ''اب تو وہ تیرا یا چودہ برس کا ہو چکا ہوگا اور میں اس کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگا، کس حال میں ہوگا؟ کن لوگوں کے درمیان پرورش پا رہا ہوگا؟''

☆☆☆

اس احاطے میں نیلم کو دیکھ کر راجو حیران رہ گیا۔

نیلم یہاں کیسے آ گئی تھی، وہ تو اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے پاس اپنا شان دار فلیٹ تھا، گاڑی تھی۔ اس کے پاس راٹھور بھی تھا پھر وہ یہاں کیسے آ گئی تھی؟

نیلم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے پاس کھڑے ہوئے اس بارعب شخص سے کچھ کہا پھر جلدی سے خود راجو کے پاس آ گئی۔ ''ارے راجو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''اور آپا! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''اوہ... یہ بہت لمبی کہانی ہے۔'' نیلم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم آؤ میرے ساتھ۔''

وہ اسے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے آئی۔ اس کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی... بلکہ پورے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' نیلم نے اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ ''اب بتاؤ، تم یہاں کیسے آ گئے؟''

''آپا! تم بتاؤ تم یہاں کیسے آ گئیں؟''

''راجو! میں بتا دوں گی۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہاں کون لایا ہے؟ تم تو راٹھور کو مار کر بھاگے تھے۔ پھر کہاں چلے گئے تھے؟''

راجو نے نیلم کو اب تک کی پوری کہانی سنا دی۔ وہ بہت حیرت سے اس کی داستان سنتی رہی۔ پھر راجو کے خاموش ہو جانے کے بعد اس نے راجو سے کہا۔ ''راجو! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بھاگ جانا چاہیے تھا۔''

''لیکن آپا! میں خود سے تو نہیں آیا۔ وہ دونوں مجھے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔'' راجو نے بتایا۔ ''لیکن آپا! یہ کون سی جگہ ہے؟''

''بھتا! یہ موت بانٹنے کی فیکٹری ہے۔'' نیلم نے کہا۔

راجو کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ یہ موت بانٹنے کی فیکٹری کیسے ہو سکتی ہے؟ پھر بھی اس نے سوال کیا۔ ''آپا! یہ اگر موت بانٹنے کی فیکٹری ہے تو پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میں مجبور ہوں۔'' نیلم نے کہا۔ ''یعقوب صاحب میرے باپ ہیں... سگے باپ اور میں ان کی بیٹی ہوں۔''

''یعقوب صاحب... کون یعقوب صاحب؟'' راجو نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی جن کو یہاں کے لوگ استاد کہتے ہیں اور جو اس کیمپ کو چلا رہے ہیں۔'' نیلم نے بتایا۔ ''راجو! میری یہ کہانی بہت عجیب ہے۔ میں انہی کی وجہ سے اس حال کو پہنچی تھی جو تم نے دیکھا ہے۔ میں ایک عیاش شخص کی داشتہ تک بن گئی تھی اور اب انہی کی وجہ سے مجھ پر دوسری مصیبتیں بھی آنے والی ہیں، یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہرحال، میری کوشش ہو گی کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ ویسے تو یہ لوگ تمہیں زندگی بھر نہیں نکلنے دیں گے۔ تم صرف یہاں سے بھاگ کر ہی نکل

سکتے ہو۔''

اسی لمحے وہ بوڑھا یعقوب کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسے دیکھ کر نیلم خاموش ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔ ''نیلم! تم اس لڑکے کو کب سے جانتی ہو؟''

''بہت دنوں سے بابا! یہ بہت اچھا لڑکا ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ''بابا! یہ یہاں سے چلا جائے تو بہت اچھا ہو۔''

''کیوں گھر کی باتیں کر رہی ہو بیٹا۔'' یعقوب نے کہا۔ ''جب اس لڑکے کو ایک اعلیٰ مقام ملنے والا ہے تو اسے بہکانے کی کوشش کر رہی ہو۔''

''نہیں بابا! میں اسے بہکا نہیں رہی۔''

''تو پھر اس کی تربیت ہو جانے دو۔'' یعقوب نے کہا۔ ''اور اسے بھلائی کے راستے پر جانے دو۔''

نیلم نے خاموشی سے گردن جھکا دی۔ یعقوب کچھ دیر بعد کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد راجو نے پوچھا۔ ''آپا! یہ سب کیا ہے؟ یہ آپ کے بابا کیا کہہ رہے تھے؟''

''راجو! یہاں نہیں... کچھ دیر کے بعد تم اپنے کمرے میں چلے جانا۔ میں وہیں آ کر تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔''

''ٹھیک ہے آپا۔''

راجو کو کمرے میں بھیج کر نیلم نے کمرے میں رکھے ہوئے ایک بکس سے ایک ڈائری نکالی اور اس کے اوراق الٹنے لگی۔

یہ ڈائری اس کی زندگی کی تاریخ تھی۔ اس کے روز و شب اس ڈائری میں تحریر تھے۔ اس کی کہانی کی ابتدا چار برس پہلے سے ہوتی تھی۔

یعقوب... نیلم کے باپ نے اپنی زندگی کی راہیں کچھ اور کر لی تھیں۔ نہ جانے کون لوگ اسے مل گئے تھے۔ اس سے پہلے وہ اچھا خاصا ایک وکاندار تھا۔ ایک بڑا اسٹور تھا اس کا۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی۔ یعقوب کی بیوی یعنی نیلم کی ماں کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب وہ پندرہ برس کی تھی۔ اس کے بعد باپ ہی نے اس کی پرورش کی تھی۔

نیلم نے کالج میں تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

سب کچھ نارمل ہی تھا کہ اچانک یعقوب نے زندگی کے راستے بدل لیے۔ وہ جنونی سا ہونے لگا۔ ہر دوسرا آدمی اسے کافر دکھائی دیتا۔ اس نے نیلم پر اچانک سختیاں شروع کر دیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے، وہ نہیں کرو۔ گھر سے ٹی وی اٹھا کر پھینک دیا۔ نیلم کو مجبور کرنے لگا کہ وہ برقع استعمال کرے اور وہ بھی مکمل۔ نیلم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ تربیت اس طرح اچانک نہیں ہوتی، ابتدا میں یہ سب کرنا پڑتا ہے اور اب تو اس نے اپنا ایک لائف اسٹائل بنا ہی لیا ہے' وہ اتنی جلدی کیسے یہ سب بدل سکتی ہے لیکن وہ اس پر سختیاں کرتا رہا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے اپنی دکان بھی فروخت کر دی تھی اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔

نیلم کا دل ہی جانتا ہے کہ اس نے یہ چار پانچ سال کیسے گزارے تھے۔ ایک نوجوان نے اسے سہارا دیا اور اس کو برباد کر کے بھاگ نکلا۔

پھر نیلم غلط راہوں پر چل نکلی۔ یعقوب کا کوئی پتا نہیں تھا۔ نیلم کو اپنا فلیٹ بیچنا پڑ گیا۔ وہ روپے کچھ دنوں تک اس کے کام آتے رہے پھر اسے راٹھور مل گیا جس نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔

اس دوران میں وہ یعقوب کو بھی تلاش کرتی رہی لیکن وہ اسے نہیں مل سکا اور جس دن راٹھور نے ذرا سی بات پر اس پر تشدد کیا اور جس دن راجو اس کا سر پھاڑ کر بھاگ نکلا تھا، اس کے دوسرے دن یعقوب اچانک اسے مل گیا۔

وہ اب بہت بدل چکا تھا۔

وہ نیلم کو اپنے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے آیا جہاں نہ جانے کس قسم کے لوگ تھے۔ بچے تھے جن کو ٹریننگ دی جاتی۔ نیلم کو اس احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ایک گھٹی ہوئی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کا باپ اس کے لیے اجنبی جیسا ہو گیا تھا۔ نیلم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کہ اچانک اسے راجو دکھائی دے گیا۔

اس نے ڈائری بکس میں رکھتے ہوئے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گی اور راجو کو بھی اپنے ساتھ لے چلے گی۔

☆☆☆

سید بادشاہ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ نادیہ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر اور سنجیدگی سے کیا ہے۔ وہ اب اپنے باپ کے پاس واپس نہیں جائے گی۔ دوسری طرف منیر کا بھی یہی مشورہ تھا کہ نادیہ جب اچھائی کے راستے پر چل نکلی ہے تو اسے واپس نہ بھیجا جائے۔

سید بادشاہ نے نادیہ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

''تم یہ بتاؤ کہ تم جو اپنے بیٹے کو تلاش کرتے پھر رہے ہو تو اسے شناخت کیسے کرو گے؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ خون خون کو پہچان لیتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سید بادشاہ نے کہا۔ ''اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا بیٹا بالکل میری شکل کا ہے۔ اور تیسری سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی کلائی پر جلنے کا نشان ہے۔ وہ جب چھوٹا تھا تو جلتی ہوئی استری اس نے اپنی کلائی پر گرالی تھی۔''

''خیر! جو بھی ہو، میں اس تلاش میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''نادیہ! میرا مشورہ ہے کہ تم واپس چلی جاؤ کیونکہ تمہیں ابھی پریشانیوں کا اندازہ نہیں ہے۔ میری زندگی میں سوائے الجھنوں کے اور کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔ دوسری طرف تمہارا باپ ہے۔ تمہارے پاس دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔ تم میرے لیے کہاں تک دھکے کھاتی رہو گی۔''

''سید بادشاہ! میں یہ دھکے تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنی پچھلی زندگی کی تلافی کے لیے برداشت کروں گی۔'' نادیہ نے کہا۔ ''میں اپنے باپ کا گھر چھوڑ آئی ہوں۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ اب مجھے وہاں واپس نہیں جانا۔''

''دیکھو، تمہارا باپ ایک طاقتور انسان ہے۔ وہ میرے اور تمہارے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتا ہے۔'' سید بادشاہ نے کہا۔

''کیا تمہیں خوف محسوس ہو رہا ہے؟''

''بے وقوف ہو تم۔ میں اپنے لیے نہیں تمہارے لیے کہہ رہا ہوں۔''

''تو پھر تم میری فکر چھوڑ دو۔'' نادیہ نے کہا۔ ''مجھے وہی کرنا ہے جو میں نے فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اب واپس نہیں جانا۔''

''تمہاری مرضی۔''

منیر نے مشورہ دیا۔ ''سرکار! آپ کو نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ آپ اس لڑکی سے نکاح کر لیں۔ ایسی صورت میں اس کا باپ مجبور ہو جائے گا۔''

''منیر! اس مکان میں نکاح کا بندوبست کیسے ہو سکتا ہے؟''

''سب ہو جائے گا۔ آپ بس حکم کریں۔''

''چلو تو پھر کر لو بندوبست۔''

''سرکار! سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ نادیہ بی بی کے لیے کچھ جوڑے خرید لیں۔'' منیر نے کہا۔ ''پیسوں کی پروا نہ کریں۔ میرے پاس ہیں۔''

''منیر! تم میرے کتنے کام آؤ گے؟''

''یہ تو میری خوش نصیبی ہو گی کہ میں آپ کے کام آ جاؤں۔'' منیر نے کہا۔ ''آپ نادیہ بی بی سے معلوم کر لیں کہ لباس کے معاملے میں ان کی کیا پسند ہے۔''

سید بادشاہ نے جب نادیہ سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ''سید بادشاہ! میری پسند وہی ہو گی جو آپ لائیں گے اور صرف عام سے دو چار جوڑے لے لیں تاکہ وہ بعد میں میرے کام آ سکیں۔''

سید بادشاہ اور منیر دونوں اسی وقت مارکیٹ کی طرف چلے گئے۔ انہیں واپس آ کر نکاح کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

لیکن جب وہ واپس آئے تو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

ان کی غیر موجودگی میں گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ محلے والے یہ بتا رہے تھے کہ وہ گولیاں چلاتے ہوئے آئے تھے اور گولیاں چلاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اس معمولی سے گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے وہ ساتھ لے جا سکتے البتہ وہ نادیہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

سید بادشاہ سکتے میں رہ گیا۔ ''منیر! مجھ غریب کے پاس ہے کیا کہ ڈاکو یہاں چلے آئے؟''

''سرکار! وہ ڈاکو نہیں تھے۔ وہ اس کے باپ کے بھیجے ہوئے آدمی ہوں گے۔'' منیر نے کہا۔ ''وہ نادیہ بی بی کو لینے آئے تھے اور انہیں لے کر واپس چلے گئے اور اس وقت نادیہ بی بی اپنے باپ کے پاس ہی ہوں گی۔''

''سمجھ گیا۔'' سید بادشاہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے اب اپنے اندر کے تنویر سائے کو بیدار کرنا ہی پڑے گا۔''

☆☆☆

راجو کو بھی ٹریننگ دی جا رہی تھی۔

اس کی کوئی خاص ٹریننگ نہیں تھی۔ بس اسے یہ بتایا جا رہا تھا کہ یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ دکھوں کا گھر ہے۔ انسان کا اصل گھر تو جنت ہے جہاں دنیا بھر کی خوشیاں ہیں اور یہ خوشیاں انہی کو ملتی ہیں جو اپنی قربانی دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ باتیں بھی راجو کی سمجھ سے باہر ہی تھیں۔

لیکن وہ خاموشی سے سنتا رہتا۔ یعقوب کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ اسے اسی قسم کی باتیں بتایا کرتا۔

ایک دن اس کیمپ میں ایک ایسا آدمی آ گیا جس کا احترام خود یعقوب بھی کر رہا تھا۔ وہ ایک نورانی صورت بوڑھا تھا جو چلنے کے لیے تو لاٹھی کا سہارا لیا کرتا لیکن اس کی آواز میں بہت گرج تھی۔

اس وقت راجو، نیلم اور یعقوب کمرے میں ہی تھے کہ باہر سے پوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے

گئیں۔ یہ تینوں فوری طور پر کمرے سے باہر آ گئے۔ وہ نورانی صورت بوڑھا دروازے کے باہر کھڑا تھا۔

''ارے حضرت آپ!'' یعقوب نے بوکھلا کر پوچھا۔ ''آپ کیسے تشریف لے آئے؟''

''یعقوب! میں تیری تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''تیرے یہ آدمی تو مجھے اندر بھی نہیں آنے دے رہے تھے لیکن جب میں نے تیرا نام لیا تو مجھے یہاں تک لے آئے ہیں۔''

''یہ استاد ہیں میرے۔'' یعقوب نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ پھر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ ''آئیں استاد، اندر آ جائیں۔ اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

نیلم نے چونکہ راجو کا ہاتھ تھام رکھا تھا اس لیے وہ بھی ان کے ساتھ کمرے میں آ گیا تھا۔ یعقوب نے بڑے احترام کے ساتھ اس بوڑھے کو بٹھایا اور خود اس کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔

''جی حضرت! اب فرمائیں۔''

''یعقوب! کیا ہو گیا ہے تجھے؟'' بوڑھے نے پوچھا۔ ''یہ تو کس راستے پر چل نکلا ہے؟ اور جو کچھ تو کر رہا ہے، کیا وہ دین کی خدمت ہے؟''

''میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں استاد۔''

''انتہائی غلط سمجھتا ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''دین تو کچھ اور ہے۔ یہ انتہا پسندی کا نہیں بلکہ برداشت کا نام ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ آنحضرتؐ نے پتھر کھانے کے باوجود دعائیں دی تھیں۔ دشمنوں کو معاف کر دیا تھا اور یہ تیرے دشمن کہاں ہیں، یہ تو تیرے اپنے لوگ ہیں۔''

''لیکن یہ سب کے سب بھٹک چکے ہیں استاد۔''

''اس کا فیصلہ کرنے والا تو کون ہوتا ہے؟ اور یہ چھوٹے چھوٹے بچے... تو انہیں کس آگ میں جھونک رہا ہے؟ یاد رکھ تو جسے دین سمجھ رہا ہے وہ سوائے دھوکے کے اور کچھ بھی نہیں ہے اور ایسا دھوکا جس میں دوسروں کو بھی جتلا کر رہا ہے اور خود بھی جتلا ہو گیا ہے۔''

''آپ کچھ بھی کہیں استاد، اب یہ بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔''

''کچھ بھی ہو، میں تجھے روکنے کی کوشش کروں گا۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''میں پولیس کو تیرے اس ٹھکانے کے بارے میں بتا دوں گا۔''

''یہ تو اس وقت ہو گا نا استاد جب آپ کو یہاں سے جانے دیا جائے گا۔'' یعقوب نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ہاں استاد! اب آپ کا یہاں سے جانا ممکن نہیں رہا کیونکہ آپ کو ہمارے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ معاف کیجیے گا استاد! آپ کو اب یہیں رہنا ہے۔ یہاں کے سارے لوگ آپ کا احترام کریں گے۔ خود میں آپ کی ہر بات برداشت کر لوں گا لیکن آپ یہاں سے جا نہیں سکیں گے۔''

راجو اس وقت بہت خوف محسوس کرنے لگا۔ اسے یعقوب سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس شخص کے چہرے پر اس وقت نرمی نہیں تھی بلکہ عجیب سا بھیانک پن تھا۔ ایسا بھیانک پن جس نے راجو کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ خود نیلم بھی بہت خوف زدہ ہو رہی تھی کیونکہ راجو کے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت ہو گئی تھی۔

☆☆☆

سید بادشاہ اب سید بادشاہ نہیں بلکہ تنویر سایا تھا۔ اس نے شوکت خان کو فون پر کہا۔ ''شوکت خان! اس وقت تم سے سید بادشاہ نہیں بلکہ تنویر سایا مخاطب ہے۔''

''ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اپنی بیٹی نادیہ کو رہا کر دو۔ اسے اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دے دو۔''

''تنویر سایا! میں نہیں جانتا نادیہ کہاں ہے۔ اسے تو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تجھے اس کا حساب دینا ہو گا۔''

''شوکت خان! میں نے کہا نا کہ میں سید بادشاہ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنویر سایا ہوں۔ اس لیے مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں نہیں چلیں گی۔ تیرے آدمی اسے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ میں تجھے صرف آدھ گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ اسے تیرے مکان سے باہر آجانا چاہیے۔ ورنہ مکان کو آگ لگا دوں گا اور یہ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تنویر سایا صرف دھمکیاں نہیں دیتا۔"

اتنا کہہ کر سید بادشاہ نے ریسیور رکھ دیا۔ اس نے یہ فون ایک کال آفس سے کیا تھا۔ اس دوران میں منیر اس کے ساتھ ہی کھڑا رہا تھا۔

"یہ بات ہوئی سرکار۔" منیر نے کہا۔ "آپ نے بالکل صحیح باتیں کی ہیں۔"

"لیکن میرا دل تو اندر سے رو رہا ہے منیر۔" سید بادشاہ کی آواز میں دکھ تھا۔ "میں نے کتنی مشکلوں سے خود کو تبدیل کیا تھا۔ اس تبدیلی کے لیے کیسی ریاضتیں کی تھیں لیکن سب ذرا سی دیر میں ختم ہو گیا۔"

"نہیں سرکار! ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔" منیر نے کہا۔ "کیونکہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ بھی ایک عبادت ہے۔ آپ کسی کو جبر کے ماحول اور حالات سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"منیر! میں نے شوکت خان سے اتنی بڑی بات کہہ تو دی ہے لیکن یہ کیسے ہوگا؟"

"اس کے لیے آپ کو اپنے پرانے ساتھیوں کی مدد لینی ہوگی سرکار۔" منیر نے کہا۔ "اس ٹیم کا سہارا لینا ہوگا جس نے ہر طرف آپ کے نام کی دھاک بٹھا دی تھی۔"

"یعنی میں ایک بار پھر پوری طرح انہی راستوں پر چل نکلوں؟"

"نہیں سرکار! نادیہ بی بی کو اس چنگل سے نکالنے کے بعد آپ یہ شہر چھوڑ دیں۔ چلے جائیں یہاں سے۔ تاکہ پھر آپ کے لیے کوئی اندیشہ نہ رہے۔"

"ہاں منیر! اب مجھے یہی کرنا ہوگا۔"

تنویر سایا جب اپنے خاص آدمی ریاض بانکے کے پاس پہنچا تو وہ اسے دیکھ کر نہال ہو گیا۔ "باس! تمہارے بغیر زندگی بالکل ویران اور پھیکی ہو گئی تھی۔ یہ تم کن راستوں پر چل نکلے تھے؟"

"بانکے! میں نیکی اور شرافت کے راستے پر چل نکلا تھا۔" سید بادشاہ نے کہا۔

"رہنے دو باس! ایسے راستے ہم لوگوں کے لیے نہیں ہیں۔ ہمارے لیے وہی راستہ صحیح ہے جس پر ہم چلتے آئے ہیں۔ تم خود دیکھ لو، تم جب تک تنویر سایا بنے رہے، تمہیں کوئی پریشان نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہر چیز تمہارے اختیار میں تھی لیکن سید بادشاہ بنتے ہی تم کمزور ہو گئے۔ دنیا بھر کی آفتیں تمہارے سر پر آگئیں۔"

"یہ سب چھوڑ بانکے! میں اس وقت تیرے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔"

"تمہارے لیے تو جان بھی حاضر ہے باس! بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"ایک جگہ چھاپا مار کر اس مکان سے ایک لڑکی کو اٹھانا ہے۔"

"جیتے رہو استاد! رگوں میں خون جوش کھانے لگا ہے۔" ریاض پرجوش ہو گیا۔ "بتاؤ کون ہے وہ لڑکی؟ کہاں رہتی ہے؟"

"اس کو بہت حفاظت سے نکالنا ہے کیونکہ وہ تیری ہونے والی بھابی ہے۔" سید بادشاہ نے بتایا۔

"یہ بات ہے باس تو پھر ہونے والی بھابی پر خراش بھی نہیں آئے گی۔" ریاض بانکے نے کہا۔ "لیکن وہ ہے کون؟ کس مکان میں رہتی ہے؟"

"تم نے شوکت خان کا نام سنا ہے؟" سید بادشاہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، وہ تو بہت بڑی چیز ہے۔ مجھے اپنا بھی حساب چکانا ہے۔" ریاض بانکے نے کہا۔

"اس کی لڑکی ہے۔ نادیہ نام ہے اس کا۔" سید بادشاہ نے بتایا۔ "لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ شوکت خان نے اس کو کہاں بند کر کے رکھا ہوگا۔"

"اس کی فکر ہی مت کرو۔ یہ معلوم کرنا بھی میرا کام ہے۔ تم بس آرام کرو اور اپنا ٹھکانا بتا دو۔ اس لڑکی کو تمہارے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

"فی الحال اسے پوائنٹ نمبر بارہ پر لے آنا۔" سید بادشاہ نے کہا۔

پوائنٹ نمبر بارہ ایک پارک تھا جہاں سید بادشاہ اکثر اپنے آدمیوں کو بلایا کرتا تھا۔

"ٹھیک ہے باس! تم بے فکر ہو جاؤ۔ شام تک تمہارا یہ کام ہو جائے گا۔"

سید بادشاہ نے اپنا کھیل شروع کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا کام اب ہو ہی جائے گا۔ ریاض بانکا اور اس کے ساتھی کچھ اسی قسم کے لوگ تھے۔ ناممکن کو ممکن کر دکھانے والے۔

وہ شام کے وقت پوائنٹ نمبر بارہ پر پہنچ گیا۔ منیر بھی

اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ اسے ریاض بانکے اور نادیہ کا انتظار تھا۔ شام پانچ بجے صرف ریاض بانکا ہی آیا۔ اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔

"کیا ہوا بانکے! کیا وہ نہیں ملی؟ کیا تم لوگ اس تک نہیں پہنچ سکے؟" سید بادشاہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"سب کچھ ہو گیا ہے باس۔" ریاض بانکا نے بتایا۔ "ہم اس مکان میں گھس گئے تھے جہاں اس لڑکی کو رکھا گیا ہے لیکن پھر کوئی اور بات ہو گئی۔"

"کیا بات ہو گئی؟"

"اس لڑکی نے ہمارے ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔" ریاض بانکا نے بتایا۔ "اگر تمہارا حکم نہیں ہوتا تو ہم اسے زبردستی بھی اٹھا کر لے آتے لیکن چونکہ تم نے منع کر دیا تھا اس لیے ہم کچھ نہیں کر سکے۔ صرف تمہارا حوالہ دیتے رہ گئے اور اس نے ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔"

"لیکن کیوں؟"

"اب میں کیا بتاؤں باس! ویسے اس لڑکی نے ایک موبائل نمبر دیا ہے اور کہا ہے کہ تم اس سے بات کر لو۔" ریاض بانکے نے موبائل نمبر کی پرچی سید بادشاہ کی طرف بڑھا دی۔

سید بادشاہ نے بڑی بے تابی سے اپنے موبائل سے اس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف نادیہ ہی تھی۔ "نادیہ! یہ سب کیا ہے؟" سید بادشاہ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں اندازہ ہے کہ میں نے کس طرح اپنے آدمیوں کو تمہیں لانے کے لیے بھیجا ہو گا؟"

"ہاں سید بادشاہ! مجھے اندازہ ہے۔" نادیہ نے کہا۔ "لیکن افسوس کہ میں تمہارے آدمیوں کے ساتھ نہیں آسکی۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دینا اور ہو سکے تو مجھے بھول جانے کی کوشش کرنا۔"

"لیکن کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"سید بادشاہ! اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ مجھے اب احساس ہوا ہے کہ میرا باپ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اس نے میرا یہ قصور بھی معاف کر دیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ چلی گئی تھی اور وہ دل کا مریض بھی ہے۔ تم نے مجھے جو ایمان داری اور سچائی کا راستہ دکھایا ہے، میں اسی پر چلتی رہوں گی۔ یہ میرا تم سے اور اپنے خدا سے وعدہ ہے۔ مجھے جو روشنی ملی ہے، اسے میں کبھی اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ تو اگر میں اس روشنی کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کی خوشیوں کا بھی خیال رکھوں تو یہ کوئی غلط بات تو نہیں ہوگی... بتاؤ؟"

"نہیں۔" سید بادشاہ کی آواز میں لرزش تھی۔ "یہ کوئی غلط بات نہیں ہوگی بلکہ شاید روشنی وہی ہے جو تم نے اب جا کر حاصل کی ہے۔"

"مجھے معاف کر دینا سید بادشاہ! اور تم اپنے راستے سے ہٹنے کی کوشش مت کرنا... خدا حافظ۔"

سید بادشاہ بہت نڈھال ہو رہا تھا۔ اس وقت منیر نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "مبارک ہو سرکار! خدا نے آپ کے لیے ایک اور آزمائش مقرر کر دی اور ایک بات کا احساس بھی دلا دیا۔"

"وہ بات کیا ہے منیر؟"

"وہ بات یہ ہے سرکار کہ محبت بہت ضروری چیز ہے۔" منیر نے کہا۔ "لیکن محبت کرنے کے لیے صحیح انتخاب اس سے زیادہ ضروری ہے۔"

"کھل کر بات کرو منیر! میں اس وقت بہت الجھا ہوا ہوں۔"

"دیکھیں سرکار! آپ ضرور محبت کریں لیکن محبوب بھی ایسا ہو جس کے ساتھ کوئی مجبوری نہ ہو۔ آپ جب چاہے اس سے مل سکیں۔ جو کسی بات کا پابند نہ ہو جس پر کوئی جبر نہ کر سکے، جو کبھی وعدہ خلافی نہ کرے، جو کبھی آپ کو مایوس نہ کرے۔"

"تم نے پھر مجھے راستہ دکھا دیا ہے... منیر! اور ایسا محبوب سوائے خدا کے اور کون ہو سکتا ہے۔ میں تو خود اس کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں یہ رکاوٹ آگئی۔"

"یہ بھی امتحان کا ایک مرحلہ تھا سرکار! مولا نے آپ کو پھر اس امتحان سے نکال لیا ہے۔"

☆☆☆

نیلم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے باپ کو کیا ہو گیا ہے۔

وہ اتنا بے رحم، اتنا سنگ دل اور اتنا وحشت ناک تو کبھی نہیں تھا۔ انتہا یہ تھی کہ نیلم کے ساتھ ساتھ اس نے خود اپنے اس استاد پر پابندیاں لگوا دی تھیں جو اسے راستہ دکھانے آیا تھا۔ نہ جانے اس کے باپ کے نزدیک سچائی کا مفہوم کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے راجو کو اس سے الگ کر دیا گیا۔ شاید یعقوب کو کسی قسم کا کھٹکا ہو گیا تھا۔ اسی لیے نیلم اور راجو دونوں کی کڑی نگرانی ہونے لگی تھی۔

نیلم پر اب پردے کی پابندی بھی تھی۔ وہ کسی کے سامنے نہیں آسکتی تھی۔ راجو سے نہ ملنے کا جواز بھی یہی بتایا گیا تھا۔

خود یعقوب نے اس سے کہا تھا۔ "دیکھو بیٹا! میں نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہتا کہ تم پر انگلیاں اٹھیں اور لوگ میرے بارے میں باتیں بنانے لگیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم راجو سے نہ ملو کیونکہ وہ اچھا خاصا بڑا ہے۔ بالغ ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں دوسروں سے بھی پردہ کرنا ہوگا۔ اب تک تو سامنے آتی رہی ہو لیکن اب نہیں آؤ گی۔"

"بابا! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے، آپ کیا کر رہے ہیں... کس راستے پر چل نکلے ہیں۔"

"سچائی کے راستے پر۔"

"خدا کے لیے اتنا تو بتا دیں کہ یہ کیسی سچائی ہے؟"

"بس، میں تم سے جو کہہ رہا ہوں، تمہیں وہ کرنا ہوگا۔" یعقوب نے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں اپنے پاس رکھ کر کتنی بڑی خلاف ورزی کی ہے۔"

"کیسی خلاف ورزی؟"

"اپنے اصولوں کی۔" یعقوب نے کہا۔ "تم یہاں دیکھ رہی ہو، کتنے لوگ ہیں۔ لیکن کیا کسی کے ساتھ اس کی بیٹی، بیوی یا ماں وغیرہ ہے؟ صرف میں ہوں جس نے تمہیں رکھا ہوا ہے۔"

"کیوں رکھا ہوا ہے؟ واپس بھیج دیں مجھے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے باہر جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم ایک بار پھر اپنے راستے پر چلنے لگو گی اور یہ میں کبھی ہونے نہیں دوں گا۔"

"اچھا کم از کم یہ تو بتا دیں کہ راجو کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟"

"راجو کل یہاں سے لاہور جا رہا ہے۔" یعقوب نے بتایا۔

"وہ کیوں؟"

"اپنی زندگی اور اپنی عاقبت بنانے کے لیے۔" یعقوب نے بتایا۔ "وہ خوش نصیب ہے کہ قدرت نے اس کو ایسا موقع دیا ہے۔"

"بابا! خدا کے لیے اسے کہیں مت بھیجیں۔ وہ میرے لیے چھوٹے بھائی کی طرح ہے۔" نیلم نے کہا۔

"یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور ہمارے فیصلے تبدیل نہیں ہوتے۔"

☆☆☆

منیر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ سید بادشاہ کو اس شہر سے چلے جانا چاہیے۔

اس شہر سے اس کی بے شمار اچھی بری یادیں وابستہ تھیں۔ یہ شہر اس کے لیے اب شجرِ ممنوعہ ہو گیا تھا۔ اس شہر میں اس کے بدنام ماضی کی پرچھائیاں رینگ رہی تھیں۔

اس شہر نے اس سے اس کی بیوی چھین لی تھی۔ اس کا بیٹا چھین لیا تھا۔ پھر اس کی محبت چھین لی تھی۔ وہ اس شہر میں تنویر سایا سے سید بادشاہ بنا تھا۔ اس شہر میں اس نے اپنے آپ کو تنویر سایا بنانے کی کوشش کی تھی لیکن خدا نے اس کو روک لیا تھا۔

اب وہ دونوں شہر چھوڑ کر لاہور جا رہے تھے... مختصر سے سامان کے ساتھ۔ ریل کے بجائے انہوں نے بس سروس کو ترجیح دی تھی۔

اسے کھڑکی کے پاس والی سیٹ ملی تھی۔ منیر اس کے ساتھ تھا۔

اس کے برابر والی سیٹ پر ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، چودہ پندرہ برس کا۔ بہت خوب صورت سا... جس نے اس گرم موسم کے باوجود ایک موٹی سی قمیص پہن رکھی تھی۔

اس کی طرف سید بادشاہ کی توجہ منیر نے دلائی تھی۔

"سرکار! ذرا اس بچے کو دیکھیں، آپ نے بتایا تھا کہ آپ کا گم شدہ بیٹا بالکل آپ ہی کی شکل کا ہے؟"

"ہاں منیر۔" سید بادشاہ کی آواز کانپنے لگی۔ "یہ تو بالکل میری طرح ہے... جیسے میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

"سرکار! ایک بات اور بھی ہے۔ میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ آپ سے برداشت نہیں ہو سکے گا۔"

"وہ کیا ہے منیر... جلدی بتاؤ۔"

"سرکار! اس کی کلائی پر استری سے جلنے کا نشان بھی ہے۔" منیر نے بتایا۔

"میرے خدا!" سید بادشاہ لرزنے لگا۔ "منیر! خدا کے لیے کچھ کرو۔ پوچھو اس سے۔ نہیں، تم رہنے دو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ یہ میرا بیٹا ہے منیر... میرا بیٹا ہے۔ میری اولاد، میرا خون۔"

"ابھی تو بس رکی ہوئی ہے۔ آپ اس سے بات کر لیں۔"

سید بادشاہ لرزتے ہوئے قدموں سے کھڑا ہوا۔ اسی وقت وہ بچہ بھی اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ سید بادشاہ نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے شانے کی طرف بڑھایا اور سب کچھ تباہ ہو گیا۔

ایک زوردار دھماکا... پھر کچھ بھی نہیں۔

چیخیں، خون اور لاشیں۔ جلتی ہوئی بس۔ مرتے ہوئے لوگ اور ایمبولینس... گاڑیوں کے سائرن۔

●●●

دوسرا رنگ

حریفِ جاں

پروین زبیر

ہمارے یہاں خواتین کو جن مشکلات... خطرات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے... ان سب کا سبب اور سرچشمہ مرد حضرات کو سمجھا جاتا ہے... اور اگر صنفِ نازک بہت زیادہ خوش شکل ہو تو ان خطرات کو سو سے ضرب دے دیجیے... لیکن کسی نہ کسی تیج پر اس کے برعکس بھی ہوتا ہے... یعنی مرد بیچارہ معصوم اور صنفِ نازک تمام ہتھیاروں سے لیس نظر آتی ہے... جبکہ مرد حریف نما حلیف... اور دوست نما دشمن کی صورت موجود ہوتے ہیں... دلکشی و شگفتگی کے پیرائے میں بنی گئی تحریر ظرافت... جس کی سطر سطر میں مزہ اور مزاح ایک جاں دو قالب تھے...

اس لڑکی کا فسانۂ عشق جس کے گرد بیک وقت کئی پروانے جمع تھے..... سرورق کا دوسرا رنگ

میلاد ختم ہوئے دیر ہو چکی تھی اور کھانے کے بھی دو راؤنڈ چل چکے تھے۔ دور سے آنے والے سب ہی مہمان کھانا کھا کر روانہ ہو رہے تھے۔ الوداعیہ کلمات کہتے ہوئے سب ہی تقریباً ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔

"میلاد بہت اچھا تھا اور کھانے کا تو جواب ہی نہیں۔ انشاء اللہ اگلے سال ایسے ہی موقع پر پھر ملاقات ہوگی۔" وغیرہ وغیرہ۔

"بہروز! جاؤ ذرا پھوپی کو گھر چھوڑ آؤ... رات زیادہ ہو گئی ہے... کوئی کے لیے رکشا ٹیکسی ملنا مشکل ہو جائے گا۔" مہناز نے چھوٹے بیٹے کو آواز دی۔

"پھوپی! آپ لوگوں کو بچے چھوڑ دیں گے۔ آرام سے پہنچ جائیں گی۔" مہناز نے بریانی کی تھیلیاں انہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پکڑاتے ہوئے ایک نظر ان کی دونوں بہوؤں اور بیٹیوں پر ڈالی جن کی گودوں میں لٹکے ہوئے بچے آدھے سوئے آدھے جاگے تھے۔ مہناز کی محبت نے پھوپی کی پریشانی کو محسوس کرلیا تھا اسی لیے انہیں گاڑیوں میں بھجوانے کا بندوبست کردیا تھا۔

''امی! اتنی دور کوٹری بھجوا رہی ہیں... ہمیں بھی بھوک لگ رہی ہے۔'' بہروز چپکے سے ماں کے کان میں منمنایا۔

''ارے بیٹا! زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگے گا۔ حیدرآباد سے کوٹری کون سا دور ہے۔ جتنی دیر میں یہاں صفائی ہوکر دوبارہ کھانا لگے گا تم لوگ واپس بھی آجاؤ گے۔ ابی اور حماد کی گاڑی لے جاؤ۔ انہیں چھوڑ کر جلدی واپس آجاؤ۔ سال میں ایک مرتبہ تو آتی ہیں میری پھوپی... جاؤ نخرے مت کرو۔'' مہناز نے آہستہ سے اسے جھاڑا کیونکہ دونوں ماں بیٹوں کو مذاکرات کرتے ہوئے پھوپی بغور دیکھ رہی تھیں۔

''اچھا بھئی، چلیں نانی! آجائیں۔'' بہروز نے جیب سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے انہیں آنے کا اشارہ کیا تو پھوپی بھی اپنی فیملی سے سلام دعا کرتی باہر نکل گئیں۔

بیروں نے جلدی جلدی محفل صاف کرکے دوبارہ کھانا سرو کردیا تھا اور اب گھر کے افراد اور قریبی رشتے دار کھانا کھا رہے تھے اور خواتین، لڑکیاں اور بچے وغیرہ کھانے میں مصروف تھے جبکہ تمام حضرات گیٹ کے باہر شامیانے میں کرسیوں پر براجمان تھے۔ خوش گپیاں چل رہی تھیں کہ نوید کے فون کی گھنٹی بجی تو اس نے کال ریسیو کی اور فون کان سے لگا لیا۔ ہیلو کہتے ہی اس نے کسی کی مختصر بات سنی۔ ہشاش بشاش چہرے کے تاثرات نہایت تیزی سے تبدیل ہوئے۔ پہلے سنجیدگی پھر بے پناہ پریشانی اور تشویش ظاہر ہوئی۔

''طہ!'' وہ زور سے چلایا اور فون جیب میں ڈالتا ہوا تیزی سے سڑک کی طرف دوڑا۔ وہ کچھ ایسی بدحواسی میں دوڑا تھا کہ آس پاس بیٹھے تیس چالیس لوگ کچھ پوچھے، کچھ بغیر اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔

اندر بڑے سے کار پورچ میں لگی ٹیبلوں پر کھانا کھاتی خواتین کو اس افتاد کی کوئی خبر نہیں تھی۔ لڑکیوں کی چہکتی آوازیں، بچوں کی ریں ریں اور خواتین کی ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ پلیٹ اور چمچوں کے بجنے کی آوازیں اس طرح برپا تھیں کہ صاف لگ رہا تھا کہ کھانا مزے دار ہے اور رات کے ساڑھے بارہ بجے بھوک اپنے عروج پر ہے۔ پبلک پورا انصاف کررہی ہے۔

ایسے میں چھوٹا گیٹ ایک دھماکے سے کھلا اور حماد دیوانوں کی دوڑتا سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر کمرے میں گیا۔

''کیا لوگ ہیں... مستیاں کرنے سے فرصت نہیں ہے۔'' ایک بڑی بی نے ناک سکیڑ کر تبصرہ کیا اور کھانے کا سلسلہ وہیں سے شروع کردیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

اچانک آوازوں کا یہ سلسلہ اس طرح رک گیا جیسے Pause کا بٹن دبا دیا گیا ہو۔ کیونکہ حماد کی چیختی ہوئی آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

''تو کیا ایسے ہی ان کے ہاتھوں مر جائیں؟''

سیڑھیوں پر ماموں دونوں ہاتھ پھیلائے اس کا راستہ روکے کھڑے تھے اور وہ ہاتھوں میں پستول تھامے باہر جانے کے لیے مچل رہا تھا... سب کھانا پینا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ وہ بھی ادھر کبھی ادھر ہوکے پوری کوشش کررہا تھا کہ ماموں کے ہاتھوں کا بیریئر توڑ کر جلد سے جلد باہر نکل جائے۔ سب حیرت و تشویش سے اس کے مسلے ہوئے کپڑوں، دھول مٹی سے اٹے بالوں اور ایک سوجی ہوئی آنکھ کو دیکھ رہے تھے... صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ اچھی خاصی ہاتھا پائی کرکے آیا ہے۔ خود اس نے تو سامنے والوں کو کتنا مارا معلوم نہیں لیکن اس کی اپنی بڑی ٹھیک ٹھاک دھلائی ہوئی ہے، یہ صاف نظر آرہا تھا۔

چند گھنٹے پہلے پہنا گیا سفید کا نیا کرتہ کئی جگہ سے سلائیوں سے ادھڑ کر چیتھڑا ہوگیا تھا۔ جیل سے جما کر نئے فیشن کے مطابق بنایا گیا بالوں کا اسٹائل دھول مٹی میں اٹ چکا تھا اور دائیں آنکھ پر کسی نے جما کر مکا رسید کیا تھا جس کے سبب آنکھ اندر سے سرخ، اوپر سے بری طرح سوجی ہوئی اور آنکھ سے لے کر بھنوؤں تک گہرا نیلا رنگ پھیل گیا تھا۔

''ثنا! یہ تیرا بیٹا گن لے کر باہر جارہا ہے... روک اسے... پتا نہیں کسے مارے گا۔'' ماموں نے منہ میں پان کا گھونٹ لگاتے ہوئے ثنا کو متوجہ کیا اور پلٹتے ہوئے حماد کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔

''حماد... حماد... رکو بیٹا!'' ثنا چلاتی ہوئی آگے بڑھی لیکن اس عرصے میں حماد نے کامیابی سے ماموں کے ہاتھوں کا بیریئر توڑا اور پستول لوڈ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی اشتعال انگیز کیفیت دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ پلیٹ ہاتھ سے چھٹکی تو اس میں بھری بریانی اور قورمے کی اچھی خاصی مقدار نے صبا کے نئے سوٹ کو رنگین کردیا۔ سوٹ کا یہ حشر دیکھ کر وہ چلائی۔

ثنا نے گھبرا کر دوڑ لگائی اور گیٹ سے باہر نکلی۔ حماد جو گاڑی اسٹارٹ کرچکا تھا، اس کی گاڑی کے سامنے جاکر اسے روکنے میں کامیاب ہوگئی۔

''گن مجھے دے دو۔'' اس نے ڈپٹ کر بیٹے سے کہا۔

''وہ سب مل کر مار رہے ہیں... بہروز اور طہ بھائی کو مار ڈالیں گے۔'' وہ چلایا۔

''گن مجھے دے دو... اور جاکر انہیں بچاؤ۔'' امی نے الجھے میں کہا۔

''گن ہوتی کس لیے ہے... ایسے ہی موقع کے لیے ہوتی ہے نا۔'' وہ پھر چلایا۔

''میں نے کہا گن مجھے دے دو۔'' ثنا نے کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر اس کے ہاتھ سے گن چھین لی۔

''ماما! یہ دیکھو... انہوں نے مجھے کس طرح مارا ہے... ان دونوں کو بھی مار رہے ہیں گن دے دو پلیز!'' حماد بلبلایا۔

''انہوں نے تمہیں ہاتھوں سے مارا ہے... گولی نہیں ماری ہے... جاؤ! تم بھی ہاتھوں سے مار دو جاکر۔''

''تم میری ماں نہیں... دشمن ہو میری۔'' اس نے فریاد کی۔

''ہاں، بس ٹھیک ہے... زیادہ فلمی ڈائیلاگ بولنے کی کوشش مت کرو... پھر کرلو... گن تمہیں دوں گی تمہیں۔'' ثنا بیٹے کے ڈرامے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ گن چھین کر واپس گھر میں آگئی۔ گیٹ کے سامنے ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ اس نے حیران ہوکر سوچا۔

''سب کہاں چلے گئے؟'' اور اندر داخل ہوگئی۔

اندر فرش سے لے کر عرش تک ایک حشر بپا ہوچکا تھا۔ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ باہر کہیں زبردست لڑائی ہورہی ہے جس میں گھر کے تمام حضرات نہ جانے کن لوگوں سے لڑ رہے ہیں اور طہ کی بے حساب مرمت ہوئی ہے۔ باقی کا بھی کچھ پتا نہیں... اللہ رحم کرے۔

☆☆☆

نانی کی فیملی کو ان کے گھر ڈراپ کرکے وہ دونوں گھر واپس آرہے تھے... رات کے ساڑھے بارہ بجے حیدرآباد کوٹری روڈ تقریباً سنسان ہی تھا۔ کوئی اکا دکا گاڑی تیزی سے گزر جاتی یا کبھی کوئی چھچھی موٹر سائیکل والا رکشا کھڑکھڑاتا ہوا گزرنے لگتا۔ نئی نویلی کارپیٹنگ ہوئی سڑک کو دور تک خالی دیکھ کر ان دونوں کے جذبہ ڈرائیونگ کو مہمیز ملی اور انہوں نے تیز رفتاری بلکہ اڑن رفتاری سے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

''اچھا! میں جو ہائی وے پر گاڑی اڑاتا جاتا ہوں... مجھے یہ کنوئیں کا مینڈک چیلنج کررہا ہے۔'' حماد اکثر ماں کے ساتھ کراچی، حیدرآباد ڈرائیو کرتا رہتا تھا اس لیے اس کو اپنی مہارت پر بھروسا تھا۔

''یہ حیدرآباد ہے بچو! ابھی کھلی سڑک ہے... شہر آنے دے پھر دیکھتا ہوں تیری ڈرائیونگ۔'' بہروز نے سائڈ سے دباتے ہوئے گاڑی آگے نکالی اور لطیف آباد کا فلائی اوور پکڑا۔

''اوئے چوزے! ہم سے پنگا... تمہیں ہوگا چنگا۔'' اس نے اسپیڈ بڑھائی۔ دونوں گاڑیاں کچھ دیر فلائی اوور پر ساتھ ساتھ دوڑیں پھر سامنے سے گاڑی آتی دیکھ کر بہروز نے رفتار کم کرکے پیچھے کرلی۔ تو حماد نے قہقہہ مارتے ہوئے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر لہرایا۔

''ہو لے... ہو لے... خوش ہو لے... ابھی دیکھ تماشا۔'' بہروز نے پھر اسپیڈ بڑھائی اور موقع دیکھ کر آگے نکل گیا۔

''یوں... یوں... یوں...'' آگے نکلتے نکلتے اس نے ہارن مار کر اپنے کزن کو چیلنج دیا۔

بس پھر کیا تھا کبھی ہم آگے... تو کبھی تم کے مصداق دونوں گاڑیاں دوڑاتے ٹاؤن کے چوراہے کے نزدیک پہنچے لگے تو وہاں روشنیاں جل رہی تھیں اور ٹاؤن لائف جاگ رہی تھی۔ دکانوں کے تھڑوں، بجلی کے کھمبوں کے نیچے اور فٹ پاتھوں پر... چار چار چھ چھ لڑکوں کے ٹولے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ گٹکے کی پچکاریوں اور سگریٹ کے سوٹوں کا دور چل رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی محفلیں گرم تھیں۔

اچانک ان لوگوں نے دیکھا دو گاڑیاں آگے پیچھے نہایت طوفانی رفتار سے آرہی ہیں۔ دوسرا ایکا پھلکا ٹریفک خود اپنے آپ کو بچاتا ان کے آس پاس سے نکلنے کی کوشش کررہا تھا۔

وہ سب اپنی باتیں چھوڑ کر پوری طرح ان گاڑیوں کی طرف متوجہ ہوگئے جو تیزی سے چوک کی طرف بڑھتی آرہی تھیں۔ اچانک ایک گاڑی نے رائٹ والا انڈیکیٹر دیا۔

''ابے یہ کون چھ نمبر کے ہیرو ہیں جو یہاں ریسنگ کررہے ہیں۔'' ایک نے پچکاری مارتے ہوئے کہا۔

''ہوں گے سالے کوئی بگڑے نواب کی اولادیں... چھچھورے... سڑک کو باپ کی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔'' دوسرے نے ٹکڑا لگا کر آگ اگلی۔

''ابے چھوڑ... تو بتا... کیا کہہ رہا تھا؟'' وہ پھر اپنی باتوں میں مصروف ہوئے ہی تھے کہ بریک چرچرانے کی آوازیں گونج اٹھیں۔

ایک گاڑی رائٹ مڑتے ہوئے لہرائی اور بچتی ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آگے جا کر رکی۔ جبکہ دوسری گاڑی نے بھی لہرا کر کسی کو بچانے کی کوشش کی لیکن رونگ سائڈ سے آنے والا... اندھیرے کا مسافر... کوئی موٹر سائیکل سوار... اس کی زد سے بچ نہ سکا۔

موٹر سائیکل ہٹ ہوئی اور اس کا مسافر اڑتا ہوا سڑک کنارے بھرے ہوئے گندے پانی میں لیٹا ہوا۔

چھپاک کی آواز کے ساتھ ہی ایک دلدوز آواز ابھری۔ پھر موٹی موٹی گالیوں کا ایک غلغلہ بلند ہوا۔

بہروز کی گاڑی نے موٹر سائیکل سوار کو بچانے کے باوجود ٹھیک ٹھاک ٹکر ماری تھی۔ اندیشہ تھا کہ کچھ زیادہ برا نہ ہو گیا ہو لیکن گالیوں کی یلغار نے بتا دیا کہ کوئی لائٹ جلائے بغیر... غلط سمت سے آنے والا... اپنی غلطی کی سزا پا چکا ہے مگر... بچ... زندہ ہے۔

"ڈھکنس کا ڈ!" اس نے سڑک پر ہی گاڑی روکی اور چابی جیب میں ڈالتا ہوا اس طرف بڑھا جہاں سے معتوب کی آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔ دوسری گاڑی سے حماد بھی اتر کر اسی جانب بڑھا۔

"سوری بھائی! اندھیرے میں تم مجھے نظر نہیں آئے... میں نے بچانے کی کوشش کی تھی لیکن..." بہروز نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو معتوب نے نان اسٹاپ ایسی ایسی گالیوں کی توپ چلائی کہ ان میں سے کئی بہروز نے زندگی میں پہلی بار سنی تھیں اور وہ تھیں بھی اس معیار کی... کہ انہیں سن کر اچھے اچھوں کے پسینے چھوٹ جائیں۔

"دیکھیں، میں آپ سے سوری کر رہا ہوں اور آپ گالیاں دیے جا رہے ہیں... غلطی تو دراصل آپ کی ہے کوئی لائٹ جلائے بغیر آپ اندھیرے میں غلط سائڈ سے آ رہے تھے... میری گاڑی سے بچ بھی جاتے... تو کوئی اور مار جاتا۔" بہروز نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ابے تیری تو..." معتوب نے ہاتھ ہلاتے ہوئے گالیوں کا نیا سلسلہ شروع کیا تو بہروز سے برداشت نہیں ہوا۔ اس کے سنگل پسلی وجود میں اشتعال کا ایک طوفان اٹھا۔ اس نے نیچے جھک کر اس کا گریبان پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھایا اور سڑک پر پھیلے گندے پانی سے بچ کر اسے دھکا دیا۔ ادھر سے حماد آ رہا تھا۔ اس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

"اچھا! ایک تو چوری... اوپر سے سینہ زوری... غلطی بھی تو کرے اور الزام بھی ہمیں دے۔" اس نے معتوب کو کھینچ کرتے ہوئے بیچ سڑک پر کھڑی گاڑی کی طرف دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا گاڑی سے جا ٹکرایا۔

"سالو! دیکھ لوں گا تم لوگوں کو... ہتھکڑیاں لگوا کر تمہیں پولیس کے ڈرائنگ روم کی سیر نہ کروائی تو نام بدل دینا میرا۔" وہ دھکا کھا کر چلایا۔

"اچھا! نام کیا بدلنا... ہم تیرا جغرافیہ بھی بدل دیتے ہیں ابھی کے ابھی۔" بہروز نے آگے بڑھ کر اس کے گالیاں اگلتے منہ پر ایک زوردار مکا رسید کیا اور پھر اسے گاڑی کے بونٹ پر لٹا کر تابڑ توڑ دھلائی کر ڈالی۔

حماد کیوں پیچھے رہتا... کزن نے طبلِ جنگ بجا دیا تھا اور میدان کارزار میں اتر گیا تو وہ کیسے الگ رہ سکتا تھا... اس نے بھی حتی المقدور اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ سب سے زیادہ نشانہ اس کا گالیاں اگلتا منہ تھا جسے کچلنے کا وہ ارادہ کر چکے تھے دونوں... بقدرِ خواہش کے اور تھپڑ مار رہے تھے... لیکن اس صفائی کے ساتھ کہ معتوب کا چشمہ... جو اس کی آنکھوں پر لگا ہوا تھا اس پر خراش بھی نہیں آئی اور نہ وہ اپنی جگہ سے ہلا۔

"ابے! یہ تو انسپکٹر ہے اوئی پولیس انسپکٹر... جس سے میری پچھلے سال لڑائی ہوئی تھی۔" بہروز کا اشتعال ذرا کم ہوا تو اس نے ہاتھ روک کر معتوب کا چہرہ دیکھا۔ پہچانا اور چلایا... تو حماد نے یک دم ہاتھ روک لیا۔

"ابے انسپکٹر سے پنگا لے لیا تو نے... سارے پولیس والے پیچھے پڑ جائیں گے۔" اس نے آہستہ سے بول کر صورت حال سمجھائی۔

"جو ہونا ہے... وہ تو اب بھی ہوگا اور جب بھی... اس لیے اسے سبق سکھانا ہے تو پورا ہی سکھا دیتے ہیں... جو ہو گا... دیکھا جائے گا۔" دونوں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ مشقِ دست درازی شروع کر دی اور اس سے پہلے کہ اس کے چہرے کا مکمل بھرتہ بنا دیتے ایک شور کی آواز سنائی دی۔

مختلف تھڑوں پر بیٹھے ٹاؤن کے لڑکوں نے یلغار کر دی تھی۔ کوئی بارہ پندرہ لڑکوں کا جلوس تھا۔ وہ شور مچاتے اور انہیں برا بھلا کہتے دوڑتے چلے آ رہے تھے۔

حماد نے صورت حال میں تبدیلی کا فوری نوٹس لیا اور دوڑ کر گاڑی کی دوسری سائڈ پکڑی۔ ان لڑکوں نے قریب آ کر بہروز کو ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور دوسری طرف دھکا دیا۔ اس نے معتوب کا گریبان مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اس لیے وہ بھی اس کے ساتھ دھکا کھا کر پہلے بونٹ سے اچھلا اور فضا میں گھومتا ہوا نیچے سڑک پر گرا۔

کمک پہنچ جانے پر اس کے حوصلے بلند ہو گئے جس کا اظہار اس نے گالیوں کی نئی بوچھاڑ کی صورت میں دیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ نیچے انسپکٹر تھا جسے اس کے اوپر چڑھا ہوا

بہروز مار رہا تھا... اور بہروز کے اوپر بارہ پندرہ لڑکوں کی یلغار تھی جو چاروں طرف سے اسے گھیر کر مار رہے تھے۔

حماد نے گاڑی کے پیچھے سے یہ کچھ دیکھا تو اسے معاملہ ہاتھ سے نکلتا نظر آیا۔ اس نے جلدی سے طٰہٰ کو فون لگایا۔

"طٰہٰ بھائی! ٹاؤن کے چوک پر لڑکوں سے لڑائی ہو رہی ہے... پندرہ بیس لڑکے بہروز کو مار رہے ہیں۔ جلدی آ جائیں... میں اکیلا اسے بچا نہیں پاؤں گا... طٰہٰ بھائی! جلدی۔" اس نے سلسلہ کاٹ دیا اور دوسری جانب آ کر ان لڑکوں سے بھڑ گیا جو بہروز کو گھیر کر اس کی دھلائی کر رہے تھے۔

طبلِ جنگ پورے زور و شور سے بج رہا تھا۔ حماد بری طرح زدوکوب ہو رہا تھا... اسی وقت اس نے طٰہٰ کی چیختی ہوئی آواز سنی اور اس میں نئی توانائی بحال ہو گئی۔

"حماد! کیا ہوا ہے؟ بہروز کہاں ہے؟" طٰہٰ اس کے قریب کھڑا ہوا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"وہ... وہ... ان سب کے نیچے ہے... یہ سب مل کر اسے مار رہے ہیں۔" حماد نے لڑکوں کے اس ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جو بہروز کے اوپر لپے پڑے ہوئے تھے۔

"طٰہٰ بھائی آ گئے۔" حماد نے زوردار نعرہ لگایا۔ مقصد نہ صرف لڑکوں کو ڈرانا تھا بلکہ بہروز کو بھی تسلی دینا تھا کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے۔ کمک آن پہنچی ہے... پھر ان دونوں نے مل کر دو لڑکوں کو اس ڈھیر سے کھینچ کر الگ کیا اور گھونسوں سمیت زوردار دھکے دے کر انہیں پرے پھینکا تاکہ دوسرے لڑکوں کے چنگل سے بہروز کو نکال سکیں۔

"ایسی کی تیسی ان طٰہٰ بھائی کی... پہلے ذرا ان 'بھائی' سے ہی نمٹ لیں۔" ایک لیڈر ٹائپ لڑکے نے دوسروں کو اشارہ دیا اور ان میں سے چار پانچ نے طٰہٰ کو گھیر لیا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟ جو مجھے مار رہے ہو... بھائی! میں نے کیا کیا ہے؟" طٰہٰ نے اس نازک وقت میں جبکہ اس مشتعل گینگ کی ساری توپوں کا رخ اپنی طرف مڑتا دیکھا تو ان کو غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی... مگر نہ... نہ بھی... کوئی کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں رگڑ کر پھونکیں ماریں اور تابڑ توڑ گھونسے چلانا شروع کر دیے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ پندرہ بیس لڑکے تین ٹولیوں میں بٹ کر ان تینوں کی جم کر پٹائی کر رہے تھے۔ بہروز نے انسپکٹر کو چھوڑا نہیں تھا، وہ مستقل اس پر چڑھا بیٹھا تھا۔ دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپایا ہوا تھا اور لڑکے اس کی پیٹھ پر... شانوں پر... اور سر پر دھولیں جما جما کر مار رہے تھے۔

اب بازی ہاتھ سے نکل رہی تھی۔ پہلے تو ان تینوں نے اپنے طور پر معاملے کو نمٹانے کی کوشش کی تھی لیکن اب طٰہٰ بھائی کو بڑی بے بسی سے پٹتا دیکھ کر اس کو ٹھیک ٹھاک خطرہ ہونے لگا۔ ایسے میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ مزید کمک طلب کی جائے اور اب بڑوں کو بتائے بغیر چارہ نہیں تھا۔

اس نے ایک لڑکے کو دھکا دے کر اپنے اوپر سے ہٹایا تو اس کی نظر گاڑی پر پڑی۔ پچھلی جانب کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے طٰہٰ بھائی کو سیٹ پر لٹایا ہوا تھا اور بے حساب کوٹ رہے تھے۔ ایسے میں کوئی چلایا۔

"ابے! گاڑی کی چابی دیکھ... اس کو لے چلتے ہیں ٹاؤن میں... وہاں اس کو چھٹی کا دودھ یاد دلائیں گے... مہینے بھر "تشریف" رکھنے کے قابل نہیں رہے گا۔"

اب کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اس نے اسی ناگفتہ بہ حالت میں جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ملایا۔

"پاپا! یہاں ٹاؤن کے چوک پر ہماری ٹاؤن کے لڑکوں سے لڑائی ہو گئی ہے۔ وہ بہت سارے لڑکے ہیں۔ ہم تینوں کو مار رہے ہیں اور طٰہٰ بھائی کو انہوں نے گاڑی میں ڈال لیا ہے... اٹھا کر لے جا رہے ہیں... جلدی آ جائیں پاپا!" اس نے جلدی جلدی نازک صورت حال کی خبر دی۔ یہ کال نوید نے ریسیو کی اور بیٹے کے منہ سے جو کچھ سنا اس نے اس کو حواس باختہ کر دیا۔

"طٰہٰ!" اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور دوڑ پڑا۔ اس کو بدحواس ہو کر اندھا دھند دوڑتے دیکھ کر وہاں موجود پورے تیس چالیس افراد بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ ان سب کا رخ ٹاؤن کے چوک کی طرف تھا۔

☆☆☆

بہت مزہ آ رہا تھا... لطیف آباد کی گاڑی والے لڑکوں کو کوٹنے میں...

"سالے! بہت اڑے اڑے پھرتے ہیں... گاڑیاں کہاں... ہوائی جہاز چلاتے پھرتے ہیں شہر کی سڑکوں پر... ہم جیسوں کو تو گھاس ہی نہیں ڈالتے... آج عرش سے فرش پر آ گئے ہیں۔" اس کے لہجے میں کلاس ڈیفرنس کی جھلسا دینے والی کڑواہٹ تھی۔

"ابے او! چھوڑنا نہیں ان برگروں کو... ذرا جم کے دھلائی کرنا۔" سیاہ قمیص اور سیل کی تہیں چڑھی جینز پہنے وہ ان چھچھوندروں کا کوئی لیڈر لگ رہا تھا۔ جو بڑی مہارت سے منہ میں گٹکے کا گھونٹ لگاتے ہوئے ہدایات بھی دے رہا تھا۔ ایک بند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکان کے سامنے لکڑی کی بینچ پر وہ اپنے دو تین ہم منصب ساتھیوں کے ساتھ شان سے بیٹھا صرف ہدایات دے رہا تھا اپنے چمچوں کو... اور وہ محاذِ جنگ پر دشمن کو ناکوں چنے چبوانے کے چکر میں خود بھی ٹھیک ٹھاک چوٹیں کھا رہے تھے۔

"ہائے ہائے..." یہ اس ہیرو کی دلدوز چیخ تھی جو طہٰ کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر گرا کر مارنے... اور اسے پورا اندر ٹھونسنے کی کوشش میں مصروف تھا اور جوش و خروش میں وہ سب سے آگے تھا۔ اس لیے نئی، بھاری پشاوری سینڈل پہنے... طہٰ کے پاؤں کی زد میں آ گیا تھا اور اس نے گھٹنے موڑ کر پورے زور... اور طاقت سے لات رسید کی تھی جو اس ہیرو کی کسی نازک جگہ پر لگی تھی اور وہ ریٹائرڈ ہرٹ ہو کر مقابلے سے آؤٹ ہو گیا تھا۔ اس کی ہائے ہائے اور دلخراش آہوں، کراہوں نے دوسروں کو بھی کچھ ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ رک گئے تھے کہ کہیں ان پر بھی یہ وقت نہ آ جائے۔

"ابے او! ابے ادھر دیکھ... یہ چالیس پچاس لوگوں کا گینگ... ان برگروں کا ہے کیا؟" لیڈر نے دور سڑک پر دوڑ کر آتے ہوئے ایک بڑے ہجوم کو دیکھ کر گھبرا کر کہا۔ وہ گھبراہٹ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی تشویش میں مبتلا تیزی سے آگے بڑھتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔

"ابے یہ اتنے سارے ہیں... اپنے لڑکوں کی تو چٹنی بنا دیں گے... ابے افتخار! بلا اپنے بھائیوں کو... بولیو! کہیں لے کر آ گئیں... ورنہ یہ نہیں رکنے والے... جلدی کر۔" اس نے گھبراہٹ میں اس جھگڑے کے پہلے مضروب افتخار کو ایک دھموکا رسید کرتے ہوئے ہدایات جاری کیں لیکن افتخار جو پہلے ہی اچھی خاصی جسمانی ضربوں کے علاوہ ذہنی ضربیں بھی سہہ چکا تھا کہ وہ ایک پولیس والا ہو کر بھی ایک نوعمر سنگل پسلی لڑکے سے پٹا... وہ یہ دھموکا برداشت نہیں کر سکا اور بیٹھے سے لیٹ گیا۔

"لعنت ہے... نشے میں ہو بندہ تو گھر میں بیٹھے... سڑکوں پر گھومنا... گاڑیوں سے ٹکرانا اور پھر لوگوں سے پٹنا اور جوتے کھانا... کس حکیم نے نسخے میں لکھ کر دیا تھا تجھے... اب دیکھو جس کی وجہ سے سب کی شامت آنے والی ہے... وہ نالی میں منہ دیے پڑا ہے۔" لیڈر نے افتخار کی جیبیں ٹٹولتے ہوئے اسے ناپسندیدگی سے دیکھا جو اس کا ہلکا سا دھموکا کھا کر تھڑے سے نیچے اس طرح گرا تھا کہ منہ سیدھا نالی میں چلا گیا تھا۔ اس نے اس کی جیبیں ٹٹول کر موبائل فون نکالا اور جلدی جلدی کوئی نمبر ملایا۔

"ہاں، تیمور بھائی! جلدی چوک پر آ جاؤ لڑکے لے کر... زبردست پھڈا ہو گیا ہے اور ہماری پارٹی ہلکی پڑ رہی ہے... فوراً آؤ بھائی!" اس طرح کا SOS دے کر وہ واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا فون دوبارہ اس نے افتخار کی جیب میں ٹھونس دیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے گہری نظروں سے میدانِ جنگ کا جائزہ لینے لگا۔

چوک کے بیچ سڑک پر گاڑی کھڑی کرنے اور مار کٹائی ہونے کے سبب دونوں طرف سے آنے اور جانے والا ٹریفک رک گیا تھا۔ دکان داروں نے آنے والے خطرے کے پیشِ نظر دکانیں بند کر کے تالے لگائے اور خود باہر کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔

کیا فلمی منظر تھا... بیچ چوراہے پر... سڑکوں پر کچھ لوگ نیچے گرے ہوئے کچھ لوگوں کو مار رہے تھے۔ اوپر چھائے ہوئے لوگوں کے سبب پٹنے والے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن یہ تین گروپ نمایاں تھے جنہیں ٹریفک جام میں پھنسی گاڑی والے... گاڑی کی کھڑکیوں میں لٹکے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اچانک تیس چالیس لوگ ان پر آن پڑے۔

بس... پھر کیا تھا... جس کے جو ہاتھ آیا اس نے اس کو گھونسوں اور تھپڑوں پر رکھ لیا۔

باسط نے ایک لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کو زوردار تھپڑ رسید کیا۔ وہ گال پر ہاتھ رکھ کر بھونچکا ہو کر مارنے والے کو دیکھنے لگا۔

"چاچو! میں تو طہٰ کو بچا رہا تھا۔" اس نے باسط کے دوسرے ہاتھ سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا تو چاچو کا دماغ اور گھوم گیا۔

"کمینے سالے! میں نے خود دیکھا... تو مارنے والوں میں شامل تھا۔" باسط نے بچتے بچتے بھی دوسرا ہاتھ اس کو رسید کر دیا۔

"طہٰ!" اس لڑکے نے بے بسی سے دوست کو پکارا۔

"ارے چاچو! کیا کر رہے ہیں۔ یہ میرا دوست ہے۔" طہٰ نے اس کی جان چھڑوائی۔

"سوری... سوری یار۔" باسط نے اس کے کندھے سے فرضی گرد جھاڑتے ہوئے اسے تسلی دی اور دوسرے لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عجب گھمسان کا رن پڑ گیا تھا جو بھی دوڑتا ہوا آیا تھا اس نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا کہ کسی نہ کسی کو تو ہاتھ مارنا ہی ہے۔

میدانِ جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ پہلے بہروز، طہٰ اور حماد کمزور پڑ رہے تھے اور دشمن ان پر چھائے ہوئے تھے لیکن کمک آ جانے کے بعد اب میدان ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔

سارے مارنے والے گھر چکے تھے اور حسبِ توفیق تھپڑ، مکوں اور لاتوں سے ان کی تواضع ہو رہی تھی۔ ان کا لیڈر پریشان تھا۔

"ابے یار! تیمور بھائی کچھ کرو... نکالو اپنے لڑکوں کو... سالے لنگڑے، ٹنڈے ہو جائیں گے... کون اسپتال بھگتے گا۔"

تیمور بھائی... جو اپنے تین چار لڑکوں کے ساتھ موقعِ واردات پر پہنچ چکے تھے... ایکشن کی جگہ مین کا پورٹریٹ بنے... غور سے میدانِ جنگ کا جائزہ لے رہے تھے۔ اپنے حاشیہ نشینوں کی درگت دیکھ کر ان کے خون میں ابال تو آ ہی رہا تھا لیکن دماغ بھی کام کر رہا تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ اس جمِ غفیر کے چنگل سے اپنے "چوزوں" کو کیسے نکالیں۔

"ابے یار تیمور بھائی! بھائی وہ..." لیڈر لالا ڈولا پریشان ہو کر تیمور بھائی کی مدد کا منتظر تھا اور تیمور بھائی کے انداز نے اسے خوف زدہ سا کر دیا تھا اور وہ بے چینی سے پٹتے ہوئے لڑکوں کی طرف اشارے کرتے ہوئے ہکا بکا کر بھائی کو میدانِ جنگ میں کودنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ان کی مزید ٹھکائی [illegible]... وہ انہیں صورتِ حال سمجھانا چاہ رہا تھا۔

اور آخرکار تیمور بھائی نے میدان میں اترنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو گردن جھٹک کر کوئی خاص اشارہ کیا اور شرٹ کا دامن ہٹا کر جینز کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی تقلید کی اور وہ تینوں ایکشن میں آ گئے۔

"آ آ آ آ..." انہوں نے پہلے باآوازِ بلند ٹارزن اسٹائل کا نعرہ بلند کیا اور اپنے اپنے پستول لوڈ کیے۔

کھڑاک... کھڑاک... کی آوازیں جیسے ہی لوگوں کو سنائی دیں تو تماشا دیکھنے والوں نے تو فوراً اپنے آپ کو الرٹ کیا۔ گاڑیوں کی کھڑکیوں سے لٹکے ہوئے لوگ فوراً غڑاپ سے اندر غروب ہوئے اور ہر گاڑی میں حرکت شروع ہو گئی۔ شیشے بند ہوئے اور وہ کہیں نہ کہیں نکل جانے کے چکر میں ادھر ادھر کی گلیوں میں غائب ہونے لگے۔

لیکن لڑنے والے جس تندہی سے مار کٹائی میں مصروف تھے ان کا انہماک فائر کی اس آواز سے ٹوٹا جو تیمور بھائی کی پستول سے ہوا تھا۔ ان سب نے دیکھا کہ تین چار لڑکے ہاتھ میں پستولیں لیے... ہاتھ فضا میں بلند کیے... ہوائی فائر کر رہے ہیں۔

لمحوں میں سب تماشا دیکھنے والے غائب... بلکہ اڑن چھو ہو گئے۔ یہاں تک کہ نوید بھائی کے ساتھ آنے والے تیس چالیس میں سے کم از کم بیس لوگ تو چشم زدن میں گاڑیوں کے پیچھے، تھڑوں کی آڑ میں، دیواروں کی اوٹ میں یوں غائب ہو گئے جیسے آئے ہی نہیں تھے۔ میدان میں صرف طہٰ اور نوید رہ گئے۔

پٹنے والے اور پیٹنے والے یا تو یک قالب دو جان کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ فائر ہوتے ہی کہاں غائب ہوئے... کچھ اندازہ نہیں ہو سکا۔ فائر مسلسل ہو رہے تھے... تیمور بھائی اور ان کے تین ساتھی مستقل مزاجی سے فائرنگ کر رہے تھے۔ پہلے وہ ہوا میں گولیاں چلاتے رہے پھر نہ جانے کہاں سے گن لوڈ کرنے کی آواز آئی، جو اس شورِ قیامت میں بھی انہوں نے سن لی۔ اور انہیں اندیشہ ہوا کہ دوسری طرف سے بھی کوئی ان کے مدِمقابل آنے کی تیاری کر رہا ہے تو انہوں نے حفظِ ماتقدم کے لیے انداز تھوڑا سا بدلا۔ اب وہ اسٹریٹ فائر کر رہے تھے جن میں سے کچھ سڑک پر اور کچھ اس متنازعہ دیوار پر... جس پر بڑے آتش بیاں سیاسی نعرے... تہ بہ تہ لکھے ہوئے تھے۔

مارنے والے لڑکوں کے غول... اور بچانے والے لوگوں کا ہجوم... دونوں غائب ہو چکے تھے... بہروز اور حماد سڑک پر بیٹھے... طہٰ اور نوید بیچ چوراہے پر کھڑے فائرنگ کرنے والے لڑکوں کو دیکھ رہے تھے۔ چاروں جانے پہچانے چہرے تھے۔

اب قریبی... سڑک کے اس پار واقع رینجرز ہیڈکوارٹر میں بیداری کے کچھ آثار نمودار ہونا شروع ہوئے... دیکھتے ہی دیکھتے رینجرز کی ایک موبائل گیٹ سے باہر نکلی اور بھیانک آواز والا ہارن بجاتی ہوئی عین چوک میں آ کر رکی۔

"اوئے! کون ہے اوئے...؟" بھاری بوٹوں کے ساتھ دھم دھم کر کے چند جوان گاڑی سے باہر کودے اور اپنی گنیں پوزیشن میں لے کر آگے بڑھے۔

"بھاگو تیمور بھائی... بھاگ لو یار! رینجرز آ گئے ہیں... ان کے ہتھے چڑھ گئے تو ہمیں مرغا بنا دیں گے سب کو... ساری عزت کا کچرا ہو جائے گا... نکل لو۔" پہلے تیمور بھائی کے ساتھی پلٹ کر بگٹٹ دوڑے اور پھر بھائی بھی ان کے پیچھے نکل لیے۔

وہ چرخ لیڈر لالا ڈولا، پٹنے والا افتخار اور ان کے دو چار حاشیہ نشین... جو لکڑی کی بینچ پر بیٹھے اطمینان سے لڑائی دیکھ رہے تھے اور وقتاً فوقتاً ہدایات بھی جاری کر رہے تھے... کب وہاں سے غائب ہوئے، کچھ پتا نہیں چلا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا بات ہے سر! کسی فائرنگ ہو رہی تھی یہ...؟" رینجرز کے افسر نے دم بخود کھڑے نوید سے پوچھا۔

"فائرنگ کرنے والے وہ بھاگ رہے ہیں... ان کو پکڑو اور پوچھو... ہمارے ہاتھ تو خالی ہیں۔" نوید نے آخری جاں باز کو غڑاپ سے پتلی گلی میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"ان کو تو ہم پکڑ ہی لیں گے سر جی! آپ بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟" افسر نے بھاری لہجے میں پوچھا تو نوید کو لگا کہ 'سر جی' اس نے جس طرح چبا چبا کر کہا ہے اسی طرح وہ کسی نہ کسی کو چبانا چاہتا ہے۔ اس نے واقعہ بتایا۔

"تو آپ پولیس میں رپورٹ کرو... بندے آپ نے پہچانے ہوئے ہیں۔ ان کے خلاف ایف آئی آر کٹواؤ... ادھر چوک میں سڑک پر 'جشن' کر کے لوگوں کو کیوں پریشان کرتے ہو؟" اس نے تلخی سے کہا تو نوید کو اس کا لہجہ بہت برا لگا۔ جس کا غصہ اس نے کڑے تیوروں سے لڑکوں کو گھور کر نکالا۔

فائرنگ کرنے والے بھاگ گئے تو آس پاس چھپ جانے والے سورما بھی آہستہ آہستہ نوید اور لڑکوں کے آس پاس جمع ہونے لگے۔

"او جائیں جی آپ لوگ پولیس اسٹیشن... ادھر ٹریفک کیوں روکا ہوا ہے۔" رینجرز کے افسر نے رات کے اس پہر آ جانے والی گاڑیوں کو رکتا دیکھ کر کہا... تو انہوں نے بھی پولیس اسٹیشن جانے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

رات کے دو بج گئے تھے اور ابھی تک گھر کے حضرات کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ تمام مہمان خواتین اور گھر کی خواتین... گھر کے ہر کمرے، لاؤنج، ڈرائنگ روم اور ڈائننگ والے حصوں میں گروپوں کی صورت میں براجمان تھیں اور دھواں دھار قسم کے تبصروں، افواہوں اور اپنے پچھلے تجربات سے سب کو باآواز بلند مستفید فرما رہی تھیں۔

بابو بھائی کی آدھی درجن بیٹیاں دنیا میں نئے نئے وارد ہونے والے ننھے سے بھانجے کے ساتھ پنگ پانگ کھیل رہی تھیں۔ وہ بھی ایک کی گود میں اوں آں کا راگ الاپتا... تو دوسری اس کو اچک لیتی... پھر دوسری... اور پھر تیسری... اور پھر...

پھپھو، خالائیں، چاچی، تائی، دادی اور نانیاں... سب ایک ہی پریشانی میں گھس کر جانے وہاں مچنے والے غدر میں کیا ہو رہا ہے۔ سب کے موبائل فون کان سے لگے ہوئے تھے اور وہ اپنے اپنے لوگوں سے فون پر رابطوں کی کوششیں کر رہی تھیں... اکثر کی یہ کوششیں ناکام ہو رہی تھیں کیونکہ حضرات تقریباً سب ہی معرکے میں مصروف تھے... اس لیے کسی کے پاس فون ریسیو کرنے کا وقت نہیں تھا... تاہم ان میں بعض مصلحت پسند بھی تھے جو 'ٹک بڑی... ڈوٹھنگ' کے اصول پر کام کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی فون ریسیو کر بھی رہا تھا۔

"ہیلو! ہاں... ہاں بھئی... ابھی تو چل رہی ہے مارا ماری... ہاں آں... خوب دھلائی کر رہے ہیں ہم ان سالوں کی... فرصت نہیں ہے بھئی... بعد میں خود فون کر لوں گا میں..." اور فون بند ہو جاتا۔

اور اگلے ہی لمحے یہ بریکنگ نیوز باآواز بلند پورے گھر میں نشر ہو جاتی۔

"خوب مار رہے ہیں ہمارے لوگ... ان ٹاؤن والے لڑکوں کو... زبردست مارا ماری چل رہی ہے دیکھنا کیسا بھرتہ بنا کے آئیں گے کہ زندگی بھر انہیں ہمت نہیں ہوگی ہمارے لڑکوں کی طرف آنکھ اٹھانے کی۔"

مہناز کا بلڈ پریشر اور بڑھتا جا رہا تھا۔ چہرہ تشویش ناک حد تک سرخ، پیشانی پر پسینا اور ہاتھ پیروں پر کپکپی... اب ان سے کھڑا بھی نہیں رہا گیا اس سے پہلے کہ وہ گرتی، بانو نے اسے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"امی! کیا ہو گیا... سب ٹھیک ہے... ابھی آ جائیں گے وہ سب... اتنا پریشان مت ہوں آپ... بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا تو مصیبت ہو جائے گی۔" وہ بھاگ کر بلڈ پریشر کی گولیاں اور پانی کا گلاس بھر کر لے آئی۔

"یہ لیں! یہ گولیاں کھائیں۔" بانو نے ہاتھ آگے بڑھایا مگر مہناز گم صم سی بیٹھی رہی۔ اس نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا تو پاس بیٹھی پھپھو نے اسے جھنجوڑا۔

"مہناز... مہناز! حوصلہ کرو... کیوں پریشان ہو رہی ہو... سب ٹھیک ہے کسی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ ابھی آ رہے ہیں سب۔" انہوں نے ہی گولی زبردستی اس کے حلق میں ڈال کر پانی کا گلاس منہ سے لگا دیا۔

اتفاق سے یہ پھپھو ایک سیاسی پارٹی سے وابستگی رکھتی تھیں اور ایک سرگرم کارکن کے طور پر پارٹی میں اور باہر کے لوگوں میں جانی جاتی تھیں۔ انہوں نے فوراً سرگرمی دکھائی اور موبائل فون نکالا اور نہایت غصے میں کسی کے نمبر پنچ کر کے فون کان سے لگایا۔

"ابھی پتا کرتی ہوں کہ یہ سب کیا ڈراما چل رہا ہے؟ کس نے ہمت کی ہے نبیلہ خان کے بھتیجوں پر ہاتھ اٹھانے کی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے دوسری جانب فون اٹھانے کا انتظار کرتی رہیں... پھر شاید کسی نے ہیلو کہا۔

"ہاں، میں نبیلہ خان بول رہی ہوں... تیمور کہاں ہے؟ اور اس کا فون تمہارے پاس کیوں ہے؟ اسے فون دو مجھے اس سے بات کرنی ہے۔" غالباً فون ریسیو کرنے والا ان کا مطلوبہ فرد نہیں تھا۔

"ہاں... تیمور! وعلیکم السلام! یہ چوک پر کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگوں نے دیکھا نہیں جا کر وہیں آفس میں بیٹھے چائے سگریٹ اڑا رہے ہو؟" انہوں نے دبنگ آواز میں مکالمہ شروع کیا۔

"ارے باجی! ابھی وہیں سے تو آ رہے ہیں ہم لوگ... لڑکوں نے بتایا آ کے... کہ افتخار کو مار رہے ہیں کچھ لڑکے... اب افتخار تو اپنا بندہ ہے نا... میں نے بھیج دیا ٹاؤن کے لڑکوں کو... لیکن باجی! سارے نکلے ہیں سالے... وہ سالا چوہدری کا بابو لاڈلا... وہ تو جا کے بیٹھ گیا لڑکوں کو لگا دیا کہ دھلائی کرو ان بزرگوں کی... وہ تو کیا دھلائی کرتے... خود ہی پٹ رہے تھے سالے... مجبوراً اپنے لڑکوں کے ساتھ مجھے جانا پڑا۔" دوسری جانب سے تیمور بھائی صورت حال کی وضاحت کر رہے تھے۔

"اچھا... تو تو نے جا کے کیا تیر مارا وہاں؟" نبیلہ خان کے کڑے تیوروں میں تشویش کا رنگ جھلکا۔

"ارے باجی! وہاں تو عجیب ہی تماشا ہو گیا۔ میں تو تین لڑکوں کو ساتھ لے کر چلا گیا تھا کیونکہ وہاں لاؤڈے کے لڑکے بھی تھے پر وہاں جو پہنچے ہیں تو سامنے سے نیا چاند چڑھ آیا۔ کوئی تیس چالیس لوگوں کا گینگ آ گیا۔ ان بزرگوں کو بچانے کے لیے... اور انہوں نے مل کر لاؤڈے کے لڑکوں کی دھلائی شروع کی ہے تو بس وی آئی پی کر دیا۔ اب ہمارے پاس تو کوئی راستہ نہیں تھا فائر کرنے کے سوا... تو بس ہم نے پہلے تو ہوائی فائر کیے... پھر مجھے ایسا لگا کہ ان میں سے بھی کچھ لوگوں کے پاس گنیں تھیں، میں نے لوڈ ہونے کی آواز سنی تو پھر ہم اسٹریٹ پر آ گئے... لڑکے بھاگ گئے... تو ہم بھی نکل لیے۔" تیمور بھائی نے کہانی مکمل کی تو نبیلہ خان کے پیٹ میں تتلیاں پھڑکنے لگیں۔

"اسٹریٹ فائر کیے تم لوگوں نے؟ کسی کو گولی لگی تو نہیں؟ کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟" انہوں نے بلک کر پوچھا۔

"نہیں باجی! اسٹریٹ فائر ہم نے دیوار پر اور سڑک پر کیے تھے تاکہ مجمع چھٹ جائے اور لڑکے نکل جائیں فائرنگ کی آوازیں سن کر رینجرز بھی آ گئی۔ اس لیے ہم اور بھی جلدی نکل لیے۔" تیمور بھائی نے تسلی دی۔

"تمہیں پتا بھی ہے جن لڑکوں سے لڑائی ہوئی ہے اور جنہیں تم لوگوں نے مارا ہے وہ کون ہیں؟" نبیلہ خان نے پھر کہا۔

"کون ہیں؟" تیمور نے سوال کیا۔

"میرے سگے بھتیجے ہیں... تم نے ان کے ساتھ..."

"باجی... باجی... باجی! آپ کو پتا ہے ہم نے ان لڑکوں کے ساتھ کچھ نہیں کیا ہے۔ ان کے ساتھ تو لاؤڈے والوں کا پنگا ہوا تھا۔"

"تو ٹھیک ہے... لاؤڈے کو بھی حساب دینا پڑے گا... میں اس کو بھی بلواتی ہوں آفس میں... افتخار جیسے بھنگی چرسی کی خاطر میرے بھتیجوں پر کوئی ہاتھ اٹھائے اور میں اسے کچھ نہ کہوں... یہ تو ہو نہیں سکتا۔ دیکھتی ہوں میں۔" انہوں نے نہایت غصے میں فون بند کر دیا۔

ساری خواتین جو پورے انہماک سے ان کی یک طرفہ باتیں سن رہی تھیں، ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

"ارے وہ ہے ایسے ہی دو چار چھچھورے لڑکوں کا گروپ... اس وقت حرے میں آ کر انہوں نے میرے بچوں سے پنگا لے تو لیا ہے لیکن اب تم دیکھنا میں کیسے ان سے ناک رگڑواتی ہوں... گھر آ کے ہاتھ جوڑ جوڑ کے معافی نہ منگوائی تو نام بدل دینا۔"

بانو نے ان کی بڑھک سن کر معصوم سی شکل بنائی۔ ہاتھ پھیلا کر اوپر چھت کی جانب دیکھ کر بے چارگی سے سر ہلایا اور پانی کا گلاس پھپھو کے ہاتھ سے لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس نے ایک بار پھر فون پر نوید کے نمبر پنچ کیے اور اتفاق سے اس کا فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو پاپا! آخر ہو کیا رہا ہے وہاں؟ میرے تینوں بھائی تو خیریت سے ہیں نا؟ سنا ہے وہاں فائرنگ بھی ہوئی ہے؟" بانو نے انتہائی پریشانی میں جلدی جلدی پوچھا۔

"کچھ نہیں ہو رہا ہے... سب کچھ ٹھیک ہے... مار کٹائی ہوئی تھی اس سے معمولی چوٹیں وغیرہ لگی ہیں۔ فائرنگ ہوائی تھی۔ کسی کو کوئی گولی وولی نہیں لگی... سب ٹھیک ہے۔" نوید نے بیٹی کو تسلی دی۔

"تو آپ لوگ گھر کیوں نہیں آ رہے ہیں؟ آپ کو پتا ہے نیوز چینل پر پٹی چل رہی ہے کہ حیدر آباد میں ٹاؤن چوک پر دو گروہوں میں زبردست تصادم... دونوں جانب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھواں دھار فائرنگ... ہم لوگوں کی جان نکلی ہوئی ہے یہ خبر دیکھ کر۔" بانو نے روہانسی آواز میں کہا۔

"ارے وہ میرا دوست ہے ناکرم! وہ اس نیوز چینل کا نمائندہ ہے... اپنے گھر میلاد میں وہ اور اس کی بیوی بھی آئے ہوئے تھے۔ ہم سب یہاں آئے تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہی آگیا تھا، یہ خبر چلوانے کی کارستانی اسی کی ہے۔ مجھے ابھی لوگوں نے بتایا تو میں اس سے کہہ کر آیا ہوں کہ خبر ہٹوا دے چینل سے... تو دوست ہے یا دشمن... بچوں کی معمولی لڑائی کو تو نے گینگ وار کی خبر بنا دیا۔"

"لیکن پاپا! آپ لوگ گھر کیوں نہیں آرہے ہو؟ ہم سب پریشان ہیں... امی کی تو حالت بہت ہی خراب ہے... ان کا بی پی شوٹ ہو کر آسمان پر پہنچا ہوا ہے۔" بانو نے پریشانی میں کہا۔

"بس بیٹا! آرہے ہیں تھوڑی دیر میں... دراصل ہم لوگ اس وقت تھانے میں بیٹھے ہوئے ہیں... ایف آئی آر لکھوا رہے ہیں ان لڑکوں کے خلاف... یہ بہت ضروری ہے... بہروز کی جس سے لڑائی ہوئی ہے... وہ پولیس والا ہے... بعد میں مسئلہ نہ ہو اس لیے بابر نے کہا کہ پہلے ہی اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دو۔" نوید نے بیٹی کو تسلی دی۔

"پاپا! جلدی آئیں... مجھے امی کی طرف سے پریشانی ہو رہی ہے۔" بانو نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

مہناز کی طبیعت کافی دگرگوں ہو رہی تھی اس لیے سب ہی خواتین نے مختلف تبصرے کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر اپنی آوازوں کا حجم تھوڑا کم کر لیا تھا اور پورے گھر میں بلند آہنگ سرگوشیوں کا سماں تھا... جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں اور رات گہری ہو رہی تھی نیند اپنے پر پھیلا کر سب کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

بچے تو پہلے ہی ریں ریں کرنے کے بعد ماؤں کے دھموکوں سے ڈر کر پہلے آنکھیں بند کر کے لیٹے... پھر سو بھی گئے... اب یہ صورت حال تھی کہ جہاں تھوڑی سی بھی جگہ تھی وہاں کسی نہ کسی سائز کا کوئی بچہ آڑا ترچھا پڑا نیند کے مزے لوٹ رہا تھا... اب مائیں اور دوسری خواتین نیند سے لڑنے میں معروف تھیں۔ ایسی ہی جھنجھناتی فضا میں اچانک پھپھو کی تیز آواز گونجی۔

"کیا جی... جی لگا رکھی ہے... میں جو پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دے... کہاں ہو تم سب... اور میرے گھر والے کہاں ہیں؟" پھپھو نے فون کان سے لگایا ہوا تھا اور نہایت جلالی موڈ میں کسی کو پھٹکارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"تو وہ ایف آئی آر تو لکھوائیں گے نا... بچوں کو مارا پیٹا تو ہے نا تم نے... تو بھگتنا تو پڑے گا۔" وہ نہ جانے کس پر تاؤ کھا رہی تھیں۔

"اچھا... ٹھیک ہے تو پھر... لاڈلے اور اس کے لڑکوں کے نام آنے دو اور ایف آئی آر میں... تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ... لیکن اتنا تو تم بھی جانتے ہو کہ فائرنگ کرنے والے تم لوگ تھے اور تمہیں فائرنگ کرتے ہوئے سب نے دیکھا ہے... اگر تمہیں نہیں معلوم... تو میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ تم لوگوں کی موبائل سے ویڈیو بھی بنالی گئی ہے سب صاف نظر آرہے ہو... سوچ لو۔" پھپھو نے بانو کو آنکھ مارتے ہوئے نہ جانے کس کا ڈبا گول کر دیا۔

بانو سمیت آس پاس کی تمام خواتین ان کی یک طرفہ گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھیں اور نبیلہ خان کو اس بات کا پوری طرح احساس بھی تھا۔ لہٰذا انہوں نے فون بند کرتے ہوئے سب پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور کسی کو مخاطب نہ کرتے ہوئے یونہی کہا۔

"ناک رگڑ دا کر معافی نہ منگوائی... تو نبیلہ خان نام نہیں... دیکھنا! یہاں آئیں گے ہاتھ جوڑتے ہوئے... نبیلہ خان کے شکنجوں سے بچ لینا اتنا آسان نہیں ہے۔" انہوں نے بھرم دکھاتے ہوئے کہا تو کچھ چہروں پر زیرلب چڑانے والی مسکراہٹ چمکی اور کچھ پر بیزاری۔ مگر مشکل یہ تھی کہ فی الحال تازہ ترین خبریں دینے والی وہی ایک اکیلی تھیں وہاں اس لیے سب ان کے آس پاس ہی بیٹھے رہنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ لاؤنج کی وسیع و عریض سیٹنگ ارینج منٹ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

"امی... امی! ابھی آپ تو اپنے آپ کو سنبھالو... وہ سب تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن آپ کو لے کر اگر اسپتال کے چکر لگانے پڑے تو بہت مشکل ہو جائے گی... پاپا اسپتال جائیں گے... یا تھانے کے معاملات نمٹائیں گے... پلیز امی! اطمینان رکھو... سب ٹھیک ہیں۔" بانو، مہناز کی بگڑتی طبیعت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ پھر اس نے فون پر باپ کا نمبر ملایا۔

"ہاں پاپا! آپ لوگوں کو ابھی کتنی دیر اور لگے گی... اچھا... ابھی ٹائم لگے گا؟ اچھا پاپا! بہروز کہاں ہے؟ وہیں آپ کے پاس ہے نا؟ اچھا آپ ایسا کرو... اسے تھوڑی دیر کے لیے گھر بھیج دو... نہیں پاپا! بہت ضروری ہے... بس اس سے کہیں آکر امی کو اپنی شکل دکھا جائے... ہاں ہاں بس تھوڑی دیر کے لیے بھیج دیں... ٹھیک ہے پاپا؟"

☆☆☆

ایس ایچ او صلح جو خان نے سامنے بیٹھے معززین کو دیکھا۔ مدعی ایک مضبوط خاندانی پس منظر رکھنے والا بینکر تھا۔ اس کے ساتھ ٹاؤن کا ناظم بابر میرانی اور تیسری کرسی پر شہر کا ایک بڑا کنٹریکٹر بابو بھائی تھا جو مضبوط مالی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ حکومتی اداروں میں دور تک اونچی پہنچ بھی رکھتا تھا... یہ تینوں ہم نوالہ و ہم پیالہ، ہمراز و دمساز ہونے کے ساتھ ساتھ رضاعی بھائی بھی تھے۔

ان کی کرسیوں کے پیچھے مدعی کے تینوں مضروب بیٹے کھڑے ہوئے تھے۔ سب سے چھوٹا دبلا پتلا نازک سا بہروز... جس کی باچھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کرتے کی ایک آستین پھٹ کر غائب ہو چکی تھی۔ خوب صورت ایمبرائیڈری والا کالر کرتے سے الگ ہو کر گلے میں اٹکا ہوا تھا۔ بقیہ کرتہ چیتھڑوں کی شکل میں اس کے جسم پر جھول رہا تھا۔

دوسرا اس کا کزن... جس کی دائیں آنکھ مضروب تھی۔ آنکھ سوج کر بند ہو چکی تھی اور اس کے چاروں طرف اچھا خاصا بڑا اور گہرا نیل پڑ گیا تھا۔ اس کا بھی سلک کا کرتہ اپنی جان... جان آفریں کے سپرد کر چکا تھا۔ بھرلے بھائی تھے ان کا چہرہ محفوظ و مامون تھا۔ کیونکہ دشمنوں نے ان کی ٹانگوں پر وار کیے تھے جنہیں انہوں نے بڑی حکمت سے روکا اور جوابی کارروائی کی تھی۔ تاہم کپڑے ان کے بھی اس معرکے کی نذر ہو گئے تھے۔ ان تینوں کے پیچھے دور تک ایک ہجوم تھا۔

"دیکھیں! ایف آئی آر تو میں لکھ لیتا ہوں۔ آپ نے کون کون سے نام بتائے ہیں... افتخار حسین، تیمور میرانی، عاصم کالو اور لاڈلا... ان پر دفعہ بھی لگا دیتا ہوں جھگڑے، فساد اور بلوے والی... لیکن ایک بات بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ دوسری پارٹی بھی آئے گی میرے پاس ایف آئی آر کٹوانے... ایک ان میں پولیس کا ڈیوٹی حاضر انسپکٹر ہے... دوسرا ایک میرانی ہے۔" اس نے معنی خیز نظروں سے ناظم ٹاؤن... بابر میرانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو... کیا مطلب ہے... وہ لوگ اسی طرح دنگا فساد کرتے رہیں گے۔ اسٹریٹ فائرنگ کی ہے انہوں نے... کسی کو بھی گولی لگ سکتی تھی اور اگر ابھی انہیں تنبیہ نہیں کی گئی تو ڈھیٹی تو پڑ گئی ہے نا... بعد میں بھی وہ کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" بابو بھائی کا غصہ بجا تھا... وہ چلائے۔

انسپکٹر کے توجہ دلاؤ نوٹس پر نوید کو بھی اس بات کا خیال آیا۔ اس نے مڑ کر بابر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر جز بز والی کیفیت صاف نظر آرہی تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا... کم از کم میرے ہوتے ایسا نہیں ہو سکتا... آپ معزز لوگ ہو... یہ ایسے گلی چھاپ لفنگوں کے منہ کہاں لگو گے... میں کوشش کروں گا کہ بچوں میں صلح صفائی ہو جائے اور جب تک ان سے یہ گارنٹی نہیں ملتی کہ آئندہ اس طرف سے ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی میں انہیں چھوڑوں گا نہیں۔" انسپکٹر صلح جو نے بات کا رخ اپنی طرف مڑتا دیکھ کر جوش میں کہا۔

"نہیں پاپا! ایسا نہیں ہوگا... مجھے معلوم ہے کیونکہ کچھ عرصہ پہلے بلکہ ایک سال پہلے بھی افتخار نے بلاوجہ مجھ سے پنگا لیا تھا اور اس وقت بھی آپ نے ہی صلح کروانے کی کوشش کی تھی... لیکن اب دیکھ لیں۔" بہروز نے انسپکٹر صلح جو کو یاد دلایا۔

"ہاں آں آں... مجھے یاد ہے لیکن پہلے میں اور اب میں فرق ہوگا... اب کے انہیں معافی مانگنی پڑے گی... سب کے سامنے... پھر میں دیکھوں گا کیسے بھولتے ہیں یہ..." صلح جو نے بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"تو ٹھیک ہے... بلاؤ ان کو... ابھی اور اسی وقت اس مسئلے کو ختم ہو جانا چاہیے... ابھی ہم سب بھی یہیں ہیں... انہیں بھی بلالو۔" نوید نے کئی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے شاباش! یہ ہوئی نا بات... لڑائی جھگڑے میں کچھ نہیں رکھا... صلح صفائی اچھی چیز ہے... افتخار تو آج کل ڈیوٹی سے چھٹی پر ہے اس کی ٹریننگ چل رہی ہے... چار مہینے اور ہیں ٹریننگ ختم ہونے کے بعد اس کا پروموشن ہوگا اور ہو سکتا ہے اسی تھانے میں میری جگہ وہ بیٹھا ہو... لیکن اگر اس کا نام کسی ایف آئی آر میں آگیا تو ٹریننگ سے آؤٹ ہوگا اور ڈیموٹ بھی ہو جائے گا۔" ایس ایچ او صلح جو معاملے کو سلجھتا دیکھ کر خوش تھا۔

"تو یہ کہیے نا کہ آپ افتخار کی محبت میں ہماری ایف آئی آر نہیں لکھ رہے ہیں کہ اس کا مستقبل خراب نہ ہو... آپ کو تو اس کی اتنی فکر ہے لیکن خود اسے اپنا مستقبل کتنا عزیز ہے... یہ اندازہ نہیں ہوا آپ کو..." بہروز نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔

"او نہیں کا کے! اپنے پاؤں پر کلہاڑی کون مارتا ہے؟ ہاں کوئی نہیں... لیکن بس کبھی کبھی مستی میں جوش میں ہوش کھو بیٹھتا ہے آدمی... غلطیاں کر جاتا ہے۔" انسپکٹر صلح جو نے نرم گفتاری کا ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کی۔

"کیا بات ہے؟ وہ غلطیاں کرتا رہے... آپ اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے پروں میں چھپاتے رہیں۔ وہ پھر غلطیاں کرے آپ پھر اسے پچکار لو... اس ساری محبت میں ہم کیا کریں...؟ کہاں جائیں کس سے کہیں؟" بہروز نے اس کی نرم گفتاری کا کوئی اثر نہیں لیا۔ "آپ ایسا کرو ایس ایچ او صاحب! ایک رسی منگواؤ... اس کا ایک سرا پھندا بنا کر میرے گلے میں ڈالو... اور دوسرا افتخار کے ایک ہاتھ میں دو... اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈا تھما دو... اس سے کہو گلی گلی لے کر پھرے اور تماشا دکھائے۔" بہروز غصے میں کچھ اور بھی کہنے جا رہا تھا کہ نوید نے بیٹے کو ڈانٹ کر خاموش کروا دیا۔

"چپ کر اُلو کے پٹھے! بڑے بیٹھے ہیں نا بات کرنے کے لیے... پھر بیچ میں چیں چیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" باپ کی ڈانٹ نے بہروز کی غصے میں رواں زبان کو بریک لگائے۔

انسپکٹر صلح جو نے اپنے نائب کو آواز لگائی۔

"اوئے میر محمد! لے آ وہ نمبر والا رجسٹر... ادھر بیٹھ کر کارروائی لکھ... جو کچھ صاحب لوگ بتائیں... تفصیل سے لکھ... بلکہ یہ جو مضروب کاکے ہیں ان کی تصویریں بھی کھینچ کر... ہاتھ لگائی ہیں... سمجھ گیا ہے نا... چل شاباش... فٹافٹ..." انسپکٹر صلح جو نے اپنے اسسٹنٹ کو خاص طور پر 'جلدی' کا حکم شاید اس لیے جاری کیا کہ لاشعوری طور پر اسے شاید یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں سامنے والی پارٹی جس کو اس نے ڈیڑھ گھنٹے کی 'زبانی' محنت سے قابو کیا ہے پھر بدل نہ جائے... پھر وہ پکی ایف آئی آر پر اصرار شروع نہ کر دے۔

احکامات جاری کرنے کے بعد انسپکٹر صلح جو نے کرسی کی پشت گاہ سے کمر ہٹائی اور توند آگے بڑھائی۔ پھر بھی ٹیلی فون تک قانون کے لمبے ہاتھ پہنچنے سے قاصر رہے تو اس نے مسکرا کر ایک کھسیانی ہوئی مسکراہٹ سامنے بیٹھے ناظرین کی طرف اچھالی جو بغور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے تھے... بابر میرانی نے خاموشی سے ٹیلی فون سیٹ آگے کی طرف کھسکا کر اس کی دسترس میں پہنچا دیا۔

"ہالو وہ..." انسپکٹر صلح جو نے نہ جانے کس کے نمبر ڈائل کر کے ہیلو بولا اور دوبارہ کرسی میں اندر تک پھیل گیا۔

"ہاں... افتخار کدھر ہے؟ تم کون ہو؟ اچھا اچھا آ آ..." اس نے کچھ بے چینی سے کان کھجایا۔

"دیکھو بھئی! ادھر یہ کچھ لوگ آئے بیٹھے ہیں۔ ایف آئی آر لکھوانے کے لیے... اور اس میں جو نام یہ بتا رہے ہیں وہ ہیں افتخار، تیمور میرانی، عاصم کالو اور لالو لا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ... کے ساتھ سرعام مار پیٹ کی گئی ہے۔ مضروبین کے چہروں اور جسم پر مار پیٹ کے واضح نشانات موجود ہیں اور اور کوئی تیس چالیس چشم دید گواہ بھی ان کے ساتھ تھانے آئے ہیں۔ ایسی صورت میں میرا فرض بنتا ہے کہ فوراً ایف آئی آر کاٹوں اور نفری بھیج کر تم چاروں کو ہتھکڑی لگوا کر اِدھر بلوا لوں۔" انسپکٹر نے اپنے ارادے بتائے اور خاموش ہو کر دوسری جانب کی بات سننے لگا۔

"اوئے... تم کتنا بھاگو گے... کہاں تک چھپو گے... تم نہیں ملو گے تو پولیس تمہارے گھر والوں کو پکڑ کر لے آئے گی... انہیں چھتر پڑیں گے تو تم لوگ آپ ہی حاضری دے دو گے اور... انسپکٹر صلح جو سے بچنا اتنا آسان نہیں ہے بچو!" اس نے سننے والے کو تڑی لگائی۔

"اوئے بے وقوف! باقی تین ڈھیٹ ہیں... بھگت لیں گے... پر یہ جو تمہارا یار غار افتخار ہے نا اس کا کیا بنے گا... سوچا ہے تم نے کبھی؟ ٹریننگ سے نکالا جائے گا... ڈیموشن ہو جائے گا اور بلیک لسٹ ہو جائے گا... سارے فیوچر کا خانہ خراب ہو جائے گا... اور یہ بات اس کھوتے کو آپ نہیں پتا؟ جو اس طرح کے تماشے لگاتا پھرتا ہے... اس سے بات کرواؤ میری... میں ذرا پوچھوں تو سہی۔" اس نے کسی کو زوردار طریقے سے جھاڑا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ دوسری جانب کسی کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔

"ہاں! کیا بات ہے؟ کدھر ہے افتخار؟... کیوں؟ کیوں بات نہیں کر سکتا؟ شاواشے بھئی شاواشے۔ ہم اس کی فکر میں ادھر سیلاب کے آگے بند بنائے بیٹھے ہو اور وہ نواب کا بچہ..." اس کے آگے موٹی سی گالی تھی جس کو تحریری صورت میں کاغذ کے جلنے کا اندیشہ ہے۔

"اس... کے بچے کو بول دو... اسے ان شریف لوگوں سے معافی مانگنا پڑے گی... اور اس کو کیا... تم سب کو باجماعت معافی مانگنا پڑے گی۔ نہیں تو تم سارے بدمعاشوں کو پہنچاؤں گا سلاخوں کے پیچھے... پھر پتا ہے کیا ہوتا ہے ادھر تھانے کے ڈرائنگ روم میں... تم سارے ہفتوں تک 'تشریف' رکھنے کے قابل نہیں رہو گے۔" انسپکٹر نے ان کے مستقبل کا بھیانک نقشہ کھینچ کر انہیں ڈرانے کی کوشش کی جو سننے والوں کو تو ڈراما لگا... لیکن بقول انسپکٹر اس کی دھمکی کامیاب رہی۔

"وہ جی! بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے لڑکوں نے افتخار کو بہت بری طرح مارا پیٹا ہے، اس کو بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں اور وہ ابھی اس قابل نہیں ہے کہ یہاں تک آ سکے... لیکن یہ پکی بات ہے کہ کل وہ سارے خود آپ کے پاس آپ

کے گھر آئیں گے... اور آپ سے ہاتھ جوڑ کر... پیر پکڑ کر معافی مانگیں گے۔" انسپکٹر نے فون رکھتے ہوئے اعلان کیا تو اس کی ڈراما بازی کے سب ہی قائل ہو گئے اور اندر ہی اندر غصے سے کھولنے لگے۔ اظہار اور تو کسی نے نہیں کیا لیکن بہروز سے اب بھی رہا نہیں گیا۔

"جھوٹ بولتے ہیں وہ لوگ... ہم نے کوئی ایسا نہیں مارا کہ وہ اٹھ نہ سکے... چل پھر نہ سکے... تھانے نہ آ سکے... دو چار تھپڑ گھونسوں میں اس جیسے بے غیرت کا کچھ نہیں بگڑتا... اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نشے میں ٹن ہے... اور اتنا بے ہوش ہے کہ وہاں بھی نالی میں منہ دیے پڑا تھا جب تک کسی کی توفیق نہیں تھی... تو یہاں کیسے آئے گا؟ آپ گاڑی بھیج کر اسے اٹھوا کر منگوائیں... آپ خود دیکھ لیں گے۔" بہروز نے انسپکٹر کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا تو وہ چیخ کر بولا۔

"دیکھو کاکے! میں یہ بھی کر سکتا ہوں... ابھی بلوا لیتا ہوں پولیس بھیج کر... جیسے بھی ہیں جس حال میں بھی ہیں... بات بڑھے گی مقدمے تک نوبت جائے گی... تو تم لوگ کتنا عرصہ پولیس کے خلاف مقدمہ لڑو گے... تمہارے ساتھ یہ جو گواہوں کا جم غفیر نظر آ رہا ہے... اس میں سے کتنے رہ جائیں گے تمہارے ساتھ پیشیاں بھگتانے... اور یہ میرانی صاحب راضی ہو جائیں گے اپنی برادری کے میرانی کے خلاف گواہی دینے کے لیے... یہ بابو بھائی! یہ کب تک اپنے کام چھوڑ چھوڑ کر عدالت میں حاضری لگائیں گے... یہ کوئی دو چار دن کا کام تو ہے نہیں... سالوں چلتے ہیں اس طرح کے مقدمے... اور سالوں کے بعد جانے کیا فیصلہ ہو... وہ چھٹ جائیں... یا تم... کسے خبر ہے... میں تو معاملے کو سدھارنے کی کوشش کر رہا ہوں... پر تم لوگ بات سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔" انسپکٹر صلح جو نے رول کو انگلیوں میں گھماتے گھماتے اپنی بات مکمل کی اور مستقبل کی ایک مکمل ہورر فلم چلا دی۔

"اُلو کے پٹھے! کہہ رہا ہوں نہ بڑے بات کر رہے ہیں تو مت بول بیچ میں... مگر باز نہیں آ رہا ہے... چل! اسے لے کر گھر جا... فوراً... ورنہ ابھی یہیں پٹے گا سب کے سامنے یہ میرے ہاتھ سے۔" نوید نے جھلا کر سارا غصہ بہروز پر اتارا تو طلال نے بھی مناسب یہی سمجھا کہ بہروز کو پکڑ کر باہر لے جائے۔

"دیکھو جی! اپنے نوید صاحب! یہ بچے ہیں۔ جذباتی ہوتے ہیں کچھ بھی الٹا سیدھا کر کے آ جاتے ہیں... پھر بھگتنا بڑوں کو بھی پڑتا ہے۔ میرا بڑا دوستانہ مشورہ ہے۔ ان کو آپس میں سامنے بٹھا کر بات کروا دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے غلطی کی ہے ان سے تو معافی میں منگواؤں گا... آپ سب کے جانے... آپ بھی دل بڑا کرو... معاملہ رفع دفع کرو۔" انسپکٹر صلح جو نے مشورہ دیا۔

"یہ معافی تلافی پہلے بھی ہو چکی تھی پھر کیا ہوا؟ دوبارہ پھر وہی لڑائی جھگڑا... پہلے صرف مار پیٹ تک کی بات... اس دفعہ فائرنگ بھی کر دی... اگلی دفعہ پھر کوئی بات ہوئی تو... ڈائریکٹ گولی ہی مار دیں گے۔" نوید نے غصے سے کہا۔

"ارے نہیں نوید صاحب! اب کی دفعہ میں ان کے ایسے نٹ ٹائٹ کروں گا کہ اگلی بار اگر کبھی آمنا سامنا ہوا بھی تو... سوچیں گے ضرور... پر کچھ نہیں کہیں گے... انسپکٹر صلح جو نام ہے میرا... لیکن اگر کوئی میرے ہتھے لگ جائے تو پھر ٹھیک ٹھاک صلح کش بن جاتا ہوں میں... آپ لوگ سوچ لیں میں ذرا واش روم تک ہو کر آتا ہوں۔" ایس ایچ او اٹھا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

نوید نے پہلے دائیں طرف گردن گھما کر اپنے دوست بابر میرانی کی طرف دیکھا تو ان کے بشرے پر چھائی ہوئی جز بز والی کیفیت صاف نظر آئی اور آنکھوں میں انسپکٹر کی بات مان لینے کی خواہش بھی صاف جھلکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

پھر اس نے بائیں طرف گردن گھمائی تو اس کے بہت قریبی، ہمراز و دمساز، رضا بھائی، بابو بھائی نے بھی چشمے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا۔

"دیکھو لو نوید بھائی! میں تو ہر طرح آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں لیکن انسپکٹر کی بات میں بھی دم ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے... لیکن اگر انسپکٹر ان لوگوں کو معافی مانگنے پر مجبور نہیں کرتا... تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا... کیوں بابر؟ تیرا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں بابو بھائی، ہم انسپکٹر صلح جو پر ہی سارا ملبہ ڈال دیتے ہیں... وہ ان چاروں کو بلوائے... ابھی اور اسی وقت... وہ سب کے سامنے اپنی ان حرکتوں پر معافی مانگیں تاکہ آئندہ کوئی بھی غلط حرکت کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچیں۔" دونوں کے تبصرے سن کر نوید نے بھی اثبات میں گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے... دیکھتے ہیں۔" نوید نے کہا اور وہ سب انسپکٹر صلح جو کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

☆☆☆

رات کے دو بجے... نیند کا بے پناہ دباؤ... لیٹنے کے لیے جگہ ناپید۔ بھاری لباس اور زیورات کی وجہ سے بے آرامی۔ بیشتر خواتین اونگھنے میں مشغول تھیں۔ لڑکیاں البتہ پوری طرح بیدار اور صورت حال کو مختلف طریقوں سے ہائیٹر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے میں مصروف تھیں۔ تاہم اونگھنے والی خواتین کے حالات و جذبات کے لحاظ کی وجہ سے انہوں نے اپنی آوازوں کا حجم کم رکھا ہوا تھا جس کے سبب پورے گھر میں ایک جھنجھناہٹ آمیز خاموشی طاری تھی۔ ایسے میں اچانک گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور سیڑھیوں پر سنائی دینے والی قدموں کی آہٹوں نے سب جاگنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''کون ہے؟ کون آیا ہے؟'' ابھی یہ سوال فضا میں گونجے ہی تھے کہ لاؤنج کا داخلی دروازہ کھلا اور بہروز کی آمد ہوئی۔ وہ ڈیزائنر کرتہ جس کی پچھلے پندرہ دنوں سے دھوم مچی ہوئی تھی اور جس کا ڈیزائن، ایمبرائیڈری اور سلائی کا اسٹائل... بہروز کی شبانہ روز... کاوشوں سے عبارت تھا... اس حال میں تھا کہ اس کی ایک آستین کو بڑی بے دردی سے کھینچ کر... پھاڑ کر غائب کر دیا گیا تھا۔ کالر جس پر بڑی مہارت سے کڑھائی خود ڈیزائن دے کر کروائی گئی تھی بقیہ کرتے سے الگ ہو کر گلے میں موجود تھا جبکہ بقیہ کرتہ کئی حصوں میں منقسم ہو کر... پھٹی ہوئی چندیوں کی شکل میں اس کے جسم پر جھول رہا تھا۔

بائیسپس سے پھٹنے والا خون ٹھوڑی تک پہنچ کر جم چکا تھا۔ جیل لگا کر بڑے اسٹائل سے جمائے گئے بال... پریشان حال تھے اور ان میں مٹی اور کچرے کی اطمینان بخش مقدار جلوہ دکھا رہی تھی۔ ہاتھوں، گردن اور چہرے پر کھرونچوں اور خراشوں کے نشان... گزری واردات کی کہانی سنا رہے تھے۔

''بہروز... بہروز... بہروز!'' جیسے ہی اس کی لاؤنج میں انٹری ہوئی جھنجھناتا ہوا ماحول یک دم جاگ اٹھا... ہر شخص اس کی طرف بڑھا کہ قریب سے اسے دیکھ سکے کہ کتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ دور سے جتنی نظر آ رہی ہے حقیقتاً اتنی ہی ہے یا کچھ زیادہ... بہروز اتنی ساری خواتین کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر شاید کچھ گھبرایا۔ اس نے کوشش کی کہ ان کے گھیرے سے بچ بچا کر نکل جائے اور سیدھا اپنے کمرے میں پناہ گزین ہو۔

طویل و عریض لاؤنج میں وہ پھپھو، خالہ، ممانی، چچی، تائی، بہنوں اور بھابیوں کے جم غفیر کو ڈاج دیتا ہوا نکلا تو... لابی میں کزنز کے گھیرے میں آ گیا۔

''ارے یار! چھوڑ مجھے... کچھ نہیں ہوا... میں بھی ٹھیک ہوں اور باقی بھی ٹھیک ہیں... مجھے کمرے سے کچھ لینا ہے اور واپس جانا ہے... ہٹو!'' اس نے کزنز کے نرغے کو توڑتے ہوئے کہا تو اس کے الفاظ نے خواتین کے دل میں اور پتا نہیں کیا غلط فہمی ڈال دی... وہ ابھی اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ بابو بھائی کی بیٹی نے ایس او ایس دیا۔

''شکیلہ باجی! یہ کمرے سے اپنی گن لینے جا رہا ہے شاید... روکو اسے۔''

بس شکیلہ باجی اور ان کے درجن بھر اسکواڈ نے پلک جھپکتے ہی کمرے کے دروازے کو گھیر لیا اور بہروز... جو تیزی سے کمرے میں پناہ گزین ہونے جا رہا تھا... اس اسکواڈ کے جاں بازوں میں گھر گیا... اس نے تھوڑی دیر طاقت استعمال کر کے... آگے بڑھ کر دروازے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو شکیلہ باجی نے فوراً دروازہ بند کیا اور لاک کر کے چابی نہ جانے کس کو تھما دی۔ اور پھر وہ چابی... دست در دست سفر کرتی جانے کن نہاں خانوں میں پہنچ گئی۔ اب وہ صحیح معنوں میں بے دست و پا ہو کر حسینوں کے ہجوم میں گھر چکا تھا جو لعن طعن کے تیر و نشتر سے لیس ہو کر... اس پر حملہ آور ہو چکی تھیں۔

''جتنی دھلائی ہونا تھی... ہو چکی... اب سانپ گزرنے کے بعد لکیر پیٹنے جا رہے ہو... اس کا فائدہ؟''

''ابے پندرہ لڑکوں سے اکیلا لڑا ہوں میں... دھلائی؟'' بہروز نے اپنی خودی بلند کرنے کی کوشش کی۔

''اس جملے کو تھوڑا درست کر لے بہروز... بول... پندرہ لڑکوں سے اکیلا پٹا ہوں میں... یہ حال تو ہونا ہی تھا۔''

''اور یہ حماد اور طٰہٰ نے بھی تیرا ہاتھ بٹایا ہے... پٹنے میں... اس لیے تھوڑی تھوڑی نیاز اور تبرک انہیں بھی ملا... تف ہے تم لوگوں پر... جاؤ ان کے گلیارے چھچھوروں سے پٹ پٹا کر آ گئے... وہ کوڑی کی عزت کروا دی لطیف آباد والوں کی۔''

''ہاں ہاں کہہ لو... کہہ سکتی ہو... کیونکہ ابھی تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا ہے نا... جن کو ہم نے پٹا ہے... منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہم نے انہیں... میں نے تو اتنے گھونسے اور تھپڑ مارے ہیں اس خبیث افتخار کے منہ ہی منہ پر... کہ بھرتہ بنا دیا ہے... کم از کم تین دن تک تو آئینہ دیکھ کر بھی ڈرتا ہی رہے گا۔''

''یہ تیرا خیال ہے کہ تو نے ایسا کیا ہوگا لیکن اس نے جو کیا ہے وہ ہمیں بھی نظر آ رہا ہے... اور اس وقت وہ بھی اپنے لوگوں کو یہی کہانی سنا رہا ہوگا کہ میں نے بہروز کا منہ توڑا، حماد کی آنکھ پر تمغہ چپکایا اور طٰہٰ کی ٹانگیں توڑ کر ڈال دیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ارے یار! تم لوگ میرے رشتے دار اور دوست ہو... یا دشمن... مجھ سے ہمدردی کے دو بول بولنے کے بجائے... سب میری ٹانگ کھینچ رہے ہو۔" بہروز نے جھنجلا کر کہا تو انہیں بھی احساس ہوا کہ شاید کچھ زیادہ ہی کھنچائی ہو گئی۔ اس سوچ کے سبب ایک لمحے کی خاموشی کا وقفہ آیا اور اسی وقفے میں تہمینہ عرف ٹیمی کی آمد ہوئی۔

"ٹک ٹک..." اس کی اونچی ایڑی فرش کے ٹائلوں پر بجی... پھر اس نے نظر اٹھا کر بہروز کو دیکھا جو پندرہ بیس لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا کھڑا تھا... اس کی سرسری نظر یک دم جھرجھرا کر ایکسرے ڈیوائس بن گئی۔ اس نے پوری آنکھیں پھاڑ کر بغور بہروز کا جائزہ لیا اور پھر اس کی طرف خاموشی کو توڑتا ہوا اس کا بے ساختہ قہقہہ سب کو حیران کر گیا۔

"یہ لو... بس بھئی! آ گئی سب سے بڑی مصیبت۔"

بہروز نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے 'سب سے بڑی مصیبت' سے جس ٹیمی کو نوازا تھا۔ وہ بابو بھائی کی چوتھے نمبر کی بیٹی تھی۔ بہروز کی تقریباً ہم عمر اور کافی حد تک ہم مزاج بھی۔ اس لیے دونوں میں کافی بے تکلفانہ دوستی تھی۔ سالانہ میلاد کے لیے سارے لڑکے لباس کی خصوصی تیاری کرتے تھے۔ اس دفعہ بہروز نے... کئی نئی کیٹلاگ سے کافی دیدہ ریزی کے بعد ڈیزائن سلیکٹ کیا تھا۔ کیٹلاگ میں اس ڈیزائن کے کرتے کی قیمت چھ ہزار نو سو ننانوے لکھی ہوئی تھی۔ جسے ظاہر ہے بہروز افورڈ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا وہ کیٹلاگ اٹھا کر اپنے درزی کے پاس پہنچا اور درزی نے وعدہ کر لیا کہ اگر کپڑا لا کر دے دیا جائے تو وہ دو ہزار میں بالکل ویسا ہی کرتہ بنا کر دے دے گا... کڑھائی سلائی سمیت...

اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔ اس نے فوراً حامی بھر لی۔ بلکہ درزی کو اس بات پر بھی راضی کر لیا کہ وہ کالر کے اندرونی حصے میں برانڈ کا ایک لیبل بھی بنا کر لگا دے۔ اس کے پچاس روپے وہ اضافی طور پر ادا کرے گا۔

اب کیونکہ یہ مشورہ اسے ٹیمی نے دیا تھا اس لیے ہر دو تین دن کے بعد اس معرکتہ الآرا ڈیزائنر کرتے کی تازہ ترین کیفیت وہ فون پر اس سے معلوم کرتی رہتی تھی۔ بہروز کے انداز بیان نے کرتے کے بارے میں اسے سخت تجسس میں مبتلا کر رکھا تھا۔

"اچھا تو کلر تو بتاؤ... کس رنگ کا کپڑا ہے؟" وہ پوچھتی۔

"دیکھو بھئی! بہت ذہنی کلر ہے اس لیے بتا نہیں سکتا۔" بہروز اس کے تجسس سے واقف تھا اس لیے چھیڑتا۔

"اوفوہ! ایسا بھی کیا ذہنی... کہ بتا نہ سکو... اچھا خیر چھوڑو... یہ بتاؤ کڑھائی کیسی ہے... وہی کالر، گلا اور آستینیں... یا کچھ مختلف ہے؟"

"ارے ایسی یونیک کڑھائی اور ایسی زبردست اسٹائلش سلائی... دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔"

"اچھا! کب آ رہا ہے سل کر... میں دیکھنے آؤں گی... آخر ایسا کیا زبردست بن رہا ہے۔"

اور آج جب اس کی نظر پہلی مرتبہ اس 'زبردست برانڈڈ' کرتے پر پڑی تو وہ اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکی۔

"اچھا تو یہ ہے وہ زبردست، معرکتہ الآرا 'برانڈڈ' کرتہ جس کے لیے تو پچھلے پورے مہینے سے خوار ہو رہا تھا۔" ٹیمی نے ہنستے ہوئے اس کے ناگفتہ بہ حلیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

"ویسے واقعی... 'اسٹائلش' تو ہے... صرف ایک آستین کے ساتھ... چند پٹیوں کی شکل میں بدن پر لہراتا کرتہ... اور کالر الگ سے گلے میں لٹکا ہوا... جب چاہو کالر والا کرتہ پہنو... جب چاہو کالر اتار کر رکھ دو... بغیر کالر والا کرتہ پہن لو... ایک ٹکٹ میں دو مزے... واؤ...!" وہ بات ختم کر کے ہنسی تو اور بھی بہت سے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"بس بھئی! بول چکیں... کہہ چکیں... تم یہ بتاؤ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟ ایک دم دو ٹکے کا ڈریس... فضول سے کلر کا... اور یہ بندے یہ کیا ہیں بھئی... اتنے بھیانک ڈیزائن کے...؟" بہروز نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے جوابی کارروائی کی۔

"چلو... چلو... اور چلو... لفظوں میں بو کباب کی سی ہے... اور بیٹے! یہ ہے ڈیزائنرز ڈریس اور خاص طور پر ڈیزائنرز جیولری۔" اس نے اٹھلاتے ہوئے اپنے عجب سے گلابی مائل بھورے سے رنگ کے شیفون کے ڈریس کو دکھایا۔ پھر اٹھلا کر کان آگے کر دیا جس میں عجیب اور منفرد سے ڈیزائن کے بندے تھے۔ اور اس کے بعد قدم بڑھا کر کرسی پر پاؤں رکھ دیا جس میں ایک چمکتی ہوئی سی پازیب نمایاں طور پر نظر آئی۔ وہ بھی کان کے بندوں کے ڈیزائن کی ہی تھی۔

"خدا کی پناہ! یہ بندے ہیں یا ٹین پلیٹوں کو الٹا کر کے ان پر بھوتوں کی شکلیں پینٹ کر کے... کان میں لٹکالی ہیں۔ پلیٹیں بھی ایک رنگ کی نہیں ملیں... ایک گلابی، ایک اورنج اور ایک پیلی... کسی بہت ہی غریب ڈیزائنر کی گھٹیا پیشکش

ہے... لو پروفائل... ہونہہ۔" بہروز نے اپنے غصے کا اظہار جلے کٹے لفظوں میں کیا تو وہ اور زور سے ہنسی۔

"ہاہاہا... غریب لوگ... ایسے ہی جلتے کڑھتے ہیں... ویسے ایک بات بتاؤں... تو اگر اس وقت ایک سلور کا پرانا سا پیالہ اپنے ہاتھ میں پکڑ لے... اور ایک موٹے منکوں کی تسبیح گلے میں ڈال لے تو اتنا آفت لگے گا کہ لوگ چونیوں کے ساتھ ساتھ اپنے آنسوؤں سے بھی دو منٹ میں تیرا پیالہ بھر دیں گے۔" ٹیمی کے لفظوں سے زیادہ تکلیف دہ اس کی جھلسا دینے والی مسکراہٹ تھی۔ بہروز اسے گھور کر رہ گیا۔

"اچھا بھئی، باتیں ہو چکی ہوں تو ذرا امی کو بھی اپنی شکل دکھا دو... ان کی حالت خراب ہو رہی ہے۔" بانو نے چھوٹے بھائی کو ڈپٹا۔

"میں اسی لیے کمرے میں جانا چاہ رہا تھا کہ کپڑے بدل کر... منہ دھو کر امی کے سامنے جاؤں... مگر ان اُودبلاؤں نے گھیر لیا... چلو... ایسے ہی چلتا ہوں۔" وہ بانو کے ساتھ اگلے کمرے میں چلا گیا جہاں مہناز اب تک سکتے کی سی کیفیت میں خاموش بیٹھی تھیں۔ پھپھو ان کے قریب بیڈ پر بیٹھی... موبائل کان سے لگائے... مستقل کسی نہ کسی سے رابطے میں مصروف تھیں۔

"دیکھو بھئی، تمہیں اندازہ نہیں ہے ان لوگوں نے میرے بھتیجوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، وہ ناقابل برداشت ہے تم لوگ اگر یہاں کچھ نہیں کر سکتے تو مجھے صاف صاف بتا دو... میں ابھی کراچی ہیڈ آفس فون کرتی ہوں... جب وہاں سے فون آئے گا تو خود ہی دوڑے دوڑے آؤ گے... پھر مجھ سے مت کہنا... کہ باجی! ہیڈ آفس فون کرنے کی کیا ضرورت تھی... ہمیں آ کے ہمیں دو تھپڑ مار لیے ہوتے۔" انہوں نے خاموش ہو کر دوسری جانب والے کی بات سنی اور پھر چیخ کر بولیں۔

"کیوں؟ وہ کیوں آئیں گے؟ واہ بھئی واہ... حرکتیں کریں تمہارے بدمعاش... اور صلح کرنے جائیں میرے بھتیجے... یہ خوب کہی تم نے... اب رہنے دو... رہنے ہی دو... میں ہیڈ آفس فون کر کے رپورٹ کرتی ہوں... سب کے نام بتا کر ان لوگوں سے پوچھوں گی کہ اب کیا کرنا ہے پھر دیکھتی ہوں کتنا دم ہے تمہارے اندر... نبیلہ خان سے پنگا لینے والی بات کی ہے نا اب میں دیکھوں گی کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔" انہوں نے بڑے غصے میں اور دبنگ لہجے میں کسی کو دھمکیوں پر دھمکیاں دے کر لرزہ طاری کر دیا اور آخری جملہ تابوت میں آخری کیل کی طرح ٹھونکتے ہوئے بولیں۔

"اب میں نہیں... تم دیکھنا اگر کراچی آفس سے بھی تمہاری گوشمالی نہیں ہوئی تو میں اور آگے جاؤں گی... پھر دیکھتی ہوں تم کیا کرتے ہو۔" انہوں نے نہایت غصے سے فون پر انگوٹھا پوری طاقت سے دبا کر کال اینڈ کی تو فون ان کے غصے کی تاب نہ لا سکا اور اس کا اسکرین ایک چھوٹی سی ترخ کی آواز کے ساتھ کریک ہو گیا۔

"لعنت ہو۔" انہوں نے فون بیڈ سائڈ پر پٹخا اور اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئیں۔

بانو جو بڑی دیر سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے فون اٹھایا اور کوئی نمبر پنچ کر کے جلدی سے کان سے لگایا اور مایوس ہو کر فون کان سے ہٹا کر آنکھوں کے سامنے لائی۔ فون سے آواز آئی تھی۔

"آپ کی مطلوبہ کال کے لیے آپ کے فون میں بیلنس موجود نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے پچھلی کالوں کو چیک کیا... فون سے آخری کال شام چار بجے کی گئی تھی اور اس کے بعد ہی شاید فون میں بیلنس ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"پھپھو نہیں بدلیں گی۔" اس نے افسوس میں سر ہلاتے ہوئے فون واپس رکھ دیا۔

اسی وقت بہروز اندر داخل ہوا اور بیڈ پر آ کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

"امی! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں ہوا... صرف ہم لوگوں کے کپڑے ضائع ہو گئے وہ اور بن جائیں گے... ریلیکس ہو جاؤ۔ ہاں... سب ٹھیک ہے... ہم لوگوں نے ان کی بہت ٹھیک کی دھنائی کی ہے اب زندگی میں کبھی ہم سے جھگڑنے کی ہمت نہیں کریں گے۔" مہناز خاموشی سے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

"امی! کچھ بولو تو صحیح... ڈانٹو، برا بھلا کہو... چاہو تو دو تھپڑ مار لو... مگر خاموش مت بیٹھو... کچھ تو کہو۔" وہ آگے کھسک کر لاڈ سے ماں کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولا۔

"جھگڑا کیوں کیا تھا؟" مہناز نے کمزور سی آواز میں کہا تو وہ پھر ایکٹیو ہو گیا۔

"میں نے کب کیا جھگڑا؟ وہ تو اس نے شروع کیا تھا۔ رونگ سائڈ سے بغیر لائٹ جلائے آ رہا تھا... میں دیکھ نہیں پایا۔ پھر اچانک روشنی میں آیا۔ تو بچاتے بچاتے بھی ہٹ ہو گیا۔ میں نے اسے اٹھایا... سوری کیا... میں اسے سوری، سوری کہے جا رہا تھا مگر اس کا دماغ اتنا خراب ہو رہا تھا کہ مجھے گالیاں دیے جا رہا تھا بس پھر میں کب تک برداشت کرتا...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگادیے دو چار ہاتھ۔" بہروز نے ہلکے پھلکے انداز میں جھگڑے کو کم کر کے سنانے کی کوشش کی... سب جو اس کی کہانی سننے کمرے میں جمع ہو گئے تھے انہیں بہت مایوسی ہوئی۔

"لو بھئی! کھودا پہاڑ نکلا چوہا... جب سے ایسی ایسی نیوز آرہی تھیں کہ جیسے بارڈر پہ جنگ چھڑ گئی ہو... اور لطیف آباد کی پلاٹون... دشمن ٹاؤن کی فوج ظفر موج سے... نہایت بے جگری سے لڑ کر... کشتوں کے پشتے لگا رہی ہے... اور یہاں..."

چوتھے نمبر والی 'مصیبت' نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسنا شروع کیا تو بہروز نے گھور کر اسے دیکھا۔

"ہنس لو... ہنس لو... جو کچھ وہاں ہوا... اگر سہنا پڑتا تو یہ ساری ہنسی دھری کی دھری رہ جاتی۔ تمہارا نام بابو انکل نے تہمینہ مدحت کیوں رکھا تھا تم مصیبت ہو اور یہی سب سے بہتر نام ہے تمہارا... مصیبت! جاؤ یہاں سے۔" وہ غصے سے بولا تو وہ مزید چڑانے والی ہنسی ہنستی ہوئی بیڈ سائڈ پر ٹک گئی۔

"تمہارے باقی جاں باز، کمانڈوز کہاں رہ گئے؟ جھگڑے سے جاں بازوں کے جوتے، چپلیں سمیٹنے میں لگے ہوں گے بے چارے۔" 'مصیبت' نے بہروز کے ننگے پیروں پہ کھلا طنز کیا۔

"امی! ابو! بھو... اس مصیبت کو سمجھا لو... ورنہ میں اس پہ کتے چھڑوا دوں گا۔ پتا نہیں کیا کیا بولے جا رہی ہے۔" بہروز جیسے پھٹ سا ہو کر بولا۔

"بھو بھو بھو..." مصیبت نے اس کا منہ چڑایا اور ہنستی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"یہ تہمینہ مدحت نہیں... 'ٹِگی مصیبت' ہے۔" بہروز نے اس کے چھوٹے قد کو نشانہ بنا کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

☆☆☆

آخر کار انسپکٹر صلح جو کی آمد ہوئی۔ وہ اپنی معرکتہ الآرا اور گنبد نما توند پہ بیلٹ کو درست جگہ قائم رکھنے کی بھرپور کوشش میں دونوں ہاتھوں کا استعمال کرتا ہوں اپنی اسپیشل سائز کی کرسی میں غروب ہوا اور وہیں سے اس کا چہرہ طلوع ہوا جو 'چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں' کی مکمل تفسیر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ چاند گرہن زدہ اور ستارے بجھتے ہوئے سے محسوس ہو رہے تھے۔ تاہم ان میں سوال واضح نظر آ رہا تھا جو آخرکار اس کے ہونٹوں پر بھی آ گیا۔

"ہاں سر جی! پھر آپ لوگوں نے کیا فیصلہ کیا؟ ایف آئی آر لکھوانی ہے یا ان لوگوں سے معافی تلافی کروادوں۔"

"دیکھو انسپکٹر! لڑائی جھگڑا، ہنگامہ کون چاہتا ہے؟ کوئی نہیں... لیکن یہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایشو بنا کر... اس طرح لڑنا کہ جیسے گینگ وار چل رہی ہو... یہ کس کو برداشت ہوگا پہلے صرف مارکٹائی اور ایک دوسرے کا سر پھاڑنے یا ہاتھ پاؤں توڑنے تک کی بات تھی، کوئی بات نہیں... ہو جاتی ہے... لڑکے ہیں... جوان خون ہے... آ جاتے ہیں غصے میں... لیکن آج جو کچھ ہوا... دو لڑکوں کو پورے گینگ نے گھیر کر مارا... اور جو کسر بچی تو... گنیں بھی استعمال کر ڈالیں... آج ہوائی فائر اور اسٹریٹ فائر کیے... چلو کسی کو گولی نہیں لگی... لیکن اگلی دفعہ کیا ہوگا... کیا ہمیشہ بچتے رہیں گے... کسی نہ کسی کا نقصان ہو گیا تو... اس کا ذمے دار کون ہو گا؟" نوید نے بڑی مدلل بات کی۔

"اوئی شاوا شے! یہ ہے نا سمجھداری کی بات۔" انسپکٹر صلح جو نے اپنا مخصوص نعرہ لگاتے ہوئے اس کی بات کو سراہا۔

"اب آپ میری بات سنو، انسپکٹر صلح جو کے ہوتے اس علاقے میں ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ آج جوان لڑکوں نے لڑائی جھگڑا... فیرنگ شیرنگ کی ہے تو اس کا جواب تو انہیں دینا پڑے گا جواب تو لوں گا ان سے میں... لیکن معافی وہ آپ سے مانگیں گے۔ ہاتھ جوڑ کر اور اگر آپ چاہو... تو پاؤں پکڑ کر۔" اس نے جوش میں آ کر اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ڈول کو ٹیبل پہ مارا جو اتفاق سے ٹیبل پہ پڑی سوئی چھیلی پنسل پر لگا اور وہ پنسل تتلی کی طرح اچھل کر سیدھی صلح جو کی ستارہ آنکھ میں اڑتی ہوئی جا گری۔ "ہائے ہے ہے..." اس کی ہائے میں کچھ ڈکرانے جیسی آواز نکلی اور صلح جو نے ڈول پھینک کر آنکھ پہ ہاتھ رکھ کر دبا لیا۔

"اوئے میر محمد... اوئے میرو۔" اس کی دہاڑیں سن کر دبلا پتلا سنگل پسلی سپاہی کمرے میں داخل ہوا تو وہ خوف کے مارے لرزتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"جی سر جی!" اس کی باریک سی آواز سن کر صلح جو نے آنکھ پر سے ہاتھ اٹھا کر سامنے دیکھا تو سارے نظر آنے والے چہروں پر زیر لب مسکراہٹ، ہنسی کو دبانے کی جستجو نظر آئی بلکہ بعض بدتمیز لڑکے تو باقاعدہ ہنس بھی رہے تھے۔ اس کا پارا اور چڑھ گیا۔

"اوئے خانہ خراب! ادھر یہ پنسل کس نے لا کر رکھی تھی۔ یہ پنسل کہاں سے آئی... جواب دے جھینگر۔" وہ زور سے چلایا تو بے چارہ 'جھینگر' اور بھی حواس باختہ سا ہو گیا۔

"وہ... سر جی! ابھی آپ نے ہی... وہ نمبر رجسٹر منگوایا تھا... پنسل اس کے ساتھ تھی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی۔

"الو کے پٹھے! رجسٹر منگوایا تھا... پنسل کیوں لا کر رکھی؟" وہ پھر بلاوجہ دہاڑا۔

"غلطی ہو گئی سر جی! معاف کر دو۔" وہ گھگھیاتے ہوئے بولا۔ اتنے میں ایک دوسرے سپاہی نے عقلمندی کی اور ایک چھوٹا تولیا رومال ٹھنڈے پانی میں بھگو کر اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انسپکٹر نے رومال اٹھا کر اپنی سرخ ہو جانے والی آنکھ پر رکھا اور بچی ہوئی آنکھ سے ان دونوں کو گھورتے ہوئے زور سے چلایا۔

"دفع ہو جاؤ۔" ان دونوں نے نہایت پھرتی سے اس کے آرڈر پر عمل درآمد کیا اور دفع ہو گئے۔

اس نے بہت تھوڑی دیر اپنی آنکھ اور غصے کو ٹھنڈا کیا اور دو تین لمبی لمبی سانسیں لے کر... آنکھیں بھینچ کر کھولیں۔ ہونٹوں کے کنارے کھینچ کر مسکرانے کی کوشش بھی کی، اس عمل سے اس کو اپنی خودی بلند کرنے کا خاطر خواہ موقع ملا۔ وہ دوبارہ سامنے کرسیوں پر بیٹھے حضرات کو دیکھ کر زبردستی مسکرایا اور ٹیلی فون مزید اپنی طرف کھسکا کر نمبر پنچ کرنے لگا۔

"ہالووو..." اس نے فون کان سے لگا کر کسی کو ہیلو کہنے کی کوشش کی۔

"اوئے! تم لوگ کیا اس کے فون سے کھیل رہے ہو۔ جس کا فون ہے اس کے علاوہ ہر آدمی فون پہ بول رہا ہے۔ پہ وہ نہیں بول رہا ہے جس سے مجھے بات کرنی ہے... اوئے اوو اس کو فون۔" اس نے دہاڑتے ہوئے کہا پھر وہ دوسری جانب سے نہ جانے کیا کیا سن کر سر ہلاتا رہا پھر گویا ہوا۔

"اچھا، اچھا تو اسے ڈاکٹر کے پاس بھیجا ہوا ہے۔ ہم م... اچھا اچھا ٹھیک ہے لیکن دیکھ لو... اس کو بھی اور تم سب کو بھی ان شریف اور معزز لوگوں سے معافی مانگنا پڑے گی... کہہ دیا ہے میں نے معافی مانگنا پڑے گی... وہ گھومتے، ادھر ادھر ڈاکٹر کے پاس سے آ جائے... تو اسے ساتھ لے کر آؤ... ادھر ہی... تھانے میں... وہ سب ادھر ہی بیٹھے ہیں... بات سمجھ میں آ گئی ہے نا۔" انسپکٹر صلح جو نے فون رکھتے ہوئے پھر سامنے بیٹھے ہوئے اور ان کے پیچھے دور تک کھڑے ہوئے معززین کو دیکھا اور کچھ مسکرانے کی کوشش کی۔

"وہ جی آپ کے بچوں کے ہاتھ ماشاء اللہ... بڑے مضبوط ہیں۔ ان لوگوں نے اس کا جبڑا توڑ دیا ہے۔ اس کے ساتھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی واپسی نہیں ہوئی ہے اور ویسے بھی مضروب جبڑا ٹوٹ جانے سے بولنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بول نہیں سکتا تو معافی کیسے مانگے گا۔ لیکن یہ پکی بات ہے کہ کل صبح سویرے میں خود ان سب کو... آپ کی خدمت میں آپ کے گھر بھیجوں گا۔ آپ چاہیں تو ان کی ناک رگڑوائیں... چاہیں تو ہاتھ جڑوائیں... معافی لیے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔" انسپکٹر نے بات صبح تک آگے بڑھا دی۔

وہ سب بُرے بُرے منہ بناتے ہوئے واپسی کے لیے نکل آئے۔

☆☆☆

"چوزے اوئے چوزے!" باہر سے کسی لڑکے کی آواز آئی جو کسی عجیب سے نام سے کسی کو پکار رہا تھا۔

"چوزے!" اس نے پھر آواز دی تو علیشا کو لگا کہ کوئی انہی کے گیٹ پر کھڑا آوازیں لگا رہا ہے۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور گیلری میں آ کر نیچے گیٹ پر جھانکا تو واقعی ایک لڑکا انہی کے گیٹ پر کھڑا اوپر دیکھ رہا تھا۔ علیشا نے اشارے سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟

"چوزے کو بھیج دو۔" اس نے صاف اور واضح الفاظ میں کہا۔

"چوزا! کون چوزا؟ کس کو بلا رہے ہو؟ یہاں کوئی چوزا ووزا نہیں رہتا۔" علیشا نے کچھ غصے سے کہا تو اس لڑکے نے دور کھڑے کسی لڑکے سے پوچھا۔

"ابے چوزے کا نام اور کیا ہے؟"

"بہروز۔" دور سے ہی کسی نے چلا کر کہا۔

"بہروز... اور چوزا؟" علیشا نے حیرت سے اپنے آپ سے سوال کیا اور واپس اندر چلی گئی۔ پھر اس نے ہر کمرے میں سوئے ہوئے لوگوں میں بہروز کو تلاش کیا تو وہ ڈرائنگ روم میں سوتا ہوا ملا۔ اس نے اس کی ٹانگ کو ہلا کر کئی جھٹکے دیے تو اس نے آنکھیں کھولیں۔

"وہ نیچے کچھ لڑکے آئے ہیں... اور کسی 'چوزے' کو بلا رہے ہیں۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔

"اچھا... آ گئے وہ لوگ۔" وہ جلدی سے اٹھا۔ تکیے کے پاس سے اپنا موبائل فون اٹھایا۔

"ارے یار! یہ سوئچ آف کیسے ہو گیا۔ تب ہی ان لوگوں کو آواز دینا پڑی۔" وہ نیند سے پوری طرح بیدار ہو کر بال ہاتھ سے ٹھیک کرتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

علیشا نے خاموشی سے کھڑکی کے پردے میں جھری بنا کر نیچے گلی میں جھانکا تو وہاں تقریباً دس بارہ رنگ برنگے... میلے میلے سے لڑکے بہروز کے چاروں طرف جمع تھے اور وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان سب کے درمیان گھر اہوا... آہستہ آہستہ انہیں کچھ کہہ رہا تھا۔ آواز اس نے ہلکی رکھی ہوئی تھی تاکہ کوئی سن نہ لے۔ صرف وہ سارے لڑکے سن رہے تھے اور آہستہ آہستہ سر ہلا رہے تھے جیسے اس کی ہدایات کو ذہن نشین کررہے ہوں۔

''ٹھیک ہے بھئی! بات سمجھ میں آگئی... بارہ بجے تک ان لوگوں کو آنا ہے... ابھی پاپا کے پاس انسپکٹر کا فون آیا تھا۔ اس نے یہ وقت بتایا ہے... تم لوگ اندر آجاؤ... اور سیڑھیوں کے نیچے یا پھر اندر کی طرف چھپ جانا... کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ تم لوگ یہاں چھپے ہوئے ہو... اور جب وہ صفائی مانگ کر واپس جارہے ہوں... تو بس پھر... کردینا وہی آئی پی۔''

اس نے گیٹ کے اندر آکر ان لڑکوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ خراب خراب اندر کہیں غروب ہوگئے۔

علیشا نے دیوار گیر وال کلاک کو دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور چادر سر تک تان کر دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو ایک بج رہا تھا۔ گھر میں برنچ چل رہا تھا۔ کچھ ڈائننگ ٹیبل پر مصروف تھے اور کچھ نے چائے کی پیالیاں تھام کر لاؤنج میں محفل جمائی ہوئی تھی۔ موضوع بحث رات والا ایڈونچر تھا۔ علیشا نے ایک نظر نوید ماموں کے برابر بیٹھے بہروز پر ڈالی۔ اس کے نارمل انداز کو دیکھ کر اس نے سوچا شاید وہ دوسرا ایڈونچر ہونہیں پایا جس کا اہتمام بہروز نے صبح کیا تھا۔ ورنہ تو اس وقت سب کچھ اس قدر پُرسکون نہ ہوتا بلکہ کھلبلی مچی ہوتی۔ وہ وہیں سیڑھی پر تک کر ان کی گفتگو سن کر صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس وقت سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی اور بابر میرانی اندر داخل ہوئے۔

''کیا ہوا بھئی، وہ لوگ آئے نہیں اب تک؟'' انہوں نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

''ہاں یار، ابھی تک تو آئے نہیں... حالانکہ کوئی دکر بجے انسپکٹر کا فون آیا تھا کہ وہ لوگ بارہ بجے آئیں گے۔ اب تو ایک بھی بج چکا... ابھی تک تو پہنچے نہیں ہیں۔'' نوید نے خبر دی۔

''پہنچیں گے بھی نہیں... پاپا! آپ دیکھ لیجیے گا وہ لوگ آئیں گے بھی نہیں... ڈرپوک ہیں سالے... اتنی ہمت کہاں سے لائیں گے کہ ہمارے گھر میں آکر ہمارا سامنا کریں۔'' بہروز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ بھوت ہیں ہم لوگ... یا اتنی خوفناک شکلیں ہیں ہماری کہ وہ ڈر کے مارے نہیں آئیں گے۔'' نوید نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یار مجھے بھی انسپکٹر نے ہی فون کرکے بتایا تھا کہ وہ لوگ جارہے ہیں آپ کے گھر... اسی لیے میں بھی آگیا تھا۔'' بابر بولے۔

''میں انسپکٹر کو فون کرتا ہوں۔ آخر ہم کب تک ان کا انتظار کریں گے اور بھی کام ہیں سب کو۔'' نوید نے کہا۔

''ہیلو! ہاں بھئی، تم کچھ لوگوں کو بھیج رہے تھے میرے پاس... بارہ بجے اب تو ڈیڑھ گھنٹا ہوگیا وہ کیا کراچی سے آرہے ہیں؟'' انسپکٹر آن تھا دوسری جانب سے انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔

''وہ جی... مجھ سے تو انہوں نے کہا کہ نکل رہے ہیں پھر بھی تھوڑی دیر پہلے میرے ساہی نے بتایا کہ ان لوگوں کو خطرہ ہے کہ اگر وہ لوگ آپ کے گھر گئے تو کہیں آپ کے لڑکے انہیں گھیر کر ماریں نہیں... اس وجہ سے وہ ڈر کے مارے گئے نہیں۔''

''کیوں بھئی میرے گھر کو ان لوگوں نے کیا بدمعاشوں کا اڈا سمجھ رکھا ہے۔ یہ ایک شریف آدمی کا گھر ہے۔ اگر وہ آنا نہیں چاہتے تو یہ ان کی نیتوں کا فتور ہے اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ آئندہ پھر کوئی ایڈونچر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے، پھر میں آرہا ہوں پولیس اسٹیشن... ان کے خلاف ایف آئی آر اب تمہیں لکھنا ہی پڑے گی... تمہارے کہنے سے میں نے لڑائی جھگڑے کو فساد بننے سے روکنے کی خاطر صلح کا راستہ نکالا تھا لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ شرارتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں... اس لیے میں آرہا ہوں۔ تم ان کے نام کی ایف آئی آر لکھو۔'' نوید نے غصے میں کہا۔

''اچھا اچھا... ایک منٹ سر جی! آپ تو غصے میں آگئے... آپ بے شک لکھوائیں ایف آئی آر... پر اس کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا... کیونکہ میری ڈیوٹی ختم ہوگئی ہے اور دوسرا ایس ایچ او چھٹی پر گیا ہوا ہے آپ ایسا کرو کل شام کو آجاؤ... میں خود لکھوں گا آپ کی ایف آئی آر... ٹھیک ہے جی؟'' انسپکٹر صلح جو نے انہیں مزید انتظار میں مبتلا کردیا۔ دونوں طرف سے فون بند ہوگئے اور اس کے بعد اسی موضوع پر ایک لمبی گفت وشنید شروع ہوگئی۔ اس عرصے میں بابو بھائی کی بھی انٹری ہوگئی اور انہوں نے ایک ایک لڑکے کی الگ الگ کھنچائی شروع کی۔ یہ ایک لمبا سلسلہ تھا اس لیے علیشا وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

''بانو! آج ڈنر میں کیا ہے؟'' ریحان نے پوچھا۔

''ڈنر میں؟ دیکھو بھئی... امی کی طبیعت خراب ہے وہ کچھ پکا نہیں سکتیں اور نہ ہی میں انہیں پکانے دوں گی... اس لیے ڈنر میں کل کی بچی ہوئی بریانی ہے... کڑاہی اور کھیر ہے... باربی کیو آملیٹ ناشتے میں ختم ہوچکے ہیں جس کو کھانا ہو بتادے میں گرم کرکے لے آتی ہوں۔'' بانو نے اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کل والا کھانا؟ ہیلو گائیز! کیا کسی کا موڈ ہے کل والے کھانے کا؟'' بہروز نے ساری چلتر پارٹی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تو سب نے باجماعت نفی میں سر ہلانا شروع کردیے۔

''اوکے... اوکے... کہیں باہر چلتے ہیں... میکڈونلڈ کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس کے نام لیتے ہی سب کی آنکھوں میں روشنی آگئی اور سب نے باجماعت اثبات میں سر ہلائے۔

''پروگرام تو بنا رہے ہو یہ سوچا کہ پاپا سے اجازت کون لے گا... پاپا نے تم لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے سب کے باہر نکلنے پر پابندی لگادی ہے۔'' بانو نے توجہ دلائی۔

''ان سے اجازت تم لوگی۔''

''میں... نہ بابا مجھے جھانپڑ نہیں کھانا وہ بہت غصے میں ہیں۔'' بانو نے صاف انکار کردیا۔

''کبھی آج تک تمہیں مارا ہے انہوں نے جھانپڑ لاڈلی بیگم... وہ تو ہم ہیں نا تمہارے تین عدد کھوتے بھائی پٹنے کے لیے... باتیں مت بناؤ... جاؤ جاکر اجازت لو۔'' نور نے اسے ڈانٹ پلائی مگر وہ پھر بھی اطمینان سے بیٹھی رہی۔

''جاؤ بانو۔''

''بھئی اگر میں اجازت لے لیتی ہوں پاپا سے... تو مجھے اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ بھئی میرا مطلب ہے جان ہتھیلی پر رکھ کر میں ہی جاؤں گی نا... پہلے ان کی ساری جھاڑ سننا پڑے گی... ہنستے مسکراتے... پھر میں اپنا ٹیلنٹ استعمال کروں گی تو مجھے کچھ تو فائدہ ہونا چاہیے۔'' سب کی گھورتی ہوئی نظروں کا احساس تھا اس کو جو انگلیوں سے گولی مار دینے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

''ٹھیک ہے... تیرے جیسے کا کنٹری بیشن ہم دے دیں گے... بچت کروادیں گے تیری... چلے گا؟'' نور نے آفر کی تو بانو کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''یہ کیا ہے بھئی؟ یہ تو غنڈا ٹیکس ہوگیا۔ سب اپنے اپنے پیسے دیں گے اور یہ فری میں کھائے گی... کھلی دھاندلی ہے یہ۔'' حماد نے پُرزور احتجاج کیا۔

''اچھا... اس کا مطلب ہے میں یہیں بیٹھی ہوں میرے اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بانو کرسی سے اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گئی۔

''نہیں نہیں نہیں... تم جاؤ... یہ حماد ایسے ہی فضول بولتا رہتا ہے... شاباش اٹھ جاؤ۔'' بہروز نے اسے تسلی دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ گاڑیوں میں بھر کر میکڈونلڈ پہنچ گئے۔ وہاں سب نے بہروز کو گھیر لیا۔

طٰہٰ نے پہل کی۔

''بہروز! تیرے اور افتخار کے بیچ کیا چل رہا ہے؟ صحیح بتا... کچھ تو مجھے اس کی بک بک سے اندازہ ہوگیا تھا اور باقی میں دوسرے لڑکوں سے پوچھ لوں گا۔ میں کراچی میں نوکری کر رہا ہوں... یہاں نہیں رہتا... تو کیا ہوا میرے دوست تو یہیں رہتے ہیں... دوسروں سے مجھے پتا چلے اس سے بہتر ہو گا کہ تو خود مجھے بتادے۔'' اس نے پوری سنجیدگی سے بہروز سے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں طٰہٰ بھائی! ایسے ہی پہلے ایک دفعہ اس سے کچھ جھگڑا ہوگیا تھا۔ وہ اس نے دل میں رکھی ہوئی تھی بات... کل پھر اسے موقع مل گیا تو اس نے بلاوجہ مارکٹائی شروع کردی۔'' بہروز نے ہنستے ہوئے بھائی کو چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کی۔

''اچھا آآآ... بلاوجہ؟ میری معلومات کے مطابق تو اس 'وجہ' کا نام بھی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں بتاؤں؟'' طٰہٰ نے اسے گھورا۔

بہروز نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو حماد بھی اسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھ اب تک سوجی ہوئی تھی اور اس پر نیل بھی جوں کا توں تھا۔

''مجھے بھی آپ کی اس 'وجہ' کے سب... یہ تمغۂ امتیاز ملا ہے... اس لیے شروع ہوجایئے۔ ورنہ آپ کے ساتھ وہ سلوک ہوگا۔ جو مچھی کے کتے کے ساتھ ہوتا ہے۔'' حماد نے اپنی سوجی ہوئی آنکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یار! کوئی بات ہی نہیں ہے... تم لوگ بھی اس نشے باز کی باتوں کو سیریس لینے بیٹھ گئے... اسے اپنا ہوش نہیں تھا تو یہ ہوش کہاں ہوگا کہ بول کیا رہا ہے... بلکہ بک کیا رہا ہے۔'' بہروز نے پھر ان سب کو چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کی تو طٰہٰ کو واقعی غصہ آگیا۔

''ٹھیک ہے... ہم سب اور باقی سب گھر والے کل سے کس قدر پریشان ہیں۔ امی اور پاپا کی حالت الگ خراب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ میں کم از کم پاپا تک صحیح بات تو پہنچا ہی دوں گا تاکہ وہ معاملات کو صحیح طرح سے ڈیل کر سکیں ابھی یہاں سے واپس چلو میں سب سے پہلے یہی کام کرتا ہوں۔" اس نے غصے میں وارننگ دی۔

"او بے شرم... کچھ شرم کر... تیری خاطر ہم جیسوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر ان ٹکے ٹکے کے چھوکروں کے جوتے کھائے ہیں۔ ورنہ ہم ان جیسوں کو تھوکنے کے قابل بھی نہیں سمجھتے... سمجھا کر نہیں اور تو ہے کہ ہم سے ہی کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بتاتا ہے صحیح بات یا نہیں۔" حماد نے بھی اسے شرم دلانے کی کوشش کی تو وہ خاموش سا ہو گیا۔

"چل بھئی! شروع ہو جا... تیری کہانی کے کچھ پردے تو ہم پر بھی کھل چکے ہیں۔ اس لیے یہ مت سمجھنا کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ تھوڑا تھوڑا تو شاید بہت سوں کو معلوم ہے یعنی جو یہاں موجود ہیں اور باقی کہانی اب تو سنا ہی ڈال۔" نور نے بھی اسے ڈانٹا تو اس نے ایک نظر سب کی گھورتی ہوئی نظروں پر ڈالی تقریباً سب ہی کی کسی نہ کسی حد تک قہر آلود نظر آ رہی تھیں۔ مجبوراً اسے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

"اچھا بھئی! بتاتا ہوں۔" بہروز نے ٹھنڈی سانس بھر کر ابتدا کی۔

"یہ تقریباً سال بھر پرانی بات ہے... پاپا اپنا کوہسار والا پلاٹ بیچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو جو بھی خریدار آتا اور پلاٹ دیکھنا چاہتا تھا... پاپا اسے میرے حوالے کر دیتے کہ جاؤ پلاٹ دکھا کر لے آؤ... کبھی یہ ہوتا کہ کسی نہ کسی وجہ سے مجھے اکیلے بھی وہاں جانا پڑتا۔ آپ لوگوں کو پتا ہے نا کوہسار جیسی خوب صورت جگہ پر ہمارا پلاٹ بھی بڑی پرائم لوکیشن پر تھا۔ بالکل آخر میں... بلندی پر... اس کے پیچھے نیچے گہرائی میں پھیلے ہوئے کھیت اور دریا کا نظارہ۔ اپنے پلاٹ پر پہنچنے کے لیے بڑی سڑک سے ہٹ کر جو کچا راستہ وہاں تک جا رہا تھا وہیں کونے پر ایک مکان بنا ہوا تھا... بالکل الگ تھلگ اور بڑا ہی خوب صورت مکان... کچھ پرانے فرنچ آرکیٹیکچر کا نمونہ تھا وہ... ڈھلوان چھتوں اور لمبی لمبی فرنچ ونڈوز والا وہ دو منزلہ مکان بہت ہی خوب صورت لگتا تھا مجھے... میں جب بھی وہاں سے گزرتا... اسے غور سے دیکھتے ہوئے ہی گزرتا تھا۔

اس دن بھی شام کا ہی وقت تھا جب میں وہاں سے گزرنے لگا تو عادتاً میں نے اس مکان کی طرف دیکھا اور بس غضب ہو گیا۔ میں نے بائیک کو بریک مارا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید یہ مکان آسیب زدہ ہے اور اس میں کوئی چڑیل پری کے بھیس میں کھڑکی میں کھڑی ہے۔"

"ابے چڑیل تھی... یا پری... سچ سچ بتا؟" وقار نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"اوہو... بابا وہ نہ چڑیل تھی اور نہ ہی پری... ایک لڑکی تھی۔ اب یا تو وہ سچ سچ بہت خوب صورت تھی یا پھر مجھے لگ رہی تھی۔"

"اچھا! تو حلیہ بتا... ہم بتا دیں گے کہ 'تھی' یا 'لگ رہی تھی'۔" نور نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو بہروز نے لہک لہک کر بولنا شروع کیا۔

"چہرہ تھا یا چاند کھلا تھا... زلف گھنیری شام تھی کیا... سفید لباس میں تھی، کھلے بال ہلکی ہوا میں ہلکورے لے رہے تھے اور چہرہ تو بتا ہی دیا کہ بس چاند ہی تھا... میں تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا... قدم زمین نے پکڑ لیے... میں تو آگے بڑھ ہی نہیں پایا۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ابے تو کیا تجھے میونسپلٹی والوں نے آ کر اٹھایا... آگے بول۔" حماد نے چڑ کر کہا۔

"آگے کیا بتاؤں میں تو اسے آنکھیں پھاڑے دیکھ ہی رہا تھا پھر اس نے بھی مجھے دیکھا اور ناگواری سے اپنی خوب صورت... رس ملائی جیسی ناک چڑھاتی ہوئی واپس اندر چلی گئی... بس... کہانی ختم۔" بہروز نے دونوں ہاتھ جھاڑے۔

"اچھا! اڑنے کی کوشش... بیٹے، تیری اس کہانی کا ایک سو چیترواں اپی سوڈ تو ابھی کل چلا ہے۔ اور کہانی ابھی بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ تو نے اتنی جلدی کہانی ختم کیسے کر دی۔ تو نے ابھی پہلی اپی سوڈ سنائی ہے... آگے چل..." حماد نے پھر اسے لتاڑا۔

"یار! بہت بھوک لگ رہی ہے... پہلے کھانا کھا لو... پھر سناتا ہوں۔" بہروز نے کھانے کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے گھورتے ہوئے اس کی بات مان ہی لی۔

☆☆☆

"یہ آج اس قدر بن سنور کر... سواری کدھر جا رہی ہے؟" بانو نے بہروز کو بالوں میں جیل لگاتے دیکھ کر پوچھا۔

"بن سنور کر؟ بانو کیا ہو گیا ہے صاف ستھرے کپڑے پہننا منع ہے کیا... بال بنانا غلط ہے کیا؟ جو ایسے پوچھ رہی ہو... بن سنور کر۔" بہروز نے بانو کے الفاظ منہ بگاڑ کر ادا کیے۔

"ہاں اکثر تو تمہیں میلا میلا ہی گھومتے دیکھا ہے اس لیے اس حلیے میں دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اب جو ذرا ڈھنگ کے حلیے میں نظر آنے لگے ہو تو کچھ شبہ سا ہونے لگا ہے۔" بانو نے اطمینان سے سیب کھاتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"شبہ؟ شبہ کس چیز کا؟" بہروز نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی کہ خدانخواستہ کسی کی نظر کرم کا شکار تو نہیں ہو گئے ہو... کسی نے بلاوجہ تمہیں کہیں لفٹ تو نہیں دے دی ہے۔"

"لفٹ؟ پتا نہیں کتنی ہیں... جو میری نظر کرم اور میری طرف سے تھوڑی بہت لفٹ کے چکر میں میرے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہیں۔ یہ تو میں ہی ہوں جو کسی کو لفٹ نہیں کرواتا... آئی بات سمجھ میں... میں کوہسار جا رہا ہوں کسی کو پلاٹ دکھانا ہے... امی کو بتا دینا۔" وہ بائیک کی چابی اٹھا کر سیڑھیاں اتر گیا۔

"چلو دلدار چلو... چاند کے پار چلو۔" وہ گنگناتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اترا۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھایا اور بائیک پر تیز رفتاری سے نکل گیا۔ بھری دوپہر اور چلچلاتی دھوپ میں وہ بائیک تقریباً اڑاتا ہوا کوہسار پہنچا۔ اپنے پلاٹ والا موڑ مڑتے ہی وہ آفت جاں اسے نظر آ گئی۔ آج وہ زرد لباس میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے وہیں اپنی بائیک روک دی اور سیاہ چشمے کے پیچھے سے اس پر گہری نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ آج اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔ اسے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے اشارے سے قریب بلایا تو وہ بھی ہمت کر کے تھوڑا قریب چلا گیا۔ یہ اس گھر کا عقبی حصہ تھا اس لیے نہ تو کوئی گیٹ تھا اور نہ ہی کوئی چوکیدار یا کتا۔ جس کھڑکی میں وہ کھڑی تھی وہ غالباً اس کے بیڈ روم کی کھڑکی تھی۔

"اے! یہ تمہاری بائیک میری کھڑکی کے سامنے کیوں رک جاتی ہے؟" اس نے بڑے انداز سے پوچھا۔

"خراب ہو جاتی ہے۔" بہروز نے باچھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کمال کی ٹریننگ دی ہوئی ہے تم نے اپنی بائیک کو... یہیں آ کر خراب ہوتی ہے اور تمہیں اسے ٹھیک کرنے میں آدھا گھنٹا لگ جاتا ہے۔" اس نے کچھ طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اگر یہ ٹائم کم ہے... تو میں اسے ٹریننگ دیتے ہوئے سمجھا دوں گا کہ ٹھیک ہونے میں تھوڑا زیادہ وقت لگایا کرے۔" بہروز مسکرایا۔

"اے ہیلو! زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے... ابھی کتا چھوڑ دیا تو ایک گھنٹا نہیں ایک سیکنڈ میں تم اور بائیک دونوں ہوا میں پرواز کرتے نظر آؤ گے سمجھے۔" اس نے سچ کی دھمکی دیتے ہوئے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"ہاں... تم اور تمہارا کتا... دونوں سر آنکھوں پر... کہاں ہے وہ... خوش قسمت جو اپنے شب و روز آپ کے ساتھ گزارتا ہے۔ میں اس کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام پیش کرنا چاہتا ہوں۔" بہروز نے فلمی انداز میں ڈائیلاگ مارے تو وہ ہنسی۔

"بلڈی ہے وہ... ادھر سلام... ادھر ہاتھ تھام... چند منٹ لگیں گے... ہڈیاں بھی نہیں چھوڑتا ہے وہ۔" اس نے ڈرانے کی کوشش کی۔

"یہ بھی اعزاز ہو گا میرے لیے کہ تمہارا کتا مجھے کھا جائے پھر وہ جب بھی بھونکے گا تو تمہیں میری ہی صدا سنائی دے گی..." بہروز نے اس کے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے گلگوں ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی۔

"خدا کی پناہ... کتنی بک بک کرتے ہو تم... آج سے پہلے کتنی لڑکیوں سے یہ ڈائیلاگ بول چکے ہو! لگتا ہے پکا رٹا لگایا ہوا ہے... فر فر بغیر فل اسٹاپ اور کاما... سارا مضمون زبانی یاد ہے۔" اس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"مجھے آج تک بچپن میں یاد کی ہوئی چھٹی کی درخواست بھی زبانی یاد ہے۔ اگر کہو تو پیش کروں... خیر جانے دیں، لیکن ابھی جو کچھ میں نے عرض کی وہ رٹا ہوا نہیں بلکہ میرے دل کی آواز تھی اور آج تک میں نے کسی لڑکی کے سامنے ایسا کوئی ڈائیلاگ نہیں بولا۔ تم میرا پہلا 'کرش' ہو... تمہیں دیکھ کر عجیب عجیب خیالات مجھ پر نازل ہو رہے ہیں جو پہلے کبھی ذہن پر اترے نہیں تھے۔" اس نے سیاہ چشمہ آنکھوں سے ہٹا کر ناک پر رکھا اور چشمے کے اوپر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے ہیلو! ایکسپریس ٹرین، بہت تیز رفتاری سے بڑھ رہے ہو... پہلی بار بات چیت میں 'کرش'... کچھ زیادہ ہی جلدی میں نہیں ہو تم؟" اس نے ذرا غصے سے اس کے سامنے ہاتھ نچاتے ہوئے سوال کیا۔

"بات چیت پہلی مرتبہ ہو رہی ہے، دیکھ تو بہت عرصے سے رہا ہوں... میرے حساب سے تو بہت پہلے یہ مذاکرات ہو جانے چاہیے تھے مگر چلیں کوئی بات نہیں... دیر آید درست آید۔" بہروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ تمہارے حساب سے... جو دیر آید ہے، وہ درست آید بھی ہے ابھی گارڈز کو بلا کر تمہاری مرمت کرواؤں... اور پھر کتا چھوڑ دوں... تب بھی درست آید ہو گا۔" اس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کرو گی... کیونکہ جو دھمکیاں دیتے ہیں۔ وہ عمل نہیں کرتے۔ صرف لفظوں سے ڈراتے ہیں یہ بھی ان کی محبت کا ایک انداز ہوتا ہے۔ اور بہت خوب ہوتا ہے۔" بہروز نے پہلے اسے چڑا کر پھر سے چکرا دیا۔

"اوایم جی اتم کیا چیز ہو چلو! اس سے پہلے کہ تمہیں کوئی دیکھ لے اور مشکوک جان کر تمہیں گھیر لے... یہاں سے نکل لو۔ اپنے پیروں پر چلے جاؤ تو اچھا ہے نہیں تو چار آدمیوں کو زحمت کرنا پڑے گی۔" اس نے کچھ غصے اور دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

"اُف ایسی بات تو ہے تمہاری... جو میرے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ کتنا خیال ہے تمہیں میرا... مجھے کوئی تکلیف پہنچے' یہ تمہیں برداشت ہی نہیں ہے بس اسی خیال سے میں جاتے جاتے پھر رک جاتا ہوں۔" اس نے چشمہ اتار کر بھرپور شرارت آمیز نظریں اس پر ڈال کر کہا تو شاید اسے سچ مچ غصہ آ گیا اور وہ غصے میں آنچل جھٹک کر واپس پلٹی اور کھڑکی کے پیچھے کہیں غروب ہو گئی۔ کھڑکی کے پٹ اس نے اس طرح بند کیے جیسے اس کے منہ پر دے مارے ہوں۔

"اُف! زرد موسم میں شوخ گلابی پھولوں کی بہار... یک دم کہاں جا چھپی... تو کہاں ہے بتا... اس نشیلی شام میں... مانے نہ میرا دل دیوانہ۔" اس نے اس کے زرد دوپٹے پر کھلے چھوٹے چھوٹے شوخ گلابی پھولوں کو یاد کرتے ہوئے یہ آواز بلند گانا گایا اور اپنی بائیک اسٹارٹ کر کے واپسی کے لیے موڑ لیا۔ کوہسار کے خوب صورت ماحول پر ڈوبتے سورج کے رنگ بکھرنا شروع ہو گئے تھے۔ کھیتوں، درختوں اور دریا کے اس پار پہاڑوں کے پیچھے سورج تیزی سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس نے کچے راستے سے نکل کر بائیک سڑک پر ڈالی اور تیزی سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

کھانا کھا کر بچے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ انہوں نے ٹی وی کھولا تو خبرنامہ ختم ہو چکا تھا اور ٹی وی پر کوئی بہت ہی دھانسو قسم کا ٹاک شو ہو رہا تھا۔ جس میں اینکر پرسن خاتون سمیت سارے شرکا حلق کے بل چیخ چیخ کر لڑ رہے تھے اور اپنے اپنے مخالفین کو کپتی ہوئی عریاں لفظوں کی گالیوں سے نواز رہے تھے۔ چہرے سرخ، آنکھیں انگارہ، گلے کی رگیں پھولی ہوئی، وہ سب ایک دوسرے کو بغیر رکے اور بغیر سنے اچھی طرح لتاڑ رہے تھے۔ ایسے میں خاتون اینکر پرسن کی چنگھاڑتی ہوئی... سیٹی جیسی آواز... اور ان کے جلتے ہوئے سوال نے... اور بھی جلتی پر تیل چھڑکا... اور ایک نیا ہنگامہ ہاؤ ہو شروع ہو گیا۔

نوید نے بیزار ہو کر ٹی وی بند کیا اور میز پر پڑا اخبار اٹھا لیا۔ دو چار سرسری نظریں ڈال کر ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ ٹی وی پر جو کچھ سنائی دے رہا ہے اور دکھائی دے رہا ہے۔ وہی اخبار کے صفحات میں تحریر کی شکل میں پھیلا ہوا گند ہے۔ لہٰذا انہوں نے اخبار بھی واپس رکھ دیا۔ نبیلہ کو فون کرنے کے ارادے سے اٹھے ہی تھے کہ انہیں بابر میرانی کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

"اچھا مہناز! میں جا رہا ہوں... بابر آ گیا ہے۔" وہ چابیاں اٹھاتے ہوئے سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔

یہ ان تینوں دوستوں کا روز کا معمول تھا۔ رات کو وہ تینوں اپنے اپنے گھروں سے نکل کر شہر کے ایک پارک میں جا کر ایک ڈیڑھ گھنٹا چہل قدمی کرتے۔ پھر کینٹین کی چائے پیتے جاتے... گپ شپ کرتے اور ایک ڈیڑھ بجے اپنے اپنے گھر لوٹ جاتے۔

نوید، بابر اور بابو کی دوستی بہت مضبوط اور گہری تھی۔ وہ تینوں اپنی اپنی زندگی کے تقریباً تمام مسائل پر ایک دوسرے سے مشورے کرتے اور ہر ایک کے مسائل کو مل کر اس طرح حل کرتے تھے جیسے وہ اس کا اپنا ذاتی مسئلہ ہو۔

اس دن بھی چہل قدمی کے دوران میں اور بعد میں بھی پورا وقت بہروز کا معاملہ ہی زیرِ بحث رہا۔

"یار! وہ انسپکٹر ٹال مٹول کر رہا ہے۔ ایف آئی آر لکھنا ہی نہیں چاہتا..." نوید نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ایف آئی آر اس کا باپ بھی لکھے گا۔ اب ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ ایک ایف آئی آر بھی نہ لکھوا سکیں۔ چلتے ہیں کل پولیس اسٹیشن... میں فون کرواتا ہوں اس کے بھی کسی باپ سے... پھر دیکھتا ہوں کیسے کرتا ہے وہ ٹال مٹول۔" بابو بھائی جلال میں آ گئے۔

"ہاں یار! ایف آئی آر لکھوانا مسئلہ نہیں ہے لیکن اس کے بعد جو مسائل ہوں گے جن کا ذکر انسپکٹر نے کیا تھا اس کے بارے میں واقعی ایک بار سوچنا ضرور پڑے گا۔" بابر نے اپنے نرم سے مخصوص لہجے میں کہا۔

"لیکن یار! بالکل خاموش ہو کر بیٹھ جانا بھی تو صحیح نہیں ہے۔ پہلے مارکٹائی کی حد تک جھگڑا ہوا... کل وہ اتنا بڑھا کہ فائرنگ ہو گئی۔ اب اگر پھر لڑکوں سے لڑائی ہوئی تو مجھے ڈر ہے خدانخواستہ دونوں طرف سے کوئی بھی اگر جان سے گزر گیا تو بات بہت بڑھ جائے گی اور یہ میں کسی صورت نہیں چاہتا۔" نوید عمل کی لڑائی سے واقعی پریشان اور فکرمند تھے۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا... ایف آئی آر میں اگر ہم ان سب بدمعاشوں کے نام ڈلوا دیں... تو کم از کم وہ محتاط تو رہیں گے۔ لڑائی جھگڑے سے گریز تو کریں گے ہی نا۔" بابو بھائی نے چیخ کر کہا۔

"ہاں بابو بھائی! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..." بابر نے کہا۔

اسی اثنا میں نوید کے فون پر کال موصول ہوئی۔

"ہیلو، ہاں نبیلہ باجی! خیریت تو ہے... اتنی رات کو فون کر رہی ہو؟" نوید نے فون کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میں نے ٹاؤن کے لڑکوں میں سے ایک دو کو بلوایا تھا کہ ذرا ان کے موڈ کا تو پتا کروں آخر وہ لوگ چاہتے کیا ہیں۔ تو بھیا! وہ تو خود بڑے ڈرے ہوئے ہیں... کہہ رہے تھے کہ ہم نے انہیں اس وقت مار تو لیا ہے لیکن اب بہروز اور اس کے ساتھی ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔ اسی ڈر سے وہ گھر پر بھی نہیں آئے... کہہ رہے تھے کہ ان کے کسی مخبر نے بتایا ہے کہ بہروز نے لڑکے گھر میں چھپائے ہوئے ہیں۔ ہم اگر وہاں گئے تو پھر ہماری واپسی مشکل ہو جائے گی... اپنے قدموں پر۔" انہوں نے بتایا۔

"ارے بکواس کر رہے ہیں باجی! ان کی باتیں صحیح نہیں ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے ہمارے گھر میں کون سے لڑکے چھپے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی خوامخواہ کی بہانہ بازی ہے۔" نوید نے غصے سے کہا۔

"اچھا بھیا! ان کا خیال ہے کہ کسی کے بھی گھر آنے کے بجائے انہیں کسی ایسی جگہ ملنا چاہیے جو غیر جانبدار اور ذمے دار لوگوں کی ہو تو میرے خیال میں اگر میں انہیں اپنے آفس میں بلوا لوں... تو تم لوگ وہاں آ جاؤ گے؟ اعتراض تو نہیں ہو گا وہاں دو چار اور ذمے دار لوگ بھی موجود ہوں گے تو اچھا رہے گا۔" نبیلہ باجی نے پیشکش کی۔

نوید نے فوراً بابر اور بابو بھائی کو بتایا اور ان سے رائے لی تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے باجی! بلوا لو انہیں اپنے آفس میں... تاکہ بتا دینا ہم بھی پہنچ جائیں گے لیکن انہیں بتا دینا کہ یہ آخری کوشش ہو گی۔ وہاں نہیں آئے... معافی نہیں مانگی... تو بس ختم... پھر ہم صرف تھانے جائیں گے اور دیکھ لیں گے صلح جو کوئی۔" نوید نے ذرا سخت لہجے میں بات ختم کر دی۔

☆☆☆

"یہ تم روزانہ اسی وقت تیار ہو کر کہاں جانے لگے ہو... کالج سے آئے... کھانا کھایا... اور اس کے بعد تمہاری تیاری شروع۔ نہانا دھونا... استری کیے کپڑے پہننا... بال جیل سے جمے ہوئے' جوتے پالش سے چمک رہے ہوتے ہیں... چہرے کو بھی شاید شوشائنر سے چمکاتے ہو... آخر جاتے کہاں ہو؟" بانو نے اسے تیار ہوتے دیکھ کر اس کا پورا حلیہ ایک ہی سانس میں بیان کرتے ہوئے سوال بھی داغ دیا۔

"کہاں جاؤں گا بھئی، دوستوں میں چلا جاتا ہوں تھوڑی دیر کے لیے۔" بہروز نے اسے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"اچھا، ان دوستوں میں لڑکیاں بھی شامل ہیں کیا؟" بانو نے پھر سوال کیا۔

"لاحول ولا قوۃ... بانو میں لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتا... تم جانتی ہو۔" اس نے صفائی پیش کی۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ پچھلے کچھ عرصے میں تمہارے اندر بڑی واضح تبدیلیاں آئی ہیں جو میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی ہیں... بہتر ہے کہ خود ہی بتا دو... ورنہ میں پتا تو لگا ہی لوں گی کہ قصہ کیا ہے؟" بانو نے ہلکی پھلکی دھمکی دی۔

"بانو! مانا کہ تم میری بڑی بہن ہو... لیکن تمہارے طور طریقے اماں جیسے ہیں کیونکہ سوتیلی اماں بننے کی کوشش کر رہی ہو!" بہروز نے بگڑتے ہوئے لہجے میں کہا تو بانو نے سر ہلاتے ہوئے اس کی بات سنی اور بولی۔

"تم اپنے آپ کو مزید مشکوک سے مشکوک تر بناتے جا رہے ہو... کچھ نہ کچھ تو ہے۔" بہروز نے غصے سے گھور کر اسے دیکھا اور بائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ لیکن بہر حال ایک فکر ضرور لاحق ہو گئی۔ بانو کے تیز دماغ نے بڑا کچھ بھانپ لیا تھا اور یہ خطرے کا سگنل تھا۔

"چلو... اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔" اس نے بے فکری سے سر ہلایا اور بائیک دوڑاتا چلا گیا۔ شوقِ دیدار اسے اڑائے لیے جا رہا تھا۔ آخر کار اس نے کوچۂ جاناں میں قدم رکھا۔ مگر مایوسی ہوئی۔ آج وہ کھڑکی بند تھی جس میں سے وہ ماہ کامل طلوع ہوتا تھا۔ ایک دو بار اس نے بائیک کو ریس بھی دی کہ وہ آواز سن کر کھڑکی میں آ جائے... مگر ایسا نہیں ہوا۔ پر وہ اتنی جلد مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے راستے سے بائیک ہٹا کر کچے حصے پر ڈال دی جس کے آگے اس کا گھر بنا ہوا تھا۔ یوں وہ اس مکان کے زیادہ قریب آ کھڑا ہوا۔ ایک دو بار ریس دے کر اس نے ہارن بھی بجایا پھر اچانک ہی کھڑکی کھلی اور وہ نمودار ہوئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’’کیا تکلیف ہے تمہیں؟ یہ شور کیوں مچایا ہوا ہے؟‘‘ اس نے ذرا غصے سے کہا۔

’’میری تکلیف تم ہو... تمہیں معلوم تو ہے پھر کیوں پوچھ رہی ہو۔‘‘ بہروز نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

’’اچھی بھلی جارہی تھی میں شاپنگ کے لیے... پر اس منحوس ڈرائیور نے بیان دیا۔ بی بی! گاڑی تو خراب ہے۔ ابھی میں جارہا ہوں کسی مکینک کو لینے... اب بتاؤ مجھے اتنی ضروری چیزیں خریدنی ہیں... اور وہ کب مکینک کو لائے گا کب گاڑی ٹھیک ہوگی اور کب میری چیزیں آئیں گی جبکہ ضرورت مجھے ابھی ہے۔ تو یہ ہے نا غصے والی بات۔ غصہ نہیں آئے گا تو کیا ہوگا؟‘‘ اس نے نان اسٹاپ گاڑی چلائی۔

’’او کے او کے، اگر زیادہ ضروری چیزیں ہیں تو مجھے بتا دو... میں لا دیتا ہوں، تمہارے لیے تو میں تارے توڑ کر لا سکتا ہوں۔ تو یہ چند چیزیں کیا چیز ہیں۔‘‘ بہروز نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کی کوشش کی تو جواب میں اس نے کوئی تکلف کیے بغیر فوراً ہاتھ میں پکڑی لسٹ اس کی طرف اچھالی جو اس نے کیچ کرلی کیونکہ اس میں ایک بالی بھی لپٹی ہوئی تھی اس لیے وہ سیدھی اس کے ہاتھوں میں آگئی۔

’’تھینک یو! سو نائس آف یو... تم پلیز جلدی سے یہ چیزیں مجھے لادو... پھر ہم بہت سی باتیں کریں گے... ویر تھینکس۔‘‘ اس نے کہا۔

بہروز جو لسٹ دیکھ رہا تھا وہ زیادہ لمبی تو نہیں تھی لیکن خاصی جناتی بھر کم تھی۔ یعنی ایک غیر ملکی شیمپو کی بڑی بوتل... ڈاگ فوڈ کا پانچ کلو کا بیگ... اورنج اور ایپل جوس کی بوتلیں... پرفیوم، ٹالکم پاؤڈر کا بڑا ڈبا اور دو ڈنر سیٹ۔

بہروز کے چہرے پر پسینے کے قطرے دھاروں میں تبدیل ہونے لگے۔ اس نے بڑی بے بسی سے اوپر دیکھا تو وہ دشمن جاں بڑی دلنواز مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

یہ تقریباً ڈھائی تین ہزار کا نسخہ تھا۔ پیسوں کے لیے وہ اس سے کہہ نہیں سکتا تھا... کرے تو کیا کرے؟ عجب کشمکش میں تھا کہ اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

’’پلیز! جلدی واپس آنا... میں یہیں کھڑکی میں کھڑے رہ کر تمہارا انتظار کروں گی۔‘‘ بہروز نے بڑے دل گرفتہ سے انداز میں اسے دیکھا تو وہ خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اب اسے جانا ہی پڑا کیونکہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

اسے معلوم تھا کہ اس کے والٹ میں اس وقت پانچ چھ سو سے زیادہ پیسے نہیں ہو سکتے اس لیے وہاں سے وہ سیدھا اپنے دوست کے پاس پہنچا۔ موبائل پر فون کرکے اسے گھر سے باہر بلایا تو وہ سوتے سے اٹھ کر آنکھیں ملتا ہوا آیا۔

’’کیوں بے؟ یہ اتنی دوپہر میں شریف لوگوں کے سونے اور آرام کرنے کا وقت ہوتا ہے، تجھ پہ کیا آفت آئی ہے جو اس چلچلاتی دھوپ میں خوار پھر رہا ہے؟ بول کیا بات ہے؟‘‘ اس نے کھری کھری سناتے ہوئے پوچھا۔

’’بول لے بھئی... تو بھی بول لے... ابے یار! مصیبت میں پڑ گیا ہوں... اس لیے آنا پڑا... امی نے سودا منگوایا تھا... پیسے یا تو کسی نے نکال لیے یا گر گئے۔ سودا لے کر جانا ضروری ہے... گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں تو ایسا کر... مجھے دو ہزار روپے دے دے... میں کل آکر گھر پر ہی واپس دے جاؤں گا۔‘‘ بہروز نے بہانہ بنایا تو اس کا دوست اندر گیا اور جلدی سے پیسے لاکر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ پیسے مل گئے... اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور صدر کی طرف چل دیا۔ لسٹ میں دی ہوئی چیزیں وہیں مل سکتی تھیں۔

جلد سے جلد وہ چیزیں خرید کر واپس آیا تو واقعی وہ کھڑکی میں ہی کھڑی تھی۔ اس دن انہوں نے تھوڑی زیادہ دیر تک باتیں کیں پھر یہ سلسلہ ہر دوسرے تیسرے روز چلنے لگا... کبھی اسے کچھ منگوانا ہوتا تھا تو کبھی کچھ...

’’ابو نے بھی ایسے ویران جنگل میں گھر بنوالیا ہے جہاں دور دور تک ضرورت کی کوئی چیز نہیں ملتی چھوٹی چھوٹی چیز ولی کے لیے کتنی زیادہ پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔‘‘ اس نے اس دن بہروز کے پہنچتے ہی تمہید باندھی۔

’’لانا کیا ہے... یہ بتاؤ... کیونکہ اب تو روز کا سلسلہ ہے یہ۔‘‘ بہروز نے سنجیدگی سے کہا تو اس نے کچھ چونک کر اسے دیکھا مگر ہمت نہیں ہاری۔

’’وہ دراصل گرمیوں میں ابو کھانے کے ساتھ سی ضرور پیتے ہیں اور انہیں اگر لسی نہ ملے تو ان کا موڈ بہت سخت خراب ہو جاتا ہے۔ اب پرابلم یہ ہے کہ دہی ختم ہو گیا ہے۔ صبح خانساماں سودا لینے گیا تھا۔ سب کچھ لے آیا۔ دہی بھول آیا۔ اب وہ کھانا بنانے کی تیاری کر رہا ہے اب اگر اسے بھیجا تو کھانے میں دیر ہو جائے گی... پھر اور مصیبت... سب کی شامت آئے گی۔‘‘ اس نے پوزیشن واضح کی۔

’’یعنی آج پھر مجھے دوڑانے کے موڈ میں ہو... یار! میں تم سے ملنے... تم سے باتیں کرنے آتا ہوں اور تم مجھے کچھ نہ کچھ لینے دوڑا دیتی ہو... دس ناٹ فیئر۔‘‘ بہروز کے ذہن میں اپنے خالی والٹ کی تصویر ابھری اور اس ٹینشن میں لیے جانے والے قرضوں کی عبرت ناک صورت حال ایک لمحے کے لیے بجلی کی طرح کوندی تو وہ کچھ ڈپریشن میں مبتلا ہونے لگا۔

’’اچھا ٹھیک ہے... تم بھی جواب دے دو... اب جو بھی ہوگا میں بھگت لوں گی۔ ابو کے عتاب کا نشانہ بننا آج لکھا ہے میری قسمت میں تو بس۔‘‘ وہ روہانسی ہوکر واپس مڑنے لگی تو بہروز پریشان ہوگیا۔

’’اچھا رکو تو سہی... میں نے منع کب کیا ہے... لیکن یہ آخری مرتبہ ہے... آئندہ اپنا سودا یاد سے خود منگوا کر رکھنا... مجھے مت دوڑانا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ اس نے اس قدر معصومیت سے سوال کیا کہ بہروز فدا ہوگیا۔

’’اس لیے کہ میں ہر وقت تمہیں اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں... یہاں آکر پھر تم سے دور جانا... بہت مشکل ہوتا ہے یار۔‘‘ وہ مسکرانے لگی۔

وہ روزانہ چار بجے کے قریب وہاں آتا تھا۔ سڑک سے اتر کر وہ کچے میں گھر کے نزدیک آکر موٹر بائیک کو دو مرتبہ ریس دیتا اور پھر بنگلے سے ایک مرتبہ ہارن بجاتا تھا۔ وہ فوراً کھڑکی کھول کر سامنے آجاتی تھی۔

اس دن بانو نے پھر نوٹ کیا کہ بہروز روزانہ تین بجے سے تیاری کرتا ہے اور بن ٹھن کر (بقول اس کے) ساڑھے تین بجے گھر سے نکل جاتا ہے۔

’’ایسا کون سا دوست ہے تمہارا... جس سے تم اس قدر پابندی سے... ٹھیک ٹائمنگ کے ساتھ... اتنی گٹ میں ملنے جاتے ہو؟‘‘ اس نے آنکھیں نکال کر سوال کیا۔

’’کیا ہے بانو؟ ہر وقت ایسے ہی سوال کرتی رہتی ہو... تم تو مجھے لگتا ہے میری دوسری اماں ہو... خواہ مخواہ دماغ مت کھایا کرو۔‘‘ اس نے بانو کو جھڑکا۔

’’اچھا... نورا آج سے تم ذرا اس کی نگرانی کرو... کچھ نہ کچھ تو پتا چل ہی جائے گا۔‘‘ بانو نے دوسرے بھائی سے کہا تو بہروز کے اندر بھی خطرے کی گھنٹی بجی۔

’’ابے یار! آج نور بھائی پیچھے نہ لگ جائیں۔ شامت آجائے گی۔ کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔‘‘ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو الرٹ کیا۔ پھر اگلے دو دن تک اس نے بریک دیا۔ دل اگرچہ بار بار مچلا کوئے جاناں کے چکر لگانے کو لیکن اس نے دل کو سمجھایا کہ بس ’’آل از ویل، آل از ویل۔‘‘ دو تین دن کے بعد اس نے ٹائمنگ تبدیل کرنے کا سوچا اور کالج سے واپسی پر اس نے ایک جگہ رک کر بن کباب کھایا... کیونکہ بھوک لگ رہی تھی۔ جیب میں پیسے نہیں تھے کہ ڈھنگ کی کسی جگہ سے کوئی معقول قسم کا برگر کھا سکتا۔

چنانچہ ٹھیلے پر سے بن کباب کھاتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو ملامت بھی کی کہ اپنے نادان دل کے ہاتھوں کس حال کو پہنچ گیا وہ... لیکن پھر بھی جذبہ صادق تھا اور ہمت جواں... لہٰذا وہ پھر کوہسار کی سڑک پر دوڑ رہا تھا اور آج وہ چار بجے کے بجائے ڈیڑھ بجے ہی پہنچ رہا تھا۔

جیسے ہی اس نے پکی سڑک سے بائیں طرف مڑنے کے لیے بائیک آہستہ کی تو عجیب ہی منظر اسے نظر آیا۔

وہ دشمن جاں اسی طرح کھڑکی میں کھڑی تھی اور اسی کی طرح کا کوئی دیوانہ نیچے بائیک سمیت کھڑا تھا۔ وہ سر اوپر اٹھا کر اسے دیکھ رہا تھا اور شاید کچھ کہہ بھی رہا تھا اور وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنی ٹکائے ہتھیلی پر اپنا چہرہ لیے بڑی محویت سے مسکرا مسکرا کر اس کی بات سن رہی تھی۔ یہ دل دوز منظر دیکھ کر اس نے نہ صرف فل بریک مارے بلکہ بائیک کو تھوڑا پیچھے لے کر ایک مکان کی آڑ میں کھڑا کرلیا اور خود تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کی دیوار کی آڑ سے جھانک جھانک کر اس دل دوز منظر کو دیکھتا رہا... اندر ہی اندر اس کا دل رو رہا تھا اور دماغ غصے سے کھولنا شروع ہوگیا۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے وہی جانا پہچانا منظر دیکھا۔ اس حسینہ چار سو بیس نے اوپر سے لپٹا ہوا ایک کاغذ اس بائیک والے کی طرف اچھالا جسے اس نے شاید اس کا دل سمجھ کر مہارت سے کیچ کرلیا۔

آگے کا منظر بہروز کے لیے جانا پہچانا تھا۔ اسے کاغذ کھول کر اس میں لپٹی نادیدہ منہ میں ڈالنا تھی۔ پھر اس حسینہ کے دلنشیں ہاتھوں سے لکھی ہوئی... چھوٹی لیکن بھاری بھرکم لسٹ پر ایک نظر ڈال کر... دوسری بے چارگی کی نظر اس حسینہ پر ڈالنا تھی۔ جس میں ایک کرب ناک فریاد... کروٹیں لے رہی ہوگی لیکن... لیکن ہونٹوں پر ایک بے بسی آمیز مسکراہٹ بھی سجی ہوئی ہوگی۔ چند الفاظ بھی دل پر جبر کرکے ادا کیے ہوں گے۔ ’’ٹھیک ہے جانو! یہ تو کچھ بھی نہیں... تم کہو گی تو آسمان سے سورج، چاند، ستارے سب کچھ توڑ لاؤں گا۔‘‘ اس نے سوچتے سوچتے ایک دفعہ پھر جھانک کر ادھر کا منظر دیکھا۔ وہ بائیک موڑ کر واپس آرہا تھا۔ اسے ادھر سے ہی گزرنا تھا۔

بہروز نے بھی اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور جیسے ہی وہ کچے راستے سے ایک پکی سڑک پر آیا... بہروز نے اپنی بائیک عین اس کے سامنے لاکر روک دی، اس نے یک دم فل بریک لگائے۔ تصادم سے بچنے کے لیے... گاڑیاں تو تصادم سے بچ گئیں لیکن اب وہ ایک دوسرے سے بالکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نزدیک... چہرہ ایک دوسرے کے سامنے اور تقریباً ناک سے ناک ملائے کھڑے تھے۔
"کیوں بے، یہ کیا حرکت ہے؟ ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو؟" اس نے ہیلمٹ سے جھانکتے ہوئے بہروز کو لتاڑا۔ تو بہروز نے بھی قریب سے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔
"افتخار تو... تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" بہروز نے اسے پہچان کر سوال کیا۔
"کر کچھ نہیں رہا ہوں... یہاں سے گزر رہا ہوں... اور یہ پبلک روڈ ہے... تیری ذاتی سڑک نہیں ہے جو اس طرح تو نے سامنے آکر میرا راستہ روکا ہے۔"
"یہاں سے گزرنے سے پہلے کہاں تھا؟ یہ پوچھ رہا ہوں میں؟" بہروز نے غصے کا اظہار کیا۔
"اچھا آ آ آ... تو اب تو ایک پولیس والے سے انویسٹی گیشن کرے گا کہ وہ کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟" اس نے ترخ کر جواب دیا۔
"کیوں، پولیس والا کیا آسمان سے اترا ہے... جو اس سے کوئی کچھ پوچھ نہیں سکتا... سیدھی طرح بتا... کہاں سے آرہا ہے؟" بہروز رعب میں نہیں آیا۔
"ابے پاگل ہو گیا ہے کیا؟ جو اس طرح کے سوال جواب کر رہا ہے۔ میں کہاں سے آرہا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں، کیوں، کیا کیسے... میں کیا پابند ہوں تیرے اس طرح کے اسٹوپڈ سوالوں کے جواب دینے کا؟" افتخار نے اس کی صاف جھنڈی اڑا دی۔
"اچھا... چل میں بتا دیتا ہوں... کہ تو کہاں سے آیا ہے... اور کہاں جا رہا ہے... وہ جو سامنے والا مکان ہے نا... تو اس کی اس دیوار کے سائے میں سے آرہا ہے جس کے اوپر کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور کھڑکی والی سے تجھے سودے کی ایک لسٹ مع ایک ٹافی کے ملی ہے... وہ ٹافی تیرے منہ میں ہے اور لسٹ جیب میں... اور اب تیرا رخ سپر مارکیٹ کی طرف ہے تو کسی دوست کے پاس جائے گا... اس سے پیسے ادھار لے گا... بلکہ... نہیں نہیں تو تو پولیس والا ہے... تو ادھار نہیں لے گا راستے میں کوئی شکار پھانسے گا... اس سے پیسے نکلوائے گا... پھر سپر مارکیٹ سے جا کر لسٹ کے مطابق چیزیں خریدے گا... واپس آئے گا... اس کھڑکی کے نیچے جا کر ہارن بجائے گا... اوپر سے ایک باسکٹ رسی میں بندھی نیچے آئے گی... تو اس میں چیزیں ڈالے گا اس کے جواب میں تجھے کھڑکی والی سے دو چار میٹھی میٹھی باتیں... اور ایک بھرپور مسکراہٹ ملے گی تو ابھی اس مسکراہٹ کی بارش میں نہا ہی رہا ہوگا کہ اچانک الفاظ کی بجلی کڑکے گی اور تیرے کانوں میں ایک آواز آئے گی... "ہائے اللہ ابو آگئے۔" کھڑکی دھڑ سے تیرے منہ پر بند ہوگی اور تو پھٹکار زدہ صورت لے کر... سر جھکائے اسی راستے سے واپس چلا جائے گا۔" بہروز نے نہایت اطمینان سے گزر جانے والے... اور آنے والے حالات بیان کیے۔ جنہیں افتخار نے پھٹی آنکھوں اور کھلے منہ سے سنا... شاید وہ حیرت کی زیادتی سے گنگ ہو گیا تھا۔ بہروز نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو ہاتھ بڑھا کر اس کا کھلا منہ بند کیا۔
"ابے منہ تو بند کر لے... ٹافی کا شیرہ منہ سے باہر بہنے لگا ہے۔" اس کی بات سن کر افتخار حیرت کے حصار سے باہر آیا۔
"ابے سچ سچ بتا تو تو اس طرح سارا منظر نامہ پیش کر رہا ہے جیسے کسی فلم کا سین ہے، تجھے کیسے معلوم یہ سب کچھ؟"
"اس لیے معلوم ہے بیٹا کہ یہ فلم پہلی بار نہیں چل رہی... کئی دفعہ چل چکی ہے اور ہر دفعہ یہی سین ہوتا ہے... ہیرو بدلتے رہتے ہیں... پر ہیروئن وہی ہوتی ہے۔" بہروز نے اطلاع دی۔
"تو کیا... تو بھی اسی فلم میں کام کر چکا ہے۔ تو بھی ہیرو رہ چکا ہے کیا اس ہیروئن کا؟" افتخار نے بوکھلا کر سوال کیا۔
"بیٹے مستقل ہیرو تو میں ہی ہوں... بس تیرے جیسے پارٹ ٹائم ہیرو بدلتے رہتے ہیں... تجھ سے پہلے کوئی اور تھا... آج تو ہے... تیرا بٹوا خالی ہو جائے گا... تو کوئی اور آجائے گا۔" بہروز نے اطمینان سے اپنا کالر چھوتے ہوئے جواب دیا۔
"بکواس مت کر... میں کوئی پارٹ ٹائم ہیرو نہیں ہوں... فل ٹائم لائف پارٹنر بننے والا ہوں۔" افتخار نے دعویٰ کیا تو بہروز نے سر ہلایا۔
"ہاں آں آں... خواب دیکھنا اچھی بات ہے... وہ بھی سینی ایم ایم کے پردے پر کوڈک فلم کے کلرز میں... لیکن میری جان! ان خوابوں کو حقیقت سمجھنا... نری حماقت اور فل ٹائم بے وقوفی کے سوا اور کچھ نہیں۔" بہروز نے اس کے دعوے پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔
"کوئی حماقت نہیں... کوئی بے وقوفی نہیں... اس سے میری بات پکی ہے... اور جلد شادی کا فیصلہ ہونے والا ہے۔" افتخار نے کہا۔
"اور یہ فیصلہ کس نے کیا؟ تو نے... اور اس ہیروئن نے... دونوں نے مل کر... اس میں اس کے اور تیرے ماں باپ، وہ بھیانک بلڈ ہاؤنڈ کتا... اس کا وہ منحوس

خانساماں... جو ہر روز سودے میں شامل سب سے مہنگی چیزیں بھول آتا ہے اور جو انہیں لانی پڑتی ہیں یا وہ ڈرائیور... جو کبھی گاڑی کو صحیح حالت میں نہیں رکھتا اس لیے ہر وقت وہ اور اس کی گاڑی گیراج میں ہوتے ہیں یا پھر وہ 'ابو' جو ہر ایسے وقت نازل ہو جاتے ہیں جب وہ انہیں وہاں سے بھگانا چاہتی ہے... یہ سب شامل ہیں کیا اس فیصلے میں؟" بہروز نے تیز رفتاری سے بولنے کے ریکارڈ قائم کرتے ہوئے کہا تو افتخار نے سر پکڑ لیا۔
"لعنت ہو تجھ پر... پتا نہیں کیا کیا بول کر... میرا دماغ گھما ڈالا ہے تو نے... بکواس بند کر اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ صرف اور صرف میرا معاملہ ہے تو اس علاقے میں نظر آنے کی کوشش مت کرنا... ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ کبھی تجھے دوست بھی رکھا تھا میں نے... پولیس والا تو ہوں لیکن تیرے ساتھ کوئی پولیس گردی نہیں کی تھی میں نے... پر اب... اب یہ جو معاملہ ہے نا... اس میں محبت بھی ہے... اور جنگ بھی جس میں سب کچھ جائز ہوتا ہے... سب کچھ بولے تو... سب کچھ... چل ہٹ... یہ ساون کی گھٹا۔" اس نے بہروز کی بائیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت سے ایک طرف تھوکا اور سائڈ سے اپنی بائیک نکال کر سڑک پر پہنچ گیا۔ وہاں بائیک اسٹارٹ کرنے کے لیے کک ماری اور پھر رک گیا۔ مڑ کر بہروز کی طرف دیکھا۔
"ویسے بائی دا وے... کبھی انسپکٹر صلح جو کا نام سنا ہے؟"
اس نے بہ آواز بلند سوال کیا تو بہروز نے نفی میں سر ہلایا۔
"تو اب سن لے... وہ جو گھر ہے نا جس کے تو چکر کاٹنے آیا تھا... انسپکٹر صلح جو کا ہے اور حسینہ طرح دار اسی کی بیٹی ہے۔" افتخار نے اس پر یہ انکشاف ایسے گولے کی طرح گرایا جیسے نیوٹن کے سر پر وہ سیب گرا تھا جس کے سبب کشش ثقل کی تھیوری برآمد ہوئی تھی۔ وہ تو یہ انکشاف کر کے چلا گیا... پر بہروز کو کافی الجھن میں ڈال گیا۔ اس نے ایک نظر دور جاتے ہوئے افتخار پر ڈالی اور دوسری نظر مڑ کر اس گھر کی بند کھڑکیوں پر ڈالی جہاں لڑکی، کتا، ڈرائیور، خانساماں اور ان سب کا باپ رہتے تھے۔ وہ سب اس کے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے تو وہ بھی واپس ہو گیا۔ سارے راستے اسے لگتا رہا کہ کوئی ہانڈی اس کے سر پر رکھی ہے اور اس میں کچھ ابل ابل کر پک رہا ہے۔
وہاں سے وہ سیدھا اپنے دوست یاور کے پاس پہنچا۔ اس کے بارے میں تمام دوست کہتے تھے کہ وہ صرف سونگھ کر معاملے کی چھان بین کر لیتا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کا منہ چلتے رہنا ضروری تھا کیونکہ جتنی تیزی سے اس کا منہ چلتا تھا اتنی تیزی کے ساتھ اس کا دماغ کام کرتا تھا۔ منہ بند... دماغ بند بہروز اس کے گھر کے پاس پہنچا تو وہ باہر ہی مل گیا۔ گلی کے نکڑ والے اسٹور سے چپس اور پوپس کے تھیلے خرید رہا تھا۔ جو سب سے بڑے سائز میں تھے۔
"ہاں بھئی، یہ اس بھری دوپہر میں خواری کیوں کرتا پھر رہا ہے؟ کوئی کام ہے کیا؟" اس نے مٹھی بھر کر چپس منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں کام تو ہے... یہ بتا... تو انسپکٹر صلح جو کو جانتا ہے؟" بہروز نے مری ہوئی آواز میں پوچھا تو یاور نے اسے غور سے دیکھا۔
"کیوں بے! کوئی پولیس کیس بنوالیا ہے اپنے اوپر کیا؟" اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے بات کچھ اور ہے۔" بہروز نے چڑچڑے لہجے میں تو یاور نے اسے مزید گھورا کچھ دیر غور سے اسے دیکھتا رہا اس نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا اور پھر ایک بے ساختہ قسم کا قہقہہ اس کے منہ سے نکلا جس سے کھائے ہوئے چپس کے ٹکڑوں کی پھوار بہروز پر بھی پڑی۔
"سمجھ گیا... سمجھ گیا... تو نے بھی کوہسار کی چوٹی سر کرنے کی کوشش میں منہ کی کھائی... اور عزت اور دولت گنوائی ہے... جیب خالی... اور فرمائش عالی ہے... پیسے ادھار چاہئیں؟" اس نے قہقہے کو بریک لگاتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں یار! پیسے نہیں... مدد چاہیے تیری۔" بہروز نے بیزاری سے کہا۔
"کیوں، ماں باپ نے جرم عشق میں گھر سے نکال دیا کیا؟ رہنے کا ٹھکانا چاہیے؟" یاور نے اپنی عقل دوڑائی۔
"ابے نہیں بھائی! تجھے کچھ معلومات چاہیے... کوہسار میں بڑی بڑی کھڑکیوں والا وہ گھر... کیا واقعی انسپکٹر صلح جو کا ہے... اور وہ لڑکی کیا واقعی اس کی بیٹی ہے؟" بہروز نے اپنی الجھن بیان کی۔
"تو شاید آخری آدمی ہے جسے یہ بات معلوم نہیں... اور تو مجھ سے پوچھ رہا ہے... ورنہ لطیف آباد کا وہ کون سا ہیرو نہیں ہے جو وہاں چکر نہیں لگا چکا ہر ایک کے ساتھ وہاں ایک سی واردات ہوتی ہے... وہ لڑکی ایک کھڑوس پولیس والے کی بیٹی ہی نہیں... خباثت میں اس سے بھی دس قدم آگے ہے۔ پہلے دانہ ڈالتی ہے... پھر کبوتر کو الو بناتی ہے... پھر اس کی جیبیں خالی کرواتی ہے جب ہیرو کی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ قرض میں گلے گلے ڈوب جاتا ہے تو اس کو ذلیل اور شرمندہ کر کے بھگا دیتی ہے۔ وہ بے چارہ شرمندگی کے سبب پھر بھی ادھر کا رخ ہی نہیں کرتا کسی ایک آدھ نے ہیرو بننے کی کوشش کی بھی تو اس کے ناہنجار گرانڈیل کتے نے اسے دوڑا دوڑا کر ہلکان کر دیا... اور شکار کی پینٹ یا شرٹ کا ٹکڑا اپنے منہ میں دانتوں میں الجھا کر فاتحانہ انداز میں واپس جا کر... اپنی مزید ناہنجار مالکن سے داد و تحسین وصول کی۔

''ویسے کیا تیرے ساتھ بھی یہی واردات ہوگئی ہے؟ پر تیرے کپڑے تو کہیں سے پھٹے ہوئے نہیں ہیں؟'' یاور نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں... شکر ہے کہ یہ نوبت نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی تھوڑی بہت عقل آ گئی پر ایک بات بتا... یہ افتخار کا کیا قصہ ہے؟'' بہروز نے پوچھا۔

''افتخاررر...'' یاور نے اس کے نام کو کھینچا۔

''دیکھ بنے! وہ بھی پولیس والا... انسپکٹر بھی پولیس والا... انسپکٹر کو بھی اپنی بیٹی کی شادی تو کرنا ہی ہے۔ افتخار ہیڈ کانسٹیبل ہے انسپکٹر چاہتا ہے کہ وہ کچھ آگے بڑھ کر کسی حد تک ہم پلہ ہو جائے۔ اسی کی تحریک پر... اس کی بیٹی نے افتخار کو شرائط کا پابند کیا ہے کہ وہ نہ صرف سول سروسز مقابلے کا امتحان دے... بلکہ اپنے ڈپارٹمنٹل ٹیسٹ اور ٹریننگ وغیرہ بھی مکمل کرے تاکہ جلدی جلدی اس کی پروموشن ہو اور وہ اونچے رینک میں آ جائے... پھر انسپکٹر بڑے فخر سے کہہ سکے کہ اس کی بیٹی کی شادی ایک بہت بڑے سرکاری افسر سے ہوئی ہے... اب چونکہ اس سارے سلسلے میں وقت لگے گا... اس لیے افتخار کبھی کبھی اس کی کھڑکی کے نیچے اسے دیکھنے پہنچ جاتا ہے کیونکہ جب تک افتخار کسی قابل نہیں ہو جاتا... وہ انسپکٹر کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا ہے... نہ ہی اس کی بیٹی سے مل سکتا ہے... یہ ہے ساری کہانی۔'' یاور چپ ہو گیا۔

''تجھے یہ سب کیسے معلوم؟'' بہروز نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں بھئی! کیا میں کسی دوسرے ہیرو سے کم ہوں... بیٹے! ہم بھی اسی دریا کے شناور ہیں... جس کے کنارے سے تو دامن بھگو کر آیا ہے۔'' یاور نے کالر چھوتے ہوئے گردن اکڑائی۔

''لاحول ولا قوۃ... اے تیرے جیسی اناج کی بوری کا وہاں کیا کام... اس لڑکی کی آنکھیں اتنی بھی کمزور نہیں ہیں کہ وہ ہیرو کے بڑے بھائی کو بھی ہیرو سمجھنے لگے۔'' بہروز نے اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔

''ایسا تیرا خیال ہے... ورنہ اسے تو اصل ہیرو میں ہی لگتا تھا۔'' یاور نے اپنی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ تیرے اپنے بیان کے مطابق اس کا اصل ہیرو ہے افتخار... پھر بھی تیری خوش فہمی ختم نہیں ہوئی۔'' بہروز جھنجلا رہا تھا۔

''ارے یار! میں تو پہلے ہی کوئٹ کر چکا تھا۔ وہ جس پیار سے لوتی ہے وہ مجھے ہضم نہیں ہو سکا... اس لیے مجھے افتخار سے... یا کسی اور سے کیا لینا دینا ہے۔''

''مگر مجھے ہے... مجھے لینا دینا ہے... مجھے اس افتخار سے لینا دینا ہے... میں اس کے ہاتھ پاؤں تڑوا دوں گا... جب میڈیکلی وہ ان فٹ ہو جائے گا تو پھر دیکھتا ہوں کیسے پہنچتا ہے اونچے رینک پر...'' بہروز غصے سے جھلا کر بولا۔

''اے یار! تو کیا سچ مچ سیریس ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ دیکھ بھائی! اگر تجھے اس لڑکی سے تعلق رکھنا ہے تو پہلے ایک دو بینک لوٹ لے تاکہ اس کا فرمائشی پروگرام چلتا رہے اور تیری گاڑی چلتی رہے... ورنہ دھوبی کا کتا بننے میں دیر نہیں لگے گی جو گھر کا نہ گھاٹ کا۔'' یاور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے اپنی گاڑی چلانے کی اب ضرورت نہیں رہی... لیکن اس کمینے افتخار کو میں نہیں چھوڑوں گا... چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' بہروز نے دھمکی دی۔

''وہ بھی یہی سوچتا ہوگا تیرے بارے میں۔'' یاور نے اطمینان سے چپس کا تھیلا خالی کر کے اسے الٹ کر ہتھیلی پر جھکا اور دور پھینک دیا۔ بچے کچھے چپس کے ٹکڑے منہ میں ڈال کر وہ پوپس کا تھیلا کھولنے لگا۔

بہروز نے سارا غصہ بائیک کی کک پر اتارا... اور آندھی طوفان کی طرح وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ دو چار دن کے بعد ہی شہر میں بہروز کا سامنا افتخار سے ہو گیا۔ بہروز کسی دکان پر رک کر کچھ خرید رہا تھا۔ بارش ہو کر رک چکی تھی اس کے پیر کے پاس ہی ایک چھوٹا سا گڑھا پانی سے بھرا ہوا تھا۔ پتلی سی گلی میں موٹر سائیکلوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اچانک ایک بائیک اس کے بالکل قریب سے گزری اور اس کا ایک پہیا پانی کے گڑھے میں پڑا تو پانی اچھل کر... کچھ چھینٹے بہروز کی پینٹ کے پائنچے پر پڑ گئے اور بہروز نے بائیک والے کو دیکھ لیا... وہ افتخار تھا۔

اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بائیک اس کے پیچھے لگائی اور چند قدم پر جا لیا۔

''سالے، کمینے تو نے جان بوجھ کر مجھ پر کیچڑ کے چھینٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اڑائے ہیں... میرے کپڑے گندے کیے ہیں۔ اب میں تجھے سبق سکھاؤں گا۔" اس نے اس کا گریبان پکڑ کر جھٹکے دیے اور ایک گھونسا رسید کیا۔ جس کا نشانہ تو اس کا چہرہ تھا لیکن اس نے بروقت ایک جانب چہرہ ہٹا کر اسے بچ ہونے سے بچالیا... پھر بھی پہلا وار ناکام ہونے کے باوجود... بہروز نے مزید تھپڑ اور گھونسوں سے اس کی تواضع کی جو اپنے ٹھیک ٹھیک نشانوں پر لگے اور انہوں نے افتخار کے چہرے اور ہاتھوں پر بیچ بیچ تباہی مچائی... بہروز کے جھٹکوں نے اس کے گریبان کے سارے بٹن بھی توڑ دیے... لوگ جمع ہو گئے... افتخار نہ جانے کیوں بہروز جیسے سنگل پسلی والے سے دب رہا تھا... اور وہ جوابی کارروائی کرنے کے مقابلے میں بھاگنے کے چکر میں زیادہ تھا۔

آخرکار اسے موقع مل گیا۔ جمع ہونے والے لوگوں نے بہروز کو سمجھانے کے چکر میں گھیر لیا اور وہ نکل بھاگا... پھر لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

☆☆☆

"تو بھئی، یہ تھی ساری کہانی... اب تو تسلی ہو گئی تم لوگوں کی۔ اب اگر اجازت ہو تو میں بھی اپنا برگر کھالوں۔" بہروز نے سب کے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا تو سب جو محویت سے اس کی کہانی سن رہے تھے، چونک سے پڑے۔

"ہاں ہاں... تو بھی اب کھا ہی لے... مگر ایک بات بتا... یہ کہانی ابھی کتنی لمبی اور چلے گی... تجھے وہ ہیروئن تو مل نہیں سکتی... کیونکہ انگور کھٹے ہیں تو پھر تو اس افتخار کو کیوں بار بار بہانے بہانے سے کوٹ رہا ہے؟" حماد نے سوال کیا۔

"یار میں کیا کروں؟ میں جب بھی اسے دیکھتا ہوں... میرا دماغ کھولنے لگتا ہے اور ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی ہے... مجھے ایسا لگتا ہے کہ صرف اسی کی وجہ سے میں اس لڑکی کے ہاتھوں بے وقوف بنا ہوں... اور اس میں ایسا ہے کیا جو مجھے اس کی خاطر ریجیکٹ کیا گیا؟" اس نے کھاتے کھاتے رک کر کہا۔

"تو یہ کہیے ناں کہ آپ کی ایگو ہرٹ ہوئی ہے... آپ! جو اپنے آپ کو بڑا طرم باز خان سمجھتے ہیں... اس لڑکی نے آپ کو پچھاڑ مارا ہے... اور یہ شکست آپ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے... آپ نے اب اپنا ون لائن موٹو بنا لیا ہے کہ کسی بھی طرح آپ اس کی توڑ پھوڑ کر کے اسے سیدھا ان فٹ کرنا چاہ رہے ہیں تاکہ وہ اونچے رینک پر پہنچنے نہ پائے... اور نہ ہی وہ انسپکٹر صلح جو کا داماد بن سکے کیونکہ یہ

اعزاز تو آپ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔" بانو ایک لمحے میں بات کی تہ تک پہنچ گئی۔

"دیکھو یار! بات یہ ہے کہ مجھے اب اپنے لیے ایسا کوئی اعزاز نہیں چاہیے لیکن میں اس لڑکی سے بدلہ ضرور لینا چاہتا ہوں... اس نے جس طرح مجھے بے وقوف بنایا... لوٹا... اس کی تھوڑی بہت سزا تو اسے ملنی ہی چاہیے نا..." بہروز نے پیپسی کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔

"یہ کیا منطق ہے بھئی، سزا لڑکی کو دینا چاہتے ہو... چکل کر رکھ دیا افتخار کو۔" ایک اور آواز آئی تو بہروز مسکرایا۔

"بھئی، دراصل افتخار ہی تو اس کا ہیرو ہے... لیے چر ہے... اس کی آئندہ زندگی افتخار کے سبب ہی تو معیار کی بلندی تک پہنچے گی... تو جس سیڑھی پر چڑھ کر وہ خود بلندیوں تو پہنچنا چاہتی ہے میں اسی سیڑھی کو توڑ پھوڑ دینا چاہتا ہوں... ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہوں... اب سمجھے ہو... کہ میں افتخار سے کیوں خار کھاتا ہوں؟"

"پہلے خار کھا رہا تھا... اب مار بھی کھائی ہے... اور آج جب بات یہاں تک پہنچی ہے تو تجھے اندازہ نہیں ہوا... کہ تیرے لیے مشکلیں کس حد تک بڑھتی جا رہی ہیں؟" طہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"مار... مار کھائی ہے میں نے... افتخار سے؟ بھائی کیا ہو گیا ہے؟ میں نے آخر تک اس کو نہیں چھوڑا... ٹاؤن کے لڑکے مجھے مار رہے تھے... افتخار کی قسمت میں تو صرف پٹنا لکھا ہے۔" بہروز نے اطمینان سے کہا تو طہ نے افسوس ناک نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایک بات بتا! وہ تجھ سے وزن میں دگنا نہیں تو ڈیڑھ گنا تو ہوگا اور ہے بھی پولیس والا... ٹرینڈ... تربیت یافتہ... اس کی کیا مت ماری گئی ہے کہ وہ تجھ سے پٹ لیتا ہے... تجھے مارتا نہیں ہے... آج تک تو نے ہی اسے پیٹا ہے... اس نے تجھے نہیں مارا... تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کوئی تو سبب ہوگا لیکن کیا؟" طہ نے سوال کیا۔

"ارے بھائی! کسی کو مارنے کے لیے وزن، طاقت اور تربیت کے بجائے... جگرا ہونا چاہیے جگرا... جو مجھ میں ہے... اس میں نہیں ہے۔"

"مجھے تیری سمجھ بوجھ پر افسوس ہو رہا ہے بہروز! تجھے معلوم ہے آج کل اس کی ٹریننگ چل رہی ہے جو تین ماہ بعد ختم ہوگی تو اس کا پروموشن ہوگا... اور وہ اسی تھانے میں... انسپکٹر صلح جو کی جگہ ایس ایچ او بن کر آ جائے گا یہ صلح جو نے بتایا ہے... اب تو خود سوچ لے... جب وہ اپنے علاقے کے

تھانے میں ایس ایچ او بن کر آئے گا تو تیرے اگلے پچھلے سارے گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں کا بدلہ تجھ سے اکٹھا کس طرح لے گا... کسی بھی بہانے تجھے پکڑ کر لاک اپ کرے گا... پھر تجھے پولیس کے ڈرائنگ روم میں لے جا کر... کس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالے گا... تو خود سوچ لے۔"

"کیوں؟ بغیر کسی وجہ کے بغیر کسی جرم کے پکڑ لے... اندھی چل رہی ہے کیا؟" بہروز کے لہجے میں کمزوری تھی۔

"تجھے اپنے ملک کی پولیس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے کیا... ابھی وہ صرف اپنا مستقبل بنانے کے لیے کمزور پڑ رہا ہے... صلح جو نے بتایا تو تھا کہ اگر ایف آئی آر میں اس کا نام آ جاتا ہے تو فوری طور پر وہ معطل ہوگا اور ٹریننگ سے بھی نکالا جائے گا... سارا مستقبل تباہ ہو جائے گا... یہی وجہ ہے کہ صلح جو ایف آئی آر کاٹنے کے بجائے... صلح کرنے پر زیادہ زور دے رہا ہے... آخر وہ اس کا ہونے والا داماد ہے۔ اس کا مستقبل خود انسپکٹر کو بھی بہت عزیز ہے۔" طہ نے تفصیل سے سمجھایا تو سب لوگ صورت حال کی نزاکت پر غور کرنے لگے۔

"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے طہ بھائی؟" بہروز نے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے... صلح کرنا ہے بس اور کیا؟" اس نے جواب دیا۔

"لیکن جھگڑا تو پھر بھی... کبھی بھی ہو سکتا ہے... اگر بہروز نہ بھی کرے تب بھی ٹاؤن کے لڑکوں سے بھی پنگا ہو گیا ہے، وہ کر سکتے ہیں... افتخار خود نہ لڑے انہیں آگے بڑھا دے کہ ذرا مزہ چکھاؤ... تو پھر؟" حماد نے سوال کیا۔

"اس کے لیے ہم یہ کر سکتے ہیں کہ بعض معزز لوگوں کی موجودگی میں یہ صلح کروائی جائے اور وہ ٹاؤن کے لڑکوں اور افتخار سے یہ وعدہ لیں کہ آئندہ وہ اس طرح کی کوئی مار کٹائی... فائرنگ وغیرہ نہ ہو... بہروز اور ہم سب کی طرف سے بھی ان لوگوں کے سامنے یقین دہانی ہو... کہ ہماری طرف سے کوئی جھگڑا نہ ہو... جن لوگوں کے سامنے یہ ہو... ان میں سب سے پہلے تو انسپکٹر صلح جو... پھر اپنے پڑوسی ڈی ایس پی انکل... پھر ناظم ٹاؤن اپنے بابر انکل... پاپا کے کولیگ کے بڑے بھائی... جو مجسٹریٹ ہیں ان سب لوگوں کو بلا لیا جائے... تو پھر امید ہے کہ بہتری ہوگی۔" طہ نے کہا۔

"چلو بھئی! آپ سب اتنا اصرار کر رہے ہو تو ایسا ہی کر لیں گے۔" بہروز نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ سب بھی اٹھ گئے۔

پھر اگلے دو دنوں کے اندر ہی نبیلہ باجی کے آفس میں سارے مذکورہ لوگوں کی موجودگی میں صلح بھی ہو گئی۔ ایک دوسرے سے گلے بھی ملوا دیا گیا اور پنجابی ایسا ہی لگا کہ

سارے گلے شکوے دور ہو گئے اور دل صاف ہو گئے۔ بڑوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا جبکہ نبیلہ باجی نے موقع محل کے اعتبار سے دونوں پارٹیوں کے لڑکوں کو ٹھیک ٹھیک تڑیاں لگانے کا فریضہ بھی بحسن وخوبی انجام دیا۔

☆☆☆

اس دن وہ گلاب پان ہاؤس سے پان لینے گیا تو برابر میں چائے کے ہوٹل پر اس نے افتخار کو بیٹھے دیکھا۔ بال پریشان، کپڑے میلے اور منہ لٹکا ہوا تھا۔ پان لے کر وہ اس کے پاس چلا گیا۔

"کیا ہو گیا؟ آج بڑا پریشان سا لگ رہا ہے... سب خیریت تو ہے نا؟" اس نے سلام دعا کے بعد سوال کیا۔

"ہاں یار، بس ایسے ہی۔" اس نے کہا تو لہجے میں اداسی کی جھلک نمایاں تھی۔ پھر اچانک ہی اسے کچھ خیال آیا، سر اٹھا کر بہروز کو دیکھا پھر بولا۔

"کوہسار چلتا ہے تھوڑی دیر کے لیے؟"

"ہائیں... کوہسار؟ بھائی تجھے تو پتا ہے اس گلی میں ہم نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ وہ تیرا راستہ ہے تو شوق سے چکر لگا وہاں کے... مجھے کیوں لے جا رہا ہے وہاں؟" بہروز کچھ حیران ہوا اس کی پیشکش پر۔

"یار بس تھوڑی دیر کے لیے... میں خود بھی کچھ دیکھنا چاہتا ہوں اور تجھے بھی کچھ دکھانا چاہتا ہوں... رکیں گے نہیں... بس فوراً ہی واپس آ جائیں گے۔" افتخار نے اصرار کیا۔

"دیکھ یار! تو پھر مجھے کچھ چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے... پھر کسی پھڈے کا موڈ ہے کیا؟" بہروز نے افتخار سے پوچھا۔

"ارے یار! لعنت بھیج پھڈے وڈے پر... وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ بنا تھا۔" اس نے کچھ دکھ اور کچھ غصے سے کہا۔

"کیوں؟ کیا مر گئی وہ؟"

"ہاں... مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ اب بحث مت کر... چل آ جائیں گے تھوڑی دیر میں۔" افتخار نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بائیکوں پر وہیں پہنچے جہاں کبھی ان کا کوچہ جاناں ہوا کرتا تھا۔ رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ بہروز نے حیران ہو کر اس خوب صورت گھر کو دیکھا جس کی بڑی بڑی فرنچ ونڈوز روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ کیونکہ یہ مکان کی پشت تھی اس لیے ابھر آرائشی روشنیاں نہیں لگائی گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں لیکن سامنے کی جانب لگائی گئی آرائشی روشنیاں اس قدر بہتات سے استعمال کی گئی تھیں کہ ان کے انعکاس سے پورا گھر جگمگا رہا تھا اور تمام کھڑکیوں کے شیشے تیز سنہری روشنیوں سے منور تھے۔

''اتنی لائٹنگ؟ یہاں کیا ہو رہا ہے بھئی؟'' بہروز نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''شادی۔'' افتخار نے مختصر جواب دیا۔

''کس کی شادی بھئی؟'' بہروز نے کچھ الجھ کر پوچھا۔

اسی فتنہ ساماں کی... اور کس کی؟'' افتخار نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

''ہائیں... اس کی شادی ہو رہی ہے... اور تم یہاں کھڑے ہو... اس کی شادی تو تمہارے ساتھ ہو رہی تھی نا... پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''بس یار! انسپکٹر صلح جو نے ہی ایس پی افسر بننے کی شرط رکھی تھی۔ میں ابھی اس کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ انہیں کوئی بنا بنایا سی ایس پی افسر مل گیا اور انہوں نے وی آئی پی کر دیا۔'' افتخار نے بڑے مجروح لہجے میں کہا۔

''اور وہ لڑکی؟ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا؟ ایک مدت سے مل رہے تھے تم لوگ یار؟'' بہروز کو افتخار پر ترس آ رہا تھا۔

''وہ لڑکی! وہ اپنے باپ سے بڑی خباثت کا شاہکار ہے۔ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کیں، مجھے بری طرح لوٹا... جھوٹے سپنے دکھائے اور آخر میں مگرمچھ کے آنسو آنکھوں میں بھر کر کہہ رہی ہے... شریف لڑکیاں ماں باپ کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتیں... اور میری مجبوری ہے کہ میں ایک شریف لڑکی ہوں... دیکھا ہے نا تو نے اس 'شریف' لڑکی کو۔'' افتخار نے شریف کو غصے سے چبا کر ادا کیا۔

اس کی بات سن کر بہروز آہستگی سے ہنسا۔ اس روشنیوں سے جگمگاتے گھر کی کھڑکیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے افتخار کو مخاطب کیا۔

''یار! اس وقت تو اور میں... ایک ایسی ٹینشن میں مبتلا ہیں کہ مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے... جو میں تجھے سنانا چاہتا ہوں... شعر کچھ اس طرح ہے۔

آعندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

تو ان حالات میں... تجھے میں ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تو رونا چاہے تو میرا کندھا حاضر ہے... یہاں دیکھنے والا، سننے والا کوئی نہیں ہے۔ تو چاہے تو یہ آواز بلند رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا ہے۔'' بہروز نے افتخار کو جو پیشکش کی تھی، اس کے مان لینے کی بعید ترین توقع بھی نہیں تھی لیکن افتخار کو نہ جانے کیا ہوا... وہ آگے آیا اور بہروز کے کندھے پر سر رکھ کر واقعی زور زور سے رونے لگا۔ کافی دیر رویا۔ اس دوران بہروز اس کو تسلی دینے کے لیے اس کی پیٹھ آہستہ آہستہ تھپکتا رہا۔ پھر آخر کار اس کی ہچکیاں اور سسکیاں رک گئیں۔ اس نے اپنے آنسو تو بہروز کی شرٹ میں جذب کر ہی دیے تھے، سر اٹھانے سے پہلے شوں کی آواز کے ساتھ اپنی ناک بھی اس کی قمیص سے پونچھ کر پیچھے ہٹ گیا۔

''شاباش! ناک بھی پونچھ ڈالی میری شرٹ سے... یہ تو نہیں کہا تھا میں نے۔'' بہروز نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''آنسو تھے۔'' اس نے صفائی پیش کی۔

''یار! مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر انسپکٹر صلح جو نے تیرے ساتھ یہ کیا کیا ہے؟'' بہروز نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وی آئی پی کر دیا ہے اس نے۔'' ابھی وہ اتنا ہی بولا تھا کہ مکان کے کونے سے ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس نے کتے کی زنجیر ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی اور وہ گرانڈیل کتا مچل رہا تھا۔

''اوئے، کون لوگ ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ تھوڑا اور آگے بڑھا تو اس نے افتخار کو پہچان لیا۔

''اوئے افتخار تو! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ تجھے پتا نہیں انسپکٹر صاحب نے سب نوکروں کو حکم دیا ہوا ہے کہ افتخار اگر آس پاس نظر آئے تو اس پر کتے چھوڑ دو... اچھا ہوا جو میں کتا ساتھ لے آیا تھا۔ یہ میں چھوڑ رہا ہوں تجھ پر۔'' نوکر نے زنجیر کھولنے کی تیاری کی اور ان دونوں نے کوئی توقف کیے بغیر دوڑ لگا دی۔

کتا آزاد ہو کر کافی دور ان کے پیچھے بھونکتا ہوا لپکتا رہا... اور وہ تیز سے تیز بائیکس دوڑاتے آخر کار کتے کو ہرانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر بھی ابتدا میں ہی کتے نے ایک چک مارا تھا افتخار کی ٹانگ پر... لیکن اس کے دانتوں میں صرف اس کی شلوار کا ایک حصہ آیا تھا اور وہ تقریباً بالشت بھر کا ٹکڑا نوچ کر لے گیا تھا۔

کافی دور پہنچ کر وہ تھوڑا سا رکے تو بہروز کی نظر افتخار کی پھٹی ہوئی شلوار پر پڑی۔

''ابے! یہ کیا کر دیا اس نے؟'' وہ چلایا۔

''وی آئی پی کر دیا اس نے۔'' افتخار نے جواب دیا۔

اور وہ دونوں ہنستے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk